خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ
جون 2014
WWW.PAKSOCIETY.COM

جلد 44 • شمارہ 06 جون 2014 • زرِ سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313(021) فیکس: 35802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

جون ایلیا

شعور

شام گہری ہوگئی ہے۔ دونوں وقت مل رہے ہیں اور مجھے نواب مرزا شوق لکھنوی کی زہرۂ اوراق اور شہرۂ آفاق مثنوی ''زہر عشق'' یاد آرہی ہے جو میں نے آٹھ نو برس کی عمر میں سنی تھی اور دس گیارہ برس کی عمر میں پڑھی تھی۔ اس حشر انگیز مثنوی کا میرے خواب لڑکپن کی دنیا، دنیا نہیں بلکہ میرے لڑکپن کی کائنات پر ایک سحر طاری تھا۔ یہ مثنوی شاعری اور معشوقانہ شاعری کا ایک معجزہ ہے۔ میں عشق و حسن کے رشتے کے ایک خاص احساس کی حالت میں دیوان غالب تو کیا خدائے سخن میر کی کلیات تک کو ''زہر عشق'' پر وار سکتا ہوں۔ اس وقت مجھے ''زہر عشق'' کا ایک شعر، ایک عجب حال خیزی کے ساتھ یاد آرہا ہے۔

رخ پہ گیسو ہوا سے ہلتے ہیں
چلیے اب دونوں وقت ملتے ہیں

''......دونوں وقت ملتے ہیں'' سے میرے ذہن میں اچانک ایک لفظ ابھرا ہے اور وہ لفظ ہے انسان۔ انسان میں بھی دو کیفیتیں ملتی ہیں۔ ایک کیفیت خیر ہے اور دوسری شر۔ اب یہ ایک الگ بات ہے کہ بعض اوقات یا اکثر اوقات انسان سراپا شر نظر آتا ہے۔

اس لفظ یعنی انسان کا ''مادہ'' یا عربی قواعد کی اصطلاح میں ''بنا'' الف، نون، سین یعنی ''انس'' ہے۔ انس کا ایک تلفظ ''انس'' ہے اور دوسرا تلفظ ''انس'' اس کے معنی ہیں خوش خلق، ملنسار اور ایک دوسرے سے مانوس ہونا۔ (وغیرہ)

اب میں انسان کے معنی کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اس لفظ کے معنی کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان وہ جاندار ہے جو اپنے دماغ یا مغز سر کی راست اور درست فعلیت یا اس کے رشد کامل کے سبب دوسرے تمام جانداروں سے اعلیٰ اور اشرف حیثیت رکھتا ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ انسان وہ (راست قامت) جاندار ہے جو راست کار، راس کوش اور درست راستے پر گامزن ہو اور اپنی نوع کے دوسرے افراد سے انس رکھتا ہو۔

اس مرحلے پر آپ بھی وہی کچھ سوچ رہے ہوں گے جو میں سوچ رہا ہوں اور وہ یہ کہ لغت کے اعتبار سے انسان کے جو معنی ہیں کیا ان معنی سے ہماری یعنی انسانوں کی اکثریت کوئی دور کا بھی تعلق رکھتی ہے؟'' کیا انسان واقعی وہ جاندار ہے جو راست کار، راستی کوش اور درست راستے پر گامزن ہو؟''

''ہرگز نہیں۔''

''کیا انسان واقعی وہ جاندار ہے جو اپنی نوع کے دوسرے افراد سے انس رکھتا ہو؟''

''ہرگز نہیں۔''

اس گفتگو کا جو پر مایہ نتیجہ نکلا وہ یہ ہے کہ ہم یکسر بے معنی اور مہمل ہیں۔ اور جون ایلیا! اس میں شبہ بھی کیا ہے کہ ہم سدا کے بے معنی اور مہمل موجود ہیں۔ الا ماشاء اللہ ہم وقت کا ایک فضول پن اور تاریخ کی ایک ہڑبونگ ہیں۔

انسانو! چاہے تم کہکشاؤں کو پنکوں کی طرح اپنی کمروں پر باندھ لو تب بھی تمہارا وجود یکسر بے معنی اور مہمل ہی رہے گا۔ تم کیا اور تمہارا نظام شمسی کیا، تمہاری کہکشائیں کیا اور تمہارے شہابیے کیا۔ جو کچھ بھی ہونے کے حال میں ہے، وہ عبث ہے، سرتاپا عبث ہے......اور میں بھی عبث ہوں اور اس کے ساتھ ہی اس بدطور اور بے ہودہ عبثیت کا اجو گر بھی ہوں۔ جو ذرا بھی بھلا مانس ہے اسے اس بدطور عبثیت کا اجوگر ہونا چاہیے۔ کچھ انسان اگر کسی قدر ٹھیک ٹھاک ہونے کے طور سے کچھ ہیں تو فطرت کے اس عطیے کی وجہ سے ہیں جسے شعور کہا جاتا ہے اور اسی عطیے کی وجہ سے وہ اپنے بامعنی ہونے پر اصرار کرتے رہے ہیں اور اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کا یہ اصرار درست ہے۔ پر یہاں کہنے کی جو بات ہے، وہ یہ ہے کہ ان کی اکثریت نے فطرت کے اس عطیے سے عام طور پر بڑی بے تدبیری اور بے دانشی کے ساتھ کام لیا ہے۔

تم اپنی بدطور مہملیت اور بے ہودہ عبثیت کے باوجود اگر شعور کو جز وقتی طور پر نہیں بلکہ کل وقتی طور پر کام میں لاؤ تو تمہاری وجودی مہملیت اور عبثیت کی چیرہ دستی تمہارا کچھ بہت زیادہ نہیں بگاڑ سکے گی۔ شعور ہی انسانوں کو اختیار سے نوازتا ہے اور شعور ہی آزادی عطا کرتا ہے۔ چاہے وہ اختیار بہت زیادہ نہ ہو اور چاہے وہ آزادی پوری آزادی نہ قرار پاسکے۔

ہے یوں کہ اس کائنات میں، اپنے آپ میں مگن رہنے والی اور اپنا آپا چھپانے والی اس نخریلی کائنات میں شعور کے بخشے ہوئے اختیار، ادنیٰ اختیار اور شعور کی ارزانی کی ہوئی آزادی، بہت کم آزادی کی حالت بھی فطرت کا کوئی معمولی عطیہ نہیں ہے۔

محترم قارئین

السلام علیکم!

جون 2014 کا شمارہ تو بے شک دلچسپی اور تحیر بھا رہے مگر مہینا۔۔۔ بجٹ، مہنگائی اور غریبوں کی دہائی کے حوالے سے عوام کے لیے ایک آزمائش بھرا مہینا تصور کیا جانے لگا ہے، جب ایک جانب تو اشیائے خورونوش کے ساتھ ساتھ دیگر تمام اشیا کی قیمتوں میں بھی من چاہا اضافہ کردیا جاتا ہے اور دوسری جانب لوگوں کو ریلیف دینے کے کھوکھلے نعرے بھی بلند کیے جاتے ہیں۔ عجب گورکھ دھندا ہے جناب۔ پچھلے دنوں چین اور قطر کے اشتراک سے بجلی کے بحران پر قابو پانے کے لیے کول پاور کا افتتاح کرتے ہوئے وزیراعظم نے بے چاری عوام کو صبر کے مشورے سے بھی نوازا۔ کاش کبھی ان طفل تسلیوں سے ہٹ کر کسی عملی مثبت اقدام کے ثمرات بھی عوام کی جھولی میں ڈال دیے جائیں۔ کیونکہ ایک ارب 20 کروڑ ڈالر لاگت کے اس منصوبے کی تکمیل 2017ء میں ممکن ہوسکے گی مگر "کون جیتا ہے ترے زلف کے سر ہونے تک" کے مصداق کس نے آنے والی کل دیکھی ہے۔ جبکہ آج کل لوڈشیڈنگ کا دورانیہ 14 گھنٹے سے زیادہ ہوگیا ہے۔ جس کی وجہ سے لوگ دیگر مشکلات کے ساتھ ساتھ پانی کی قلت کا شکار بھی ہو رہے ہیں۔ حالانکہ انتخابات کے دوران برسراقتدار سیاسی جماعت نے وعدہ کیا تھا کہ تمام سنگین معاملات پر جلد از جلد قابو پالیا جائے گا مگر اب وہ مہینوں کے بجائے برسوں میں بجلی کا مسئلہ حل کرنے کی بات کر رہے ہیں۔ بجلی کی قلت اور گرانی کا ایک بڑا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ بڑے حلقے اور ادارے اربوں روپے کے نادہندہ ہیں۔ ان کی آسائشات و تعیشات کا عذاب عام شہریوں کو لوڈشیڈنگ کی صورت میں بھگتنا پڑ رہا ہے۔ یہ زخم اگرچہ پرانا ہے مگر وہ ہر دور میں تازہ رہنے والا ہے۔ شاید ہمیشہ ایسا ہی ہوتا آرہا ہے جس کی خطا نہیں ہوتی سزا اسی کو ملتی ہے۔ یہاں ایک شکایت محکمہ تعلیم بالخصوص پرائیویٹ کرسچن مشنری اسکولوں کے حوالے سے ضرور زیر بحث لانا چاہتے ہیں کہ جہاں تعلیمی معیار کے حوالے سے توجہ تو ہے مگر اخلاقیات کے معیار کو برقرار رکھنے میں کہیں کہیں غفلت بھی برتی جارہی ہے۔ بچوں کے نزدیک جس طرح اساتذہ اہم اور قابل احترام ہیں اسی طرح ان کے اپنے والدین کے ساتھ اساتذہ کا رویہ ان بچوں کے ذہنوں پر مثبت یا منفی اثرات مرتب کرتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ ان اسکولوں میں اساتذہ والدین کے ساتھ انتہائی ہتک آمیز انداز میں پیش آتے ہیں۔ جس سے بچے نفسیاتی طور پر خوف اور شرمندگی کا شکار ہوجاتے ہیں اور شرمندگی کا یہ احساس انہیں اپنے والدین کو اسکول آنے اور ٹیچر سے ملاقات کرنے میں رکاوٹ اور جارحیت کا سبب بنتا ہے اور ان کی شخصیت بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوجاتی ہے اور یہ کسی بھی لحاظ سے تعمیری رویہ ہرگز نہیں ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں بھی حکومتی اور پرائیویٹ اداروں کو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ جس سے ایک اچھا معاشرہ ترتیب دینے میں مدد مل سکتی ہے۔ مدد اور رہنمائی کے لیے تو تیار بیٹھے ہیں ہمارے یہ پیارے اور قابل قارئین بھی، جن کے سندیسے منتظر ہیں ہماری توجہ کے۔۔۔ تو ملاقات کرتے ہیں اپنے دوستوں سے۔

☩ **رضوان تنولی کریڑوی، کوہاٹ** سے محفل کی زینت بنے ہیں۔ "اسیری کے دن تمام ہوئے۔ باغی پنچھی پھیرو نے آزادی کی سانس لی، اداؤں بھری چمنستان سے گلوں کی خوشبو لی قلم میں محبت کی روشنائی لی پھر میں نے لکھا اہل محفل کو سلام پُرخلوص، سرورق کی حسینہ کو کمال بے اعتنائی سے نظرانداز کرتے ہوئے قرشی اسپغول کی نخریلی حسینہ کو خوب سراہا۔ مرحوم جون ایلیا بات ماضی کی ہو حال یا مستقبل کی ہم ڈھیٹ تھے، ڈھیٹ رہیں گے۔ مایوس درماندہ قوم کو دادو دیے میں اسٹریٹ چائلڈ فٹ بال ورلڈ ٹورنامنٹ کی خوشی کی نوید دینے کا شکریہ۔ صدر محفل صفدر معاویہ نے غیر جانب داری سے صرف اپنے دوستوں کے تبصرے پسند کیے۔ گویا اندھا بانٹے ریوڑیاں وہ بھی اپنے اپنوں میں۔ جاوید بلوچ کی پھبتی میں متین سلطان نے مولی کا بیج بو کے خوب ہل چلا کے ذوق و شوق سے وافر پانی لگایا۔ بہن زویا اعجاز آپ نے بھڑوں کے چھتے میں جو وڑے کے ڈنڈے مارے۔ جھگڑی بادشاہ بیگم الیلی کے روپ میں دل کش جلوے دکھا رہی ہے اویل ڈن۔ طاہر گلزار اور ابرار وارث میرے سسپنس کے پُرخلوص دوست مجھے فخر ہے ان پر۔ متین سلطان کی جوڑی نایاب کے ہمراہ علی ڈوگر کی جوڑی تسلیم کے ہمراہ خوب جچے گی کستوری لگا کے۔ قیصر اقبال آپ نے ہندو کو گیدڑ کہہ کر جو عظیم الشان گستاخی کی ہے ناں تو اب ادھر جنگل میں گیدڑ احتجاجاً دھرنا دے کے بیٹھ گئے ہیں۔ کہانیوں کی ابتدا مجتبوں کے دیوتا طاہر جاوید مغل کی پس زنداں سے کی، میں قلم کو اپنے خون جگر میں ڈبو کر پیارے طاہر کے شایانِ شان الفاظ قلمبند کروں پھر بھی تعریف اختیار سے باہر ہے۔ ضیا تسنیم بلگرامی کے تصوف کے صفحات میری بگڑی باغی طبیعت کے لیے مشعل راہ ثابت ہوتے ہیں۔ الیاس سیتاپوری کی تاریخی شاہکار گردش رہرواں کے اسیر پہلے بھی شائع ہوچکی ہے بہرحال لطف دوبالا ہوگیا۔ کاشف زبیر کی دل نشین تحریر ناہمت ایک گونگی بہری سولہ سالہ لڑکی کی خون خوار درندوں کو واصل جہنم کرتی نظر آئی۔ سلیم انور کا انوکھا انتقام باپ نے بے حسی کی انتہا کی لیکن بیٹے نے باپ کے کرتوت پہ پردہ رکھا اور اپنی قربانی دے دی۔ عدالت کے کٹہرے میں ایک جھوٹے کیس کا سچا فیصلہ مرزا امجد بیگ کی دست آید خوب رہی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی بیجان خشک اور بور رہی۔ تنویر ریاض کی سودا مغربی معاشرہ کی کہانی بہو نے ساس کے کاموں سے بچنے کے لیے کس نرالے طریقے سے قتل کیا، اچھی کہانی رہی۔ امجد رئیس کی ستم ظریف واجبی سی رہی۔ نجمہ سوری کی ممی کی چوری منفرد و چور تک ولیٹ کا ایک شاندار کارنامہ اپنی اسسٹنٹ گلوریا کو ممی بنا کے اصلی ممی واپس لانا عمدہ رہی۔ آخری کہانی ناصر ملک کی بےرحم

گنبد سسپنس کے آخری صفحات کا حق ادا کرگئی۔ وسیم کی بے حسی کو مہرالنسا کی عقل مندی رام کرگئی، اسٹوری آف منتھ رہی۔ محفل شعر و سخن میں ابرار وارث، رمضان پاشا، اشوک کمار، سید اکبر شاہ، قدرت اللہ نیازی کا انتخاب عمدہ رہا۔"

☩ **توصیف احمد، پٹھان کالونی، کراچی** سے تشریف لائے ہیں۔ "کچھ عرصے کی غیر حاضری کے بعد داخل محفل ہونے کی جسارت کر رہا ہوں۔ امید ہے منے دوستوں کو بالکل بھی برا نہیں لگے گا۔ غیر حاضری کا سبب محض آپ کی تین ماہ کی مسلسل بے رخی ہی رہی جس کے بعد تین ماہ تک شاید میرا قلم بھی جواب دے گیا تھا لیکن یہ سسپنس کی محبت ہی ہے جس نے دوبارہ قلم اٹھانے پر مجبور کردیا۔ ابتدائے گرما یعنی مئی کا شمارہ 16 تاریخ کو ملا۔ ادھر پردہ کے حسینہ سرورق کو ایک ذرا غور سے دیکھا تو بائیں آنکھ سے کچھ کانی نظر آئیں بےچاری۔ انشائیہ "راکھ یادھواں" میں جون ایلیا صاحب کہیں اندر، بہت اندر بڑی دور سے بول رہے تھے جو کہ شاید سنائی بھی نہیں دے رہا تھا۔ ادریے کے متعلق میں یہی کہوں گا کہ جو بچے ہمارے مستقبل کے معمار ہیں والدین کے بے جا لاڈ پیار اور غلط ماحول میں الفک بیٹھک کی وجہ سے ہماری بربادی کا سبب بن رہے ہیں۔ اس بار بزم یاراں میں محمد صفدر معاویہ مہمان خصوصی تھے، مبارک ہو بھائی۔ فوزیہ تبسم صاحب کمال ہے آپ خود ہی اپنے ہاتھوں کو خوب صورت کہہ رہی ہیں۔ زویا اعجاز صاحبہ لگتا ہے آپ کچھ زیادہ ہی اپ سیٹ تھیں اس لیے کسی سے بھی سیدھے منہ بات نہیں کی۔ سب کو کھری کھری سنا دی۔ کہانیوں کی ابتدا حسب معمول تاریخی کہانی سے کی۔ دوست آید میں بیگ صاحب اپنے ایک اور شاندار کارنامے کے ساتھ حاضر تھے۔ دولت کی ہوس میں جرم کرنا کوئی نئی بات نہیں لیکن قانون کی بالادستی کی وجہ سے پہلے بھی کبھی اور کہیں کہیں ایسا ہوتا تھا۔ محفل شعر و سخن میں ماہ رین ناز اور اشوک کمار صاحب کا انتخاب لاجواب رہا۔"

☩ **بشریٰ افضل، بہاول پور** سے محفل میں حاضر ہیں۔ "سسپنس 18 اپریل کو موصول ہوا، ٹائٹل گرل گہری سوچوں میں گم ہیں ایک بات ہے کہ پورے ٹائٹل پر صنف نازک کا قبضہ ہے۔ سادگی اور مشرقی انداز لیے ہوئے ہے۔ مرحوم جون ایلیا کا راکھ یادھواں پڑھا کتنی سچی اور کھری باتیں کرتے تھے۔ کاش لوگ ان کی باتیں پڑھ کر عمل کرسکتے۔ اپنی محفل میں پہنچے تو انکل کی کھری کھری باتیں دل کو چھو لیتی ہیں۔ کرسیٔ صدارت پر محمد صفدر معاویہ کو پایا بھئی سنبھال کر بیٹھ جائیں کہیں خوشی میں گر ہی نہ جائیں۔ بہرحال مبارکاں۔ صفدر صاحب اگر ان حکمرانوں کے دل میں خدا کا خوف پیدا ہوجائے تو ہمارے ملکی مسائل کیسے نہ حل ہوں۔ منشی محمد عزیز میمن خدا آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ اب تو آپ یقیناً کافی بہتر ہوں گے انکل نے آپ کی مشکل آسان کردی۔ ان کا شکریہ ادا کریں۔ الیلی آپ نے کتنی خوب صورت بات کہی ہے۔ اعجاز احمد راحیل تھینکس اور وہاں آپ سب کی دعاؤں سے میرا مسئلہ حل ہوگیا ہے۔ میں سب کی مشکور ہوں۔ مظہر سلیم کا تبصرہ اچھا تھا۔ ناہمت نے تو رد تنگ کھڑے کردیے اور ہم دنگ رہ گئے۔ سودا میں اگر وہ گھر کے کام سے اتنا گھبرا گئی تو قتل جیسا سنگین جرم ضرور کرنا تھا۔ شوہر سے علیحدگی اختیار کر لیتی تو جیل اس کا مقدر نہ بنتی۔ برا سودا کیا اس نے۔ متکلم صوفی کے ایمان افروز واقعات سے فیض حاصل کیا۔ انوکھا انتقام میں دونوں بھائیوں کو باپ نے بھرپور محبت دی لیکن اولاد سے کبھی سکون نہیں ملتا بے چارہ باپ اپنی جان سے گیا اور بھائی جائداد کے پیچھے پڑے رہے مگر باپ نے صحیح فیصلہ کیا تھا۔"

☩ **منشی محمد عزیز میمن، اڈن ضلع رباڑی** سے چلے آرہے ہیں۔ "مورخہ 16 اپریل کو بورے والا سے دانا محمد شاہد کا مسیج آیا۔ مئی کے سسپنس میں آپ کا خط پڑھا ہے۔ خوشگوار حیرت ہوئی کہ اتنی جلدی۔ خیر جناب پھر کیا تھا ڈاک خانے کی جانب دوڑا لیکن وہ بند ہوچکا تھا۔ میں نے کراچی ادارے کو فون کیا۔ بتایا آپ کو سسپنس 14 تاریخ کو بھیجا جاچکا ہے۔ یقین کیجیے اس رات نیند نہیں آئی۔ شکریہ جناب خط اور شعر شائع کرنے پر اور آپ نے جو زویا اعجاز کو جواب دیا ہے کہ کبھی کبھی دل بڑا کرکے دوسروں کو بھی جگہ دینی چاہیے تو جناب آپ کا یہ حکم سر آنکھوں پر۔ دیکھیے ہم عاشق لوگ ہیں خط لکھے بنا رہ نہیں سکتے آگے آپ کی مرضی۔ ماشاءاللہ چشم بددور کیا زبردست سرورق بنایا ہے ذاکر صاحب نے۔ انشائیہ دھواں یا راکھ پر کیا تبصرہ کریں۔ نہ جانے کہاں کھوگئی مروت۔ بڑی دور تک تو میرے ساتھ آئی۔ آپ کے خط کے ابتدا میں آپ نے قرب قیامت کی نشانیوں کے متعلق لکھا۔ یقیناً تقریباً سبھی نشانیاں آپ اور ہم دیکھ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔ اعجاز احمد راحیل، اب تو مجھے بھی حیرت ہو رہی ہے کہ آپ کے ہر خط میں ماہ رین ناز کا ذکر اور ماہ رین جی کے خط میں آپ کا ذکر ہوتا ہے؟ الیلی آپ کے ساجن کہاں ہیں، الیلا ساجن؟ آپ کا خط اگرچہ مختصر سا تھا مگر تھا بڑا چٹپٹا اور بڑی گڈ۔ گردش رہرواں کے اسیر، الیاس سیتاپوری کی تحریر جو شروع کی تو ختم کرکے ہی دم لیا۔ کتنے موڑ تھے اس کہانی میں اور ہر موڑ ایک علیحدہ ہی رنگ لیے ہوئے تھا۔ ناہمت ایک حوصلہ مند لڑکی روحینہ کی داستان اویل ڈن کاشف زبیر صاحب۔ دیر آید میں مرزا امجد بیگ صاحب نے ایک اور بے گناہ داؤد کو رہائی دلائی اور اصل مجرم ارشد محمود کو بے نقاب کروایا۔ محفل شعر و سخن میں ماہ رین ناز، ڈوگر، راجا افتخار علی افق، ابرار وارث علی، الیلی اور اشفاق شاہین کا انتخاب پسند آیا۔ ستم ظریف مختصری مگر کاٹ دار تحریر تھی۔ امجد رئیس کی خالص مال کی گھٹیا سوچ پر بہت افسوس ہوا۔ ممی کی چوری بڑے عرصے بعد نجمہ سوری، تنک ولیٹ کے ساتھ آئی ہیں میرا مطلب ہے تنک ولیٹ کی کہانی لے کر جس میں تنک ولیٹ نے ممی چوری کرکے الفریڈ کو دینے کے بجائے نیشنل میوزیم والوں کے حوالے کردی۔ اقتباسات اور کترنوں میں طالب حسین طلحہ نے بہت اچھی اچھی اور پیاری پیاری باتیں بتائی ہیں جو کہ قابل عمل ہیں۔"

☩ **بلیک کیٹ، کراچی** سے شریک محفل ہیں۔ "16 تاریخ کی گرم دوپہر میں سسپنس ٹھنڈی خوشگوار ہوا کے جھونکے کی مانند ملا۔ انشائیہ راکھ یادھواں میں جون ایلیا نے دانائی کے موتی بکھیرے مگر عمل کون کرے گا؟ صدارت بونگے برادری کے صفدر معاویہ کے حصے میں آئی مبارک باد۔ دوسری اور تیسری پوزیشن کی صنف نازک صوبیہ اقبال اور فوزیہ تبسم تاپ کی تبصرہ نگاری کھا گئیں۔ اشوک کمار یہ منہ اور مسور کی دال آپ نے ابھی خطوط کی محفل میں دیکھا ہی کیا ہے آپ کاسہ لیسی اور لیپا پوتی میں ایوارڈ یافتہ لگتے ہو۔ منشی محمد عزیز میمن صاحب آپ نے یاد کیا بلیک کیٹ عینک والے جن کی طرح حاضر ہوگئی۔ شوکت شہریار آپ لگائی بجھائی ماہرانہ انداز میں کرکے ناک گیری اچھی کرتے ہیں۔ زویا اعجاز نے مخالفوں کو خوب رگڑا لگایا زندہ باد جیتی رہو۔ مظہر سلیم روتے منہ ناتے ناز جی کے قدموں میں گڑگڑاتے نظر آئے۔ بہن بشریٰ افضل آپ کیوں نیک پروین بن گئی ہو اپنے پرانے انداز میں ان بھوتوں کے لتے لیا کرو۔ اپنے مزاج کی لڑاکا الیلی اور ام

بتول بہت پسند آئیں۔ مہرین کی صنف کرخت کو اچھا اختتام پالی دیتی ہیں۔ ہمایوں سعید کی بات چورنی کے بالوں میں جھاڑ جھنکار والی بات پر بہت ہنسی آئی۔ الیاس سیتاپوری کی تاریخی کہانی سسپنس کے ماتھے کا روشن جھلملاتا جھومر قاری منظر نگاری میں کھو جاتا ہے اور عربی، ایرانی، تتاری، ترک قوم کو اپنی نگاہوں کے سامنے دیکھتا ہے۔ جہاں نام ہو کاشف زبیر کا تو خود کو کیسے پڑھنے سے روکا جا سکتا ہے۔ کاشف زبیر نے باہمت میں ثابت کر دیا کہ کچھ لڑکیاں باہمت بھی ہوتی ہیں۔ طاہر جاوید مغل کی پس زنداں محبت کے ساز پہ دھڑکتے دل کے کومل پاکیزہ جذبوں سے سرشار سراہے جانے کے قابل تعریف اور قابل داستان ہے۔ نجمہ سودی فیورٹ رائٹر اور نک دیلوٹ میرا پسندیدہ کردار می کی چوری میں نجمہ نے بہت عمدہ گفٹ دیا۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی اصلاحی تحریر متکلم صوفی دل و دماغ کو روشن و معطر کر گئی۔"

✠ **وسیم احمد خان**، خانیوال سے محفل میں شریک ہیں "میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کہاں سے شروع کروں کیونکہ میں نے پہلی بار بہت امید کے ساتھ خط لکھا تھا کہ مئی کے شمارے میں شائع ہو گا اور 3 کہانیوں پر تبصرہ بھی کیا تھا شائع ہوتا تو کیا شائع ہوتا مگر افسوس خط تو کیا شائع ہونا تھا میرا نام نہ شائع ہونے والے خطوط کی لسٹ میں بھی نہیں تھا۔ بہت صدمہ ہوا کیونکہ میرے اپنے شہر والوں کے یعنی خانیوال والوں کے پورے 3 خطوط شامل اشاعت تھے۔ لگتا ہے نئے پڑھنے والوں کو اتنی جلدی پذیرائی نہیں ملتی۔ اس ماہ پوری بے چینی سے سسپنس کا انتظار کیا اپنا خط نہ دیکھ کر یقین نہیں آیا۔ ناامیدی کفر ہے اور میں ناامید نہیں ہوں مگر مجھے دکھ ہوا ہے (کمال ہے۔۔۔ ذرا ذرا سی بات پر اتنا دکھ؟) بہرحال پس زنداں بہت اچھی جا رہی ہے۔ مجھے ارم کا کردار بہت برا لگتا ہے جب سے ارم کہانی میں وارد ہوئی تو اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ اس لڑکی نے پہلے بھی کوئی نہ کوئی چاند چڑھا رکھے ہوں گے۔ ابھی ناصر ملک کی کہانی اور انوکھا انتقام ہی پڑھی ہے کیونکہ جلدی خط لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ خط جلدی پہنچ جائے۔ سرورق نے اس مرتبہ مایوس کیا ہے۔ سرورق کی حسینہ کسی حسینہ کے بجائے 4 بچوں کی اماں لگ رہی ہے۔ رضوان تنولی کر بیڑی کی کترنیں اچھی لگیں۔ خانیوال میں اس وقت بارش ہو رہی ہے۔ میں خط لکھنے بیٹھا تو کاپی نہ ملی تو بارش میں بھیگ کر قریبی شاپ سے کاپی لے کر آیا ہوں۔" (یکی بس آپ کی محبت ہے۔ شکریہ)

✠ **گل مروت**، لکی مروت سے محفل کی زینت بنے ہیں "طبیعت کی ناسازی اور اوپر سے گھر میں مہمانوں کا رش۔ اس مصروفیت میں سسپنس کا انتظار۔ یہ ہماری سسپنس سے محبت نہیں تو اور کیا ہے؟ (بہت شکریہ) انشائیہ راکھ یا دھواں ہر حساس دل کی آواز۔ محفل میں محمد صفدر صدارت کی کرسی پر نظر آئے۔ کمانڈو لالا، بہت مبارک ہو۔ صوبیہ مسسز وزیراعظم کی سیٹ پر آپ کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ قدرت لالا بھی سعدیہ آپی کو گڑ دیتے نظر آئے۔ ماروی کی یہ قسط خوب رہی۔ امید ہے محبوب کی اگلی قسط میں رہائی ممکن ہو جائے۔ پس زنداں میں حجاب نے جلال کے ہر ظلم کے سامنے سرتسلیم خم کر دیا ہے۔ درست آید میں جیت مرزا بیگ صاحب کی ہوئی اور اصل قاتل پکڑا گیا اور داؤ کو رہائی ملی۔ بے روزن گنبد میں آخرکار وسیم کو مہرو کی قربانیوں کا احساس ہو ہی گیا۔ محفل شعر و سخن بھی اس دفعہ پسند آیا۔ کترنیں اس دفعہ معیاری تھیں۔ اور اوّل مئی کا سسپنس بہت اچھا رہا۔"

✠ **عبدالغفور خان ساغری خٹک**، ضلع اٹک سے چلے آرہے ہیں "کچھ مصروفیات کی بنا پر 3 ماہ کے بعد حاضر محفل ہوں۔ 22 تاریخ کو سسپنس کا دیدار نصیب ہوا، ٹائٹل خوشنما ہے۔ خطوط میں محفل محمد صفدر معاویہ کو کرسی کی صدارت پر فائز دیکھا اور صوبیہ اقبال کو سیکریٹری کے فرائض پر دیکھا۔ خطوط کی تعداد 24 تھی۔ صنف نازک کی تعداد جن میں 7 تھی۔ بلیک لسٹ 6 تھے سوہاجی واقعی ٹیچر کا احترام ضروری ہے کیونکہ والدین تو پیدا کرتے ہیں لیکن استاد ہمیں زمانے کی اونچ نیچ سکھاتا ہے ویسے بھی حضرت علیؓ کا قول ہے کہ جس نے مجھے ایک لفظ سکھایا، وہ میرا استاد ہے۔ کہانیوں میں پس زنداں پڑھی، دل خون کے آنسو رویا کہ جلال نے حجاب کو غلط مارا پیٹا اس کی آنکھوں پر ارم کی محبت کی پٹی لگی ہے۔ ویسے ہادی جو کچھ ارم کے بارے میں جمع کر رہا ہے۔ اگلی قسط یادگار ہوگی۔ اشعار تمام اچھے تھے لیکن مس زرینہ، تسنیم سلطان، شفیق احمد کے زیادہ اچھے لگے۔ باقی رسالہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔"

✠ **روشنی رشید**، دھمیال کیمپ، راولپنڈی سے تشریف لائی ہیں "سب سے پہلے مدیر اعلیٰ صاحب کا خط پڑھا بہت اچھا لگا۔ ماہ مئی کا شمارہ 21 اپریل کو ملا۔ اس ماہ کا سرورق بہت اچھا لگا۔ مشرقی شرم و حیا اور لڑکی کے سر پر دوپٹا لڑکی کے حسن میں نور کی کرنیں بکھیر رہا تھا۔ ہمارے ملک میں دوپٹا تو ناپید ہو گیا ہے۔ پہلے گلے میں تو نظر آتا تھا اور عجیب مغلوک الحالی نظر آتی ہے ہر طرف۔ بہت دکھ ہوتا ہے کہ ہماری اپنی اسلامی ثقافت اتنی مضبوط اور بھرپور ہونے کے باوجود ہم آدھے تیتر اور آدھے بٹیر بنے ہوئے ہیں۔ محفل خط میں حاضری دی، تمام تبصرے بہت بہترین تھے۔ ڈاکٹر نعیم اکبر سحر آپ کے تبصرے کا بہت انتظار رہتا ہے۔ آج کل کیا مصروفیات ہیں؟ تسنیم سلطان آپ کے بابا کا کیا نام ہے؟ کہانیوں میں سب سے پہلے بیگ صاحب کی کہانی درست آید پڑھی۔ بیگ صاحب نے اصل مجرم کو خوب بے نقاب کیا، جرم ہر حال میں سامنے آکر رہتا ہے اسے چھپانے کی لاکھ کوشش کیوں نہ کرلیں پھر بھی سامنے آکر رہتا ہے۔ پھر تنویر عباس صاحب کی کہانی سودا پڑھی۔ بہت حاضر دماغی اور وسیع النظری تھی اس کہانی میں۔ پھر ناصر ملک صاحب کی کہانی بے روزن گنبد پڑھی، بہت اچھی لگی۔ محفل شعر و سخن میں راجا افتخار علی افقی اور مرزا علی عرف ندیم عباس تنہا کا شعر بہت اچھا لگا۔"

✠ **رمضان پاشا** گلشن اقبال، کراچی سے محفل میں تشریف لائے ہیں "حسب معمول آپ کا اداریہ حسب حال اور حسب ضرورت تھا اور نصیحت آموز بھی اور دیتا ہوں۔ خطوط کی محفل میں پہلے نمبر پر آنے والے صفدر صاحب کو مبارکباد، موصوف کا تبصرہ پسند آیا۔ اشوک کمار کا خط بھی قابل داد تھا۔ اعجاز احمد راحیل صاحب آپ کہتے ہیں کہ آتے رہا کریں، بھائی میں تو آیا تھا مگر ایڈیٹر صاحب نے گیٹ سے ہی آؤٹ کر دیا، میں کیا کروں؟ (ایسے موقع پر صبر کرتے ہیں، شور نہیں کرتے) اشعار کی محفل میں مس زرینہ نواز کا انتخاب پسند آیا، نزاکت علی کا چناؤ بھی اچھا تھا، اعجاز احمد راحیل کا قطع بھی دل کو بھایا۔ ہمارے سسپنس میں دو جان لیوا قسط وار کہانیاں چل رہی ہیں، نہ جینے دیتی ہیں نہ مرنے، ان دو کہانیوں نے مجھے عجب کشمکش اور تشویش و پیچ میں مبتلا کر رکھا ہے، کسے اول نمبر دوں اور کسے

دوم۔ ان دو قاتل کہانیوں کے نام ہیں، پس زنداں اور ماروی۔ بے روزن گنبد نے بھی سراپا ہلا کے رکھ دیا، اس کا اختتام نہ صرف غیر متوقع تھا بلکہ حیران کن بھی تھا اور خوب صورت بھی، دیلیئن ناصر ملک! غیر ملکی کہانیوں میں انوکھا انتقام اچھی لگی، ایک پراثر کہانی تھی، حاصل مطالعہ لاجک بری بلا۔ سودا پسند نہیں آئی۔ ستم ظریف، اب امریکی بچیاں بھی اغوا برائے تاوان کا ڈراما پلے کرنے لگی ہیں۔ ہیجان، ڈاکٹر شیر شاہ سید نے اپنے زیک سے ہٹ کر ایک تہلکہ خیز کہانی تحریر کی ہے جو آخر تک دل کو دھڑکاتی رہی۔"

✠ **محمد قدرت اللہ نیازی**، حکیم ٹاؤن خانیوال سے چلے آرہے ہیں "سرورق پر ایک دیسی حسینہ گندم کاٹنے کے بعد نڈھال سی نظر آئی۔ اداریہ میں پہلی بار خود احتسابی کی ترغیب بہت موثر پیرائے میں کی گئی یقیناً ہر فرد کو انفرادی سطح پر ذمہ داری سے اپنے فرائض سرانجام دینے چاہئیں۔ یہی انفرادی ادائیگی اجتماعی فرائض کی ادائیگی کا سبب بنے گی۔ سرورق اور اداریہ کے بعد اپنی محفل میں جھانک لگائی۔ محمد صفدر معاویہ خانیوال آپ کو تبصرہ کے اول آنے پر دلی مبارک باد ہو۔ آپ میرے ضلع کے ہیں یہ جان کر خوشی دگنی ہو گئی۔ اشوک کمار یہ ساری محفلیں، رونقیں کسی سے ادھار لی ہوئی ہیں اس لیے زیادہ خوش نہ ہوں۔ آپ کو خوش آمدید اور سعدیہ کو آپ نے خاتون کہہ دیا یہ کیا غضب کیا؟ قیصر اقبال! آپ کی ہمت کو داد دیتا ہوں آپ کے تبصرے لکھنے کی رفتار بہت تیز ہے اور آلو کا نام نہ لیں آلو نے تو بیچارہ رکھا ہے آج کل۔ تنویر عباس! مصروفیت کا بہانہ نہ کریں کہ کئی ساتھی اپنی مصروفیت میں بھی سسپنس کو نہیں بھلا پاتے۔ میڈم الٹینی! ارم بتول کو ستایا نہ دیجئے ہر حد کراس کرنا لازم تھا کیا؟ بلقیس خان! ہم آپ کی بات سے مکمل اتفاق کرتے ہیں کہ حجاب کا ہادی سے ملنا بالکل غلط ہے۔ محمد جاوید شبیر! ہماری پولیس سے خوف مجرم کو نہیں شریف آدمی کو آتا ہے۔ آخری صفحات پر ناصر ملک کی بے روزن گنبد پڑھی محبت کے موضوع پر لکھی گئی طویل کہانی بہت پسند آئی۔ مکالمے زبردست تھے۔ پس زنداں میں جلال، حجاب اور ہادی کی تکون للکار کے یوسف، تابش اور ثروت کی کاپی لگی۔ ماروی میں اس بار بہت سے تغیر رونما ہوئے۔ ماروی کو حاصل کر کے بھی مرینہ پریشان ہے اور ماروی کو ڈھونڈنے والے بھی پریشان۔ کاشف زبیر کی باہمت میں مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے ظلم نے بہت افسردہ کیا۔ درست آید میں مرزا امجد بیگ نے کئی قارئین کی شکایت اور غلط فہمی دور کر دی جن کو گلہ تھا کہ کیا مرزا صاحب کبھی ناکام نہیں ہوئے۔ ہیجان ڈاکٹر شیر شاہ کی جنگ سے پیدا ہونے والے حالات میں رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ کو آشکار کرتی نظر آئی۔ سب سے زیادہ متاثر کرتی ہوئی۔ محفل شعر و سخن اور کترنیں بھی خوب رہیں۔"

✠ **سوہاجی**، لاہور سے چلی آرہی ہیں "ایک ماہ کی غیر حاضری کے بعد تمام حاضرین محفل کو سلام۔ جو لوگ حاضر نہیں وہ حاضر ہو کر سوہاجی کو سلام پیش کریں۔ پھولوں کی اس محفل میں ہمیشہ صنف نازک کا داج رہا ہے اور رہے گا۔ سازشی عناصر ردی کی ٹوکری میں قید کر دیے جائیں گے۔ ٹائٹل گرل کی تعریف خانیوال والے لوگوں کے سپرد کیونکہ نہیں پردہ اٹھانے کی عادت ہے۔ جون ایلیا کا انشائیہ کہ محبت واقعی اندر باہر کا موسم بدل دیتی ہے لیکن اگر اس میں جھوٹ شامل ہو جائے تو سب بکھر راکھ ہو جاتا ہے۔ بھائی صفدر آپ کی ٹیکم تو بہت لکی ثابت ہوئی ہیں۔ آپ کے لیے آتے ہی سسپنس کی کرسی صدارت پر بٹھا دیا مبارک ہو۔ حبیب احمد بیچ میں رشتے جذبات، احساسات اور محبت سے بنتے ہیں۔ جس میں یہ سب نہیں وہ انسان صرف کاروبار کرتا ہے۔ ناصر ملک کی بے روزن گنبد عورت کے بہت سے نام ہیں قربانی وفا کی دیوی لیکن ہر کوئی رستم سیال نہیں ہوتا مہرو بے لوث محبت کرنے والی وفا کی دیوی جس نے اپنے محبوب شوہر کی خوشی کے لیے سب کیا یہاں تک شوہر میں شراکت داری بھی قبول کر لی۔ لیکن مرد صرف ظاہری حسن دیکھتا ہے۔ ممی کی چوری، نجمہ سودی ہمیشہ نک دیلوٹ کی دلچسپ چوری سامنے لاتی ہیں، وہ چوری تو کرتا ہے لیکن ایمان داری سے۔ ہیجان ڈاکٹر شیر شاہ سید کی کہانی بہترین اور ہمارے اندر ایک تحریک ابھارتی ہے کہ اس تخلیق کار نے ہمارے لیے ہمیشہ بہتر سے بہتر رکھا ہوتا ہے لیکن جب ہمارا دل و جان سے عزیز انسان ہم سے بچھڑ جائے تو کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ باہمت، کاشف زبیر کی کہ اگر انسان باہمت ہو اور اللہ تعالیٰ پر پختہ یقین ہو تو ناممکن بھی ممکن ہو جاتا ہے۔ مرزا امجد بیگ نے اپنی خداداد ذہنی صلاحیت سے پھر ایک مظلوم کو پھانسی کے پھندے سے بچا لیا، محبتوں سے عظیم مغل اعظم طاہر جاوید مغل کی پس زنداں بہترین کہانی ہے، جو لفظ بہ لفظ سحر میں جکڑے رکھتی ہے۔ معلوم ہی نہیں رہتا کہانی کب ختم ہو گئی اور آگے کیا ہوگا، اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ ماروی محی الدین نواب کی بہترین کاوش ہے۔ ماروی قسمت کی دھنی ہے وہ عاشق وہ بھی خلوص دل سے سچی محبت کرنے والے۔ آگے دیکھیں مرینہ کیا گیم چلتی ہے اور قسمت ماروی کو کیسے اس کے چنگل سے بچاتی ہے۔ اشعار کی محفل زبردست رہی۔"

✠ **محمد اسحاق انجم**، کنگن پور قصور سے محفل کی زینت بنے ہیں "شمارہ مئی 2014 ملا۔ انشائیہ جون ایلیا زندگی کی تلخ حقیقتوں سے پردہ اٹھاتے ہمیں راکھ اور دھواں میں لے گئے۔ دو سچ لکھتے! آپ کے خط، یہ محفل تو ہمیں بہت پسند ہے اسی کی خاطر ہم گردش دوراں کے اسیر ہو گئے ہم باہمت، تھے ورنہ طاہر جاوید مغل تو ہمیں لمبی زنداں ہی رکھتے اور ہم سے انوکھا انتقام لینا چاہتے تھے پر تو ہم نے معراج رسول صاحب کا انہیں بتایا کہ جس طرح انہوں نے آپ کو تلاش کیا تھا یہ بات ثمر عباس کو بھی معلوم نہیں صرف ہمیں پتہ ہے۔ بھلا ہو مرزا امجد بیگ کا جو درست آید، ایک جھوٹ کو سچ میں پیش کر دا سکے۔ ہم تو ہیجان میں ہی رہے اور محفل شعر و سخن کا پتا تک نہ چل سکا اور سودا کر لیا۔ محی الدین نواب صاحب نے مجھے بتایا انہوں نے کہا کہ ماروی، جو میں تحریر کر سکتا تھا کر ڈالی۔ یہ ٹھیک ہے کہ کچھ ستم ظریف ان کے پیچھے ہیں کہ ممی کی چوری کا کوئی طریقہ آپ بتائیں۔ نجمہ سودی تو بے شمار وارداتوں پر لکھ چکی ہیں اب تو متکلم صوفی کی اسیر ہو جائیں فیض یاب ہوں گی ورنہ بے روزن گنبد کی طرح تدبیروں کے چکر میں کترنیں ہی رہیں گی۔ ہم تو دل کی بات کہہ دیتے ہیں۔ چلیے انہیں کیسے کہوں کہ وہ بات ثمر عباس صاحب کے بارے میں تھی۔ پہلے ہی ہمارا خط گول کر دیا جاتا ہے۔ ایک سال بعد پھر لکھ دیا۔ چلو دیکھا جائے گا۔"

سانحۂ ارتحال

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشن کے دیرینہ کارکن جناب اظہر جمیل صدیقی مشیت ایزدی سے یکم مئی 2014 کو انتقال کر گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ رب العزت انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام اور اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ قارئین سے فاتحہ خوانی کی درخواست ہے۔

✠ **احمد خان توحیدی،** پاکستان اسٹیل، کراچی سے محفل میں چلے آرہے ہیں "سسپنس مئی کی ڈیلیوری 16 اپریل شام کو ہوگئی۔ جلد بازی کا شکریہ۔ انشائیہ جون ایلیا، راکھ یا دھواں۔ پہلے دھواں پھر آگ پھر راکھ۔ لیڈران کے جھوٹ اور لوڈشیڈنگ ایک دوسرے کو مات دینے کی فکر میں ہیں۔ جھوٹے بے ضمیر ٹولہ کو سوتے میں منہ کھلا دیکھ کر جیسے یہ سب ہڑپ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ آپ کے چند الفاظ میں سمندر ہوتا ہے تو دوسری طرف جس قوم کا 9 سالہ بچہ اولیول یونیورسٹی میں ٹاپ کر کے پوری دنیا کا آٹھ سو سالہ ریکارڈ توڑ دیتا ہے۔ زرخیز مٹی کو درست آبیاری چاہیے۔ محفل خطوط میں صفدر معاویہ جامع تبصرے کے ساتھ کرسی صدارت پر جلوہ افروز مبارکباد۔ مارچ اپریل عدم فرصت مسلسل سفر محفل میں شرکت نہ کرسکا۔ فوزیہ تبسم خانیوال، آلو پیاز کا بزنس آپ کریں یا سعدیہ بخاری، اتنے مہنگے خریدنے سے ہم قاصر ہیں۔ صرف آلو آلو ہائے ہائے... مسز زدیا اعجاز، محفل گھر کی فیلی اللہ صبر والوں کے ساتھ ہے۔ 80 سالہ حسینہ نائٹل کے ساتھ آپ کا رشتہ پوتی کا ہے یا پڑپوتی کا؟ تبصرہ اچھا۔ سیم کی گردش میں ماروی کی طرف لپکے۔ رابعہ کی حشمت جلالی سے اچھی چال وڈیرے شاہ ولی اللہ کو اس کا بیٹا پھندے میں لے رہا ہے۔ ماروی مرینہ کے پاس مراد سنگی اور محبوب سے کیسے ملاپ ہوتا ہے۔ بے چینی سے منتظر۔ پس زنداں، ہادی کا پر خلوص ایثار جلد حجاب کو تخت پر اور ارم کو تختہ پر پہنچا دے گا۔ باہمت، روبینہ نے ہمت نہ ہار کر واقعی ہمت مرداں مدد خدا والا مقولہ سچ کر دکھایا۔ محفل شعر و سخن میں زرینہ نواز کا شعر اچھا لگا۔ انوکھا انتقام، ہیجان، سودا، وقتی گزارہ تحریریں۔ ناصر ملک، بے روزن گنبد کی بیوٹی فل اسٹوری لائے۔ مہر النساء نے وسیم کی قلبی خواہش پوری کر کے بہت عظمت کا ثبوت دیا۔ وسیم نے بھی قلبی اعتراف سے فراخ دلی کا ثبوت دیا۔"

✠ **محمد جاوید،** تحصیل علی پور سے زینت محفل ہیں "سسپنس سے محبت ہے کہ دن بہ دن فوزیہ تبسم کے وزن کی طرح بڑھتی ہی چلی جارہی ہے۔ انشائیہ ایک صاحب ضمیر کے ضمیر کی آواز رہا، دانشور فلاسفر منفرد جداگانہ تیز دھار انداز تحریر کے حامل سوانح نگار جون ایلیا۔ کئی قابل ذکر کتب کے مصنف تھے۔ اداریہ حسب معمول تعمیراتی سوچ کا غماز رہا، دل و دماغ سے کشید کیا ہوا بے لاگ سندیسہ۔ دل حاضر رجسٹر! میں دیکھ کر بس اتنا کہیں کے ایک سرخ تازہ گلاب تھا جو نادانستگی میں انکل کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ ساہیوال کے ہوائی اعجاز سب نے دل کھول کر لکھا مگر آپ نے صرف منہ کھول کر لکھا۔ مظہر سلیم جوہر میں اینٹ پھینکو گے کپڑے اپنے ہی خراب ہوں گے۔ اپنی دل آویز سوچ کا رخ کاشف زبیر کا انگلش ترجمہ ڈھونڈنے کی نیت سے فہرست کی جانب موڑا۔ تلاش رائیگاں نہیں گئی۔ باہمت میں باہمت لڑکی روبینہ کے لیے بس ہم اتنا کہیں کے کہ ہمت نسواں مدد خدا۔ گردش دوراں کے اسیر۔۔۔ کے اسیروں کی لطیف محبت دیرپا عداوت بے مثیل ذہانت حسن و نزاکت کے حسین سنگین جذبوں میں گندھی تاریخی چاپسند آئی۔ کچھ روز قبل ناصر ملک کو دل نے دل ہی دل میں یاد کیا۔ صدائے دل دل والے تک پہنچی اور ناصر ملک بے روزن گنبد لیے سسپنس ڈائجسٹ میں حاضر تھے۔ مہر النساء جیسی نیک سیرت بیوی عطیہ الٰہی ہے گویا بیوی ہو تو مہر النساء جیسی پھول کملا جاتے ہیں مگر ان کی مہک سانسوں کو دیر تک معطر رکھتی ہے۔ کافی عرصے بعد آخری صفحات پر کہانی پڑھنے کا مزہ آیا۔"

✠ **شاہد محمود،** لاہور سے تشریف لائے ہیں "آج اپریل کی 23 تاریخ ہے اور آج کے دن کو لوگ یوم کتاب کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ سو ہم نے سوچا کہ ہم بھی اپنی کتاب دل کھول کر رکھ دیں۔ ہمارے "دل کی کتاب کے سامنے" یوں تو ہمارا سسپنس کے ساتھ اس وقت سے تعلق ہے جب ہمیں اس کا نام بھی صحیح طرح پڑھنا نہیں آتا تھا۔ کیونکہ ہمارے بڑے بھائی صاحب سسپنس پابندی سے پڑھتے تھے۔ جب مسافر ختم ہوئی تو بے اختیار خط لکھنے کو جی چاہا کہ آپ نے اس کو اتنی جلدی لپیٹ دیا۔ نہ امیر نواز اور شہرے کی ملاقات نہ میڈم اور ڈاکٹر کی ملاقات۔ اس شمارے پر تاریخی کہانی بالکل خشک روکھی پھیکی اور بیزار کن تھی۔ مرزا صاحب بھی اپنا رنگ نہ جما سکے آخری کہانی دل کو جھنجوڑ گئی اور ماروی کا تو جواب نہیں لیکن لگتا ہے یہ بھی جلدی ختم ہونے جارہی ہے۔ باہمت دل کو چھو گئی۔ سودا پڑھ کر گھوم گئے اور باقی گزارہ ہی تھا۔"

✠ **بشیر احمد بھٹی،** فوجی بستی بہاولپور سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں "مئی 2014ء کا سسپنس سامنے ہے۔ گردش دوراں کے اسیر الیاس سیتاپوری مرحوم کی لکھی ہوئی تاریخی کہانی نے ماضی کی سیر کرادی۔ کاشف زبیر صاحب کی باہمت اچھی رہی۔ پس زنداں کا چوتھا حصہ پڑھا (لاجواب) ہے۔ نواب صاحب ماروی کو خوب صورت انداز میں آگے بڑھا رہے ہیں۔ چھٹی قسط پڑھی۔ بے روزن گنبد ناصر ملک صاحب نے خوب صورت پیرائے میں لکھی ہے۔"

✠ **راجہ راحیل، محمد سہیل وریہ،** ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے چلے آرہے ہیں "مئی کا شمارہ 22 تاریخ کو سیشن عدالت میں اپنے والد سے وصول کیا۔ سسپنس ہاتھوں میں آیا تو ہاتھوں میں جان ہی آگئی۔ حسینۂ سرورق اپنے آپ کو دوپٹے کی اوٹ میں چھپاتے نظر آئی۔ اس کے بعد جون ایلیا کا انشائیہ پڑھا۔ واقعی ہی آج کے انسان کو نہ سکون ہے نہ چین ہے۔ انسان کا ضمیر اسے ہر وقت ملامت کرتا رہتا ہے۔ لگاتار پچھلے دو ماہ سے میرے خط کو شائع نہ کیا گیا ایسا کیوں کیا آپ نے؟ (بس جگہ کی مجبوری) خطوط کی محفل میں محمد صفدر معاویہ کو کرسی صدارت پر براجمان پایا۔ مبارکباد قبول ہو۔ صوبیہ اقبال محفل والوں کو کھری کھری سناتی نظر آئیں۔ زدیا اعجاز ہماری دعا ہے کہ خدا کی ذات آپ کو امتحان میں نمایاں کامیابی عطا کرے۔ سب سے پہلے پس زنداں پڑھی۔ ارم ہادی کے کیمرے سے تصویر چرا کر جلال کو دکھاتی ہے۔ جس کی وجہ سے حجاب کی ازدواجی زندگی مزید مشکلات کا شکار ہوگئی ہے۔ محی الدین نواب کی ماروی پڑھی۔ ماروی کا مرینہ کے ہاتھ لگنا۔ دوسری طرف جیلر دلاور جان کے ذریعہ محبوب جانڈیو کو جیل میں خبر ہوجاتی ہے کہ ماروی زندہ ہے۔ مرزا امجد بیگ کی درست آیہ پڑی جس میں بیگ صاحب اپنے موکل داؤد کو اسلم فاروقی کے قتل کے الزام سے باعزت بری کروانے میں کامیاب ہوئے۔ محفل شعر و سخن میں رمضان پاشا اور ساگر گوکر کے اشعار اچھے لگے۔"

✠ **مقصود علی،** ملیر کینٹ کراچی سے تشریف لارہے ہیں "مئی 2014ء کا شمارہ 21 اپریل کو ملا۔ سرورق شاید انکل ذاکر جی نے سعدیہ بخاری کو دیکھ کر بنایا تھا۔ ایلیا صاحب نے سچ ہی کہا ہے کہ منافقت کا کردار اور سچ اور جھوٹ کے درمیان لٹکے رہنے سے ہم یا تو راکھ ہوجائیں گے یا پھر دھواں بن کر اڑ جائیں

گے۔ تاہم یہ خوشخبری اچھی لگی کہ اسٹریٹ چلڈرن ٹورنامنٹ میں پاکستانی بچوں نے تیسری پوزیشن لی ہے۔ محفل یاراں میں نظر دوڑائی تو محمد صفدر معاویہ آف خانیوال پہلے نمبر پر نظر آئے بہت مبارک ہو جناب کو۔ سب سے پہلے الیاس سیتاپوری کی گردش دوراں کے اسیر پڑھی۔ مصنف نے عباسی خلفا کے دور میں عربوں اور ترکوں کے درمیان پائی جانے والی چپقلش کو بہت ہی موثر انداز میں پیش کیا۔ کاشف زبیر صاحب باہمت لڑکی کی کہانی لائے۔ سلیم انور کی انوکھا انتقام بالکل ہی انوکھی رہی۔ امجد بیگ صاحب اور درست آیہ میں معاشرے کے شاطرانہ کرداروں کو بے نقاب کرتے نظر آئے۔ نجمہ صوفی صاحب کی ممی کی چوری تک دیلوٹ کی ایک اور کامیاب کارروائی کی اچھی کہانی تھی۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی بقلم صوفی دل و دماغ کو روشن کرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے ایمان کو بھی تازہ کر گئی۔ جناب ناصر ملک کی تحریر بے روزن گنبد ایک زبردست کہانی اور اسٹوری آف دی منتھ رہی۔ مہرو نے سب کچھ قربان کر کے اپنے گھر کی رونق بحال کی یہی اس کی سب سے بڑی کامیابی تھی۔ سب سے پہلے پس زنداں کا ذکر۔ ہائے ہائے ہادی یہ تو نے کیا کر دیا۔ خوامخواہ بے چاری حجاب کی زندگی میں زہر گھول دیا جبکہ ماروی کی یہ قسط بھی بھرپور رہی۔ کہانی اب اپنے کلائمکس کی طرف بڑھ رہی ہے۔ سودا اور ستم ظریف دونوں ہی اوسط درجے کی تھیں کوئی خاص رنگ جما نہ سکیں۔ محفل شعر و سخن میں مہرین ناز، حسیب احمد حناّئے، احمد خان توحیدی، اشکوک کمار اور ام لیلیٰ کے اشعار اچھے لگے۔ تمام کترنیں اور لطائف بھی اچھے تھے۔ مجموعی طور پر شاندار شمارہ تھا۔"

✠ **ابن مقبول جاوید احمد صدیقی،** راولپنڈی سے تبصرہ کر رہے ہیں "خاصی مدت کے بعد حاضر محفل ہو رہا ہوں مگر سسپنس کا ساتھ تو کبھی بھی نہ چھوٹا تھا۔ انتہائی منفرد اور دل پذیر کہانیوں کا انتخاب جس میں اردو ادب کے بڑے بڑے لکھاریوں کے مقابلے میں لکھی گئی دل کی گہرائیوں تک اثر آنے والی یہ کہانیاں صرف اور صرف سسپنس کی ہی پالیسی ہے۔ آپ کے خط میں خبردار کرنے والی باتیں، حلال و حرام کو ہم سب سمجھ لیں تو پورا معاشرہ ہی سدھر جائے۔ دوسرے اولاد کی تربیت کی طرف وہ والدین توجہ دیں نا جن کی اپنی تربیت کی گئی تھی، پاکستان کی پہلی نسل ہی بے ایمانی، لوٹ کھسوٹ، سود، رشوت خوری، زمینیں، مکانات اور اسٹیٹس کے چکروں میں پھنس گئی تو کہاں کی حلال حرام روزی اور کہاں کی تربیت؟ جون ایلیا کا کونسا انشائیہ ہے جو دل و دماغ کو ہلا نہ دے؟ راکھ اور دھواں بھی ایسا ہی ہے۔ لیجیے یہ معاویہ صاحب تو دلیز پری پر براجمان مل گئے اور محمد صفدر معاویہ اتنے گلے شکوے کیا کہتے کہ مسند صدارت پر براجمان کر دیا۔ بھئی دیر سویر تو ہے نا۔ اشوک کمار جی اللہ نہ کرے کہ قیصر اقبال سمیت ہمارے تمام قارئین کو ایمبولینس کی ضرورت پڑے۔ قیصر اقبال کچھ آپ نے بخاری کو چسپاری کے وزن پر لا کر خوب محظوظ کیا۔ بشریٰ افضل کا نام دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ 8،7 سال پرانے تبصرے یاد آگئے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے جناب ناصر ملک کی لکھی بے روزن گنبد ایک الگ داستان رہی۔ دیسے یہ پیچیدہ، چیدہ چیدہ، بھاری بھرکم الفاظ کے تانے بانے سے بنی گئی ایسی کہانی رہی جو احساسات کے سمندر میں قاری کو ڈبو کر آخر تک لے کر چلتی ہے کہ اچانک ان احساسات کو دھچکا لگتا ہے کہ بس اب کنارا آگیا۔ مہرو کا پیار تو لازوال تھا۔ ڈاکٹر تنویر شاہ سید جب بھی آتے ہیں اسی طرح خوب صورت، لازوال اور معاشرے کی صحیح عکاسی کرتی ہوئے کہانی لائیں گے اور اس دفعہ بھی ہیجان ایسی ہی بے پناہ دل میں اثر کرنے والی داستان ہے۔ سسپنس کی جان اور لاکھوں قارئین کی ہر ماہ پڑھنے کی تمنا، حسام بٹ کی تحریر اس دفعہ بھی بڑا ہی مزہ دے گئی۔ کہانی کا تانا بانا بہت ہی پرکشش رہا۔ انوکھا انتقام بھی انوکھی کہانی رہی۔ گردش دوراں کے اسیر، الیاس صاحب کی حسب سابق ہمارے ماضی کے بڑے بڑے نام کس کس طریقے سے مسلمانوں کو اسلام کو اور اسلامی روایات کو پامال کرتے تھے۔ کاش یہ حکمران تعلیم کی طرف لگ جاتے۔ زبردست کاوش تھی۔ دوسری سلسلے وار کہانیاں کیا بات ہے کہ بہترین پلاٹ، بہترین الفاظ اور روانی میں یکتا ہوا کرتی ہیں۔ محفل شعر و سخن میں تینوں میں قاری کے شعر زبردست تھے بلکہ مہرین ناز ڈوگر کا انتخاب لاجواب تھا۔ سندھی سے ترجمہ کی گئی کہانیاں، امر جلیل کی سندھی سے کہانیوں کو بھی ضرور جگہ دیجیے گا۔"

✠ **ماہا ایمان،** حافظ آباد سے محفل کی زینت بنی ہیں "عرض حال یہ ہے کہ ہم بھی اس مہنگائی اور عدم تحفظ کے دور میں اللہ کے فضل و کرم سے بخیریت ہیں۔ چند ماہ کے غیاب کے بعد ہماری مانند بہار روانی آپ سب کے لیے خوشگوار ہوگی۔ جن احباب نے یاد رکھا، ان کا شکریہ اور جو بھول گئے ان کی خدمت میں دست بستہ عرض ہے کہ تمہیں چاہتیں ہمیں پروا نہیں۔ مئی 2014ء کا سسپنس خاصے صبر آزما انتظار کے بعد موصول ہوا۔ نئی اطلاع یہ ہے کہ ہم نے بھی فیس بک پہ JDP فین کلب جوائن کرلیا۔ اپنے فیورٹ رائٹرز کو دیکھنے بات کرنے اور بہت سے جاسوسیز سے بات چیت کا موقع ملا۔ تکبیر عباس سے ہماری التماس ہے کہ JDP کا وزٹ کریں کہ وہاں نثر پھیلانے والے ایک موصوف سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم اور آپ ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔ لو بھلا بتاؤ کوئی کبھی تیر اور تیر بھی اکٹھے ہوئے ہیں۔ جون ایلیا کا انشائیہ موتیوں کی مالا کی طرح ہے۔ اب یہ جس کے نصیب میں ہوگا وہ ان موتیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لے گا۔ اداریے میں آپ کا کہنا بجا ہے کہ عہد حاضر مصائب و آلام کا دوسرا نام ہے۔ سب کا سب سے پسندیدہ فقرہ آج کل یہی ہے کہ پاکستان اس وقت تاریخ کے نازک اور مشکل ترین دور سے گزر رہا ہے جو کہ غلط بھی نہیں ہے۔ محمد صفدر معاویہ کا تبصرہ پہلے نمبر پر پڑھنے کو ملا۔ پرواز تو اچھی تھی آپ کی لیکن اڑتے وقت بلندی کا خیال بھی رکھا کریں۔ محمد قدرت اللہ نیازی صاحب آپ کے لیے مفت مشورہ ہے کہ زیادہ حجامت کریں۔ مہرین ناز آپ کے انداز بیان نے طبیعت خوش کر دی۔ بلقیس خان کی آمد بھی اس ہوا کا جھونکا لگی۔ جس سے آج کل واپڈا والے ہمیں محروم رکھنے کی اپنی سی سعی کر رہے ہیں۔ زدیا اعجاز صنف نازک صنف کرخت دونوں کی عظیم الشان طریقہ سے کھنچائی کرتی پائی گئیں۔ مگر عباس بابر انکل کہاں غائب ہوجاتے ہیں۔ محفل ہی بے رنگ کر جاتے ہیں لیکن آپ بھی کیا کریں جرم ضعیفی کے تقاضے ہیں نظر کم ہو رہی ہے تو تبصرہ بھی کم ہی ہوتا ہے۔ بشریٰ افضل جی اتنا کم کیوں تشریف لاتی ہیں۔ ام لیلیٰ سنا ہے کہ آپ کا البیلا سا تبصرہ پڑھ کے بہت سوں کے حواس مختل ہوگئے۔ سب سے بہترین تبصرہ مظہر سلیم کا تھا۔ اسلامی تاریخ ہماری کمزوری ہے سو اسی سے آغاز کیا۔ حضرت سہلؓ بن عبداللہ کے حالات و واقعات نے قلب پہ گہرا اثر کیا۔ ہادی اور حجاب کی داستان پس زنداں ابتدا میں ہی متاثر کرنے میں کامیاب ہوچکی ہے۔ جلال اپنی جہالت اور حجاب اپنے صبر کی انتہا پر ہے۔ ہادی کا عشق یکطرفہ عشق بھی نت نئے کرتبے دکھانے کو تیار ہے۔ محی الدین نواب کی ماروی نواب صاحب کے مخصوص طرز تحریر کی حامل بہت دفعہ کی پڑھی ہوئی ایک چہرہ

کئی روپ بھی چھاؤں کبھی دھوپ ٹائپ کی تحریر ہے۔۔۔ بے روزن گنبد ناصر ملک کی ایک عجیب سی تحریر تھی مجھے تو آسانی سے ہضم نہیں ہوئی۔ وسیم عجیب کاٹھ کے الو سا تھا اور محترمہ بیگم مہر النسا حد سے زیادہ ایثار کا پیکر۔ وسیم ان لوگوں میں سے تھا جو مکان بدلتے ہیں، رشتے بدلتے ہیں اور دوست بدلتے ہیں لیکن پھر بھی دکھی رہتے ہیں کیونکہ وہ اپنا رویہ نہیں بدلتے۔ مرزا امجد بیگ نے ہمیشہ کی طرح اپنے موکل کو زورِ وکالت سے بازیاب کروایا۔ میرے فیورٹ رائٹر کاشف زبیر کی مختصر تحریر باہمت میں روبینہ واقعی باہمت ثابت ہوئی اور ناتجربہ کار ہوتے ہوئے بھی تجربہ کاروں کو ناکوں چنے چبوا گئی۔ سلیم انور کی انوکھا انتقام میں جیک کے باپ نے مرنے کے بعد بھی اسے نہیں بخشا۔ میرے فیورٹ نک نے اس بار ممی کی چوری کی، نجمہ مودی صاحب بھی بڑی موڈی ہیں۔ کافی دیر بعد چکر لگاتی ہیں۔ محفل شعر و سخن ہمیشہ کی طرح آباد ہے اور سسپنس کو سجا رہی ہے۔ متین سلطان، ایم این عماد، اشوک کمار کا انتخاب عمدہ تھا۔ کھوئے ہوؤں بچھڑے ہوؤں جیسے دلنشین، تصویر العین سے ہماری التجا ہے واپس محفل میں تشریف لے آئیں۔"

✠ اعجاز احمد راحیل، ساہیوال سے چلے آرہے ہیں "20 اپریل کی صبح بادِ صبا کے سنگ اٹھکیلیاں کرتا ہوا میرا سسپنس میری بصارتوں کا رزق بے تاب نظروں کے سامنے تھا۔ سرورق پر موجود محبوبہ دلنواز کی اداس نظریں اس بات کی غماز ہیں کہ جیسے وہ کسی دور جانے والے کے رستے پہ لگی ہوئی ہیں۔ جون ایلیا صاحب بھی ہمیں درس محبت دیتے نظر آئے مگر من کے کھوٹے کیا سمجھیں گے بھلا محبت کو۔۔۔؟ اداریہ ہمیشہ کی طرح مبنی بر حقیقت ہے یہ سچ ہے کہ ماں کی گود ہی اولاد کی اصل تربیت گاہ ہوتی ہے۔۔۔ بزم طرب میں اس دفعہ شہر محبت والوں کی شوخیاں اپنے عروج پہ تھیں اپنی دوست مہرین ناز کا سندر سا تبصرہ من کو بھا گیا۔ ویلڈن۔۔۔ پیارے بھائی صفدر معاویہ آپ کو ہماری طرف سے دلی مبارک باد۔ پیارے مظہر سلیم جی جس جوہڑ میں آپ جیسی نام نہاد مخلوق رہتی ہو وہاں مہرین ناز کا کیا کام۔۔۔؟ بشریٰ افضل جی بوتلے کو بھلا کیا پتا روحانی باپ کی عزت کا۔۔۔؟ سب سے پہلے باب محبت پہ دستک دی، اس میں کوئی شک نہیں محترم طاہر جاوید مغل لہو زنداں کو بہت خوب صورتی سے آگے بڑھا رہے ہیں۔ ایک شاعر ہونے کے ناتے ہادی کی دلی کیفیات کا پورا ادراک ہے، محبت قربانی مانگتی ہے انسان تجربات کی بھٹی سے گزر کر ہی کندن بنتا ہے۔ حجاب کی مشکلات میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔ ہادی نے ارم کے پر کاٹ کے رکھ دیے ہیں۔ محی الدین نواب کی ماروی کو بصد شوق پڑھا، مراد مرینہ کو تگنی کا ناچ نچا رہا ہے تو مرینہ بھی کسی سے کم نہیں۔ حشمت جلالی کے ستارے بھی گردش میں ہیں، جیلر صاحب بھی پھنسے ہوئے ہیں۔۔۔ کچھ نئے کردار بھی سامنے آئے ہیں۔۔۔ بہرکیف موجودہ قسط اپنا رنگ جما گئی۔ ناصر ملک صاحب آخری صفحات کی زینت بنے، بے روزن گنبد ان کی نایاب تحریر ہے۔ بلاشبہ ظاہری خوب صورتی سب کچھ نہیں ہوتی اصل خوب صورتی تو انسان کے اندر کی ہوتی ہے، مہرو نے اس بات کو مکمل طور پر ثابت بھی کیا لیکن وسیم کا کردار محبت میں تڑپ۔ حقیقت کے قریب تر لگی اور میں وسیم میں خود کو دیکھتا رہا کھوجتا رہا۔۔۔ اس دفعہ ابتدائی صفحات پر الیاس سیتاپوری نے گردشِ دوراں کے اسیر جیسی تحریر لکھ کر حقِ قلم ادا کر دیا۔ مصنف نے نفرتوں کے دیار میں محو رقص محبت کو بہت خوب صورتی سے بیان کیا۔ مرزا امجد بیگ نے درست آید میں اپنے موکل داؤد کو جہاں بچایا وہاں ارشد محمود جیسے دولت کی خاطر ہر حد پار کرنے والے کو انجام تک پہنچایا۔۔۔ انسان اگر ہمت و استقلال سے کام لے تو مشکل سے مشکل حالات کا بھی مقابلہ کر سکتا ہے۔ کاشف زبیر کی باہمت اچھا تاثر دے گئی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی ہیجان محبت اور درد و غم پر لکھی گئی تحریر دل میں اک عجیب سی کسک پیدا کر گئی۔ ممی کی چوری ہونٹوں پہ مسکراہٹ بکھیرنے میں کامیاب رہی۔۔۔ سودا بھی بہترین اسٹوری ہے لائف میں کچھ ایسے سودے بھی کرنے پڑتے ہیں جو سکون دیتے ہیں۔ حکم ولی ایمان کو جلا بخشنے میں کامیاب رہی۔ محفل شعر و سخن میں قارئین کی طرف سے عمدہ تحفے بھیجے گئے ہیں اس میں کوئی شک نہیں مئی کا شمارہ پڑھنے کے قابل ہے۔"

✠ اشفاق شاہین، کراچی سے شریک محفل ہیں "خلاف توقع سسپنس اس بار 15 اپریل کو ہی مل گیا تھا۔ سسپنس کا ٹائٹل اس بار جاذب نظر تھا۔ جون ایلیا کے انشائیے پر پہنچا کہ یا دھواں ان کی سمجھ میں نہ آنے والی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کی پھر محفل خطوطاں میں پہنچے، سب سے پہلے اپنے نام کی طرف نظریں دوڑائیں، خود کو کہیں نہ پا کر دل دھک سے رہ گیا لیکن پھر خطوط پڑھ کر کچھ تسلی ہوئی کہ کسی بھی طرح محفل میں موجود تو ہیں، ہم نہ سہی ہمارا ذکر ہی سہی۔ صفدر معاویہ سب سے پہلے نمایاں تھے بہترین چناؤ تھا الفاظ کا، گریٹ اشوک کمار! ہم کہاں کے تبصرہ نگار محترم بس سسپنس اور دوستوں کی محبت ہمیں کھینچ لاتی ہے۔ فوزیہ تبسم اور صوبیہ اقبال خوب صورت خطوط کے ساتھ موجود تھیں۔ محفل شعر و سخن میں مہرین ناز، ماہین فاطمہ اور عزیز مے کا انتخاب لاجواب تھا۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف، سب سے پہلے لہو زنداں میں کودے، ہادی کی ذرا سی غلطی سے حجاب کے ساتھ کیا کچھ ہو گیا۔ ہادی نے کچھ پتے کھیلے تو ہیں دیکھو اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے اور حجاب کے لیے کہاں سے امید کی کوئی کرن نظر آتی ہے۔ ماروی کا مطالعہ کیا، کہانی میں نئے نئے موڑ آرہے ہیں۔ اب دیکھو مرینہ کیا قدم اٹھاتی ہے؟ ماروی محبوب کے پاس پہنچ پاتی ہے یا نہیں اور مراد کا کیا بنتا ہے، اچھی جا رہی ہے۔ گردش دوراں کے اسیر تاریخ کے خفیہ گوشوں سے چنی ایک لاجواب اور سبق آموز تحریر ہے۔ کاشف زبیر کی باہمت زبردست خصوصاً روبینہ کا کردار تو کہانی کی جان تھا۔ مرزا امجد بیگ، درست آید کے ساتھ اپنے ایک بہترین کیس کو لے کر آئے۔ اس میں انہوں نے کچھ اپنا تذکرہ کیا ہے، بہت اچھا لگا اور سب سے آخر میں آخری کہانی کی بات کرتے ہیں، وسیم کی اتنی لمبی سرد خاموشی، مہرو کی وفائیں اور مریم کا کردار، الفاظ کا چناؤ بہترین، سب کچھ بہترین تھا۔"

✠ صوبیہ اقبال، راولپنڈی سے تبصرہ کر رہی ہیں "مئی کا سسپنس اب کی بار تھوڑا سا لیٹ ملا۔ سرورق کی لڑکی کا پوز بہت پیارا لگا۔ اگر لیس اور دوپٹے کا کلر ایک جیسا ہوتا تو اور بھی پیاری لگتی۔ انشائیہ راکھ یا دھواں ہر محب وطن کے دل کی آواز لگا۔ خطوط کی محفل میں صفدر معاویہ صدارت کرتے نظر آئے۔ تبصرہ بہت مختصر تھا پھر بھی صفدر بھائی مبارکباد۔ زویا اعجاز آپ کے لیے صرف اتنا ہی، اونچی دکان، پھیکا پکوان۔ مظہر بھائی جو خود تخریبی سوچوں کا جوہڑ ہو تو اس نے تو ہر وقت اس جوہڑ میں غوطہ زن رہنا ہے۔ الیلی، تمہاری دم پر کس نے پاؤں رکھ دیا ہے؟ آغاز ابتدائی صفحات کی کہانی گردش دوراں کے اسیر سے کیا۔ منصور کے واقعات پسند آئے۔ مغل صاحب کی لہو زنداں میں ہادی کی کوششیں کیا رنگ لاتی ہیں۔ بس ارم کی شکست کا انتظار ہے۔ درست آید میں ارشد محمود اصل قاتل ٹھہرا اور داؤد بری ہوا۔ ماروی کے سارے کردار اپنے چکر چلا رہے ہیں۔ دیکھتے ہیں اب مرینہ کیا کھیل کھیلتی ہے۔ بے روزن گنبد میں مہر النسا کی جیت اچھی لگی تو وسیم

کے ساتھ مریم کی جوڑی بھی اچھی لگی۔ حکم صوفی میں اللہ کے بزرگ جبل کے واقعات پڑھنے کو ملے۔ ممی کی چوری میں نک نے مصری ممی کا راز فاش کیا۔ باہمت میں روبینہ معذور ہو کر بھی باہمت نکلی۔ ہیجان میں فیروز کا فیصلہ اور قربانی پسند آئی۔ سودا اور انوکھا انتقام بھی ٹھیک لگیں۔ محفل شعر و سخن کے ساتھ مراسلے بھی خوب رہے۔"

✠ بختاور بلوچ، لسبیلہ، صوبہ بلوچستان سے محفل میں شریک ہیں "سسپنس سے اپنی رفاقت اور وابستگی کو ایک طویل عرصہ بیت چکا ہے۔۔۔ اس سے پہلے بھی محفل سسپنس میں قدم رکھنے کی کوشش کر چکے ہیں اور ہر بار ہمیں مایوس لوٹایا گیا ہے مگر ہم بھی ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں ہیں (شاباش) سسپنس کی خوب صورت تحریریں ہمیں مجبور کرتی ہیں کہ ہم ہر ماہ اسے خرید کے پڑھیں۔ محفل خطوط میں قارئین کی نوک جھوک اور شرارتوں سے محظوظ ہوتے ہیں اور فخر بھی کرتے ہیں کہ آج کے اس سائنسی دور میں۔۔۔ داناؤں کی اس دنیا میں کچھ پاگل ایسے بھی ہیں جو آج تک قلم و کتاب سے اپنا پاکیزہ رشتہ برقرار رکھے ہوئے ہیں، ہم خاص طور پر قیدی بھائیوں کے عزم اور ذوق ادب کو سلام پیش کرتے ہیں، اس طویل رفاقت کے دوران ہمیں بہت سے نامور مصنفین کی لازوال تحریریں پڑھنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ ناصر ملک صاحب بہت کم عرصے میں صفحات سسپنس، قارئین کے دلوں پر چھا گئے۔ ہم سندھی ادب سے چند مختصر تحریروں کا انتخاب کر کے، اردو ترجمہ کر کے سسپنس کے لیے بھیج سکتے ہیں یا نہیں؟ (جی بالکل بھیج سکتے ہیں) اگر حوصلہ افزائی ہوئی تو کوشش جاری رکھ سکتے ہیں۔" (یہ تو ہوگئیں ذاتی باتیں، شمارے پر تبصرہ کہاں ہے بھئی۔۔۔)

✠ حوریہ علی اینڈ مقدس فرام فورنگی حاضر محفل ہیں "امتحان کی آمد آمد ہے۔ پھر بھی سسپنس سے ہماری محبت دیکھ کر خط لکھنے کے لیے وقت نکال ہی لیا ہے۔ مئی کا شمارہ 21 اپریل کو خریدا۔ سرورق کی لڑکی کا آنچل میں گھبرا کر چہرہ چھپانا اس بات کو ظاہر کر رہا ہے کہ کہیں دور سے ہمایوں سعید اس کو گھور رہا ہوگا۔ اپنی محفل میں صفدر معاویہ بازی لیتے نظر آئے۔ مبارک ہو آپ کو بھائی۔ اشوک کمار، اپنی تعلیم پر دھیان دو۔ بوڑھے لوگوں کو مسم اور بولڈ، بولڈ کہہ کر دینا ملک نہ بناؤ اور اپنے مفت کے مشورے بھی خود سنبھالنے کی کوشش کرو۔ قیصر اقبال ہمیشہ کی طرح سب کی کلاس لیتے نظر آئے۔ زویا اعجاز، اللہ رے خوش فہمیاں، صرف اتنا کہوں گی۔ الیلی تبصرہ کیا کرو، بچی نہ بنا کرو۔ لہو زنداں بہت بہترین جا رہی ہے۔ ایک طرف حجاب پر ظلم ہو رہے ہیں تو ہادی بھی خوب ہاتھ پیر مار رہا ہے۔ ماروی میں جیلر اور اس کی بیٹی مرینہ ابھی تک اپنے چکروں میں مصروف ہیں۔ تو ان کے لیے مراد کا حصول مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔ بے روزن گنبد میں آخرکار مہر النسا کی کاوشیں رنگ لائیں اور مریم کے ساتھ ساتھ وہ بھی وسیم کا ساتھ حاصل کرنے میں کامیاب ٹھہری۔ درست آید میں فوزیہ کا شوہر داؤد تھوڑا لیٹ ہی سہی بے گناہ تو قرار پایا۔ ممی کی چوری بھی خوب رہی۔ حکم صوفی کے ایمان افروز واقعات تو گردش دوراں کے اسیر ہیں، تاریخی واقعات معلومات کا خزانہ ثابت ہوئے۔ محفل شعر و سخن میں بہترین انتخاب پڑھنے کو ملا۔"

✠ مہرین ناز، حیدرآباد سے حاضر محفل ہیں "مئی کا شمارہ سسپنس بادِ بہاری کے ایک خوشگوار جھونکے کی طرح ہمارے پاس آیا۔ ماہ رخ سسپنس چھوئی موئی کی تفسیر لگی۔ انشائیہ پڑھ کر لگا کہ جیسے آئینہ دکھا دیا گیا ہو۔ اداریہ کی فکر انگیزی بے حد متاثر کن ہے اور سرزمین پاک پہ ٹیلنٹ کی کمی نہیں۔ یہ حقیقت ہے محمد صفدر معاویہ اب تک جتنے تبصرے صدارت پر منتخب کیے گئے ان میں سب سے اچھا تبصرہ مجھے آپ کا لگا، مبارکباد اور ہمارے تبصرے پسند کرنے کا شکریہ۔ بشریٰ افضل جی آپ میری پسندیدہ تبصرہ نگار ہیں۔ سوہا جی بادِ مخالف سے گھبرایا نہیں کرتے۔ ہمایوں صاحب ریکارڈ ہوتے ہی توڑنے کے لیے ہیں۔ بھائی نیازی صاحب آپ کی نصیحت سر آنکھوں پہ، لیکن ہر انسان اپنا اچھا برا جانتا ہے۔ میں رمضان المبارک میں دوبارہ عمرہ کی سعادت حاصل کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ شوکت بھائی انسان کا دل خوب صورت ہونا چاہیے صورت تو ثانوی چیز ہے۔ ہماری الیلی تو اس محفل کی لیڈی دبنگ بن گئی ہے۔ ناصر ملک صاحب اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ بے روزن گنبد کے ساتھ موجود تھے۔ یہ بھی ان کی ونڈرفل تحریر ثابت ہوئی۔ انسان کی قسمت میں محبت دل کے دروازے پر دستک ضرور دیتی ہے، اچھا جیون ساتھی ملنا بھی نصیب کی بات ہے۔ ادب کے آکاش پر درخشاں ستارے کے مانند چمکنے والے نامور رائٹر طاہر جاوید مغل لہو زنداں میں اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ حاضر ہوئے۔ ہادی بھی حجاب کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہے۔ نہ جانے کیوں محبت کرنے والوں کے درمیان یہ ظالم سماج رکاوٹیں کھڑی کرتا ہے۔ محی الدین نواب بہت قابل لکھاری ہیں، ہم شروع ہی سے ان کی تحریروں کے شیدائی ہیں گو کہ ماروی ان کی اچھی تحریر ہے مگر ابھی تک کچھ ایسا نظر نہیں آیا جو ہمارے اور سسپنس کے مزاج کے مطابق ہو۔ مرزا امجد بیگ کی درست آید، موجودہ معاشرے کی مکمل عکاسی کرتی اور سبق آمیز اسٹوری ہے جرم چھپانے سے نہیں چھپتا، اگر وکیل بھی بیگ صاحب ہوں۔ فاروقی کے قاتل ارشد کو بے نقاب کیا۔ گردش دوراں کے اسیر میں الیاس سیتاپوری نے نفرتوں اور ظلم کے درمیان محبت کو حسین لفظوں میں بیان کیا ہے۔ کاشف زبیر کی باہمت پسند آئی۔ انسان جب اپنے ارادوں میں مضبوط ہوتا ہے تو وہ مشکلات سے مقابلہ کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی ہیجان، بھی دوسری تحریروں کی طرح دل میں اتھل پتھل پیدا کر گئی۔ محفل شعر و سخن میں اپنا قطعہ دوسرے نمبر پہ دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ سال کا پانچواں شمارہ بھی کامیابی سے ہمکنار ہوا۔"

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

حسیب احمد چانے، لگڈی کرک۔ محمد صفدر معاویہ، حمزہ احمد خان، خانیوال۔ طاہرہ گلزار، پشاور۔ محمد خواجہ، کورنگی، کراچی۔ قیصر اقبال گچ، بکلول، ضلع بھکر۔ شوکت شہریار، اوکاڑہ۔ ادریس احمد خان، ناظم آباد، کراچی۔ سید اکبر شاہ، اوگی، مانسہرہ۔ ملک رحمت، میانوالی۔ ایم افضل کھرل، ننکانہ صاحب۔ علی ڈوگر، ساہیوال۔ فوزیہ تبسم، خانیوال۔ ہارون رشید، مردان۔ انور یوسف زئی، اسلام آباد۔ قیصر اعوان، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا۔ محمد ہمایوں سعید، بنوں۔ الیلی، کراچی۔ اللہ نواز اتی کلاچی، ڈیرہ اسماعیل خان۔

حساب دوستاں

الیاس سیتاپوری

حساب دوستوں کا ہو یا دشمنوں کا... میزان کھری ہو تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوتے دیر نہیں لگتی... اور اگر یہ حساب کتاب وقت کے ہاتھوں میں آجائے تو لمحوں کا شمار جذبات واحساسات اور حیرت انگیز واقعات کے حصار میں قید کرکے ہر پل کی پڑتال ہونے لگتی ہے اور رفتہ رفتہ یہی جانچ پڑتال تاریخ کا حصہ بن جاتی ہے۔ یہ ہر دور کی حقیقت ہے کہ جب تک بے وقوف زندہ ہیں عقلمندوں کا کاروبار چمکتا رہے گا... اس کی سادہ لوحی اور بے شمار دولت بھی اس کے لیے وبال بن گئی تھی۔ ایسے میں اگر کوئی ہمدم، کوئی غمگسار بھی ساتھ نہ ہو تو شعور کے تمام دروازوں پر قفل لگ جاتا ہے۔ اگرچہ اس کے پاس کسی سلطنت کی بادشاہت نہ تھی... نہ دربار میں دریادلی کی مثالیں تھیں... اس کے باوجود ایک دنیا اس کے پیچھے تھی اور وہ محوِ سفر تھا... مگر اسے شاید یہ ادراک ہی نہ تھا کہ سفر میں اگر زادِ سفر ساتھ نہ ہو تو ہوائیں بھی مخالف ہوجاتی ہیں۔ جنگ کوئی بھی ہو تدبیروں سے لڑی جاتی ہے، طاقت اور دولت کے بل پر تو حکمرانی کی جاتی ہے... لیکن اس کی سادہ لوحی اسے ہر موڑ پر زندگی کا ایک الگ ہی رخ دکھاتی رہی اور وہ سمجھوتوں کے ہجوم میں خود کو ڈھونڈتا رہا... اس بار تاریخ ایک اور ہی انداز میں اوراق پلٹ رہی تھی۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

اہواز کے تاجر حمدون کا جب انتقال ہوا تو اس کے پسماندگان میں اس کا بیٹا لیث اس کے پاس ہی موجود تھا لیکن اس کا بڑا بھائی یعقوب اور ماں حج بیت اللہ کو گئے ہوئے تھے۔ لیث نے رو دھو کر باپ کے دوستوں اور پاس پڑوس والوں کے تعاون سے مرحوم کی آخری رسوم ادا کیں اور اپنی ماں اور بھائی کا انتظار کرنے لگا۔ باپ نے اتنی جائداد اور نقد رقم چھوڑی تھی کہ وہ معاش کی طرف سے بالکل بے فکر تھا۔

شتر بے مہار، دولت اور جائداد پر سے غیر معمولی حق تصرف اور اختیار ہونے کی وجہ سے خود غرض اور لالچی انسانوں نے لیث کے اردگرد حریص مکھیوں کی طرح جمع ہونا شروع کردیا۔ ان کی چرب زبانی کے وار شروع ہوگئے اور لیث اپنی فطری شرم اور تکلف کی وجہ سے یہ وار سہنے پر مجبور ہوگیا۔ وہ اس پر ترغیب اور تحریص کے پھندے پھینکتے مگر وہ ان پھندوں سے، یہ کہہ کر بچ نکلتا کہ وہ اپنی ماں اور بڑے بھائی کی موجودگی اور زندگی میں اپنے باپ کی جائداد اور دولت کا تنہا مالک نہیں ہے اور جب تک یہ دونوں حج سے واپس نہ آجائیں، لیث اس جائداد اور دولت کو ان دونوں
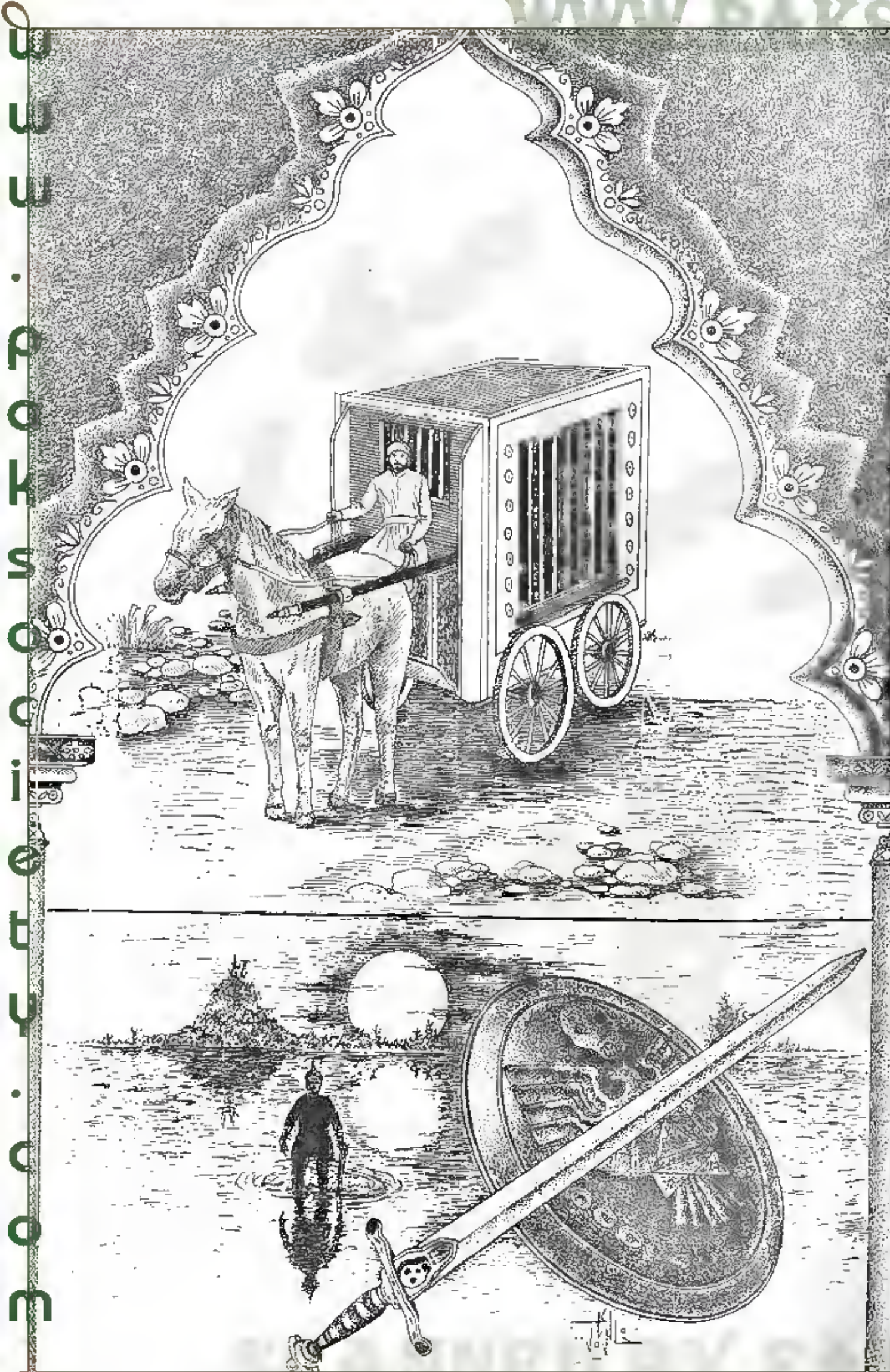
کی امانت سے زیادہ نہیں سمجھتا۔

لیکن ماں اور بھائی یعقوب کا کہیں پتا نہ تھا۔ لیث کو اپنے بڑے بھائی یعقوب کا انتظار اس لیے بھی تھا کہ مرحوم باپ نے بغداد میں بھی کاروبار کررکھا تھا اور اس کا صحیح علم یعقوب ہی کو تھا۔ اس کے علاوہ لیث کے علم میں یہ بات بھی تھی کہ مرحوم باپ نے کاروبار کے ساتھ ہی بغداد میں کسی بیوہ سے شادی بھی کررکھی تھی۔ اس بیوہ کی پہلے شوہر سے ایک لڑکی بھی تھی جس کا نام عنان تھا۔ لیث کا باپ جب تک زندہ رہا آٹھ ماہ اہواز میں رہتا اور چار ماہ بغداد میں گزارتا۔ اب جبکہ اس کا انتقال ہوچکا تھا لیث چاہتا تھا کہ موت کی خبر بغداد بھی پہنچادی جائے اور وہاں کے کاروبار کو اپنے قبضے میں لے لیا جائے لیکن جب تک بڑا بھائی یعقوب نہ آجاتا ہر کام مشکل تھا۔

حجاج کا ایک قافلہ جو اصفہان جارہا تھا اہواز کے باہر ٹھہرا تو اہواز کے لوگ ان کی زیارت کو گئے اور ان سے معلوم کیا کہ اہواز کے حاجی کب تک واپس آرہے ہیں۔ اصفہانی حجاج نے بتایا کہ اہواز کے حاجیوں پر راہ میں ڈاکا پڑگیا اور بہتوں کو قتل کرکے ان کے سامان کو لوٹ لیا گیا، اب وہ پریشان حال لوگ آٹھ دس دن میں یہاں آجائیں گے۔ لیث کا دل دھک دھک کرنے لگا اور وہ اپنے دل میں اپنی ماں اور بھائی کی زندگی کی دعائیں مانگنے لگا۔

چودھویں دن اہواز کے حجاج بھی آگئے لیکن ان میں اس کی ماں اور یعقوب نہیں تھے۔ قافلے والوں نے بتایا کہ قزاقوں کے حملے میں لیث کی ماں تو ماری گئی لیکن بھائی کو زندہ اغوا کرکے لے گئے ہیں اور اب پتا نہیں کہ وہ زندہ بھی ہے یا مرگیا۔

لیث کے لیے یہ بڑی پریشان کن اور حوصلہ شکن خبر تھی۔ باپ کی موت، ماں کے قتل اور بھائی کے اغوا نے اسے بہت فکرمند اور ملول کردیا۔ جب دوستوں کو ان حالات کا علم ہوا تو انہیں یقین ہوگیا کہ اب شکار زیادہ دن دور اور لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ ان لوگوں نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہمدردی اور خیرخواہی جتانا شروع کردی۔ لیث کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان میں اس کا کون سب سے زیادہ ہمدرد اور مخلص ہے لیکن ان میں یونس سب سے زیادہ شاطر اور چالاک نکلا۔ یونس، لیث سے چھ سات سال بڑا تھا۔ اس کا باپ قاضی تھا اور اسی وجہ سے اس کا حلقہ احباب وسیع تھا۔ اس کے جاننے والوں میں ہر قسم کے لوگ تھے۔ یہ لوگوں کی جھوٹی سچی سفارشیں کرکے اپنے باپ سے کام کروادیا کرتا تھا اور ان سفارشوں کے عوض ان سے رقمیں وصول کرلیتا تھا لیکن یہ کام تھا بہت تھکا دینے والا۔ کبھی کبھی باپ ناراض بھی ہوجاتا اور سفارش پر کام کرنے سے انکار کردیتا تھا۔ حالانکہ وہ سفارشوں کی اجرت پہلے ہی وصول کرلیا کرتا تھا۔ ان حالات میں یونس کو بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ کیونکہ باپ سفارش پر کام نہ کرتا اور سفارش کا پیشگی معاوضہ ادا کرنے والے اسے تنگ کرنا شروع کردیتے۔ اس کا آخری نتیجہ یہ نکلتا کہ بدنامی اور رسوائی سے یونس کے کاروبار سفارش کو دھکا لگتا۔

ان حالات میں یونس کو یہ معلوم ہوا کہ اہواز کے ایک بڑے تاجر کا انتقال ہوچکا ہے اور اس کے پسماندگان میں ایک ناتجربے کار نوجوان کے سوا کوئی بھی نہیں تو اس کی مارے خوشی کے باچھیں کھل گئیں۔ وہ لیث سے ملا، اپنا تعارف کروایا اور اسے یقین دلایا۔ ”پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، مجھے اپنا بڑا بھائی ہی سمجھو اور اپنے دکھ درد، خوشی اور غم میں برابر کا شریک تصور کرو۔“

پھر جب یہ معلوم ہوا کہ لیث کی ماں رہزنوں کے ہاتھوں ہلاک ہوگئی اور لیث کا بڑا بھائی اغوا کرلیا گیا تو یونس کو یہ یقین ہوگیا کہ اب یعقوب کی واپسی ناممکن ہے اور ڈاکو اسے قتل کرچکے ہوں گے، گویا اب میدان صاف تھا اور لیث اس کے قابو میں تھا کہ جس طرح چاہے اس کا شکار کرے۔

لیث اب کسی کا انتظار نہیں کرسکتا تھا۔ مرحوم باپ کا کاروبار اسے خود سنبھالنا تھا۔ یوں بھی گھر میں بے کار بیٹھنا ایک مشکل کام تھا۔ گھر میں ایک غلام تھا سو وہ بھی بوڑھا، معذور جو کام کرنے کے بجائے کھانستا رہتا۔ شام اور رات کے سناٹے میں تنہائی بڑی کرب ناک ہوجاتی۔ کچھ دنوں تک مطلبی دوستوں نے راتوں کو اپنی ہاؤ ہو سے زندہ رکھنے کی کوشش کی مگر جب ان کے درمیان قاضی کا بیٹا یونس آگیا تو وہ آہستہ آہستہ رفوچکر ہونے لگے۔ یونس نے اپنی اہمیت اور ضرورت کو ثابت کرنے کے لیے ایک ایک، دو دو دن کے وقفے سے آنا شروع کیا اور جب آتا تو اپنی بے پناہ چاہت اور خلوص کا کچھ اس طرح اظہار کرتا کہ لیث کا غلام تک اس کے خلوص کا معتقد ہوجاتا اور وہ یونس سے درخواست کرتا کہ ”لیث کا دل بہلانے کے لیے تم روزانہ آجایا کرو۔“

لیث اور غلام کی بار بار درخواست پر یونس نے پابندی سے آنا شروع کردیا۔

رات کے سناٹے میں بوڑھے غلام کی بار بار کھانسنے

کی آواز سے یونس تنگ آگیا۔ لیث سے کہا۔ ”لیث! کیا اس گھر میں کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں اس بوڑھے غلام کو ڈال دیا جائے اور اس کی منحوس کھوں کھوں سے نجات مل سکے؟“

لیث نے جواب دیا۔ ”یہ مکان نہیں حویلی ہے اور اس میں دس غلام اس طرح رہ سکتے ہیں کہ ان کی آوازیں ہمارے کانوں تک نہ آئیں لیکن میں نے اس غلام کو اس لیے خود سے قریب رکھا ہے کہ رات کی تنہائی اور سناٹے میں اس کی کھوں کھوں ہی بڑی غنیمت معلوم ہوتی ہے۔“

یونس طنزاً ہنس دیا، بولا۔ ”لیث! یا تو تو ضرورت سے زیادہ بھولا ہے یا پھر انتہائی بدمذاق کہ نوجوان اور دولت مند ہونے کے باوجود تو رات کی تنہائی اور سناٹے کی وحشت کا علاج اپنے بوڑھے غلام کی کھوں کھوں میں تلاش کررہا ہے، اب تو مجھے یہ محسوس ہورہا ہے کہ میرا محض دوستی کی حد میں رہنا تیرے حق میں بڑا ظلم ہوگا۔ مجھے تیری اتالیقی کے فرائض پورے کرنا ہوں گے اور میں تجھے یہ بتاؤں گا کہ آدمی دولت مند ہو اور نوجوان بھی ہو اور ان دونوں خصوصیات کے ساتھ اپنی مرضی کا مالک اور مختار بھی ہو تو اس کو اپنی زندگی کس طرح گزارنا چاہیے۔“

ان دونوں کی گفتگو غلام نے بھی سن لی، وہ دور ہی دور سے بولا۔ ”اگر مجھے اپنے آقا زادے کے لیے حویلی کے باہر چلا جانا پڑے تب بھی خوش ہی نظر آؤں گا۔ ویسے کھانسی کا مرض اللہ کی طرف سے ہے اور اس کے لیے مجھے شرمندہ نہیں کرنا چاہیے۔“

یونس نے بڑی بے مروتی سے کہا۔ ”یہ کیا بک بک لگا رکھی ہے اس وقت اپنے منحوس وجود کو میری نظروں سے دور لے جا۔“

لیث کو یونس کا تحقیر آمیز لہجہ ناگوار گزرا لیکن غلام کے مقابلے میں یونس آزاد اور افضل تھا۔ اس نے غلام سے کہا۔ ”آج سے تو میرے قریب نہیں رہے گا۔ جا حویلی کے اس حصے میں چلا جا جو غلاموں اور خدمت گاروں کے لیے وقف ہے۔“

غلام چلا گیا لیکن اس کے بھاری بھاری قدم یہ بتارہے تھے کہ وہ اپنی ذلت پر بہت افسردہ اور ملول ہے۔

غلام کے چلے جانے کے بعد یونس نے کہا۔ ”غلاموں کو اپنے ذاتی معاملات سے اگر لاعلم نہیں تو دور ضرور رکھنا چاہیے۔“

لیث نے عاجزی سے جواب دیا۔ ”یونس! میں تیری اتالیقی میں آدابِ زندگی سیکھ لوں گا۔“

یونس نے کہا۔ ”کل سے اس حویلی میں شراب اور شباب کو یکجا کردیا جائے گا اور یہی وہ طریقہ ہے جس سے تیری تنہائی اور رات کے سناٹے کا علاج ہوجائے گا۔“

لیث کو اپنے باپ کی یاد آئی۔ اس نے اپنے نفس اور متعلقین کی ضروریات کو مار کر یہ دولت اکٹھا کی تھی۔ اس نے کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا تھا اور وہ اپنی دونوں بیویوں کے علاوہ کسی تیسری عورت کا خیال تک نہ لایا تھا۔ لیث کو ذرا تامل ہوا، جھجکتے ہوئے کہا۔

”شراب اور شباب؟ یہ کہاں سے آئیں گے انہیں کون اور کیوں لائے گا؟“

یونس نے لیث کے داہنے گال پر ہلکی سی چپت رسید کی، مسکراتا ہوئے بولا۔ ”سادہ لوح نوجوان! یہ دونوں چیزیں میں لاؤں گا اور تیرے لیے لاؤں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ تیرا باپ بخیل تھا اور بخیلی لعنت ہے، میں تجھے اسے اس لعنت سے دور بلکہ محفوظ رکھوں گا۔ میں نے تیرے غلام کو اسی لیے یہاں سے بھگادیا ہے کہ اس نے تیرے باپ کے زمانہ بخل کو دیکھا ہے، اس لیے اگر اس کے سامنے میں تیری تنہائی اور وحشت کے تیر بہدف علاج کا ذکر کرتا تو وہ برداشت نہ کرپاتا اور میرے بارے میں معلوم نہیں کیا رائے قائم کرتا۔“

لیث نے پوچھا۔ ”اور اس میں رقم کتنی خرچ ہوگی؟“

یونس نے جواب دیا۔ ”ایسا سوال نہیں کر۔ اس وقت میں تیرا طبیب ہوں اور تیری وحشت اور تنہائی کا علاج کررہا ہوں۔ جان ہے تو جہان ہے اور اگر اس جان کو خفقان کا روگ لگ گیا تو ساری دولت دھری کی دھری رہ جائے گی اور تیرا غلام یا پڑوسی مزے کریں گے۔“ لیث چپ ہوگیا۔

دوسرے دن سرِشام ہی یونس خچر پر شراب اور آلاتِ شراب لے کر حویلی میں داخل ہوا۔ شراب کی بو فضا میں پھیل گئی۔ اسے خچر والے کی مدد سے حویلی کے ایک بڑے کمرے میں پہنچادیا گیا۔ یونس نے شراب اور خچر کے کرایے کا ایک حبہ بھی لیث سے نہیں لیا اور پھر اسی گھوڑے سے واپس چلا گیا، جس پر بیٹھ کر حویلی میں داخل ہوا تھا۔ جاتے جاتے کہتا گیا۔

”لیث میرے دوست، مایوس نہ ہوجانا۔ شراب تو آگئی اب شباب کی فکر میں جارہا ہوں۔“

یونس چلا گیا اور لیث شباب کی خیالی لذتوں کے مزے لینے لگا۔ یونس کی واپسی میں جتنی دیر ہورہی تھی، لیث کی آتشِ شوق شدت اختیار کرتی جارہی تھی۔

عشا کی اذان نے اسے چونکا دیا اور وہ اپنی سفلہ خواہشات کی موجزنی پر خجل ہوگیا۔ وہ حویلی میں واپس آگیا اور اپنے باپ کی دولت کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ درہم ودینار کے انبار میں اسے اپنے باپ کی روح چوکسی کرتی محسوس ہورہی تھی۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ اس کے باپ نے یہ درہم ودینار کس کے لیے جمع کیے تھے۔ کیا مرحوم باپ کی نفس کشی جائز تھی۔ درہم دینار کا مصرف کیا ہے؟ کیا انسان کو خدا کی نعمت سے لطف اندوز نہیں ہونا چاہیے؟ اس وقت وہ متضاد کیفیات میں جلا تھا۔

اسی وقت حویلی کے صدر دروازے میں کسی گاڑی کے پہیوں اور گھوڑے کی ٹاپوں کا شور بلند ہوا۔ یہ دبے قدموں باہر نکلا۔ اس نے دور صدر دروازے کی چھوٹی سی شاہراہ پر ایک گاڑی کو اپنی طرف آتے دیکھا، گاڑی کے آگے ایک گھوڑا تھا۔ گاڑی اور گھوڑا دونوں ہی اس سے دور دور آکر رک گئے۔ اپنے قدوقامت سے یونس اندھیرے ہی میں پہچانا جارہا تھا۔ اس نے دور ہی سے آواز دی۔

”لیث! روشنی کر، کہیں ایسا نہ ہو اندھیرے میں پائے یار میں موچ آجائے۔“

لیث بھاگ کر اندر آگیا اور ایک کافوری شمع دان ہاتھ میں لیے باہر آگیا۔ یونس نے اپنے گھوڑے کو ایک ستون سے باندھ دیا اور آگے بڑھ کر شمع دان لیث کے ہاتھ سے لے لی، بولا۔ ”میں شمع دان سنبھالتا ہوں تو گاڑی میں سے اس رشکِ حور کو اتار لے کیونکہ اسے میں تیری امانت سمجھ کر لایا ہوں۔“

لیث کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ لرزتا کپکپاتا گاڑی کے پاس پہنچ گیا۔ گاڑی بان گاڑی سے کود کر پیچھے آگیا اور لیث ہمت کر کے گاڑی کے دروازے پر کھڑا ہوگیا۔ اس کے پیچھے پیچھے یونس بھی شمع دان لیے چل رہا تھا اور اب بھی وہ اس کے دائیں طرف کاندھے سے لگ کر کھڑا ہوگیا، سرگوشی میں بولا۔ ”دیکھ، اس پری پیکر کو اگر تو نے اپنے مال وزر سے خود پامال کیا تو کوئی بات نہ ہوگی۔ تجھے پورا پورا موقع حاصل ہے کہ اسے اپنے دل نشیں انداز اور شائستہ طور طریق سے محبت کرنے پر مجبور کردے۔“

لیث نے گاڑی میں منہ ڈال کر مودبانہ گزارش کی۔ ”اے رشکِ مہوشاں! لیث ابن مغیث تجھے خوش آمدید کہتا ہے۔ میرا ہاتھ پکڑ اور نیچے آجا تاکہ میں تیری راہ میں دیدہ ودل کا فرش بچھادوں اور تو اس پر بصد ناز وادا محوِ خرام ہو۔“

یونس اس طرزِ تکلم سے بہت خوش ہوا۔ گاڑی کے اندر سے ایک ہاتھ نمودار ہوا اور اس نے لیث کا ہاتھ پکڑلیا۔ دوسرے ہی لمحہ گاڑی کے اندر سے ایک سترہ، اٹھارہ سالہ حسین لڑکی لہراتی بل کھاتی اتر پڑی۔ لیث نے صدائے مرحبا بلند کی اور لڑکی نے لیث کو پُرشوق نظروں سے دیکھ کر ایک تبسم بکھیر دیا۔

لیث نے دوبارہ تشبیہ اور اشعار کا سہارا لیا۔ اس کی کمر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”جب تک میں نے تجھے دیکھا نہ تھا عالم خیال میں تیری شکل وصورت اور سراپا کے نقشے بنا بگاڑ رہا تھا لیکن اب جبکہ تو میرے پہلو میں کھڑی ہے اور میں تجھے دیکھ سکتا ہوں تو اچانک محسوس ہوا کہ میں نے عالم خیال میں حسنِ امکاں کا جو بھی تصور کیا تھا وہ ناقص اور ناتمام تھا۔ تیری مثال تو اس آفتاب جیسی ہے جو نظروں کے سامنے ہونے کے باوجود دیکھا نہیں جاسکتا۔“

لڑکی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اس طرح ابھری جس طرح صبح وشام اُفق پر شفق پھوٹتی ہے۔ اس نے نہایت مترنم آواز میں کہا۔ ”ہنوز میں تیری بابت بس اتنا ہی جانتی ہوں کہ تو اہواز کے تاجر حمدون مغیث کا بیٹا ہے مگر تو نے جس شائستہ اور مرصع انداز میں میری پذیرائی کی ہے اس نے میرا دل تیرے حوالے کردیا ہے اب میں تیری بے دام بندی ہوں۔“

یونس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ سادہ لوح لیث اتنے شاندار طریقے سے اس کی لائی ہوئی نازک اندام کی پذیرائی کررہا تھا کہ وہ لیث سے اس کی توقع ہی نہیں کرسکتا تھا۔

لیث اور لڑکی کے آگے آگے یونس روشنی دکھاتا چل رہا تھا اور لیث لڑکی کی کمر میں ہاتھ دیے یوں سنبھل سنبھل کر چل رہا تھا گویا لڑکی نہیں آبگینہ تھی کہ ذرا سی اونچ نیچ اسے چورچور کردے گی۔

لڑکی کے لیے ایک کمرا پہلے ہی سے سجا دیا گیا تھا۔ لیث اسے ہمراہ لیے اس کے بجائے کمرے میں چلا گیا۔ یہاں دیواروں پر حسین منبت کاری کی ہوئی تھی اور کھڑکیوں پر خوب صورت رنگ برنگے مشجر پردے لٹکے ہوئے تھے اور پورا کمرا پنج شاخہ قندیلوں سے جگ مگ جگ مگ کررہا تھا۔ ایک طرف کونے میں شراب کا مٹکا اور آلات شراب رکھے ہوئے تھے۔ چھوٹی چھوٹی چوکور طاقوں میں خوشبویات سلگ رہی تھیں اور ان کی تیز خوشبو سے پورا کمرا مہک رہا تھا۔ ایک طرف کھونٹی پر تسبیح لٹک رہی تھی۔ کمرے

کے دو کناروں پر، ایک دوسرے کے بالمقابل دو تخت بچھے ہوئے تھے۔ ان کے پائے منقش تھے اور دونوں تختوں پر موٹے موٹے گدے تھے جن میں کھجور کی چھال بھردی گئی تھی۔ ان گدوں پر یمن کی دیدہ زیب اور قیمتی چادریں بچھی ہوئی تھیں۔ تختوں کے سرہانے گاؤتکیوں کے علاوہ کئی کئی ذرا کم دبیز تکیے رکھے تھے۔

اسی لمحے انہیں محسوس ہوا جیسے کوئی کمرے میں جھانک رہا ہے۔ یونس نے پوچھا۔ ”کون ہے؟“

جب وہ قریب آگیا تو لیث نے سختی سے محاسبہ کیا۔ ”کیا تو ابھی کمرے میں جھانک رہا تھا؟“

غلام نے کھانستے ہوئے جواب دیا۔ ”ہاں میں جھانک رہا تھا کیونکہ جس کمرے میں لڑکی کے ساتھ دو نوجوان پہلے سے موجود ہوں وہاں جھانک لینا جرم تو نہیں ہے۔“

چونکہ پانی نشیب میں مر رہا تھا اس لیے لیث نے خاموشی اختیار کی۔ کچھ تامل کے بعد پوچھا۔

”لیکن تو ہمارے پاس کیا لینے آیا تھا۔“

غلام کو اب بھی کچھ تامل تھا لیکن جب لیث نے سخت لہجہ اختیار کیا تو غلام نے جواب دیا۔ ”آقا زادے! تو نہیں جانتا کہ تیرے باپ اور میرے آقا نے یہ دولت کتنی مشکل اور نفس کشی کے بعد جمع کی تھی، آج جب میں نے اس لڑکی کو اندر داخل ہوتے دیکھا تو میں پریشان ہوگیا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میرے آقا کا مال وزر پھول کی طرح ہے جس کو یہ لڑکی شہد کی مکھی کی طرح چوس جائے گی۔“

لیث نے سختی سے کہا۔ ”میرا باپ نہیں جانتا تھا کہ دولت خدا کی نعمت ہے، اس کو اس نعمت سے لطف اندوز ہونا چاہیے تھا مگر اس نے کفرانِ نعمت کیا اب میں اس غلطی سے بچنا چاہتا ہوں۔“

غلام نے رقت سے عرض کیا۔ ”اگر میرے آقا نے کفرانِ نعمت نہ کیا ہوتا تو آج یہ دولت تیرے اختیار اور تصرف میں نہ ہوتی۔“ پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کچھ دیکھنے کی کوشش کرنے لگا، بولا۔ ”میری تیز حس یہاں آقا کی روح کو محسوس کررہی ہے۔ میں اسے اچھی طرح بے چین اور مضطرب سائے کی طرح لرزاں وترساں محسوس کررہا ہوں۔“

لیث نے جواب دیا۔ ”اگر تو میرے باپ کی روح کو واقعی یہیں کہیں محسوس کررہا ہے تو، تو اس کے حضور مودبانہ گزارش کر کہ میں اپنے کمرے میں جارہا ہوں۔ اگر میری عدم موجودگی میں میرے باپ کی روح تجھ پر ظاہر ہوجائے اور کسی قسم کے دکھ یا افسوس کا اظہار کرے تو میری طرف سے کہہ دینا کہ میں نہ تو کمزور ہوں نہ بوڑھا۔ میں تو جوان ہوں اس لیے صبر نہیں کرسکتا۔ جب میں تیری عمر کو پہنچوں گا تو یہ میرا وعدہ ہے کہ میں بھی بخل اختیار کرلوں گا۔“

یونس کمرے سے نکل کر آواز دینے لگا۔ ”لیث! تو کیا کرنے لگا؟ تو کیسا عاشق ہے جو اپنی محبوبہ کو زحمت انتظار دے رہا ہے۔“

لیث فوراً ہی کمرے میں واپس آگیا۔ لڑکی نے مسکرا کر پوچھا۔ ”کیا باہر کوئی مجھ سے زیادہ لطیف اور خوبرو تجھ سے ہم کلام تھا جو باہر نکلتے ہی مجھے بھلا بیٹھا؟“

لیث نے لڑکی کا ہاتھ پکڑلیا اور اسے پہلے تو دونوں آنکھوں پر رکھا پھر اسے چوم کر رخساروں پر پھیرنا شروع کیا، بولا۔ ”حاشا وکلا، میں نہیں جانتا کہ اس دنیا میں کوئی تیرا مثیل بھی ہے۔ میں تو اپنے غلام سے ہم کلام تھا۔ جو بوڑھا بھی ہے اور معذور بھی اور دن رات کھانستے رہتا جس کا محبوب مشغلہ ہے۔“

لڑکی نے کہا۔ ”سبحان اللہ! غلام اور پھر تیرے بیان جیسا غلام بھی کوئی ایسی ہستی ہے جس سے یوں انہماک سے باتیں کی جائیں۔“

یونس نے لیث کا ساتھ دیا، بولا۔ ”اے رشکِ نازنیناں! لیث کو معاف کردے کیونکہ ابھی تو یہ کتاب کے سادے ورق کی طرح ہے جس پر میرے تیرے کلمات شوق اور حرکات ناز وادا سے گل کاریاں کی جائیں گی۔ ابھی تو یہ تیرے کلک شوق کا تشنہ ہے۔ میں چاہتا ہوں تو معاملاتِ عشق ومحبت میں اسے اتنا کامل واکمل کردے کہ اسے جو بھی دیکھے اور اس سے ہم کلام ہو تو اس کی زبان سے بے ساختہ کلمات داد وتحسین ادا ہونے لگیں۔“

لڑکی نے جواب دیا۔ ”خیر اس بار تو میں اسے معاف کرتی ہوں لیکن بار بار ہرگز نہ معاف کروں گی۔“

لیث اور تو کچھ نہ کرسکا فرطِ شوق اور وفورِ ندامت سے اپنا سر لڑکی کے قدموں میں رکھ دیا۔

☆☆☆

یونس اس کا استاد اور رہنما تھا۔ وہ ان دونوں کو تنہا چھوڑ کر باہر آگیا لیکن ذرا سی دیر کے لیے کمرے میں دوبارہ داخل ہوا اور دونوں سے کہا۔ ”میں باہر موجود ہوں آواز دے کر بلایا جاسکتا ہوں۔“ پھر لڑکی سے کہا۔ ”خنسا! میں لیث سے یہ نہ سنوں کہ تو نے سرد مہری دکھائی ہے۔ میں

تجھے اس غرض سے لیث کے پاس لایا ہوں کہ اس کی تنہائی اور اداسی کا اس سے بہتر علاج ممکن نہیں تھا۔" اور لیث سے کہا۔ "اگر میں فلسفی ہوتا تو اس دنیا کو یہی درس دیتا کہ دنیا ایک غمکدہ ہے اور انسان مجسمہ آلام، اس لیے اس غمکدے اور زندگی کے رنج والم کو اس طرح دور کیا جائے کہ ہاتھوں میں مشروب اور آغوش میں ہوش ربا شباب اور پری پیکر اور زاہد شکن مستی۔ اب تم دونوں اپنے اپنے غموں کا علاج کرو، میں تم دونوں سے قدرے دور نغمہ وسرود سے دل بہلاتا ہوں۔ اگر میرے گانے کی آواز تم دونوں کے کانوں تک آئے تو تم دونوں مجھے معاف کر دینا۔ کوئی کسی طرح دل بہلاتا ہے اور کوئی کسی طرح۔"

لیث، یونس کے ایثار سے بڑا متاثر تھا، اس نے سوچا یونس اگر چاہتا تو اپنے لیے بھی کوئی لڑکی لا سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور ساری شادمانی اور ساری خوشی اس کی آغوش میں ڈال دی۔ لیث نے لمحوں میں یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ یونس کو اس کا بدلہ ضرور دے گا۔ اس نے یونس کو اپنے بھائی یعقوب کا درجہ دے دیا۔ جس کا باپ کے ترکے میں حصہ تھا۔ اس نے سوچا کہ جب وہ یونس کے سامنے ایک دم یہ اعلان کرے گا کہ اس نے یونس کو اپنا حقیقی بھائی تسلیم کر کے اسے اپنے باپ کے ترکے کا حصے دار بنا دیا ہے تو وہ کس قدر خوش ہوگا۔

لڑکی نے پوچھا۔ "تو سوچنے کیا لگا؟ اگر میری موجودگی بھی تیری فکروں کو دور نہ کر سکی تو میرا یہاں مزید رکنا فضول ہے۔"

لیث گھبرا کر ہوش میں آ گیا، بولا۔ "اس وقت تو میں تیرے ہی خیال میں گم تھا۔ یونس نے تجھے کس نام سے مخاطب کیا تھا؟"

لڑکی نے جواب دیا۔ "خنسا کیونکہ میرا نام ہی یہی ہے۔"

لیث نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "میں اس شخص کی کیا تعریف کروں جس نے تیرا نام خنسا رکھا تھا۔ خنسا ہرنی کو کہتے ہیں اور میں تیری آنکھوں میں ہرنی ہی جیسی مستی دیکھ رہا ہوں۔"

خنسا نے شرما کر ایک ادا سے کہا۔ "سبحان اللہ، اگر یہی حال رہا تو، تو ایک نہ ایک دن شاعری بھی کرنے لگے گا۔"

لیث نے اسے اپنی آغوش میں بھینچ لیا اور اس کی زلفوں کی خوشبو سونگھنے لگا۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"کاش یہ لمحات یوں ہی رک جائیں، کاش یہ وقت ٹھہر جائے۔"

خنسا کا منہ اس کے سینے میں دبا ہوا تھا۔ اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ "اگر تیری دعا قبول ہو جائے اور لمحات رک جائیں یا وقت ٹھہر جائے تو اس سے ہم دونوں کو کیا فائدہ پہنچے گا؟ لطف اور سرخوشی تو ان لہروں میں ہے جو اس وقت ہم دونوں کے وجود میں مچل رہی ہیں۔ ٹھہراؤ موت ہے اور کم از کم میں تو موت کا خیال تک ناپسند کرتی ہوں۔"

اسی لمحے یونس کے گانے کی آواز بھی گونجنے لگی۔ یونس کی آواز میں سوز تھا۔

میں پینا چاہتا ہوں لیکن محتسب روکتا ہے کہ یہ حرام ہے

میں گانا چاہتا ہوں لیکن منہ بند کر دیا گیا کہ گانا ممنوع ہے

میں مہ وشوں کی تصویریں دیکھنا چاہتا ہوں لیکن وہ کہتا ہے کہ یہ اصنام پرستی ہے، اب کیا کروں؟

اے محتسب آ، میں تجھے بتاتا ہوں کہ مے نوشی پر پابندی لگا کر تو نے

مے نوشوں کو عاجز اور مجبور تو نہیں کر دیا۔ وہ اب بھی پیتے ہیں

اپنے محبوب کے آہو چشم مے کدے سے پُرکیف نظاروں سے

صہبا بدوش ہواؤں سے، جھومتے لڑکھڑاتے بھورے بادلوں سے

اے گانے کو ممنوع قرار دینے والے! تو کدھر چلا گیا؟

ذرا میرے پاس تو آ۔ میں تجھے چڑیوں کی چہکار سناؤں

ایسی چہکار جس میں آواز بھی ہے اور ساز بھی
بارش کی رم جھم سن کیا اس میں گانے کا مزہ نہیں؟
دریاؤں کی گنگناہٹ میں موسیقی کا ترنم ہے
لوگو! اس غمکدہ حیات کو مے کدے میں بدل ڈالو
اور بشریت کے شر اور حزینے کی آگ کو
اپنے محبوب کے آب وصال سے بجھا ڈالو
سوچو مت وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا
دنیا سوچنے کی، کچھ کر گزرنے کی جگہ ہے
سوچنے کی بہترین جگہ قبر ہے وہاں قیامت تک سوچتے رہنا۔"

یونس کی آواز اور کلام کی معنی آفرینی نے لیث اور خنسا کو یکساں متاثر اور وارفتہ کیا۔ لیث کے دل میں شراب اور خنسا کے بارے میں جو ذرا سا تکلف اور خیال تھا، تو وہ اب بالکل دور ہو چکا تھا۔ لیث مہمیز لگائے ہوئے گھوڑے کی طرح بگٹٹ چل پڑا اور خنسا کے عشرت کدے سے جی بھر کے سیر ہونے لگا۔ ایک بار نہیں، کئی بار، لیکن خنسا میں لیث جیسا جوش و خروش نہیں تھا۔ اگر یونس کی آواز اور پُر معنی کلام نے ان دونوں کے درمیان مداخلت نہ کی ہوتی تو اس وقت خنسا کا محور و مرکز محض لیث ہی ہوتا لیکن یونس نے لیث کے اثر کو بالکل زائل تو نہیں کم ضرور کر دیا تھا۔ خنسا جب تک لیث کے اختیار اور تصرف میں رہی یونس کے خیال سے پیچھا نہیں چھڑا سکی۔ خنسا کے اس انتشار کو لیث بھی محسوس کرتا رہا لیکن اس کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ وہ یونس کے بارے میں سوچ رہی ہے اور لیث کی آغوش میں بھی یونس کی آغوش کا مزہ لیا جا رہا ہے۔

صبح، جب تینوں یک جا ہوئے تو لیث کا مارے خوشی اور احساس احسان مندی کے برا حال تھا۔ وہ جب بھی یونس کی طرف دیکھتا اس کی آنکھوں سے احساس شکر گزاری اور جذبہ احسان مندی صاف صاف جھلکنے لگتا لیکن جب وہ خنسا کی طرف دیکھتا تو اس کی آنکھوں میں شوق اور محبت کے جذبات سمٹ آتے۔ یونس ان دونوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ وہ بار بار یہی سوالات کرتا۔

”لیث! سچ بتا، تجھے خنسا کیسی لگی؟ میرے انتخاب کی داد دے گا یا نہیں؟“

خنسا سے کہتا۔ ”لیث کی سادگی اور ناتجربے کاری میں اس کا خلوص اور جذبہ بے ریا کو تو نے بھی محسوس کر لیا ہوگا؟ اب تو لیث کی ہے جب تک لیث تیری ضرورت محسوس کرے۔“

لیث نے کہا۔ ”یونس! میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ تجھے اپنے بڑے بھائی یعقوب کی جگہ تصور کروں......“

یونس نے فوراً لقمہ دیا، بولا۔ ”خبردار ایسی بات نہ کہہ، جس پر تو عمل نہ کر سکے اور جو مستقبل میں تیری پریشانی کا باعث بن جائے۔“

لیث نے کہا۔ ”تیرا وجود میرے لیے وجہ سکون اور مسرت ہے۔ تو نے یہ کس طرح سمجھ لیا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے اس پر عمل نہیں کر سکوں گا اور یہ کہ تو مستقبل میں کسی طرح میری پریشانی کا باعث بن سکتا ہے۔“

یونس نے جواب دیا۔ ”تو نے اس پر بھی غور کیا کہ اگر تو نے مجھے اپنے بڑے بھائی یعقوب کی جگہ تصور کر لیا تو اس سے کیا کیا لازم آ جائے گا؟“

لیث نے کہا۔ ”ہاں میں نے اس پر غور کر لیا ہے۔ میں اپنے باپ کے ترکے میں تجھے بھی شامل کر لینا چاہتا ہوں۔ میں بھائی یعقوب کا حصہ تجھے دینا چاہتا ہوں۔“

یونس نے حیرت سے منہ بنا کر کہا۔ ”کیا واقعی؟ کیا تو جو کچھ کہہ رہا ہے، سچ ہے اور بقائمی ہوش و حواس کہہ رہا ہے؟ کہیں رات کی شراب کا سرور اب بھی تیرے دل و دماغ پر طاری نہیں ہے؟“

لیث نے خنسا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں جو کچھ کہہ رہا ہوں خنسا اس کی گواہ رہے گی اور پھر تیرا باپ تو اہواز کا قاضی ہے اسے آج ہی بلوا لے اور اس سے اثاثہ تقسیم کروا لے۔“

یونس نے افسوس سے کہا۔ ”لیکن میرا باپ میرے خلاف ہے اگر میں اسے بلاؤں گا تو وہ تجھے میرے خلاف ورغلانا شروع کر دے گا اور پھر یہ کہ میں نے جو کچھ کہا مذاق میں کہا ہے تو اس قدر سنجیدہ کیوں ہو گیا؟“

لیث نے جواب دیا۔ ”لیکن میں نے جو کہا، مذاق میں نہیں، سنجیدگی سے کہا ہے اور میں اس پر عمل کر کے رہوں گا۔“

یونس نے سمجھایا۔ ”ایسا نہ کر لیث کیونکہ اس سے یہ ڈر پیدا ہو جاتا ہے کہ کل ہماری دوستی بھی خطرے میں پڑ جائے گی اور میں اپنی دوستی کو مال و زر پر مقدم رکھنا چاہتا ہوں۔“

لیث نے جواب دیا۔ ”دوستی بہرحال دوستی ہے لیکن بھائی کا رشتہ اس دوستی کو اور زیادہ مضبوط اور مستحکم کر دے گا۔“

یونس ہنس دیا، بولا۔ ”ارے تو، تو بہت جذباتی ہو گیا۔ مجھے تیرا بڑا بھائی بننے میں نہ تو کوئی اعتراض ہے اور نہ تامل لیکن بعد میں جو بھی سنے گا یہی کہے گا کہ یونس نے لیث کو ورغلا کر اس کی آدھی دولت پر قبضہ کر لیا۔“

لیث نے کہا۔ ”مجھے دنیا کی کوئی پروا نہیں۔ جب میں اپنی خوشی سے تجھے اپنا بھائی بنا رہا ہوں تو کسی کو اعتراض کا کیا حق؟“

یونس نے متامل لہجے میں کہا۔ ”اس پر اچھی طرح سوچ لے پہلے۔“

خنسا بولی۔ ”جب یہ اپنی خوشی سے تجھے اپنا بھائی بنا رہا ہے تو تجھے اعتراض کیوں ہے؟“

یونس نے جواب دیا۔ ”میں زمانے سے ڈرتا

ہوں۔“

لیث نے اصرار کیا۔ ”میں آج ہی تیرے باپ کو بلوا کر حصے بخرے کرتا ہوں۔“

یونس نے فوراً منع کیا۔ ”نہیں، نہیں، میرے باپ کو ہرگز نہ بلانا۔ ان دنوں وہ میرا سب سے بڑا مخالف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں خلق خدا کی خدمت کیوں کرتا ہوں۔ وہ یہاں آتے ہی مجھے بھی برا بھلا کہے گا اور تیری بھی خبر لے لے گا۔“

لیث نے خنسا سے پوچھا۔ ”اب تو ہی بتا، مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

خنسا نے جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے ابھی تم دونوں کچھ عرصہ بھائیوں کی طرح رہو اور پھر جو کچھ آپس میں طے کیا ہے اس پر خاموشی سے عمل کر ڈالو۔“

لیث نے کہا۔ ”میں اس پر بھی تیار ہوں۔“

لیکن یونس نے اس خیال کی مخالفت کی، بولا۔ ”یہ بھی اچھی تجویز ہے لیکن اس میں فسخ معاہدہ کا امکان ہر وقت موجود رہتا ہے۔ جب ہم دونوں بھائیوں کی طرح ساتھ ساتھ رہنے لگیں گے تو ہمارے حاسد بھی پیدا ہو جائیں گے اور پورے زور و شور سے ہم میں نفاق ڈالنے کی کوششیں شروع کر دیں گے اور اس وقت معلوم نہیں ہم دونوں میں کون بہک جائے اور آہستہ آہستہ بے زاری محسوس کرنے لگے۔“

لیث نے کہا۔ ”تب پھر ہم تینوں بغداد چلیں کیونکہ میرے باپ کا بغداد میں بھی کاروبار تھا۔ وہاں میری سوتیلی ماں رہتی ہے۔ پتا میرے پاس ہے وہاں ہم دونوں ایک دوسرے کے بھائی بن کر رہیں گے۔“

یونس نے پوچھا۔ ”اگر بغداد چلیں گے تو اہواز کی جائداد اور دولت کا کیا ہوگا؟“

لیث نے جواب دیا۔ ”یہاں کی جائداد فروخت کر کے مال و زر اپنے ساتھ لے چلوں گا۔“

اس تجویز سے یونس بہت خوش ہوا، بولا۔ ”یہ بڑی اچھی تجویز ہے۔ اب میں خود بھی اہواز سے اکتا گیا ہوں۔“

خنسا نے پوچھا۔ ”اور میرا کیا بنے گا؟“

لیث نے بڑی محبت سے جواب دیا۔ ”خنسا! تو تو میری جان ہے جہاں میرا جسم ہوگا وہیں میری جان بھی ہوگی۔“

یونس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”تب پھر یہ طے ہو گیا کہ اہواز کی جائداد اور کاروبار کو ختم کر کے مال و زر بنا لیا جائے اور پھر ہم تینوں بغداد نکل چلیں۔“

لیث بھی کھڑا ہو گیا، بولا۔ ”ہاں یہ میرا اٹل فیصلہ ہے اور اس میں ردّ و بدل کا کوئی امکان نہیں۔“

یونس نے دونوں سے کہا۔ ”اچھا اب میں چلتا ہوں اور اہواز سے روانگی کا ایک جامع منصوبہ بناتا ہوں۔“

وہ کچھ دور جا کر کھڑا ہو گیا اور کچھ سوچ کر لیث کی طرف مڑا، اشارے سے اپنے پاس بلا لیا۔ جب لیث اس کے پاس پہنچ گیا تو یونس نے سرگوشی میں کہا۔ ”لیث! میں نے خنسا کو کوچہ مہوشاں سے تین ہزار دینار میں خریدا تھا۔ اس وقت میرے پاس یہ رقم نہیں تھی، میں نے یہ رقم ایک دوست سے لے کر خنسا کو خرید لیا تھا۔ اب یہ رقم ہمیں واپس کر دینا چاہیے کیونکہ ہم یوں بھی اہواز کو چھوڑ رہے ہیں۔“

لیث نے پوچھا۔ ”یہ تین ہزار دینار ابھی اور اسی وقت درکار ہیں یا......“

یونس نے جواب دیا۔ ”ایسی جلدی بھی نہیں ہے۔ کل، پرسوں یا بعد میں کسی بھی دن دے دینا۔ میں نے تو ایک بات تیرے کان میں ڈال دی لیکن اس میں ایک شرط بھی ہے۔“

لیث نے پوچھا۔ ”کون سی شرط؟ میں وہ شرط بھی پوری کر دوں گا۔“

یونس نے جواب دیا۔ ”اب یوں بھی تو میرا بھائی بن چکا ہے، ہم دونوں کے مقابلے میں خنسا یوں بھی غیر ہے۔ تو ان دیناروں کی بابت خنسا کو کچھ بھی نہیں بتائے گا۔“

لیث نے کہا۔ ”میرا وعدہ ہے میں ایسی غلطی نہیں کروں گا۔“

یونس نے کہا۔ ”یہ معاملہ ہم دونوں کے درمیان مواخات کی آزمائش بھی ہے، ایک قسم کا امتحان بھی۔“

لیث نے جواب دیا۔ ”میں نے وعدہ جو کر لیا۔ میں نے تجھے اپنا بھائی بنایا ہے تو مرتے دم تک بھائی ہی کہوں گا اور بھائی ہی سمجھوں گا۔“

خنسا نے مسکرا کر پوچھا۔ ”یہ تم دونوں میں سے ایسی کون سی راز کی بات ہو رہی ہے جس کا مجھے علم نہیں ہونا چاہیے؟“

یونس نے زور سے جواب دیا۔ ”میں لیث سے یہ کہہ رہا تھا کہ اب جبکہ ہم لوگ بغداد چل رہے ہیں تو وہاں خنسا کا خاص خیال رکھنا ہوگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بغداد کی حسین لڑکیاں لیث کو تیری طرف سے غافل کر دیں۔“ پھر آہستہ سے لیث سے کہا۔ ”تو میری یہی بات خنسا کے ذہن نشین

کروائے گا، سمجھا؟"

لیث نے جواب دیا۔ "سمجھا تو اطمینان رکھ۔"

یونس چلا گیا اور لیث خنسا کے پاس جا بیٹھا۔

وہیں ایک طرف سے لیث کا بوڑھا غلام کھانستا ہوا آ گیا اور لیث سے کہنے لگا۔ "آقا زادے! کیا تو مجھے اپنا وفادار نہیں سمجھتا؟"

خنسا نے غلام کو پہلی بار غور سے دیکھا۔ اس کا ستا ہوا چہرہ اور دونوں جبڑوں کی ابھری ہوئی بڑی بڑی ہڈیاں بڑی مکروہ لگ رہی تھیں۔ آنکھیں یوں بھی بڑی تھیں لیکن گوشت سے خالی چہرے پر کچھ زیادہ ہی بڑی نظر آ رہی تھیں۔ اس نے گھبرا کر اپنا منہ پھیر لیا۔ لیث نے اس کی بات گویا سنی ہی نہ تھی۔ وہ خاموش کچھ سوچنے میں مشغول تھا۔

خنسا نے اُسے ٹہوکا دیا، بولی۔ "تو چلا کہاں گیا؟ دیکھ یہ ہڈیوں والا شیطان تجھ سے کیا کہہ رہا ہے؟"

بوڑھا غلام خنسا کا اہانت آمیز فقرہ تلملا کر برداشت کر گیا۔

لیث نے سر اٹھا کر غلام کو دیکھا، پوچھا۔ "تو مجھ سے کچھ کہہ رہا ہے؟"

غلام نے جواب دیا۔ "ہاں، میں آقا زادے ہی سے مخاطب ہوں۔ میں پوچھ رہا تھا کہ کیا میرا آقا زادہ مجھے اپنا وفادار نہیں سمجھتا؟"

لیث نے کہا۔ "کیوں، میں تجھے اپنا وفادار کیوں نہیں سمجھوں گا؟"

غلام نے جواب دیا۔ "یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ تو میری بات نہیں مان رہا۔"

لیث نے پوچھا۔ "میں نے تیری کون سی بات نہیں مانی؟"

غلام نے جواب دیا۔ "مجھے قاضی کا بیٹا یونس ذرا بھی پسند نہیں۔ تو اس سے راہ و رسم ختم کر دے۔"

خنسا چڑ گئی، بولی۔ "کیا اس حویلی میں اس غلام کی اتنی حیثیت ہے کہ اس کے مشورے پر تو یونس سے تعلقات ختم کر دے؟"

لیث نے گھبرا کر جواب دیا۔ "نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔" پھر غلام کو ڈانٹا۔ "اب تو یہاں سے دفع ہو جا اور خبردار جو آئندہ کوئی ایسا ویسا مشورہ دیا۔"

خنسا نے ٹوک دیا۔ "ایسا ویسا کیا معنی، اس سے کہو خبردار جو آئندہ میرے معاملات میں زبان کھولی۔"

لیث نے کھسیا کر کہا۔ "چلو یہی سہی۔ خبردار جو تو نے میرے کسی بھی معاملے میں کوئی دخل دیا۔"

غلام شرمندہ ہو کر چپ ہو گیا۔ اس نے بڑی بے بسی سے خنسا کی طرف دیکھا اور پھر واپس چلا گیا۔

خنسا نے زور سے کہا۔ "اگر میں اس گھر میں رہ گئی تو اس شیطان کو بتا دوں گی کہ اسے یہاں کس طرح رہنا چاہیے۔"

غلام برداشت نہ کر سکا دور ہی سے بولا۔ "شاید تو یہ بھول رہی ہے کہ تو خود بھی زر خرید لونڈی ہے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ میں یہ نہیں جانتا کہ تو کتنے میں خریدی گئی ہے۔"

خنسا غصے میں کھڑی ہو گئی، بولی۔ "لیث! ابھی تو مجھے اپنی جان کہہ رہا تھا۔ میں کچھ بھی سہی لیکن ایسی تو نہیں کہ یہ بوڑھا اور کالا کلوٹا دوزخی، جہنم کا دربان مجھے گالی دے کر چلا جائے۔"

لیث کو بھی غصہ آ گیا۔ وہ تیزی سے دوڑا اور غلام کی کمر پر دو لاتیں رسید کر دیں۔ غلام لڑکھڑا کر اوندھے منہ گر گیا۔ ناک اور منہ سے خون جاری ہو گیا۔ خنسا اسے منہ کے بل گرتے دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس دی، بولی۔

"جو دوڑے گا وہ منہ کے بل گرے گا ضرور۔" لیکن غلام بدستور بے حس و حرکت زمین پڑا رہا۔ لیث اسے چھوڑ کر برا بھلا کہتا خنسا کے پاس چلا گیا۔

☆☆☆

غلام بڑی دیر تک بے ہوش پڑا رہا۔ خنسا، لیث کو ساتھ لے کر اندر چلی گئی اور لیث کو مجبور کرتی رہی کہ وہ اس بوڑھے غلام کو آزاد کر دے اور صاف صاف کہہ دے کہ وہ اس حویلی کو چھوڑ کر کہیں بھی چلا جائے لیکن لیث یہ حکم نہیں دینا چاہتا تھا کیونکہ اس کا دردمند دل جانتا تھا کہ اس بڑھاپے میں وہ کہاں بھٹکتا پھرے گا۔

لیث، خنسا میں مشغول رہا اور اہواز کے کاروبار کے خاتمے اور جائداد کو بیچ دینے کے فرائض یونس کو سونپ دیے گئے۔ وہ اس کام میں اتنا منہمک ہوا کہ اس نے لیث اور خنسا کی کئی کئی دن تک شکل نہ دیکھی۔ اسی دوران لیث نے خاموشی سے تین ہزار دینار بھی یونس کے حوالے کر دیے۔ لیث کو یونس کے آنے یا نہ آنے کی کوئی فکر نہیں تھی لیکن خنسا کو اس کا انتظار تھا۔ خنسا کے لیے یونس میں بڑی دلکشی تھی۔ وہ لیث کے پلے پڑ گئی تھی لیکن، اگر خنسا کا دل ٹٹولا جاتا تو وہاں یونس ہی کی شبیہ تھی۔ یونس کی ذہانت، پُرلطف اندازِ گفتگو۔ شاندار آواز اور بہترین مذاق چند ایسے جوہر تھے کہ خنسا ان

پر مرمٹی تھی۔ اب وہ ایک موقعے کی تلاش میں تھی۔ لیث کی عدم موجودگی اور یونس کی موجودگی میں وہ اپنا مدعا بیان کر دینا چاہتی تھی لیکن یونس چھلاوے کی طرح آتا اور چلا جاتا۔

کاروبار ختم ہو گیا، حویلی بک گئی اور حویلی کے علاوہ جو کچھ تھا، اسے بھی فروخت کر دیا گیا۔ دولت کا ڈھیر لگ گیا۔ اہواز کے پڑاؤ پر اس قافلے کا انتظار کیا جانے لگا جس کی منزلِ مقصود بغداد ہوتا۔ غلام کو یہ باتیں اس وقت معلوم ہوئیں جب یہ سارا کام ختم ہو چکا تھا۔ لیث نے اس کی کوٹھری میں جا کر اسے مطلع کر دیا کہ "میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تجھے آزاد کر دوں چنانچہ آج سے تو آزاد ہے اور جہاں جی چاہے چلا جا۔"

غلام نے کراہتے ہوئے احتجاج کیا۔ "لیکن میں آزادی کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

لیث نے جواب دیا۔ "میں مجبور ہوں کیونکہ میں بغداد جا رہا ہوں اور میں نے اپنی منقولہ اور غیر منقولہ جائداد فروخت کر دی ہے۔ یہاں تک کہ یہ حویلی بھی۔ میں نے حویلی خالی کرنے کے لیے ساتھ دن کی مہلت مانگ لی تھی جو پرسوں پوری ہو جائے گی۔ اس لیے میں کل تک اسے خالی کر دینا چاہتا ہوں۔ میں خود تو بغداد چلا جاؤں گا لیکن تو آزاد ہے، جہاں چاہے چلا جا مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

غلام کرب سے بلبلا اٹھا، روتے ہوئے کہا۔ "آقا زادے! یہ تو کیا کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے؟ تو مجھے قتل کر دے لیکن میں یہی کہوں گا کہ قاضی کا بیٹا یونس تجھے تباہ و برباد کر کے رہے گا اور اس کے ساتھ ہی یہ بنت جاریہ (لونڈی کی جنی) بھی تیری بربادی کے درپے ہیں۔"

لیث نے سختی سے جواب دیا۔ "افسوس کہ میں ان دونوں کے خلاف ایک لفظ بھی نہ سنوں گا تو اپنی زبان کو قابو میں رکھ اور کل تک کسی ٹھکانے کا بندوبست کر لے۔"

غلام تن کر کھڑا ہو گیا، بولا۔ "میں تیرے ساتھ چلوں گا کیونکہ میں سمجھ چکا ہوں کہ یہ یونس اور آفت کی پرکالا خنسا تجھے کہیں کا بھی نہ رکھیں گے۔ میں ان موذیوں سے تجھے بچاؤں گا۔ مجھے جدا نہ کر، مجھے اپنے ساتھ رکھ، میں تیرے کام آؤں گا۔"

لیث کا دل پسیج گیا اور وہ کسی حد تک غلام کو اپنے ساتھ رکھنے پر آمادہ بھی ہو گیا، بولا۔ "لیکن تو یہ وعدہ کر کہ خنسا اور یونس کے معاملات میں کوئی دخل اندازی نہیں کرے گا۔"

غلام نے جواب دیا۔ "میں اس کا وعدہ تو کر لوں گا لیکن مجھے اس وقت تو بولنا ہی پڑے گا جب میں یہ محسوس کروں گا کہ تیرے ساتھ دغابازی کی جا رہی ہے۔"

لیث نے کہا۔ "ہاں اس وقت تو، تو واقعی بول سکتا ہے لیکن تجھے ہر حال میں خنسا اور یونس کا احترام کرنا ہے کیونکہ میں خود ان میں سے ایک کا احترام اور دوسرے سے محبت کرتا ہوں۔"

اسی کوٹھری میں یونس اور خنسا بھی پہنچ گئے۔ خنسا بہت خوش تھی، بولی۔ "یہ یہاں چپکے چپکے کس کے خلاف باتیں ہو رہی ہیں ذرا میں بھی تو سنوں وہ گفتگو۔"

لیث نے کھسیا کر جواب دیا۔ "میں نے اسے آزاد کر دیا تھا لیکن یہ آزادی پر تیار نہیں اس لیے ہمارے ساتھ بغداد چلے گا۔"

خنسا نے سختی سے مخالفت کی۔ "لیکن میں اس کالے شیطان کو اپنے ساتھ ہرگز نہ لے جاؤں گی۔"

یونس نے کہا۔ "میرا بھی یہی خیال ہے کہ اسے اپنے ساتھ بغداد نہیں لے جانا چاہیے۔"

لیث نے خوشامدانہ کہا۔ "لیکن میں نے اس سے وعدہ کر لیا ہے کہ میں اسے اپنے ساتھ بغداد ضرور لے چلوں گا۔"

یونس نے لیث کے رجحان سے واقف ہوتے ہی پلٹا کھایا، بولا۔ "اگر لیث نے ساتھ لے چلنے کا وعدہ کر لیا ہے تو ہم دونوں کو بھی لیث کے اس وعدے کا احترام کرنا چاہیے۔"

خنسا نے غلام کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں خود بھی اختلاف رائے کو زیادہ پسند نہیں کرتی۔ اگر لیث کی یہی مرضی ہے تو اس بوڑھے اور کالے شیطان کو اپنے ساتھ لے چلو، مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں۔"

یونس نے اعلان کیا۔ "اب چونکہ ہم سب بغداد جانے والے ہیں اور اہواز کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیں گے اس لیے آج کی رات کو یادگار بنا دیا جائے۔ ہم تینوں اہواز کی مشہور تفریح گاہ نہر بلط کے کنارے اپنی آج کی رات بسر کریں گے۔"

خنسا نے تائید کی لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ۔ "وہاں دل بستگی کا دوسرا سامان بھی ہونا چاہیے۔"

لیث نے جواب دیا۔ "مجھے منظور ہے لیکن مجھے یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ دل بستگی کے سامان میں کیا کیا آتا ہے؟"

خنسا نے کہا۔ "رقص و موسیقی، اگر رقص نہیں تو موسیقی ضرور ہو۔ مزامیر کا انتظام بھی ہونا چاہیے اور پینے کے لیے

www.paksociety.com

وافر مقدار میں شراب بھی۔"

غلام چپ نہ رہ سکا پھر بولا۔ "آقا زادے! افسوس کہ یہ دونوں تیری بربادی کے درپے ہیں۔"

یونس نے جھڑک دیا۔ "تو پھر بولا؟ تو باز نہیں آئے گا؟"

لیث نے غلام سے کہا۔ "ابھی ابھی میں نے تجھ سے یہ کہا تھا کہ ان دونوں پر کوئی تنقید نہیں ہوگی لیکن تو برابر بولے جارہا ہے۔ یہ آخر کیوں؟"

خنسا نے بے تعلق رہنے کی کوشش کی، بولی۔ "جیسی صورت ویسی فطرت لیکن میں لیث سے محبت کرتی ہوں اس لیے اس کے کسی معاملے میں، دخل نہیں دینا چاہتی۔"

لیث نے خجالت مٹانے کی کوشش کی، بولا۔ "خنسا اور یونس! افسوس کہ یہ غلام یا میرے دوسرے مخالفین پوری پوری کوشش کر دیکھیں کہ میں تم دونوں سے کنارہ کشی اختیار کرلوں لیکن میں ایسا نہیں کرسکتا۔"

یونس نے ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے جاتے ہوئے کہا۔ "تو گویا ہر کام ہوگیا۔ جو کچھ اور جس طرح سوچا تھا، ٹھیک اسی طرح سب کچھ ہوتا چلا جارہا ہے اس لیے اس غلام کی میری نظر میں کوئی وقعت نہیں۔"

لیث نے کہا۔ "میں ایک بار پھر یہی کہوں گا کہ موجودہ حالات میں جو کچھ ہورہا ہے، درست ہے۔ میں آج کی رات نہر بط کے کنارے گزار کر اسے یادگار بنادوں گا۔"

نہر بط کے دونوں کناروں پر چاندنی راتیں بڑی پُر لطف اور حسین ہوجاتی ہیں۔ انسان تو انسان پرند تک اس کے دونوں کناروں پر جمع ہوجاتے ہیں۔ بطخ اور بگلے دھلی ہوئی چاندنی میں جب اڑتے یا بھاگتے نظر آتے تو انسان ان کی دلکشی میں یوں گم ہوجاتا گویا وہ اس ماحول میں شامل ہی نہ ہو۔

اس نہر بط کے ایک طرف لیث، یونس اور خنسا بھی پہنچ گئے۔ ذرا ذرا فاصلے سے خیموں کا شہر سا آباد تھا اور یہ سارے ہی وہ لوگ تھے جو لیث کی طرح چاندنی رات میں نہر بط سے لطف اندوز ہونے کے لیے آئے تھے۔ انہی خیموں کے پاس خالی جگہ پر لیث کے چار خیمے نصب کردیے گئے۔ ان کے ساتھ کھانے پینے کا سامان بھی تھا۔ شراب، گوشت اور کئی قسم کے پھل۔ مزامیر بھی تھے اور ان کے بجانے والے بھی۔ یہیں لیث پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ خنسا اچھی مغنیہ بھی ہے۔ جب اس کھلی فضا اور پُرسکون مقام پر راگ رنگ کا سلسلہ چھڑا تو ایک سماں بندھ گیا۔ لیث خوش تھا کہ اس کی محفل دوسروں کی توجہ کا بھی مرکز بن گئی تھی۔ ان میں ہر ایک یونس سے واقف تھا کیونکہ وہ اہواز کے قاضی کا بیٹا تھا اور مانا ہوا چرب زبان تھا۔ جب انہوں نے یونس کا گانا سنا تو کئی نے یہ رائے دی کہ اگر یونس فریبی نہ ہوتا تو اس کی ہم نشینی پر فخر کیا جاسکتا تھا۔

یونس کے بعد جب خنسا کی باری آئی تو لوگ جھوم جھوم اٹھے اور متفقہ طور پر کہا۔ "خوش قسمت ہے وہ شخص جسے اس خوش الحان مغنیہ کا وصال نصیب ہوا اور جنت ہے وہ محل جس میں یہ حور سکونت پذیر ہے۔"

لیث ان دونوں کی شان میں مدح کے کلمات سن کر بہت خوش ہوا لیکن اس بات سے ملول بھی ہوا کہ اس کا کوئی بھی نام نہ لے رہا تھا۔ اس نے سوچا کاش میں دولت مند کا بیٹا نہ ہوتا اور محض ایک مغنی ہوتا۔ باکمال گویا، کہ لوگ میری تعریفیں کیا کرتے۔

کسی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور شانہ دبا کے اپنی طرف متوجہ کیا۔ لیث جیسے ہی مڑا، اس نے کان سے منہ لگا کر دریافت کیا۔ "میرا خیال ہے کہ تو ہی وہ خوش نصیب نوجوان لیث ہے جس کا باپ حمدون مغیث انتقال کرگیا اور بڑا بھائی یعقوب کہیں لاپتا ہوگیا؟"

لیث نے جواب دیا۔ "تو نے بالکل صحیح پہچانا لیکن تو کون ہے؟"

اس شخص نے کہا۔ "میں تیرے مصاحب خاص عیار دوست یونس کے باپ کا محرر ہوں اور کئی دن سے تیرے پاس آنے کا سوچ رہا تھا۔"

لیث نے یونس کے بارے میں ہتک آمیز فقرہ سنا تو اسے بہت برا لگا، بولا۔ "تو بقول خود یونس کے باپ کا محرر ہے اور اپنے آقا زادے کی برائی کرتا ہے۔"

اس نے جواب دیا۔ "میں برائی نہیں کررہا، یونس سے تو ایک زمانہ واقف ہے چنانچہ جب قاضی کو یہ معلوم ہوا کہ یونس نے تجھ سے بڑا ربط ضبط بڑھا رکھا ہے تو اس نے مجھے حکم دیا کہ میں تجھ سے مل کر یونس کے شر سے تجھے آگاہ کردوں۔"

لیث، یونس کی برائی سننا نہیں چاہتا تھا، بے پروائی سے بولا۔ "افسوس کہ زمانہ اچھوں کو برا کہتا ہے۔"

محرر نے پوچھا۔ "یہ مغنیہ کس کی محبوبہ ہے؟"

لیث نے فخریہ جواب دیا۔ "میری اور اسے بھی یونس نے دوستی میں میری نذر کردیا۔"

محرر ہنسا، کہنے لگا۔ "سبحان اللہ! تجھ میں کون سا ہنر تھا

جس سے متاثر ہوکر یہ مغنیہ تیری نذر کردی گئی؟ اور پھر زمانے کی ریت تو یہ ہے کہ دولت مند اور اہل جاہ مرتبہ اس قسم کی سخاوتیں کیا کرتے ہیں، یہ کہیں بھی سننے میں نہیں آیا کہ جن کے پاس کچھ نہ ہو وہ اغنیا کو بخشش دینے لگیں۔"

لیث نے چڑ کر کہا۔ "اچھا اب خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ، دیکھ خنسا کیا خوب گارہی ہے۔"

اس شخص نے جواب دیا۔ "باپ کی دولت اور دوست کا نذرانہ اس میں تیرا اپنا کیا ہے جو تو یوں خوش ہورہا ہے۔"

یہ شخص تو چلا گیا لیکن لیث کے دل میں یونس کے خلاف ایک گرہ ڈال گیا۔ ایک غیر محسوس گرہ، جس کا علم خود لیث کو بھی نہیں تھا۔

رات گئے تک نہر بط کے کنارے ہنگامہ برپا رہا۔ جگہ حسین تھی لیکن رات کے پچھلے پہر انہیں اس کے عیب کا بھی علم ہوگیا۔ بڑے بڑے مچھروں نے ان پر یلغار کردی اور ان کا سارا مزہ کرکرا کردیا۔ انہوں نے جھاڑ جھنکار جلا کر دھواں کردیا اور اپنے اپنے خیموں میں عود اور لوبان سلگا دیا۔ خیمے اور اس کے باہر کی فضا خوشبوؤں سے مہک گئی۔ لیث گانے سے اکتانے لگا اور خیمے کی خوشبو نے اس کے جسم میں ایک دوسری ہی لہر دوڑادی تھی۔ سارا جسم سنسنانے لگا اور جسم اور روح ایک ساتھ دوسری ہی بھوک محسوس کرنے لگے۔ اس نے یونس سے کہا۔ "اب میں تھک گیا ہوں اور آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

یونس نے اپنے باپ کے محرر کو لیث سے باتیں کرتے دیکھ لیا تھا اور اسی وقت سے وہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ اس کے باپ کے محرر نے آخر لیث سے بات کیا کی۔ یونس نے جماہی لی اور بے دلی سے کہا۔

"تھک تو میں خود بھی گیا ہوں اور آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

لیث نے کہا۔ "اب تو محفل کو برخاست کردے اور اپنے خیمے میں جاکر آرام کر۔ مزامیر بجانے والے بھی تیرے ہی خیمے میں آرام کریں گے۔"

یونس نے جواب دیا۔ "خنسا گارہی ہے تو اسے... فی الحال گانے ہی دے۔ کیا میں تجھ سے چند باتیں کرسکتا ہوں؟"

لیث نے عدم دلچسپی کا اظہار کیا، بولا۔ "کیا وہ باتیں صبح نہیں ہوسکتیں؟"

یونس کے دل میں چور تو پہلے سے ہی تھا، اب وہ بھڑک اٹھا، بولا۔ "لیث! کیا تجھ میں تبدیلیاں نہیں آرہی ہیں؟"

لیث نے بدستور بے دلی سے جواب دیا۔ "قطعاً نہیں، میں نہیں بدل سکتا۔ نہ بدلا ہوں اور نہ آئندہ بدلوں گا۔"

یونس نے تیوریاں چڑھا کر بھنچی بھنچی آواز میں کہا۔ "تو غلط بیانی سے کام لے رہا ہے۔ میں خوب جانتا ہوں کہ لوگ تجھے میرے خلاف ورغلانے میں مشغول ہیں اور تو ان باتوں کو کتنا ہی درگزر کیوں نہ کرے لیکن ان کا غیر محسوس طور پر اثر قبول کرنے پر مجبور ہے۔"

لیث نے یونس کو چمٹالیا اور بڑے پُرخلوص لہجے میں کہا۔ "تو ان وسوسوں میں کیوں گھبرا جارہا ہے؟ یہ خیالات اور شبہات تیرے دل میں آخر آ کیوں رہے ہیں؟"

یونس نے جواب دیا۔ "اہواز کے لوگ میرے دشمن ہیں اور انہیں جب بھی موقع ملے گا وہ تجھے ورغلانے سے باز نہیں رہیں گے۔"

لیث نے تسلی دی۔ "بس چند ہی دنوں کی تو بات ہے، اب ہم اہواز میں رہیں گے ہی نہیں۔ بغداد چلے جائیں گے پھر ہم میں اختلاف اور نفاق کے بیج بونے والے بھی نہ ہوں گے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔"

یونس نے کہا۔ "اچھا تو سچ بتا، میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ میرے باپ کا محرر تجھ سے کس قسم کی باتیں کررہا تھا؟"

لیث نے پوری بات صاف صاف بتادی اور آخر میں کہا۔ "لیکن میں نے اس کی باتوں کا کوئی اثر ہی نہ لیا اور اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ دنیا کا پرانا دستور ہے کہ اچھوں کو برا کہتی ہے۔"

یونس کو لیث کی سادگی اور سچائی کا فوراً ہی یقین آگیا۔ اس نے خوش ہوکر محفل کو برخاست کردیا۔ آس پاس سے آنے والے اپنے اپنے خیموں میں واپس چلے گئے اور یونس ساز بجانے والوں کو اپنے خیمے میں لے گیا۔ لیث، خنسا کے ساتھ بیٹھ گیا۔ خنسا نے لیث سے درخواست کی کہ وہ ذرا سی دیر کے لیے یونس کو بلالے، وہ اس سے چند باتیں کرے گی۔

لیث نے برا سا منہ بنا کر جواب دیا۔ "اب اس وقت اسے بلا کر تو کیا باتیں کرے گی؟ کیا صبح نہیں ہوگی؟"

خنسا نے کہا۔ "میں اسے مبارک باد دینا چاہتی ہوں۔ اس کی آواز اور گیت کا کوئی جواب نہیں۔"

لیث جل گیا، بولا۔ "تو یہ مبارک باد صبح بھی دے سکتی

ہے۔"

خنسا نے بے چینی سے کہا۔"وہ تو ٹھیک ہے لیکن مبارک باد دینے کا یہی مناسب وقت ہے۔صبح تک بات پرانی ہو جائے گی اور اس میں مزہ نہیں آئے گا۔"

لیث نے ناگواری سے کہا۔"اگر تو بضد ہی ہے تو میں اسے اسی وقت بلا لیتا ہوں۔"

خنسا نے لیث کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور اپنا لباس اور سنگار درست کرنے لگی۔کچھ دیر بعد یونس آگیا۔لیث نے یونس کو خنسا کے پاس چھوڑا اور خود باہر جانے لگا، بولا۔"اچھا تم دونوں باتیں کرو،اس وقت تک میں خیمے کے باہر ٹہل رہا ہوں۔جب باتیں ختم ہو جائیں تو مجھے آواز دے کر بلا لینا۔"

دونوں ہی نے لیث کی ناراضی کو محسوس کر لیا۔یونس اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔"لیث خدا کے لیے رک جا،کیا تو ناراض ہو گیا؟ آخر کس بات پر، کیوں؟"

خنسا بھی لیث کے پاس پہنچ گئی،بولی۔"ارے اس وقت کوئی ایسی ویسی بات بھی تو نہیں ہوئی پھر خفگی کی وجہ؟"

لیث نے جواب دیا۔"میں خفا نہیں ہوں بلکہ یوں ہی باہر جا رہا ہوں۔"

یونس نے خنسا کی طرف دیکھا،بولا۔"خنسا! تو نے مجھے کیوں بلایا تھا؟ جلدی بتا تاکہ میں فوراً ہی یہاں سے چلا جاؤں؟"

خنسا بھی وقت کی نزاکت محسوس کر چکی تھی،بولی۔"میں تجھے تیری آواز اور گیت کی مبارک باد پیش کرتی ہوں۔"

یونس نے جواب دیا۔"شکریہ،یا کچھ اور بھی؟"

خنسا نے مزید کہا۔"یونس! شکریے کی کوئی بات نہیں۔"

اب لیث باہر جا چکا تھا،خنسا نے کہا۔"یونس! اس وقت تو،تو چلا جا پھر بات کروں گی لیکن اس وقت صرف ایک ہی بات کروں گی۔"

یونس نے کہا۔"کون سی بات؟"

خنسا نے جواب دیا۔"میں تجھ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ تو نے مجھے اپنے لیے خریدا تھا یا لیث کے لیے؟"

یونس نے کہا۔"میں نے تجھے لیث ہی کے لیے خریدا تھا مگر خریدتے وقت میری نیت بدل گئی تھی۔مجھے تو بہت اچھی لگی تھی لیکن میں بھی کیا کرتا،میں مجبور تھا میرے پاس دولت نہیں تھی۔"

خنسا نے شکایتاً کہا۔"لیث کے پاس دولت کے سوا ہے ہی کیا؟ اسے گانا بھی نہیں آتا،وہ شاعر بھی نہیں،لطیفہ گو،بذلہ سنج بھی اور حد تو یہ ہے کہ وہ تاجر بھی نہیں۔وہ کچھ بھی نہیں ان حالات میں،میں کس طرح رہوں گی۔"

یونس نے جواب دیا۔"یہ پیچیدہ اور وقت طلب بحث ہے۔میں کسی وقت تفصیل سے بات کروں گا۔"

خنسا نے جلدی جلدی کہا۔"لیکن بات ہوگی ضرور، میں انتظار کروں گی۔"

یونس نے باہر جاتے جاتے کہا۔"دیکھ! ایک بات کا خاص خیال رکھ۔لیث کو میری طرف سے بدلنے نہ دے کیونکہ اس میں ہم دونوں کا بھلا ہے۔"

یونس باہر چلا گیا اور لیث سے عاجزی سے کہا۔"لیث! مجھے افسوس ہے کہ خنسا کی ذرا سی بے چینی اور عجلت نے تجھے دکھ پہنچایا۔اب میں نے اسے منع کر دیا ہے اور کہہ دیا ہے کہ میں کوئی باقاعدہ مغنی تو ہوں نہیں، جسے داد اور شکریے کی حاجت ہو۔"

لیث خاموش رہا اور جب یونس اپنے خیمے میں چلا گیا تب وہ بھی اپنے خیمے میں داخل ہوا اور خنسا سے طنزاً پوچھا۔"کیا یونس چلا گیا؟ اسے مبارک باد دے دی؟"

خنسا نے جواب دیا۔"ہاں وہ چلا گیا اور اب ہم دونوں نے آپس میں یہ طے کر لیا ہے کہ ہم کوئی ایسی بات نہیں کریں گے جس سے تیرے دل کو دکھ پہنچے۔"

لیث خاموش رہا،اس کے سینے پر عین دل کی جگہ ایک بھاری پتھر رکھا ہوا تھا۔خنسا نے اس بدلے ہوئے لیث کی طرف شک و شبہے سے دیکھا۔اس نے لیث کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور محبت کی اداکاری کر کے اس کو ایک بار پھر خوش کر دیا اور لیث نے خنسا کی آغوش میں خود کو بالکل ہلکا اور مست الست محسوس کیا۔

☆☆☆

اہواز چھوڑنے سے ایک دن پہلے یونس کا باپ لیث کے گھر پہنچ گیا۔اس وقت لیث اور خنسا کہیں گئے ہوئے تھے۔بس یونس تنہا لیٹا ہوا تھا۔بوڑھا غلام اپنے حجرے میں پڑا کھانس رہا تھا۔یونس کا باپ،اہواز کا قاضی اپنے بیٹے کے سامنے کھڑا اسے یہ خوش خبری سنا رہا تھا کہ وہ خود بھی بغداد جا رہا ہے کیونکہ بغداد کے آل بویہ کا ذہین ترین شخص عضدالدولہ اسے بغداد بلا رہا ہے۔

یہ خبر یونس کے لیے بڑی پریشان کن تھی کیونکہ یونس نہیں چاہتا تھا کہ اس کا باپ اس کی مخالفت کرنے کے لیے بغداد پہنچ جائے۔یونس نے پوچھا۔"بغداد میں عضدالدولہ نے آپ کو کیوں بلایا ہے؟"

باپ نے جواب دیا۔"عضدالدولہ سے میرے ذاتی مراسم ہیں۔وہ چاہتا ہے کہ میں بغداد میں اس کے قریب رہوں۔"

یونس نے طیش میں کہا۔"لیکن ایک بات آپ یاد رکھیں گے۔میں بھی بغداد جا رہا ہوں۔آپ مجھے وہاں بدنام نہیں کریں گے۔"

باپ نے جواب دیا۔"بدنام میں نہیں تیرے کرتوت کرتے ہیں۔میری بدقسمتی ہے کہ تو میرا بیٹا ہے۔تیری بدنامی میری بدنامی کا باعث بن جاتی ہے اور اگر کوئی مجھے بدنام کرے گا تو میں اس کا ہر طرح تدارک کروں گا، خواہ وہ میرا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔"

یونس نے کہا۔"میں بغداد میں آپ کا نام تک نہیں لوں گا پھر بدنامی کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟"

قاضی نے بڑی خوشی کا اظہار کیا،بولا۔"اگر تو میرا نام نہیں لے گا اور مجھے تیری وجہ سے بدنام نہیں ہونا پڑے گا تو میں بھی تجھے یکسر بھلا دوں گا۔"

یونس نے شکایتاً کہا۔"میں آپ سے یہ نہیں کہتا کہ آپ میری ذمے داری قبول کیجیے۔میں یہ بھی نہیں کہتا کہ آپ مجھے کسی اچھی سی جگہ پر ملازم کروا دیجیے اور میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ آپ میرا ماہانہ مقرر فرما دیجیے۔میں نے کبھی آپ سے کوئی رعایت بھی نہیں مانگی۔جب میں آپ سے کچھ نہیں چاہتا تو آپ میرے معاملات میں کیوں دخل دیں۔میں نے ناتجربہ کار نوجوان لیث کا دامن پکڑ لیا ہے اور آپ اس کوشش میں ہیں کہ مجھے یہاں سے بھی اکھاڑ دینا چاہتے ہیں۔"

قاضی نے جواب دیا۔"یہ تو مجھ پر تہمت لگا رہا ہے، میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔میں نے لیث کے پاس سے اکھاڑ دینے کی کوئی کوشش نہیں کی۔"

یونس نے محرر کا حوالہ دیا،بولا۔"پھر اس نے آپ کا نام لے کر لیث سے اس قسم کی باتیں کیوں کیں؟"

قاضی نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر کنپٹی کھجلانا شروع کر دی،بولا۔"تیری ساری باتوں کا میرے پاس ایک ہی جواب ہے۔تو نے نہ تو معقول تعلیم حاصل کی اور نہ ہی تہذیب اور شائستگی حاصل کی۔تو نے میرا نام لے لے کر لوگوں کو دھوکے دیے۔تو نے میرے نام کو کمائی کا ذریعہ بنا لیا۔تیرے ان کرتوتوں سے ایک زمانہ واقف ہے۔میرا عملہ بھی واقف ہے۔میرا محرر تجھے سب سے زیادہ جانتا ہے۔اب اگر اس نے میری خیر خواہی میں تیرے خلاف لیث سے کچھ باتیں کی ہیں تو اسے اس کا حق پہنچتا ہے۔میں اپنے محرر سے باز پرس نہیں کر سکتا۔"

یونس نے بھی تیزی اختیار کی،بڑے جوش سے بولا۔"میں نے جو کچھ کیا،اس کی ذمے داری بھی آپ پر عائد ہوتی ہے۔میں اگر کچھ نہیں بن سکا تو اس کے بھی آپ ہی ذمے دار ہیں۔آپ نے میری ماں کو طلاق دے دی اور مجھے اس سے چھین لیا۔بھلا بتائیے تو سہی،اس وقت میں کتنے سال کا تھا۔غالباً دو ڈھائی سال کا پھر میری تربیت کس طرح ہوئی۔آپ واقف ہوں یا نہ ہوں لیکن میں جانتا ہوں کیونکہ مجھ پر بیتی ہے۔میں نے جھیلا ہے۔میں سب کی غفلت اور بے پروائی کا شکار رہا ہوں۔تنہا الگ تھلگ، ناقدری کا شکار۔"

قاضی نے جھڑک کر جواب دیا۔"گستاخ! تو اپنی نااہلی کا الزام مجھے دے رہا ہے۔میں کیا ہوں،اہواز کے لوگ اچھی طرح جانتے ہیں۔میری امانت اور دیانت کا دور دور شہرہ ہے۔میرے منصفانہ فیصلوں کا چرچا سن کر عضدالدولہ مجھے بغداد بلا رہا ہے اور تو مجھے الزام دے رہا ہے۔نالائق،گستاخ،ناخلف۔"

یونس ڈر گیا کہ کہیں باپ کی آواز بوڑھا غلام نہ سن لے،نرمی سے بولا۔"آپ کی امانت اور دیانت کا تو میں خود بھی قائل ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ مقدمات کے فیصلوں میں پورے پورے انصاف سے کام لیتے ہیں لیکن میں تو آپ کی اس ناقدری اور غفلت کی شکایت کر رہا تھا جو آپ نے میرے سلسلے میں برتی ہے۔"

لیکن قاضی بری طرح برہم تھا۔کپکپاتے ہوئے بولا۔"اب تو میرا فیصلہ بھی سن لے۔ہم دونوں میں سے ایک ہی بغداد جائے گا یا تو صرف تو ہی جائے گا یا بس میں جاؤں گا اور اگر دونوں ہی جائیں گے تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہے۔"

یونس ڈر گیا۔وہ اپنے باپ کے اثر و رسوخ اور مرتبے سے خوف زدہ تھا،سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔"کون سی صورت؟"

قاضی نے جواب دیا۔"میں تجھے عاق کر دوں گا کیونکہ اس صورت میں تیری بداعمالیوں کو یہ کہہ کر بے اثر کر دوں گا کہ میں نے تجھے عاق کر دیا ہے۔"

یونس کے دل کو دھکا سا لگا،اس نے آہستہ سے کہا۔"اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میرے عاق کیے جانے میں

آپ کا مفاد مضمر ہے تو میں راضی ہوں۔ شاید یہ آخری سزا ہے جو آپ مجھے دیں گے۔"

قاضی نے جواب دیا۔ "آخری نہیں، مستقل سزا...... دنیا میں بھی اور عقبیٰ میں بھی۔"

یونس نے کہا۔ "خدا منصف عادل ہے تو وہ ہم دونوں کے مقدمے کا جو فیصلہ کرے گا وہ آپ کے فیصلے سے مختلف ہوگا۔"

قاضی نے اپنے پیچھے کسی کو محسوس کیا، پلٹ کر دیکھا تو لیث اور خنسا چلے آرہے تھے۔ یونس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "اچھا اب آپ تشریف لے جایے اور وہی کیجیے جس کا ابھی اعلان فرمایا تھا کیونکہ میں بغداد ضرور جاؤں گا۔"

قاضی کچھ سوچ کر خاموش ہوگیا اور جانے کے لیے کھڑا ہوگیا۔

لیث اور خنسا تیز تیز قدم اٹھاتے ان دونوں کے پاس پہنچے اور قاضی کو ایک ساتھ سلام کیا۔ قاضی نے سلام کا جواب دیا اور لیث کو بڑے غور سے دیکھا اور کہا۔ "شاید تاجر حمدون مغیث کا بیٹا لیث تو ہی ہے؟"

لیث نے جواب دیا۔ "ہاں، حمدون مغیث میرا ہی باپ تھا اور آپ؟ شاید اہواز کے قاضی لبیب بخدی...... میں نے آپ کی موجودگی کا اندازہ آپ کے خدام ہی سے لگا لیا تھا جو اس وقت میری حویلی کے باہر یتیموں کی طرح سوکھ رہے ہیں۔"

قاضی نے چونک کر بہت زیادہ غور سے لیث کو دیکھا، بولا۔ "میں نے تو یہ سنا تھا کہ تو ایک بھولا بھالا سادہ لوح نوجوان ہے لیکن تیری اس بات سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تو اتنا بھولا بھی نہیں جتنا تیری بابت مشہور کیا گیا ہے۔"

اب خنسا نے زبان کھولی، کہا۔ "غالباً آپ یونس کے والد ہیں؟"

یونس نے فوراً تردید کی۔ "ہیں نہیں تھے، اب یہ میرے والد نہیں ہیں۔"

لیث اور خنسا چونک پڑے، خنسا بولی۔ "یہ کیا بات ہوئی کہ ہیں نہیں تھے؟ اگر والد تھے تو اب بھی والد ہیں اور اگر والد نہیں تھے تو اب بھی والد نہیں ہوں گے۔"

قاضی نے جواب دیا۔ "یہ نالائق اور ناخلف بیٹا تھا اس لیے میں نے اسے عاق کردیا۔"

یونس تڑپ گیا، تلملا کر بولا۔ "بس جناب! جب ایک بات ختم ہوگئی ہے تو اب اس کے چرچے سے کچھ حاصل نہیں۔ میں اچھا ہوں یا برا، میں آپ کا کوئی نہیں۔ میں لائق ہوں تو اپنے لیے اور نالائق ہوں تو اپنے لیے۔ آپ خدا کے لیے مجھ پر رحم فرمائیں اور یہاں سے تشریف لے جائیں۔"

قاضی تیزی سے باہر نکل گیا۔ جاتے وقت اس نے سلام بھی نہیں کیا اور یونس ان دونوں سے نظریں ملائے بغیر اٹھا اور ایک دوسرے کمرے میں جاکر اوندھے منہ تخت پر گر گیا اور بچوں کی طرح سسک سسک کر رونے لگا۔

☆☆☆

جس قافلے میں یونس، لیث اور خنسا سفر کررہے تھے۔ اس میں قاضی لبیب بخدی بھی موجود تھا۔ اس کے ساتھ اس کی بیویاں، بچے اور خدام بھی تھے۔ وہ قافلے میں شامل ہونے کے باوجود اہل قافلہ سے الگ تھلگ نظر آتا تھا۔ یونس کا بس چلتا تو وہ اس قافلے کے ساتھ سفر ہی نہ کرتا۔ لیث اور خنسا کو یونس پر رحم آرہا تھا۔ کوئی باپ اتنا ظالم بھی ہوسکتا ہے، لیث تو یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا جبکہ خنسا کا خیال اس سے مختلف تھا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ باپ اس سے زیادہ ظالم یوں ہوسکتا ہے کہ کتنے ہی والدین ایسے بھی ہیں جو اپنی بیٹیوں کو قلیل معاوضے پر فروخت کردیتے ہیں اور پھر یہ لڑکیاں تجارت کے کئی مراحل سے گزر کر لونڈیوں کی طرح بازاروں میں بک جاتی ہیں۔ جس کی عین نظیر خنسا خود تھی۔

یہ قافلہ پہلے تو بصرے میں چند دنوں کے لیے ٹھہرا، اس کے بعد بغداد کی طرف چل دیا۔ لیث کے پاس مشکیزوں میں بھری ہوئی دولت تھی، جس کی یونس اور لیث جان کی طرح حفاظت کررہے تھے۔ جب ان کا قافلہ بصرے سے مغرب کی طرف روانہ ہوا اور ایک منزل کے بعد باغ نما درختوں کے ایک طویل جھنڈ میں پڑاؤ کیا تو وہاں کے ٹوٹے پھوٹے، مٹی کے چولہوں، جلی ہوئی سیاہ زمین، راکھ اور جانوروں کی لید سے انہیں اندازہ ہوا کہ وہاں ان سے پہلے بھی کوئی قافلہ پڑاؤ کیے ہوئے تھا۔ لیث اور خنسا بہت خوش تھے لیکن یونس بہت فکرمند ہوگیا تھا۔ اس کی فکرمندی کا اثر خنسا پر بھی پڑ رہا تھا لیکن خنسا اس اثر کو بڑی خوب صورتی سے چھپا رہی تھی۔

پڑاؤ پر راتوں میں قافلے والے داستان سرائیاں کرتے۔ اپنے اپنے تجربات اور واقعات زندگی سناتے، کچھ گانے سے خود بھی محظوظ ہوتے اور دوسروں کو بھی محظوظ کرتے جن کے پاس دولت تھی، وہ اس کی فکر اور چوکسی میں کسی طرف توجہ ہی نہ دیتے اور ہر وقت چوکنے رہ

کر خطرات کی بو سونگھتے رہتے ۔ قافلے کے طلایہ گرد راتوں کو مسلح ہو کر قافلے کے چاروں طرف طواف کرتے رہتے ۔

ہلکی ہلکی سردیاں شروع ہو گئی تھیں ۔ راتیں کچھ زیادہ سرد ہو گئی تھیں اور شبنم کی نمی نے موسم کو اور زیادہ خشک کر دیا تھا ۔ وہ لوگ جو راتیں کھلے آسمان تلے بسر کرنے پر مجبور تھے ہڈیوں تک میں اتر جانے والی شبنمی قطرات انھیں بہت پریشان کرتے ۔ وہ سارا دن کسلمندی اور تکان محسوس کرتے اور اس لائق نہ رہتے کہ مزید محنت مشقت کر سکیں لیکن انھیں اس کا علاج بھی آتا تھا اور وہ ان پر بہت جلد گھریلو جڑی بوٹیوں سے قابو پالیتے تھے ۔

یونس کے لیے لیث بہت قیمتی نوجوان تھا اور اپنی ہر ممکنہ کوشش سے وہ لیث کے دل کو جیتے رہنے کی فکر میں تھا ۔ وہ لیث کو ہنساتا رہتا، اسے مزے مزے کے لطیفے سناتا رہتا اور اسے زمانے کے نشیب و فراز کے قصے سنا کر یہ جتانے کی کوشش کرتا کہ مخلص دوست بڑی مشکل اور خوش قسمتی سے ملتا اور جب یہ مل جاتا ہے تو پھر حاسد اس فکر میں لگ جاتے ہیں کہ ان میں اختلاف اور نفاق کیونکر پیدا کیا جائے ۔

اب لیث اتنا سیدھا بھی نہیں تھا کہ یونس کی باتیں نہ سمجھ پاتا ہو ۔ وہ یونس کی ایک ایک بات اور اس کا ایک ایک اشارہ خوب سمجھنے لگا تھا ۔ وہ یونس کے ہر اشارے پر یہی کہتا ۔ ”یہ حاسد کم از کم مجھے تو گمراہ نہیں کر سکتے ۔“

خنسا کو لیث سے زیادہ یونس سے ہمدردی بھی تھی اور محبت بھی ۔ وہ جب موقع ملتا، یونس کو یہی سمجھاتی ۔ ”جو کچھ بننا ہے تو خود بن، لیث کو زیادہ سمجھانے بجھانے کی ضرورت نہیں ۔“ کبھی حسرت سے کہتی ۔ ”لیث کی جگہ تجھے ہونا چاہیے تھا اور تیری جگہ لیث کو ۔“

قافلہ چلنے کی تیاری کر رہا تھا ۔ یونس اور لیث بھی مشکیزے اور دوسرا سامان اونٹوں پر رکھ رہے تھے ۔ اسی عالم میں ایک شخص ان دونوں کے پاس آیا اور یونس کو ایک کاغذ دے دیا، بولا ۔ ”قاضی لبیب بجدی نے دیا ہے ۔“

یونس نے یہ کاغذ لے کر اس شخص کو پہچاننے کی کوشش کی ۔ اس کے بعد کاغذ پڑھنے لگا، یہ عاق نامہ تھا ۔ اس میں لکھا تھا ۔

”میں قاضی لبیب بجدی، قاضی اہواز اپنے نالائق بیٹے یونس کو عاق کرتا ہوں ۔ اب یہ دنیا اور آخرت میں میرا بیٹا نہیں رہا ۔ یہ میرے ورثے اور ترکے کا حصے دار بھی نہیں رہا ۔ اس عاق نامے کے بعد یونس اپنے ہر معاملے کا خود ہی ذمے دار ہوگا ۔ دینی معاملات میں بھی اور دنیاوی امور میں بھی ۔“

عاق نامہ پڑھ کر یونس کو ایسا لگا گویا اس پر پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو ۔ لیث نے پوچھا ۔ ”یہ کیا ہے؟“

یونس نے جواب دینے کے بجائے عاق نامہ تھما دیا، بولا ۔ ”اب میں کیا بتاؤں، تو خود پڑھ لے ۔“

لیث نے عاق نامہ پڑھا تو اسے بھی بڑا دکھ ہوا، بولا ۔ ”دوست! تو ملول نہ ہو ۔ تو میرا بھائی ہے، میں تیرا ساتھ دوں گا ۔ مرتے دم تک، آخری وقت تک ۔“

یونس نے سوگوار آواز میں کہا ۔ ”اگر مجھے آخرت کا خوف نہ ہوتا تو میں اپنے باپ کو اسی وقت ہلاک کر دیتا ۔“

لیث نے کہا ۔ ”وہ تو غصے میں کوئی بھی یہ حرکت کر سکتا ہے لیکن اس عاق نامے کے بعد جو بھی تیری اس حرکت کے بارے میں سنے گا یہی کہے گا کہ قاضی نے تجھے عاق جو کیا تھا تو صحیح کیا تھا ۔“

یونس نے جواب دیا ۔ ”لیکن میں اس لیے ایسی حرکت نہیں کروں گا کہ میں جانتا ہوں کہ خدا علیم و بصیر ہے ۔ وہ ہم دونوں کے ظلم اور زیادتی سے اچھی طرح آگاہ ہے اور صحیح فیصلہ وہی کرے گا ۔“

لیث نے ذرا تکلف سے پوچھا ۔ ”یونس! تیرے باپ کی بابت اگر میں چند سوالات کروں تو کیا تو ان کے صحیح جواب دے گا؟“

یونس نے جواب دیا ۔ ”کیوں نہیں، میں جھوٹ نہیں بولوں گا ۔“

لیث نے پوچھا ۔ ”تیرا باپ امانت اور دیانت میں کیسا ہے؟“

یونس نے جواب دیا ۔ ”بہت ایمان دار، بڑا دیانت والا ۔“

”اور مقدمات کے فیصلوں میں انصاف کیسے کرتا ہے؟“

یونس نے کہا ۔ ”میں اپنے باپ کا عاق شدہ بیٹا ہوں لیکن اب بھی میں یہی کہوں گا کہ میرا باپ اعلیٰ درجے کا عادل اور منصف ہے ۔ اس نے جتنے مقدمات کے فیصلے دیے، سچے اور مبنی بر انصاف دیے ۔“

لیث نے برا سا منہ بنایا، کہا ۔ ”پھر اس نے تیرے ساتھ یہ زیادتی کیوں کی؟“

یونس بڑی بے چارگی سے نظریں ملا ملا کر چرا لیتا تھا، جواب دیا ۔ ”انا اور ضد کی بات ہے ۔ میں نے اپنے باپ سے ہمیشہ یہی کہا ہے کہ میں جو کچھ بھی ہوں اور مجھ میں جو برائیاں ہیں اس کے ذمے دار بھی آپ ہی ہیں ۔ میں آپ کی عدم توجہی اور غفلت کا شکار ہوں لیکن میرا باپ میری یہ بات ماننے کو تیار ہی نہیں اور آخر جھنجلا کر مجھے عاق کر دیا ۔ ہو سکتا ہے کہ بعد میں کبھی وہ اپنے کیے پر شرمندہ بھی ہو ۔“

لیث نے افسوس سے کہا ۔ ”تب پھر تیرا باپ بڑی متضاد فطرت کا مالک ہے ۔“

قافلہ کوچ کی تیاری کر چکا تھا ۔ اونٹوں کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیاں بجنے لگیں ۔ بتدریج قافلے نے حرکت کی اور رفتہ رفتہ پورا قافلہ چل پڑا ۔ اب یونس میں بڑی تبدیلی پیدا ہوتی جا رہی تھی ۔ اس میں سوچنے کی صلاحیت کچھ زیادہ ہی ہو گئی تھی اور بغداد میں داخلے سے پہلے ہی اس نے یہ قطعی فیصلہ کر لیا کہ اب اسے کسی کا دست نگر نہیں رہنا ہے ۔ باپ کے بعد اب وہ کون سا رشتہ تھا جس پر وہ اعتبار کر سکتا تھا ۔ لیث یہ محض ایک دوست تھا، جس نے سادگی اور سادہ لوحی میں اس کا سہارا لے لیا ہے ۔ حاسد اور لگانے بجھانے والے دن رات اس فکر میں ہیں کہ دونوں میں جھگڑا کروا دیا جائے ۔ باپ نے تو عاق کر کے اس سے پیچھا چھڑا لیا ہے لیکن لیث کو اس کی بھی ضرورت نہیں ۔

سامنے باب البصرہ نظر آ رہا تھا ۔ اب یہ لوگ بغداد کے دروازے پر پہنچ چکے تھے ۔ داخلے سے پہلے خلافت کے آدمیوں نے اہل قافلہ کی اچھی طرح تحقیق کی ۔ یہیں عضدالدولہ کے آدمی کھڑے تھے جو بآواز بلند کہہ رہے تھے ۔ ”ہم عضدالدولہ کی طرف سے اہواز کے قاضی لبیب بجدی کے استقبال کو حاضر ہوئے ہیں ۔ وہ جہاں بھی ہوں، ہمارے پاس تشریف لے آئیں ۔“

قاضی لبیب بجدی اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا استقبال کے لیے آنے والوں میں پہنچ گیا ۔ انہوں نے قاضی کی شاندار پذیرائی کی ۔ یونس اور اس پذیرائی کا منظر دور سے دیکھ رہے تھے ۔ دونوں ہی متاثر ہوئے لیکن اب وہ خود بھی کچھ بننا چاہتے تھے ۔ لیث نے ایک بار پھر یونس کو تسلی دی، بولا ۔ ”باپ کی عزت و تکریم تیرے کام نہیں آ سکتی اس لیے تو ادھر نہ دیکھ اور اپنے بارے میں غور و فکر کرتا رہ ۔“

بغداد کی فصیل میں داخل ہوتے وقت ان لوگوں میں بڑی جذباتیت سی آ گئی ۔ یہاں سادہ لوحی اور سادہ مزاجی سے کام نہیں چل سکتا تھا ۔ بغداد کا طمطراق اور شان و شوکت دیکھ کر دونوں ہی کا کچھ عجیب حال ہو گیا ۔ خنسا بھی حیران تھی ۔ یہاں نہروں کا جال سا بچھا ہوا تھا اور نہروں کے آس پاس محلات تھے ۔ لیث نے اپنی سوتیلی ماں کے پتے کا کاغذ ہاتھ میں لے لیا اور ایک ایک سے اس کا پتا معلوم کرنے لگا ۔ بڑی دیر بعد کسی نے بتایا کہ حمدون مغیث کی بیوی اور بیٹی سوق الکتان (روئی کا بازار) کے چوراہے پر ایک سرخی مائل محل میں رہتی ہیں ۔

لیث نے کہا ۔ ”افسوس کہ میں بغداد میں اجنبیوں کی طرح مارا مارا پھر رہا ہوں حالانکہ میرا باپ یہاں کے متمول تاجروں میں گنا جاتا تھا ۔“

کچھ دیر بعد یہ اپنی سوتیلی ماں کے محل کے سامنے جا کھڑا ہوا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ محل کے دروازے پر کئی آدمی دربانی کر رہے ہیں اور محل کی ظاہری شان و شوکت سے دیکھنے والوں پر بڑا رعب پڑتا تھا ۔ محل کے صدر دروازے پر موٹا موٹا لکھا تھا ۔

”قصر المغیث ۔“

دیناروں اور سونے چاندی سے بھرے ہوئے مشکیزوں سے لدے ہوئے اونٹوں اور سواری کے گھوڑوں سمیت یہ تینوں جب قصر المغیث کے پھاٹک پر کھڑے ہو گئے تو دربانوں نے انہیں بڑی حیرت سے دیکھا ۔ ان میں خنسا کا محمل بھی تھا ۔ وہ محمل کا پردہ ہٹا ہٹا کر قصر مغیث کو پُرشوق نظروں سے دیکھ رہی تھی ۔

ایک دربان ان کے پاس آیا اور پوچھا ۔ ”تمہیں کس سے ملنا ہے؟“

لیث نے جواب دیا ۔ ”غالباً حمدون مغیث تاجر جب بغداد آتا تھا تو اپنے اس قصر میں قیام کرتا تھا؟“

دربان نے کہا ۔ ”بے شک، بے شک ۔“ پھر اونٹوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا ۔ ”کیا ان اونٹوں پر تجارت کا سامان لدا ہوا ہے اور تو کون ہے اور یہاں کیوں آیا ہے؟“

دوسرا دربان دوڑتا ہوا آیا اور پہلے دربان کو دھکا دے کر پیچھے کر دیا، بولا ۔ ”احمق! کیا تو اس نوجوان کے چہرے میں اپنے آقا حمدون مغیث کی شبیہ نہیں دیکھ رہا؟ مجھے تو یہ آقا زادہ محسوس ہوتا ہے جو اہواز سے آیا ہے ۔“

لیث اور یونس اس دوسرے دربان کی ذہانت سے بہت متاثر ہوئے ۔ لیث نے جواب دیا ۔ ”دربان! خدا تجھے خوش حال رہنے کی توفیق فرمائے ۔ تو نے مجھے پہچان لیا ۔ میں لیث بن مغیث ہوں، اپنی ماں سے ملنے آیا ہوں ۔“

محل کا پھاٹک کھل گیا ۔ اس میں اونٹ اور گھوڑے داخل ہو گئے اور ذہین دربان بھاگا بھاگا لیث کی سوتیلی ماں کے پاس پہنچا اور اسے مطلع کیا کہ آقا زادہ اہواز سے آ گیا

ہے۔

ماں نے زنان خانے کے دروازے پر آکر لیث کو بلوایا اور پردے کی آڑ سے لیث کو اچھی طرح دیکھ کر پوچھا۔ ”تیرا نام کیا ہے؟“

لیث نے جواب دیا۔ ”لیث بن حمدون مغیث۔“

پردے کے پیچھے سے آواز آئی۔ ”واللہ تو سچا ہے کیونکہ نوجوان مغیث نظر آرہا ہے۔“

اس کے بعد لیث کو اندر بلوالیا۔ ماں نے پوچھا۔ ”تیرا باپ کہاں ہے؟ آخر وہ کیوں نہیں آیا؟“

لیث نے غمزدہ آواز میں جواب دیا۔ ”میرا باپ اللہ کو پیارا ہوگیا۔“

اسی وقت اس کی سوتیلی بہن بھی آگئی۔ لیث نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”غالباً اس کا نام عنان ہے؟“

ماں نے جواب دیا۔ ”ہاں لیکن ابھی تو نے کیا کہا تھا؟ تیرا باپ اور میرا شوہر اللہ کو پیارا ہوگیا؟ یہ تو کیا کہہ رہا ہے؟ کیا یہ سچ ہے؟“

لیث نے کہا۔ ”میں اپنے باپ کے غم میں اتنے آنسو بہاچکا ہوں کہ مزید بہانے کی گنجائش ہی نہیں رہی۔ اگر وقت نے میرے زخمی دل پر اندمال کا پھایا نہ رکھ دیا ہوتا تو میں اپنے مرحوم باپ کے ذکر پر بے اختیار رو دیتا۔ اب آپ لوگ رو سکتی ہیں۔“

عنان اور اس کی ماں نے واقعی رونا شروع کردیا۔

لیث نے کہا۔ ”صاف گوئی کی معافی چاہتا ہوں۔ اس وقت میرا بھائی یونس اور میری محبوبہ خنسا بھی ہے۔ میں ان دونوں کو بھی اپنے ساتھ ہی ٹھہرانا چاہتا ہوں۔“

ماں نے غمزدہ آواز میں کہا۔ ”انہیں بھی اندر بلالے۔“ پھر کچھ سوچ کر پوچھا۔ ”لیکن جہاں تک مجھے یاد آتا ہے تیرے بھائی کا نام یونس نہیں یعقوب تھا۔“

لیث نے جواب دیا۔ ”آپ نے بجا فرمایا لیکن اب میں نے اس کا نام یونس رکھ دیا ہے۔“

ماں نے کہا۔ ”میں اندر چلی جاتی ہوں کیونکہ مجھے اپنی بیٹی عنان کے ساتھ تیرے باپ اور اپنے شوہر کا غم منانا ہے۔ تو یونس اور اپنی محبوبہ کو اندر بلالے اور میرے آدمی ان کے لیے کمروں کا انتظام بھی کردیں گے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔“

اس کے بعد وہ اپنی بیٹی عنان کو اپنے ساتھ لے کر کسی دوسرے کمرے میں چلی گئی اور لیث نے یونس اور خنسا کو اندر بلالیا۔ یہاں اس نے یونس سے پہلی بات یہ کہی کہ میری ماں کی نظر میں تو میرا بڑا بھائی یعقوب ہے اور میں نے تیرا نام بدل کر یونس رکھ دیا ہے۔ اب خبردار جو تو نے کوئی اور داستان سنائی۔ اگر تو نے ایسی کوئی غلطی کی تو پھر ہم دونوں کا یہاں رہنا محال ہوجائے گا۔“

یونس نے جواب دیا۔ ”میں تو وہی کہوں گا جس کا تو مجھے حکم دے گا۔“

اس کے بعد خنسا سے کہا۔ ”اور میں نے تیری بابت صاف صاف بتادیا ہے کہ تو میری محبوبہ ہے۔ میں نے تجھے لونڈی نہیں کہا، تو میری محبوبہ ہے جس سے میں عنقریب شادی کرنے والا ہوں۔“

خنسا نے فرطِ جذبات میں کہا۔ ”لیث! تو شاندار انسان ہے۔“

اندر کہرام برپا ہوگیا۔ بعد میں اس غم میں دربان بھی شامل ہوگئے۔ لیث اور یونس نے مال وزر کے مشکیزے بحفاظت اپنے کمرے میں رکھوادیے اور تینوں آپس میں باتیں کرنے لگے۔ یونس کو ایک اور ہی فکر لاحق تھی۔ وہ جلد از جلد کوئی ایسی صورت روبہ عمل میں لانا چاہتا تھا جس سے وہ واقعی لیث کے بھائی کی طرح مال وزر اور جائداد میں حصے دار ہوجائے لیکن لیث اس کی خاموشی اور فکرمندی کا کوئی اور ہی مطلب لے رہا تھا۔ خنسا اس قصر کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر سوچ رہی تھی، کاش یہ سب کچھ یونس کا ہوتا اور وہ لیث کے بجائے یونس کے اختیار میں ہوتی۔

لیث کی سوتیلی ماں غم منا چکنے کے بعد اپنے اور اپنی بیٹی کے مستقبل کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس کا کوئی بیٹا نہیں تھا، لیث کی آمد کو وہ ایک طرح سے خطرہ بھی سمجھ رہی تھی۔ اس نے سوچا کہیں یہ دونوں بھائی بغداد کے کاروبار اور جائداد پر قبضہ کرنے تو نہیں آگئے۔ حالات اور وقت کی نزاکت کے پیشِ نظر وہ کسی بھی جھگڑے سے بچنا چاہتی تھی۔ وہ لیث اور یونس سے ملی، دونوں سے باتیں کیں اور اس بات کا اندازہ لگانے لگی کہ دونوں بھائیوں میں ہوشیار اور چالاک کون زیادہ ہے؟ دیکھنے اور باتیں کرنے میں یونس زیادہ ہوشیار اور عقل مند محسوس ہوتا تھا اور سادگی اور بھولے پن میں لیث کا کوئی جواب نہیں تھا پھر یہ بات لیث کی ماں کے لیے بڑی عجیب اور حیران کن تھی کہ پھر چھوٹا بھائی اپنے بڑے بھائی پر حکم کیوں چلاتا ہے؟

ادھر یونس اور لیث نے عنان کو دیکھا جو حسن کا شہ پارہ تھی۔ آواز میں کھنک، چال میں لچک، ہنستی تو دونوں رخساروں میں گڑھے پڑجاتے، مسکراتی تو بجلیاں سی کوند

جاتیں، چلتی تو دونوں کے دلوں کی دھڑکنیں رک جاتیں۔ عنان، لیث کی سوتیلی بہن تھی۔ باپ دو، مائیں الگ الگ۔ اس طرح عنان اس کی بیوی بن سکتی تھی۔

دوسری طرف یونس تھا، جس کا بظاہر عنان سے وہی رشتہ تھا جو لیث کا لیکن لیث جانتا تھا کہ یونس کا عنان پر کوئی حق نہیں اور یونس یہ سمجھتا تھا کہ لیث چونکہ خنسا کو پاچکا ہے اور وہ یونس کو اپنا بھائی بناچکا ہے اس لیے یہ بہترین موقع تھا کہ لیث، عنان کی یونس سے شادی کرواکے اس رشتے کو مضبوط کردے۔ عنان کی ماں نے یونس کو تیز طرار محسوس کرکے اس کو اپنی بیٹی کے لیے پسند کرلیا تھا۔ خنسا اس تماشے کو دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کسی بھی مرحلے پر فیصلہ کن کردار ادا کرسکتی ہے کیونکہ اس کا جو اثر لیث پر تھا وہی یونس پر۔ وہ عنان اور اس کی ماں کا قصہ کسی بھی وقت پاک کرسکتی ہے۔

بغداد میں لیث کے باپ کے دو کاروبار تھے۔ ہیرے جواہرات کا اور سونے چاندی کے زیوارت کا۔ اس کاروبار کی نگرانی لیث کا باپ خود کیا کرتا تھا اور اس کی عدم موجودگی میں یہ کام عنان کی ماں انجام دیتی تھی۔ اب لیث نے مطالبہ کیا کہ یہ ذمے داریاں بھی اس کے سپرد کردی جائیں لیکن عنان کی ماں اس پر تیار نہ ہوئی۔ اس نے کہا۔ ”کام جس طرح چل رہا ہے اسے اسی طرح چلنے دیا جائے۔ تم دونوں کا حصہ بصورت نفع ملتا رہے گا۔“

لیث نے یونس کی عدم موجودگی میں کہا۔ ”لیکن ماں! آپ نفع مجھے دیں گی صرف مجھے۔ یونس کا نفع میں ہی وصول کروں گا اور میں جتنا مناسب سمجھوں گا یونس کو بھی دے دوں گا۔“

ماں نے حیرت سے کہا۔ ”لیث! میں ایک بات شدت سے محسوس کررہی ہوں۔ معلوم نہیں اس کا صحیح جواب کون دے گا۔ تو یا تیرا بڑا بھائی یونس۔“

لیث نے جواب دیا۔ ”دونوں کی طرف سے جواب میں ہی دوں گا۔“

ماں نے کہا۔ ”بڑا بھائی یونس ہے لیکن حکم تیرا چلتا ہے، آخر کیوں؟“

لیث نے جواب دیا۔ ”میرے باپ نے مرنے سے پہلے یہ وصیت کی تھی کہ اس کے مال وزر اور کاروبار میں فیصلہ اور حکم میرا چلے گا اور میرا بڑا بھائی یونس وہی پائے گا جو میں خود سے دے دوں گا۔“

ماں نے حیرت سے پوچھا۔ ”آخر کیوں؟“

لیث نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے آہستہ سے جواب دیا۔ ”میرا باپ یونس کو گستاخ اور ناخلف سمجھتا تھا اور یہ بھی کیونکہ باپ کی موت کے وقت یونس ان کے پاس موجود نہیں تھا اور پھر یہ اپنے حصے کا بیشتر حصہ کھا اڑا چکا ہے۔“

ماں نے کہا۔ ”خوب، مجھے یہ سب نہیں معلوم تھا۔“

لیث نے کہا۔ ”اس لیے میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ میری رائے اور مشورے کے بغیر یونس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کیجیے گا۔“

ماں لیث کی باتوں سے مطمئن نہیں ہوئی۔ دل میں شبہات کا کانٹا کھٹک رہا تھا، بولی۔ ”بہتر ہے، میں تجھ سے مشورہ کرلیا کروں گی۔ یوں بھی یونس کو بھی سمجھاؤں گی کہ آخر وہ زندگی کے معاملوں میں سنجیدگی کیوں نہیں اختیار کرتا۔“

لیث نے پھر منع کیا۔ ”نہیں، نہیں ماں! ایسی کوئی بات نہیں کیجیے گا کیونکہ یونس پر کسی نصیحت کا بھی اثر نہ ہوگا۔“

دوسری طرف یونس، لیث میں تبدیلیاں محسوس کررہا تھا۔ اب وہ زیادہ دیر تک طفیلی بن کر رہنا نہیں چاہتا تھا۔ لیث اس کو ساتھ لے کر سونے چاندی کے زیورات اور ہیرے جواہرات کے بازاروں میں لے گیا۔ راستے میں یونس نے لیث سے اپنا ذکر شروع کردیا، بولا۔ ”لیث! کیا تو اب بھی اپنے اس عہد پر قائم ہے کہ میں تیرا بھائی ہوں؟“

لیث نے جواب دیا۔ ”میں غلط وعدے نہیں کرتا۔ میں نے تجھے بھائی بنایا ہے تو مرتے دم تک بھائی کہوں گا اور بھائی سمجھوں گا۔“

یونس نے افسردگی سے کہا۔ ”لیث! مجھے آزمائش میں نہ ڈال اور ایک فیصلہ فوراً کرڈال۔“

لیث نے پوچھا۔ ”کون سا فیصلہ؟“

یونس نے جواب دیا۔ ”جیسا کہ تو خود کہتا ہے اور ایک زمانے سے کہتا بھی رہا ہے۔ مجھے اپنا بھائی بنالے عملاً سرکاری کاغذات کے ذریعے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو بدرجہ مجبوری میں کہیں اور چلا جاؤں گا کیونکہ میں زندگی بھر طفیلی بن کر نہیں رہ سکتا۔“

لیث نے کہا۔ ”یونس! تو میرا بڑا بھائی ہے اس میں طفیلی بننے کی کیا بات ہے؟“

یونس نے چڑ کر پوچھا۔ ”میں کس طرح تیرا بڑا بھائی ہوں؟ میں کس طرح یہ ثابت کروں گا کہ میں تیرا بڑا بھائی ہوں۔“

لیث نے جواب دیا۔ ”یہ ثابت کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ بس میں نے کہہ جو دیا کہ تو میرا بڑا بھائی ہے۔“

یونس نے بڑے افسوس سے کہا۔ ''میں تیرا بڑا بھائی نہیں ہوں، میں صرف طفیلی ہوں۔''

لیث نے یونس کو گلے لگا لیا اور فرطِ جوش میں چمٹا کر بولا۔ ''بول! میں کیا کروں جس سے تجھے یہ یقین آجائے کہ میں تجھے اپنا بڑا بھائی سمجھتا ہوں۔''

یونس نے جواب دیا۔ ''میں اور کچھ نہیں چاہتا، بغداد کے کاروبار اور جائداد میں ایک حبہ، شمہ برابر بھی نہیں چاہتا۔ تو اہواز سے جو کچھ لایا ہے اس میں کا نصف مجھے دے دے۔ تب میں سمجھوں گا کہ تو میرا چھوٹا بھائی ہے اور میں تیرا بڑا بھائی۔''

لیث ہنس دیا اور اور یونس کی پیشانی چوم لی، بولا۔ ''بس اتنی ذرا سی بات..... بھائی یونس! تو اہواز کے مال و زر کا نصف مانگ رہا ہے میں بغداد کے مال و زر میں بھی تجھے شریک کرنا چاہتا ہوں۔''

یونس نے بے نیازی سے کہا۔ ''زیادہ کی میں ہوس نہیں رکھتا۔ میں جو کچھ مانگ رہا ہوں اگر یہی مل جائے تو میں زندگی بھر تیرا احسان مند رہوں گا۔''

لیث نے کہا۔ ''احسان مند ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے تجھے اپنا بھائی بنایا ہے تو ہر طرح سے اسے نباہوں گا۔''

یونس، لیث سے اپنی باتوں کو منوا لینا آسان سمجھتا تھا لیکن اب بڑی مشکل پیش آرہی تھی اور مشکل کا سبب بھی لیث کی یہی نرمی اور ملائمت ہی تھی۔

یونس سرو ست خاموش ہوگیا۔ لیث نے یونس سے کہا۔ ''اچھا تو یہ کر کہ بغداد کے بازاروں میں گھوم پھر کر یہ جائزہ لے کہ تو اگر تجارت کرے تو تیرے لیے کون سا پیشہ مناسب رہے گا۔''

یونس نے جواب دیا۔ ''میں تاجر نہیں بنوں گا کیونکہ شاید میرے خاندان میں کسی نے تجارت نہیں کی۔''

لیث نے پوچھا۔ ''پھر تو کیا کرے گا؟ ملازمت کرے گا؟''

یونس نے جواب دیا۔ ''ہاں شاید ملازمت کرلوں لیکن میں ملازمت بھی کوئی ایسی ویسی نہیں کروں گا۔''

لیث نے اصرار کیا۔ ''پھر بھی میری خواہش ہے کہ تو بغداد کے بازاروں کا جائزہ لے۔ میں کاروبار کرنا چاہتا ہوں اور اس وقت تک میں کچھ نہیں کرسکتا جب تک کہ میں یہاں کے بازاروں سے واقف نہ ہوجاؤں۔''

یونس نے جواب دیا۔ ''تو اصرار کرتا ہے تو چلا جاؤں گا ورنہ میں اپنے لیے بازار کا جائزہ لینا پسند نہیں کرتا۔''

یونس اسی وقت چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی لیث نے خنسا سے کہا۔ ''خنسا! میں نے بوڑھے غلام کو اپنے ساتھ نہ لا کر سخت غلطی کی ہے۔ وہ مردم شناس اور دوسروں کے مقابلے میں میرا سب سے زیادہ ہمدرد اور خیر خواہ ہے۔''

لیکن خنسا نے یونس کی تائید کی، بولی۔ ''میری نظر میں یونس سے زیادہ تیرا کوئی ہمدرد نہیں۔''

لیث نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ''اپنا اپنا خیال، اپنی اپنی رائے۔''

قصر کے عقب میں ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا۔ وہاں صبح و شام قصر والوں کی نشست رہتی اور یہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں دنیا بھر کے مسائل زیرِ بحث رہتے اور بڑے بڑے فیصلے کیے جاتے۔ چنانچہ عصر سے بھی پہلے لیث وہیں جا کر بیٹھ گیا۔ یونس اور لیث کی ماں بازار گئے ہوئے تھے۔ خنسا اور عثمان گھر ہی میں تھے۔ خنسا بھی لیث ہی کے پاس پہنچ گئی۔ لیث نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ وہ کچھ دیر لیث کے پاس ہی چپ چاپ بیٹھی رہی۔ جب وہ کسی طرح مخاطب ہی نہ ہوا تو خنسا نے تنگ کر پوچھا۔ ''کیا میں چلی جاؤں؟''

لیث کی نظریں چنبیلی کے پودے پر جمی ہوئی تھیں، خنسا کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''کوئی مضائقہ نہیں، جاسکتی ہو۔''

خنسا نے کہا۔ ''کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آخر یہ بے زاری کیوں؟''

لیث نے جواب دیا۔ ''اس کا سبب بھی تمہیں بہت جلد معلوم ہوجائے گا۔''

''ابھی کیوں نہیں، آخر یہ تکلف کیوں؟''

''ہر بات کا ایک وقت ہوتا ہے خنسا۔ اس بات کا بھی وقت آجائے گا۔''

خنسا غصے میں کھڑی ہوگئی۔ لیث! میں تیری بے التفاتیوں سے عاجز آگئی ہوں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تو عثمان میں دلچسپی لینے لگا ہو؟''

''یہ عین ممکن ہے..... اپنے دل کو ٹٹول کر یہی سوال میں اپنے آپ سے بھی کرتا رہتا ہوں، جس دن بھی اس کا صحیح جواب مل جائے گا میں خود کو ہلکا اور مطمئن محسوس کرنے لگوں گا۔''

خنسا غصے میں چلی گئی تو لیث نے ذرا زور سے کہا۔ ''خنسا سنتا تو، میرا ایک کام کردے۔''

خنسا نے پوچھا۔ ''کون سا کام؟''

لیث نے جواب دیا۔ ''اب اگر تو ادھر جا رہی ہے تو عنان کو میرے پاس بھیج دینا۔''

خنسا سناٹے میں آ گئی، کچھ دیر خاموش کھڑی رہی پھر بولی۔ ''میں عنان کو تو بھیج دوں گی لیکن اس موضوع پر بات کسی اور ہی دن کو ہو گی۔''

لیث نے جواب دیا۔ ''بے شک، میں تیار ہوں۔''

خنسا چلی گئی اور کچھ دیر بعد عنان کو لیث کے پاس بھیج دیا۔ اس نے آتے ہی بڑی بے تکلفی سے پوچھا۔ ''لیث! کیا تو نے مجھے بلوایا تھا یا یہ بات خنسا نے اپنی طرف سے کہہ دی؟''

لیث نے پُرشوق نظروں سے عنان کو دیکھا، بولا۔ ''عنان! بیٹھ میں نے ہی تجھے بلوایا تھا۔''

عنان نے پوچھا۔ ''کیوں، کوئی خاص بات؟''

لیث نے جواب دیا۔ ''عنان! میں تجھ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تو اجازت دے تو ورنہ میں اس پر تجھے مجبور نہیں کروں گا۔''

عنان نے کہا۔ ''کیجیے باتیں، میں سنوں گی اور ان کے جواب دوں گی۔''

لیث نے کہا۔ ''یہ بالکل درست ہے نا کہ تیرا باپ کوئی اور تھا اور تو میرے باپ کی بیٹی نہیں ہے؟''

عنان نے جواب دیا۔ ''ہاں، یہ بات بالکل درست ہے۔ ذرا بھی جھوٹ نہیں۔''

لیث نے اثر انگیز پیرائے میں کہا۔ ''عنان! میرا باپ تیرا ذکر اکثر کرتا رہتا تھا اور اس ذکر میں بڑی مٹھاس اور مزہ ہوتا تھا۔ میرا باپ کہتا تھا کہ تیرے حسن کا بھی کوئی جواب نہیں۔''

عنان نے شرما کر کہا۔ ''ہو سکتا ہے، تیرے باپ نے میری تعریف کی ہو لیکن میں تو یہ جاننا چاہتی ہوں کہ آخر اس بات کا مطلب کیا ہے؟''

لیث نے کہا۔ ''اور جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ بڑی لمبی باتیں ہیں مگر نہیں میں تیری ماں سے کروں گا۔''

عنان نے کہا۔ ''میری باتیں، میرے خلاف ہوں یا تائید میں، سامنے ہی ہونا چاہئیں۔''

لیث کی زبان لڑکھڑانے لگی، بولا۔ ''میں کون مخالفت کرنے والا۔''

عنان نے جواب دیا۔ ''بھائی لیث! اب میں آپ کو بھی خوب جانتی ہوں۔''

لیث نے پوچھا۔ ''تو مجھے کس طرح مطلع کرے گی؟''

عنان نے شرما کر جواب دیا۔ ''میں پورے دن گھر ہی میں رہتی ہوں۔''

لیث نے بڑی گرم جوشی سے کہا۔ ''اب تو جاننا ہی چاہتی ہے تو ساری روداد مجھ سے سن لے۔''

عنان نے سر جھکا کر جواب دیا۔ ''بسم اللہ، شروع کیجیے۔''

لیث نے کہا۔ ''میرا باپ مجھ سے کہا کرتا تھا کہ تیری دلہن بغداد میں ہے۔ میں ایک عرصے تک باپ کی یہ بات نہیں سمجھ سکا لیکن اب جبکہ میں بغداد آ چکا ہوں اور میں تجھے اپنے روبرو دیکھ رہا ہوں تو مرحوم باپ کی وہ بات سمجھ میں آ گئی۔''

عنان نے جواب دیا۔ ''پتا نہیں تیرے باپ نے یہ بات تجھ سے کہی تھی یا یونس سے کیونکہ یونس میری ماں سے کہہ رہا تھا کہ مرحوم باپ نے میرا رشتہ یونس سے طے کر دیا تھا اور ماں اس بات سے اتفاق کر رہی ہے۔''

لیث چوکنا ہو گیا، حیرت سے پوچھا۔ ''ان دونوں میں یہ بات کب ہوئی؟''

عنان نے جواب دیا۔ ''کئی دن ہوئے۔ شاید میری ماں یونس کو پسند بھی کرتی ہے۔''

لیث کو غصہ آ گیا، بولا۔ ''ایسا نہیں ہو سکتا، یونس کو یہ باتیں میری لاعلمی میں کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اگر وہ میرے ساتھ بھی وہی کر رہا ہے جو دوسروں کے ساتھ کر چکا ہے تو میں اسے مزہ چکھا دوں گا۔''

عنان خاموش رہی لیکن اس کے انداز سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ خود بھی اپنی ماں کے فیصلے سے متفق نہیں ہے۔

اس وقت لیث کا غصے سے برا حال تھا۔ وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اس نے ایک دم عنان کو دونوں شانوں سے پکڑ لیا، پوچھا۔ ''عنان! تجھے خدا کی قسم، سچ سچ بتا کیا تو بھی یونس کو پسند کرتی ہے؟ کیا تو نے بھی اس سے کوئی وعدہ کر لیا ہے؟''

عنان نے جواب دیا۔ ''میرے شانے کیوں پکڑتا ہے؟ انہیں چھوڑ دے۔''

لیث نے انہیں مضبوطی سے پکڑے رکھا اور جھٹکا دے کر پوچھا۔ ''یہ میری بات کا جواب تو نہیں ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا تو نے بھی یونس کو پسند کر لیا ہے؟ تو نے تو یونس سے کوئی وعدہ نہیں کر لیا؟''

عنان نے اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی، بولی۔ ''یہ تجھے ہو کیا گیا؟ چھوڑتا کیوں نہیں؟ میں نے یونس سے کوئی وعدہ نہیں کیا اور نہ ہی مجھے وہ پسند ہے۔''

لیث نے اسے چھوڑ دیا، بولا۔ ''اگر یہ بات ہے تو مجھے کوئی فکر نہیں بس ایک بات اور بتا دے؟''

عنان نے پوچھا۔ ''وہ کیا...... کون سی بات؟''

لیث نے جواب دیا۔ ''جب میں تجھ سے یہ کہتا ہوں کہ میرے مرحوم باپ نے تجھے میرے لیے پسند کر لیا تھا تو یہ سن کر تیرے احساسات کیا ہوتے ہیں؟''

عنان نے کہا۔ ''تو اپنی محبوبہ خنسا کو اپنے ساتھ لیے پھرتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ تو اس سے شادی کرنے والا ہے جب یہ بات ہے تو تو میرے خواب کیوں دیکھتا ہے؟''

لیث چکرا گیا، گھبرا کر بولا۔ ''اچھا، اگر میں یہ کہوں کہ میں خنسا سے شادی نہیں کروں گا، تب پھر تو کیا کہے گی؟ پھر تیرا فیصلہ کیا ہو گا؟''

عنان مسکرانے لگی۔ ''زبان کھولنے سے پہلے یہ ضرور سوچ لیا کر تیری باتوں کا مخاطب پر اثر کیا پڑے گا۔''

لیث معصومیت سے بولا۔ ''کیا اثر پڑے گا؟ میں تیرا مطلب نہیں سمجھا عنان؟ تو کہنا کیا چاہتی ہے؟''

عنان نے جواب دیا۔ ''تو ایک طرف تو خنسا کو اپنی محبوبہ کہتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ اس سے شادی کرنے والا ہے۔ دوسری طرف مجھے دیکھ کر پھسلا تو یہ کہنے لگا کہ اگر میں کہوں تو، تو اس سے شادی نہیں کرے گا۔ آخر بات کیا ہوئی، جب تیرے عہد و پیمان اتنے ہی بودے ہیں تو پھر میں تجھ پر کیسے اعتبار کروں گی۔''

لیث، عنان کے اعتراض پر بوکھلا گیا۔ اب فرار کی کوئی راہ نہ تھی۔ ''اگر تو ہامی بھر لے اور مجھے یہ یقین دلا دے کہ اگر میں کسی طرح تجھے مطمئن کر سکا تو، تو میری رفاقت پر آمادہ ہو جائے گی تو میں وہ سب کچھ تجھے بتا دوں گا جس سے میں، یونس اور خنسا کے علاوہ چوتھا واقف نہیں ہے اور اگر تینوں کے علاوہ کوئی واقف بھی ہے تو ہمارے آس پاس نہیں ہے، کہیں بہت دور ہو گا۔''

عنان نے بے دلی سے جواب دیا۔ ''میں تیری وہ داستان بھی سن لوں گی جو یقیناً اپنی بے گناہی اور معصومیت کو ثابت کرنے کے لیے تیری دماغی اختراع ہو گی لیکن آج اس وقت نہیں پھر کسی وقت۔''

لیث سب کچھ اسی وقت بتا دینے کے لیے بے چین تھا، بولا۔ ''عنان! میں تیرا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔''

عنان نے جواب دیا۔ ''مگر میں اس وقت کچھ بھی نہیں سنوں گی، پھر کسی وقت۔''

لیث نے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا لیکن عنان نے جھٹک دیا اور ذرا فاصلے پر جا کھڑی ہوئی، بولی۔ ''دور سے بات کر، ابھی تک تو میں اس غلط فہمی میں تھی کہ یونس بڑا باتونی اور شاطر ہے لیکن اس وقت کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ تو بھی کم نہیں، واقعی اس کا چھوٹا بھائی ہے۔''

لیث نے انکار کیا۔ ''نہیں، میں اس کا چھوٹا بھائی نہیں ہوں۔ میں تم سب کی یہی غلط فہمی تو دور کرنا چاہتا ہوں۔''

عنان نے جاتے ہوئے کہا۔ ''غلط، تم دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ حرکتیں یکساں ہیں، یونس بھی شانے پکڑ کر جھنجوڑتا ہے تو بھی یہی کرتا ہے۔ یونس بھی میرا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرتا ہے تیری بھی یہی عادت ہے۔ میں کس طرح مان لوں کہ تم دونوں بھائی نہیں ہو۔''

عنان چلی گئی لیکن لیث پر چند انکشافات ہو گئے۔ اندر ہی اندر، در پردہ یونس بھی عنان کو قابو میں کر لینے کی کوشش کر رہا ہے۔ یونس نے عنان کی ماں سے شادی کی بات بھی کر لی ہے اور اسے کسی بات کی خبر ہی نہیں۔ اس موقع پر اسے اپنے غلام کی بات یاد آئی جو بار بار یہی کہتا تھا کہ یونس قابل اعتبار نہیں ہے، یہ تجھے تباہ و برباد کر دے گا۔

پھر اسے یونس کے باپ قاضی لبیب بغدادی کی باتیں یاد آئیں اور قاضی لبیب کے اس محرر کی بھی جس سے نہر بلد کے کنارے بات ہوئی تھی۔ اب اسے احساس ہونے لگا تھا کہ یونس قابل اعتبار نہیں ہے۔ یونس اندر ہی اندر جو کچھ کر رہا ہے اگر اس میں کامیاب ہو جائے تو لیث کہیں کا بھی نہ رہے گا کیونکہ عنان کا شوہر بن جانے کے بعد وہ اس کے باپ کے پورے کاروبار پر قبضہ کر سکتا ہے۔ لیث جذباتی ہو گیا لیکن پھر یونس کے خوف نے اس کی جذباتیت کو زائل کر دیا اور اس نے یہ فیصلہ کیا کہ اب جو کچھ بھی کرنا ہے ہوشیاری، چالاکی، عقلمندی اور غیر جذباتی انداز میں کرنا ہے کیونکہ جوش اور جذبے سے یونس کو نہیں پچھاڑا جا سکتا۔

☆☆☆

لیث نے پہلا کام یہ کیا کہ یونس کے باپ کا عاق نامہ چرا لیا اور دوسرا یہ کہ یونس سے تعلقات زیادہ خوشگوار کر لیے اور یوں بن گیا گویا اسے یونس کی کسی بات کا پتا ہی نہیں۔ دوسری طرف اس فکر میں رہا کہ موقع ملتے ہی وہ سب کچھ عنان کو بتا دے اور اسے اپنے اعتماد میں لینے کی کوشش کرے۔ لیث کو عنان کی ماں اور یونس کی باتوں سے یہ

اندازہ ہونے لگا تھا کہ ان دونوں آپس میں کوئی اہم فیصلہ کرلیا ہے۔ لیث سوچ رہا تھا کہ آخر یونس میں وہ کون سی بات ہے جس سے عنان کی ماں اس پر بہت زیادہ ملتفت ہوگئی ہے۔ ہاں، عنان ان دونوں سے الگ تھلگ اور بے زار بے زاری نظر آرہی تھی۔

خنسا بھی قصر کے ماحول کی کشیدگی اور جوڑ توڑ کو اچھی طرح محسوس کررہی تھی اور یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ اسے اس میں کوئی بھی شریک نہیں کررہا تھا اور نہ ہی اعتماد میں لینے کی ضرورت محسوس کرتا تھا۔ خنسا کے مزاج میں چڑچڑاپن اور جھنجلاہٹ آگئی تھی۔ وہ لیث اور یونس دونوں ہی سے ناراض تھی۔ اسے بڑا غصہ تھا کہ ان دونوں نے ایک مال وزر رکھنے والی لڑکی کے پیچھے اسے بالکل نظرانداز کردیا تھا۔ ایک بے ہنر کم تعلیم یافتہ لیکن دولت رکھنے والی لڑکی کے لیے۔

اس دوران عنان کی ماں بیمار پڑگئی اور اتنی سخت بیمار ہوئی کہ بچنے کی امید نہ رہی۔ بغداد کے نامی گرامی طبیبوں نے اس کا علاج کیا لیکن مرض کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس کے علاج میں لیث نے سستی مگر یونس نے چستی دکھائی۔ لیث اپنی سوتیلی ماں سے ناراض تھا کیونکہ اس نے یونس کو اپنے اعتماد میں لے رکھا تھا اس لیے اگر وہ مر بھی جائے تو اس سے لیث کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تھا اور وہ عنان سے شادی کرکے بڑی آسانی سے اپنے باپ کی جائداد اور کاروبار پر قبضہ کرسکتا تھا۔

لیکن یونس اپنی ماں کی خدمت گزاری میں مصروف تھا۔ اس نے اپنی توقعات اور امیدیں لیث سے توڑ کر اس بیمار عورت سے لگا رکھی تھیں۔ اب اگر یہ بھی جدا ہوجاتی تو وہ ایک بار پھر ایک بڑے سہارے سے محروم ہوجاتا تھا۔

عنان کو اپنی ماں کی زندگی عزیز تھی اور اسے لیث کی بے حسی اور بے پروائی اچھی نہیں لگی۔ اس کے ساتھ ہی وہ یونس کی خدمت گزاری اور تیمارداری کو ایک قسم کی خوشامد اور مطلب برآری کا عمل قرار دے رہی تھی۔ خنسا ہر ایک سے ناراض تھی۔ اس پورے ماحول سے جس نے اسے نظرانداز کررکھا تھا۔

جب عنان کی ماں کا مرض لاعلاج نظر آنے لگا تو یونس نے ایک بار پھر لیث سے وہی پرانا ذکر چھیڑ دیا۔ اس نے لیث سے غیرمعمولی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے لیث سے کہا۔ "لیث! خدا کے لیے ماں کے لیے کچھ کر۔ میں اس کے علاج اور تیمارداری میں غیرمعمولی دلچسپی یوں لے رہا ہوں کہ میں تیرا بھائی اور اس کا بیٹا ہوں۔ وہ سوتیلا ہی بیٹا سہی لیکن بیٹا تو ہوں۔"

لیث اپنے عناد کو چھپائے رکھنا چاہتا تھا کیونکہ اس کے لیے اپنے خیال میں ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا، جواب دیا۔ "بھائی یونس! ماں کے علاج کے سلسلے میں تو نے مجھ سے زیادہ کوششیں کی ہیں اور اس کا جو نتیجہ ہے وہ بھی ہمارے سامنے ہے۔ اب تو ہی بتا کہ اب اور کیا کیا جاسکتا ہے؟"

یونس واقعی بہت پریشان تھا، بولا۔ "لیث! کچھ بھی ہو، ماں کو اچھا ضرور ہونا چاہیے۔"

لیث نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "اگر مشیت ایزدی یہی ہے کہ ماں ہم سے جدا ہوجائے تو ہم سب مجبور اور بے بس ہیں۔ ہمیں صبر کرلینا چاہیے۔"

یونس نے لیث کو چمٹالیا، بولا۔ "لیث! بار بار کہتے شرم آتی ہے لیکن میرے خیال میں اب ہم دونوں کو باقاعدہ بھائی بن جانا چاہیے۔ مواخات سنتِ رسول (صلعم) ہے۔ آخر مہاجرین کو انصار نے اپنا بھائی بنایا تھا۔"

لیث نے بھی گرم جوشی دکھائی، بولا۔ "جب میں نے تجھ سے بار بار یہی کہا ہے کہ تو میرا بھائی ہے تو، تو اس میں شک وشبہ کیوں کرتا ہے؟"

یونس نے کہا۔ "معلوم نہیں کیوں، مجھے شبہ رہتا ہے۔ آخر اس کا عملی مظاہرہ بھی تو کوئی چیز ہے۔"

لیث نے جواب دیا۔ "میں نے تجھے اپنے اس قصر میں بھائی کی طرح رکھا ہے۔ میری سوتیلی ماں تجھے بھی میرا بھائی اور اپنا سوتیلا بیٹا سمجھتی ہے۔ عنان بھی تجھے اپنا بھائی سمجھتی ہے، اب اس کے بعد بھی کسی عملی مظاہرے کی ضرورت باقی رہتی ہے؟"

یونس نے کہا۔ "ہاں، اس کے بعد بھی عملی مظاہرے کی ضرورت باقی رہتی ہے۔"

لیث نے پوچھا۔ "وہ کس طرح، کس عملی مظاہرے کی؟"

یونس نے جواب دیا۔ "میں چاہتا ہوں کہ مجھے بھائی ہونے کا حق مل جائے۔ میں نے اہواز میں تیرا بہت ساتھ دیا اور اس محبت اور خلوص کے صلے میں تو نے یہ اعلان کیا کہ تو نے مجھے اپنے بڑے بھائی یعقوب کی جگہ دے دی ہے۔"

لیث نے کہا۔ "میں نے جو کچھ کہا تھا، مجھے یاد ہے اور میں اپنا وعدہ ضرور پورا کروں گا لیکن ابھی نہیں۔"

یونس نے پوچھا۔ "پھر کب؟"

لیث نے جواب دیا۔ "میں بتادوں گا۔"

یونس نے کہا۔ "بہتر ہے، اب میں اس سلسلے میں کبھی بھی کوئی بات نہ کروں گا۔"

ان دونوں نے سلسلۂ گفتگو کچھ اس طرح اچانک ختم کیا، جس سے یہ اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ دونوں ایک دوسرے سے صاف نہیں ہیں اور یونس کی طرف سے ایک قسم کا اعلان جنگ ہوچکا ہے۔ اس خاموش اعلان جنگ کو لیث نے بھی محسوس کرلیا۔ کچھ خوف بھی محسوس کیا لیکن اس نے یونس کے عاق نامے کو اپنے قبضے میں کررکھا تھا اس لیے کچھ ہمت آگئی۔

☆☆☆

یونس نے ماں کے علاج کے سلسلے میں خلافت کے مختارِکل عضدالدولہ کے خاص طبیب تک رسائی حاصل کرلی۔ اس طبیب کے لیے اس کو اپنے باپ قاضی لبیب بغدادی کا سہارا لینا پڑا۔ اس نے رو رو کر باپ سے درخواست کی کہ وہ اس کی مدد کرے کیونکہ اس علاج پر اس کے مستقبل کا انحصار ہے۔ قاضی کو رحم آگیا اور اس نے عضدالدولہ سے کہلوا کر شاہی طبیب کو ساتھ کردیا۔ شاہی طبیب اور قصر مغیث کی بیوہ کا علاج۔ دیکھنے والوں کو حیرت ہوگئی۔ خود لیث بھی حیرت زدہ رہ گیا اور خاصا مرعوب ہوا۔ ماں خود کو احسان مند محسوس کرنے لگی۔

شاہی طبیب کا علاج کارگر ہوا اور ماں آہستہ آہستہ صحت یاب ہونے لگی۔ یونس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ عنان بھی بہت خوش تھی لیکن لیث ملول تھا۔ عنان، یونس کی شکر گزار تھی اور اس واقعے نے اس کو یونس کی طرف کسی حد تک مائل کردیا۔

خنسا نے جب یہ محسوس کیا کہ اب یونس کا قابو میں آنا مشکل ہوگیا ہے اور قصر کی ان گن سے یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ عنان کو یونس سے وابستہ کردیا جائے گا تو وہ لیث کی دلجوئی کرنے لگی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس معرکے میں لیث کی حیثیت مضبوط اور مرکزی ہے۔ وہ یونس سے سخت ناراض تھی جس نے دولت کی ہوس میں خنسا کو نظرانداز کردیا تھا۔

لیث نے یونس کو اپنی ماں کے کمرے میں جاتا دیکھا تو غصے سے برا حال ہوگیا۔ اس کے ساتھ قدم بقدم شاہی طبیب بھی چل رہا تھا۔ لیث کے پیچھے خنسا بھی کھڑی تھی اور وہ لیث کے جذباتی تلاطم کا کامیاب اندازہ لگاچکی تھی۔ لیث بڑبڑایا، بولا۔ "یونس! تو سب کچھ کرکے دیکھ لے، آخری وار میں کروں گا اور ایسا بھرپور کروں گا کہ مجال ہے جو سنبھلے۔"

خنسا نے بڑی محبت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا، بولی۔ "بے شک، یہ اسی کا مستحق ہے احسان فراموش کہیں کا۔"

لیث نے چونک کر پیچھے دیکھا اور خنسا کو موجود دیکھ کر زبردستی مسکرایا، بولا۔ "تو کیا سمجھی؟ میں کیا کہہ رہا تھا اور کیوں کہہ رہا تھا اور کس کو کہہ رہا تھا؟"

خنسا نے جواب دیا۔ "لیث! میں بچی یا احمق نہیں ہوں تو یونس کو کہہ رہا تھا اور کیوں کہہ رہا تھا، یہ بات بتانے کی نہیں سمجھنے کی ہے۔ کیا میں بتاؤں؟"

لیث اس ماحول میں خود کو بالکل تنہا محسوس کررہا تھا۔ خنسا کی اپنائیت کا انداز خاصا تسلی آمیز ثابت ہوا، بولا۔ "خنسا! ان حالات میں، میں کیا کروں؟ کچھ تو مشورہ دے۔"

خنسا نے شکایت آمیز پیرائے میں کہا۔ "افسوس کہ تو نے مجھے اپنا سمجھا ہی نہیں۔ تو نے اہواز میں میرے سامنے بے پناہ محبت کا اظہار ہی نہیں دعویٰ بھی کیا تھا پھر جب ہم یہاں بغداد کے قصر مغیث میں اترے تو، تو نے میرا جس طرح تعارف کروایا اس میں بھی تیری بے پناہ محبت موجود تھی لیکن جب ہمارے درمیان عنان آگئی تو میں نے خود کو تنہا محسوس کرنا شروع کردیا اور اگر میں صاف صاف کہوں تو یہی کہوں گی کہ تم دونوں ہی عنان کے چکر میں دیوانے، از خود رفتہ ہوگئے ہو اور میری طرف سے غفلت اختیار کی۔"

لیث نے بڑی محبت سے کہا۔ "آ، ہم دونوں اندر بیٹھ کر باتیں کریں اور میں کوشش کروں گا کہ تیری غلط فہمیاں دور کردوں۔"

خنسا اس کے ساتھ کمرے میں چلی گئی اور اس نے اندر سے بند کرلیا۔ کافی دنوں بعد لیث نے خنسا کو غور سے دیکھا تھا۔ اس کا سراپا ایسا نہیں تھا کہ تخلیے میں اس کو اپنے روبرو دیکھ کر کوئی بھی انسان بھوک نہ محسوس کرنے لگتا۔ لیث بھی اس سے نہیں بچ سکا، بولا۔

"خنسا! میں دیر تک عذر معذرت کروں اور خوامخواہ بحث ومباحثے میں اپنا وقت ضائع کروں۔ اس سے یہ بہتر سمجھتا ہوں کہ اپنی شکست کا اعلان کردوں۔ مجھے اقرار ہے کہ میں نے تیری طرف سے عدم توجہی برتی، تغافل اختیار کیا۔ میں نے عنان کی تسخیر کے چکر میں تجھے نظرانداز کردیا حالانکہ مجھے یہ سوچنا چاہیے تھا کہ جو بہار میرے اپنے قبضے

میں ہے اس کو نظر انداز کرنا کفرانِ نعمت کے مصداق ہے۔"
خضا اس کی آغوش میں دبک کر رونے لگی۔"میں نے یہ دن بڑی اذیت میں گزارے ہیں اور کبھی کبھی میں اتنی مایوس ہوجاتی تھی کہ مرجانے کو جی چاہتا تھا، میں نے تجھ سے محبت کی ہے، میں نے تجھے دل و جان سے چاہا ہے اور میں اپنی محبت کی ناقدری برداشت نہیں کرسکتی۔"
لیث نے اس کی زلفوں پر منہ رکھ دیا، بولا۔"خضا! میں چاہتا ہوں کہ تو مجھ سے یہ وعدہ کرلے کہ میں جو کچھ کہنے والا ہوں، اس پر تو یقین کرلے گی۔"
خضا نے جواب دیا۔"میں پوچھے بغیر یہ وعدہ کس طرح کرلوں کہ میں تیری باتوں پر یقین کرلوں گی۔ جو بات دل سے نکلے گی، دل میں جگہ پائے گی کیونکہ دل سے نکلنے والی بات سچی ہوتی ہے اور اس پر یقین کرنا ہی پڑتا ہے۔"
لیث نے کہا۔"تو سن! جب سے میں بغداد آیا ہوں اسی کوشش میں ہوں کہ کسی طرح اپنا حق حاصل کرلوں لیکن جب میں نے یہ دیکھا کہ میری سوتیلی ماں کی کوئی اولادِ نرینہ نہیں ہے اور اگر تقسیم ہوئی تو ان کا حصہ انہیں مل جائے گا اور میرا حصہ مجھے۔ میں اپنے حصے کو کام میں لاسکوں گا لیکن میری سوتیلی ماں اپنے حصے کا کیا کرے گی؟ شاید کچھ بھی نہیں۔ اس لیے میں نے فیصلہ کرلیا کہ عتان سے شادی کرکے ان کا حصہ بھی کارآمد بنالوں گا اور عتان سے شادی کے بعد تجھ سے شادی کرلوں گا کیونکہ میں تجھے بھی نہیں چھوڑ سکتا۔"
خضا نے گویا مذاق اڑایا، بے اختیار ہنس دی، بولی۔ "شکریہ، شکریہ۔ کیسا شاندار منصوبہ تھا تیرا لیکن تھا ذرا مشکل۔ کامیابی بڑی مشکل سے ہوگی۔"
لیث نے کھسیا کر کہا۔"تو میرا مذاق اڑا رہی ہے حالانکہ میں نے جو کچھ کہا، اس میں جھوٹ کا شائبہ تک نہیں ہے۔"
خضا نے برجستہ جواب دیا۔"اس لیے تو ہنس رہی ہوں کہ میں اس سچ کی تو عادی ہوں جس میں جھوٹ بھی شامل ہو لیکن میں مکمل سچائی کی لذت سے ذرا بھی واقف نہیں، پھر ہنسوں نہیں تو کیا رو دوں؟"
لیث نے اور زیادہ کھسیا کر اسے گرادیا۔"تو یوں نہیں مانے گی۔ دیکھ میں تیری اس بات کو کس طرح غلط کرتا ہوں اور یہ عملاً بتاتا ہوں کہ ہم دونوں کے تعلقات میں ایک ایسا سچ موجود ہے جس میں جھوٹ کا شائبہ تک نہیں۔"
خضا نے ہنس کر جواب دیا۔"لیث! میں تیرا مطلب خوب سمجھتی ہوں۔ اے کاش! تو صرف میرا ہوتا اور اگر نہیں تو اس پر بھی قناعت کرلوں گی کہ تو میرا بھی ہو۔"
لیث نے بڑی گرم جوشی سے چمٹا کر کہا۔"تب پھر تو اس پر یقین رکھ کہ میں تیرا بھی ہوں اور تیرا ہی رہوں گا۔"
دیر بعد جب چڑھی ندی اتر گئی اور سرکش موجیں ساحلِ مراد سے ٹکرا ٹکرا کر آسودہ ہوگئیں تو ان دونوں کی طبیعتیں اعتدال پر آگئیں اور خضا نے اپنا اصل کام شروع کردیا، بولی۔"لیث! بخدا تو یقین کر، میں اس پر بھی قناعت کرلوں گی کہ تو میرا بھی رہے، حالانکہ تو نے وعدہ اس سے زیادہ کا کیا تھا مگر میں یہ ضرور جتاؤں گی کہ تو عتان نام کے جس سائے کے پیچھے دوڑ رہا ہے اس کی حصول یابی کم از کم اب ناممکن ہوگئی ہے۔"
لیث نے پوچھا۔"وہ کیوں؟"
خضا نے جواب دیا۔"وہ یوں کہ یونس نے عتان کی ماں کو اپنے قابو میں کرلیا ہے اور عتان کی ماں تجھ پر یونس ہی کو ترجیح دیتی ہے۔"
لیث نے کہا۔"بے شک تو سچ کہتی ہے لیکن میں نے یہ سوچا ہے کہ اپنی سوتیلی ماں کے بجائے عتان کو راضی کیا جائے۔ اگر میں عتان کو اپنے قابو میں لاسکا تو میں کسی کی بھی پروا نہیں کروں گا۔"
خضا نے پوچھا۔"پھر کیا خیال ہے، کیا عتان تیرے قابو میں آجائے گی؟"
لیث نے جواب دیا۔"کیوں نہیں، میں نے کئی بار عتان سے باتیں کیں اور اس کے دل کو بار بار ٹٹولا ہے تو محسوس کیا کہ میں نہاں خانۂ دل میں کہیں نہ کہیں موجود ضرور ہوں اور جب یہ بات معلوم ہوجائے کہ میں اس کے دل میں کہیں نہ کہیں موجود ہوں تو اس کی تسخیر مشکل نہیں رہتی۔ میں، اللہ نے چاہا تو عتان کو آمادہ کرلوں گا۔"
خضا نے طنزاً کہا۔"ناممکن، یہ محض خام خیالی ہے تیری۔ وہ تجھ پر نہیں، یونس پر مائل ہے۔"
"میں کس طرح مان لوں تیری یہ بات، کوئی ثبوت؟"
"ثبوت میں، میں ان دونوں کی گفتگو سنوا دوں گی۔ اب وہ دونوں چھپ چھپ کر ملتے رہتے ہیں اور شاید ان دونوں میں کسی قسم کے عہد و پیماں بھی ہوچکے ہیں۔"
لیکن لیث کو اب بھی خضا کی باتوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے جو لذت اور جو خوشی اس کو ملی تھی اب پھر سے کوفت اور اذیت کا سامنا تھا کچھ سوچتا ہوا بولا۔"خضا!

اگر تو کسی طرح یہ ثابت کردے کہ یونس عتان کو مائل کرچکا ہے تو میں وہ انتہائی قدم اٹھادوں گا جس کا یونس تصور بھی نہیں کرسکتا۔"
خضا نے اسے اور زیادہ چڑھا دینے کی کوشش کی، بولی۔"میں تو تجھے یہی مشورہ دوں گی کہ جو کچھ کرنا ہے فوراً کر گزر، کہیں ایسا نہ ہو کہ حالات قابو سے نکل جائیں اور معاملات تیری دسترس میں نہ رہیں۔"
لیث نے جواب دیا۔"لیکن میں اس وقت تک کچھ بھی نہیں کرسکتا جب تک مجھے تیری اس بات کا قطعی ثبوت نہ مل جائے۔ میں شک و شبے اور محض ظن اور قیاس پر اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتا۔"
خضا نے پراعتماد لہجے میں جواب دیا۔"اگر تو ثبوت ہی چاہتا ہے تو میں یہ ثبوت دو دن میں ہی فراہم کردوں گی۔ شاید تیسرے دن کی نوبت ہی نہ آئے۔"
لیث نے جوش میں کہا۔"تب پھر میری طرف سے بھی اس پر یقین رکھ کر کہ میں یونس کے خلاف اپنا انتہائی قدم فوراً ہی اٹھادوں گا چند ثانیوں کے اندر شاید چند ساعتوں کی نوبت ہی نہ آئے۔"

☆☆☆

عتان کی ماں بالکل ٹھیک ہوگئی۔ وہ یونس کی احسان مند تھی اور لیث سے شاکی۔ قصر کے خدمت گاروں میں بھی تبدیلیاں آگئیں۔ اب وہ یونس کی عزت زیادہ کرتے تھے اور لیث کی کم۔ خضا بڑی چالاکی سے یہ تبدیلیاں اور امتیازی سلوک لیث پر واضح کرتی جارہی تھی۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ یونس اور عتان کو پیار و محبت کی باتیں کرتے پکڑے اور لیث کو مشاہدہ کروادے لیکن ایسا موقع ہاتھ نہیں آرہا تھا۔
آخر ایک دن، رات کو موقع مل ہی گیا۔ خضا نے لیث کو مشورہ دیا۔"آ ہم دونوں یہیں کہیں قصر میں چھپ جائیں اور یہ مشہور کردیں کہ ہم دونوں باہر گئے ہوئے ہیں کیونکہ میں یہ محسوس کررہی ہوں کہ یہ دونوں ہم دونوں کی موجودگی کی وجہ سے احتیاط برت رہے ہیں۔ ہمارے ہٹتے ہی دونوں یکجا ہوجائیں گے اور امید ہے کہ پیار و محبت کی باتیں شروع کردیں۔"
لیث نے خضا کی بات سے اتفاق کیا اور ایک خدمت گار کو بلا کر قصر میں مشہور کردیا کہ وہ دونوں باہر گئے ہوئے ہیں۔
ان دونوں نے اپنے کمرے سے دیکھا، کچھ دیر بعد یونس باہر نکلا اور لیث کے کمرے کی طرف چلا۔ یہ دونوں دروازے کو باہر سے بند کرکے دوسرے دروازے سے اندر آئے ہوئے تھے۔ یونس کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اس طویل پردے کے پیچھے چلے گئے جس نے کمرے کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ یونس نے دروازے کی جھری میں سے اندر جھانکا اور اسے خالی دیکھ کر واپس چلا گیا۔
کچھ ہی دیر بعد ان دونوں نے یونس اور عتان کو باغیچے کی طرف جاتے دیکھا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگئے تو لیث اور عتان کمرے کے پچھلے دروازے سے نکل کر باغیچے کی طرف گئے۔ ان دونوں نے دور ہی سے یونس اور عتان کو مہندی کے پودوں کی جھاڑی میں بیٹھے دیکھ لیا۔ ان کے لباس کی جھلکیاں دور ہی سے دکھائی دے رہی تھیں۔ اوپر سائبان بھی بیلوں کا تھا۔ یونس اور عتان اگر چاہتے تو ان انگوری کمروں میں سے کسی ایک میں بیٹھ سکتے تھے لیکن انہوں نے اپنے لیے مہندی کی جھاڑیاں پسند کی تھیں۔ شاید اس لیے کہ یہاں سے آنے والوں پر نظر رکھی جاسکتی تھی۔
لیث اور خضا دیوار سے چمٹ کر آہستہ آہستہ تاکستان کی طرف بڑھے اور کافی مشکل سے قریب ترین انگوری کمرے میں داخل ہوگئے۔ ان دونوں کو اب بھی یہ شبہ تھا کہ کہیں ان دونوں میں سے کسی ایک نے انہیں دیکھ نہ لیا ہو۔ وہ کچھ دیر دم سادھے چپ چاپ بیٹھے رہے۔ انہیں ہر لمحے یہی دھڑکا لگا تھا کہ کوئی اب آیا کہ اب آیا لیکن جب کوئی بھی نہ آیا اور باتوں کی آوازیں آتی رہیں تو وہ اپنی کامیابی پر مطمئن ہوگئے۔ انہوں نے پوری توجہ سے ان کی باتیں سننا شروع کردیں۔ فاصلہ زیادہ تھا اور باتیں دھیمی آواز میں ہورہی تھیں۔ اس لیے باتیں تسلسل سے نہیں سنی جاسکتی تھیں۔
دونوں نے سنا، عتان کہہ رہی تھی۔"میں مخالفت نہیں کروں گی یہ میرا وعدہ ہے۔"
اس کے بعد یونس نے کیا کہا، صاف سنائی نہیں دیا۔ عتان پھر بولی لیکن ان دونوں کی آوازیں سمجھ میں نہیں آرہی تھیں پھر اچانک یونس کی آواز صاف سنائی دی۔
"آخر کیوں، جب تو خود ہی یہ دیکھ رہی ہے کہ لیث کے پاس خضا موجود ہے تو، تو اس کی جگہ میرا انتخاب کیوں نہیں کرتی۔ میں اس کا حلف اٹھا سکتا ہوں کہ تیرے علاوہ کسی اور سے شادی نہیں کروں گا۔ نہ تو تجھ سے شادی کرنے سے پہلے اور نہ شادی کے بعد۔"
جواب میں عتان نے کیا کہا، کچھ سمجھ میں نہیں آیا لیکن

اس کے فوراً بعد یونس کی آواز سنائی دی جو ذرا جوش میں نکل رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ”عنان! جتنا لیث کو میں جانتا ہوں تو نہیں جانتی۔ لیث خود غرض، مطلبی انسان ہے۔ جب تک مطلب رہتا ہے بھیگی بلی بنا رہتا ہے لیکن مطلب نکل جانے کے بعد بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے بے وقوف بنائے رکھتا ہے۔ میں اس کی بدترین یا بہترین مثال ہوں، میں اسے سیدھا سادا، بھولا بھالا انسان سمجھتا رہا لیکن اب یہ انکشاف ہوا کہ لیث بہت ہی چالاک نوجوان ہے۔ میں اس کا ایسا شکار ہوں جو اس کی شکایت بھی نہیں کرسکتا۔“

لیث نے سرگوشی میں خنسا سے کہا۔ ”میرا خیال ہے عنان یونس کو پسند نہیں کرتی اور یونس راضی کرنے کی کوشش کررہا ہے۔“

خنسا نے جواب دیا۔ ”ہوسکتا ہے، مگر اس وقت تو وہ تجھے برا بھلا کہہ رہا ہے۔“

لیث نے متبسم ہوکر کہا۔ ”ہاں، میں نے اس سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا نہیں کیا۔ اس پر وہ برہم ہے لیکن میں نے اپنا وعدہ پورا کیوں نہیں کیا یونس اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کررہا۔“

خنسا نے کہا۔ ”اب کچھ ایسا ہونا چاہیے کہ یونس، عنان سے شادی نہ کرسکے۔ میں یہ پسند کرلوں گی عنان سے تو شادی کرے لیکن یہ گوارا نہیں کروں گی کہ اس سے یونس شادی کرے۔“

لیث، خنسا کی تجویز سے بہت خوش ہوا کیونکہ اس طرح خنسا نے اس کو عنان سے شادی کرنے کی اجازت دے دی تھی حالانکہ خنسا اس طرح یونس کو عنان سے محروم کرکے اس کو اپنے لیے محفوظ کرلینا چاہتی تھی۔

لیث نے کہا۔ ”خنسا! اگر تیری بھی یہی مرضی ہے کہ یونس کو عنان سے شادی نہ کرنے دی جائے تو میں اس کشمکش اور اس معرکے کو یہیں، اسی جگہ اور اسی وقت ختم کیے دیتا ہوں۔ اب تو بھی تماشا دیکھ لے۔“

اس کے بعد وہ خنسا کو انگور کے سائبان سے نکال کر اچانک ان دونوں کے سامنے پہنچ گیا۔ یونس گھبرا کر کھڑا ہوگیا۔ عنان فوری طور پر کچھ بھی نہیں سمجھ سکی کہ ان دونوں کے پاس اچانک کون آگیا لیکن جب اس نے ان دونوں کو دیکھا تو خاصی پریشان ہوگئی۔ یونس نے بدحواس ہوکر پوچھا۔

”یہ تم دونوں کہاں تھے اس وقت؟“

لیث نے انگور کے سائبان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہاں، ہم دونوں بڑی دیر سے وہیں بیٹھے باتیں کررہے ہیں لیکن جب تم دونوں کی آوازیں سنیں تو چپ ہوگئے اور تمہاری باتیں سننے لگے۔“

یونس بہت شرمندہ تھا اور اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا۔ لیث نے عنان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”عنان! سچ بتا کہ یہ یونس تجھ سے کیا کہہ رہا تھا؟“

یونس نے بدمزگی سے کہا۔ ”بات مجھ سے کر، عنان سے کیا پوچھتا ہے تو؟“

لیث نے تیوریوں پر بل ڈال لیے اور کہا۔ ”اچھا، اگر تو خود ہی بتانا چاہتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن تیرے لیے یہ ضروری ہے کہ جھوٹ نہ بولے۔“

یونس نے جواب دیا۔ ”میں عنان سے کہہ رہا تھا کہ میں نے تیرا بہت ساتھ دیا ہے۔“

لیث نے طنزاً کہا۔ ”اگر تو نے میرا ساتھ دیا ہے تو اس میں احسان یا کمال کی کیا بات ہے، کیا تو میرا بھائی نہیں ہے؟“

یونس لاجواب ہوگیا، وہ جواب میں کچھ بھی نہیں کہہ سکا۔ خنسا نے لیث کو کہنی ماری کہ ”اب تکلف کی ضرورت نہیں، بات صاف صاف کر۔“

لیث نے یونس سے نظریں نہیں ملائیں، آنکھیں نیچی کرکے بولا۔ ”یونس! افسوس کہ میں نے تیری گفتگو کا وہ حصہ سن لیا ہے جس میں تو نے میرا ذکر کیا تھا۔ تیری نظر میں، میں کیا ہوں آج مجھے معلوم ہوگیا۔ افسوس کہ میں نے تو تجھے اپنا بھائی سمجھا لیکن تو نے مجھے مطلبی، خود غرض اور فریبی سمجھا۔“

اب یونس کے سامنے اس کے سوا کوئی دوسری راہ نہیں تھی کہ لیث سے صاف صاف بات کرلے، بولا۔ ”میں خدا اور اس کے رسول (صلعم) کے نام پر صرف یہ پوچھوں گا کہ میں نے تجھے جو کچھ بھی کہا، اس میں جھوٹ کتنا ہے اور سچائی کتنی؟ میں نے سنا ہے کہ انسانی نفاق اسی چیز کو کہا جاتا ہے کہ جو عہد کرے اسے پورا نہ کرے، بولے تو جھوٹ بولے......“

لیث نے بات کاٹ کر جواب دیا۔ ”یونس! پہلے تو میرا یہی ارادہ تھا کہ میں نے تجھ سے جو وعدے کیے ہیں انہیں پورا کردوں لیکن اس دوران جب تیری چالاکیاں مجھ پر ظاہر ہونے لگیں تو میں نے ایفائے عہد میں تامل اختیار کیا اور جب میں اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ تو ایک خطرناک اور تکلیف دہ چال چل رہا ہے تو میں بھی اپنے عہد سے پھر گیا

اور......“

یونس پوری بات سنے بغیر ہنسا، کہنے لگا۔ ”لیث! میں نے جو کچھ کہا محض اس لیے کہ میرے دل سے تیرا اعتبار اٹھ گیا تھا۔ آخر میں ایک ذہین انسان ہوں۔ میں ہار تو نہیں مان سکتا تھا چنانچہ اس وقت میں تیرے روبرو سر اونچا کرکے یہ کہہ رہا ہوں کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوچکا اور تو ایک ناتجربےکار اور ناکام نوجوان ہے۔ تیری فضول چالاکی نے تجھے ایسی جگہ کھڑا کردیا ہے جہاں نقصان کے سوا کچھ بھی نہیں۔“

لیث کو غصہ تو بہت آیا لیکن پی گیا۔ عنان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تو شاید یہ کہنا چاہتا ہے کہ میرے ہوتے ہوئے تو عنان سے شادی کرلے گا؟“

یونس نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں یہی کہنا چاہتا ہوں۔“

لیث نے حقارت سے کہا۔ ”ناممکن، میرے ہوتے ہوئے یہ ناممکن ہے۔ عنان سے میں شادی کروں گا اور کس طرح کروں گا تو اچھی طرح جانتا ہے۔“

یونس نے پورے اعتماد سے کہا۔ ”اس میں کیا ہے، ہم دونوں ہی موجود ہیں اور ہمیں عنقریب یہ معلوم ہوجائے گا کہ کس کا دعویٰ سچا ہے اور کس کا جھوٹا۔“

لیث نے خنسا سے کہا۔ ”خنسا! تو یونس کو اپنے ساتھ لے جا اور اسے سمجھا کہ یہ جو کچھ کررہا ہے اس میں فائدہ ذرا بھی نہیں۔ اس کے حق میں نقصان ہی نقصان ہے۔“ اور عنان سے کہا۔ ”تو میرے پاس رک میں تجھ سے چند ضروری باتیں کروں گا۔“

یونس، خنسا کے ساتھ انگوروں کے سائبان تلے چلا گیا۔ عنان، لیث ہی کے پاس موجود رہی۔

یونس کے جاتے ہی لیث نے عنان سے پوچھا۔ ”عنان! یونس تجھ سے کیا کہہ رہا تھا؟“

عنان نے جواب دیا۔ ”یونس مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے بس اسی پر مصر تھا کہ میں ہاں کردوں۔“

”پھر تو نے ہاں کردی یا نہیں؟“

”نہیں، میں نے ہاں نہیں کی اور یہ کہہ دیا کہ اگر میری ماں نے تجھے پسند کرلیا تو میں اس کی مخالفت نہیں کروں گی۔“

لیث نے سختی سے کہا۔ ”نہیں، تو اس عیار سے شادی نہیں کرے گی کیونکہ تیرا حق دار میں ہوں، صرف میں۔ یونس تو میرا بھائی بھی نہیں۔“

عنان نے حیرت سے پوچھا۔ ”یونس تیرا بھائی بھی نہیں؟ وہ کس طرح حالانکہ تو نے تو اس کا تعارف بڑا بھائی کہہ کر کروایا تھا؟“

لیث نے جواب دیا۔ ”ہاں، یونس نے ایک زمانے میں میرا بڑا ساتھ دیا تھا۔ اسی جذبہ احسان مندی سے مغلوب ہوکر میں نے اسے اپنا بڑا بھائی کہہ دیا تھا لیکن اب میں یہ محسوس کررہا ہوں کہ یونس اپنے اس فرضی اور عارضی رشتے سے فائدہ اٹھانے کے چکر میں ہے اور جب تک میں اس قصر میں موجود ہوں، یونس کامیاب نہیں ہوسکتا۔“

عنان کو لیث کی باتوں پر یقین نہیں آرہا تھا، بولی۔ ”تو جو کچھ کہہ رہا ہے کیا اس کو سچ ثابت کرنے کا کوئی ثبوت بھی ہے تیرے پاس یا صرف باتیں ہی باتیں ہیں۔“

لیث نے اپنی جیب سے عاق نامہ نکالا اور عنان کے سامنے رکھ دیا، بولا۔ ”اس کو پڑھ اس عاق نامے میں تجھے یونس کی صحیح شکل دکھلائی دے جائے گی۔“

عنان نے عاق نامہ پڑھا مگر کچھ سمجھ نہ سکی، پوچھا۔ ”یہ کیا ہے، میں مطلب نہیں سمجھی؟“

لیث نے جواب دیا۔ ”یونس اہواز کے قاضی لبیب بخدی کا بیٹا ہے مگر اس کی ناقص اور معیوب حرکات کی وجہ سے باپ نے اسے عاق کردیا۔ اب باپ اس کی صورت تک نہیں دیکھنا چاہتا۔“

عنان آزردہ ہوگئی، بولی۔ ”بھائی لیث! اگر یہ بات تھی تو تجھے اب تک چھپانا نہیں چاہیے تھا۔“

لیث نے جواب دیا۔ ”میں یونس کا احسان مند تھا اس لیے خاموش رہا لیکن اب جبکہ پانی سر سے اونچا ہوتا جارہا ہے۔ میں خاموش نہیں رہ سکتا۔“

عنان خاموش کچھ سوچ رہی تھی لیث کچھ دیر تک اس کے بولنے کا منتظر رہا لیکن جب وہ نہیں بولی تو خود ہی بولا۔ ”عنان! آخر تو نے کیا سوچ کر اس سے یہ کہہ دیا کہ تو اپنی ماں کی مخالفت نہیں کرے گی۔“

عنان نے جواب دیا۔ ”بھائی لیث! یونس نے میری ماں کے علاج اور تیمارداری پر جو توجہ دی ہے اس سے اس نے میری ماں کے دل کو فتح کرلیا ہے اور جب میں نے یہ محسوس کیا کہ میری ماں یونس پر غیر معمولی مہربان ہے اور مجھ کو یونس سے وابستہ کردینا چاہتی ہے تو میں بھی نیم راضی ہوگئی۔“

لیث نے بڑے اعتماد اور دباؤ سے کہا۔ ”اچھا، اب تو میری بات بھی سن لے۔ میں تیری ماں کو بھی یونس کی اصل حیثیت سے آگاہ کردوں گا اور اسے مجبور کردوں گا کہ وہ یونس کو قطعاً نظر انداز کردے۔ میں یونس کو اپنے پاس سے رخصت کردینا چاہتا ہوں۔ اب تیرا کام یہ ہے کہ تو بھی یونس کو صاف صاف بتادے کہ میں تیرے جیسے فریبی سے شادی نہیں کرسکتی۔“

عنان نے معذوری ظاہر کی، بولی۔ ”میں اپنی ماں کی مرضی کی پابند ہوں۔ اگر اس نے یونس کو دھتکار دیا تو میں بھی دھتکاروں گی اور اگر اس نے اپنا فیصلہ نہ بدلا تو پھر میں بھی مجبور ہو جاؤں گی۔“

لیث نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ”ماں کو میری مرضی پر چلنا ہوگا کیونکہ میں اپنے باپ کا قائم مقام اور جانشین ہوں۔“

عنان نے پوچھا۔ ”تیرا بڑا بھائی یعقوب کہاں چلا گیا؟ وہ کہاں ہے؟“

لیث نے جواب دیا۔ ”وہ میری ماں کے ساتھ حج پر گیا تھا واپسی میں قافلے پر ڈاکوؤں نے حملہ کرکے میری ماں کو ہلاک کردیا اور بھائی یعقوب کو اغوا کرلیا اور اب لوگوں کا خیال ہے کہ ڈاکوؤں نے اسے ہلاک کردیا ہوگا۔“

عنان نے کہا۔ ”بھائی لیث! آؤ ہم دونوں ایک بات پر سمجھوتا کرلیں، میں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ تجھ سے اسی صورت میں شادی کروں گی کہ تو خنسا کو الگ کردے کیونکہ جس طرح میں اپنا پورا وجود تیرے حوالے کروں گی اسی طرح میں تجھ سے بھی یہی چاہوں گی کہ تو دو حصوں میں تقسیم مجھے نہ ملے۔ میں سالم لیث چاہتی ہوں، مشترک، دو حق داروں میں مشترک لیث نہیں چاہتی۔“

لیث نے جواب دیا۔ ”لیکن اس میں مجبوری یہ ہے کہ میں نے خنسا سے شادی کا وعدہ کرلیا ہے۔“

”تب پھر اپنا وعدہ پورا کر اور خنسا سے شادی کرلے اور میرا خیال دل سے نکال دے۔“

لیث نے پوچھا۔ ”اور اگر تیری ماں کو خنسا کی موجودگی اور تعلق پر کوئی اعتراض نہ ہوا تو پھر تو، تو مان جائے گی؟“

عنان نے جواب دیا۔ ”یہ میری ذات کا، زندگی بھر کا مسئلہ ہے۔ میں پھر بھی نہیں مانوں گی۔“

لیث نے چڑ کر کہا۔ ”تب پھر تو صاف صاف یہ کیوں نہیں کہتی کہ تو مجھ سے شادی کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔“

”یہ بات بھی نہیں، اگر تو میری خنسا والی شرط قبول کرلے تو میں اپنی ماں سے بغاوت کرکے تجھ سے شادی کرلوں گی۔“

لیث مشکل میں پڑ گیا، وہ خنسا کو نہیں چھوڑ سکتا تھا لیکن عنان بھی نہیں چھوڑی جاسکتی تھی کیونکہ عنان بھی نہ صرف یہ کہ لیث کو پسند تھی بلکہ اس کے ساتھ ہی اسے اپنے باپ کی پوری جائداد اور کاروبار بھی مل سکتا تھا۔ اس دہرے فائدے کو وہ کس طرح نظر انداز کرسکتا تھا۔ بولا۔ ”اگر تو اس پر مصر ہے کہ پہلے میں خنسا کو الگ کروں اس کے بعد تو مجھ سے شادی کرلے گی تو میں اس پر بھی تیار ہوں۔“

عنان خوشی سے مسکرانے لگی، بولی۔ ”میں اپنے فیصلے سے آج ہی اپنی ماں کو مطلع کردوں گی۔“

لیث نے پوچھا۔ ”تب پھر میں مطمئن ہو جاؤں؟“

عنان نے جواب دیا۔ ”بالکل، میں تجھ پر اعتبار کروں گی۔“

لیث نے کہا۔ ”تب پھر تو جاکر اسی وقت اپنی ماں کو مطلع کردے کہ میں آج رات عشا کے بعد ان سے بات کرنے آرہا ہوں۔“

عنان نے جواب دیا۔ ”ضرور کہہ دوں گی لیکن دیکھو، رات کا وعدہ بھول نہ جانا اور اپنے وعدے سے پھر نہ جانا۔“

لیث نے چٹکی بجائی، بولا۔ ”پھرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔“

عنان نے سر جھکا کر کہا۔ ”لیث! یہ حقیقت ہے کہ میرا ذاتی رجحان تیری ہی طرف ہے۔ اب اگر میں تجھے نہ پاسکتی تو مجھے اس کا بے حد ملال ہوتا۔“

لیث نے جواب دیا۔ ”اب میں مطمئن ہوں اور سکون سے رہ سکتا ہوں۔ اس طرح میں یونس کی بدچلنی کا منہ توڑ جواب بھی دے سکوں گا۔“

عنان نے پوچھا۔ ”کیا اب میں جاسکتی ہوں؟“

”ہاں لیکن میری ایک بات مان کر۔“

”کون سی بات؟“

لیث نے جواب دیا۔ ”جانے سے پہلے میں تیری چاندی روشن پیشانی کا بوسہ لینا چاہتا ہوں۔“

عنان نے شوخی سے جھڑک دیا۔ ”واہ، یہ تو ایک ہی رہی۔ بس جناب! جب تک ہم دونوں رشتۂ ازدواج میں منسلک نہیں ہو جاتے، میں اس فضول بات کا کوئی موقع نہیں دوں گی۔“

لیث نے ہونٹ دبائے اور دانت پیستا ہوا بولا۔ ”اچھا عنان رہ جا، شادی کے بعد میں گن گن کر بدلے لوں گا۔“

”دیکھا جائے گا۔“ اور عنان، لیث کو اداس اور ویران چھوڑ کر چلی گئی۔

☆☆☆

دوسری طرف خنسا بھی دیر تک یونس کو یہ سمجھاتی رہی تھی کہ چونکہ لیث کی نیت بدل چکی ہے اس لیے عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ چالاکی سے لیث سے کچھ لے کر الگ ہوجائے۔ خنسا نے یونس سے وعدہ کیا کہ اگر وہ اس کا مشورہ مان لے تو اس کی دوسری کوشش یہ ہوگی کہ لیث سے یونس کو کچھ نہ کچھ دلوا دے۔

یونس نے جواب دیا۔ ”لیکن میں عنان سے شادی کرکے اس کی ماں کے پورے حصے پر قبضہ کرنا چاہتا ہوں۔“

خنسا نے کہا۔ ”یونس! یہ تیرا خام خیال ہے، تیری شادی عنان سے نہیں ہوسکتی کیونکہ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ لیث تیری مخالفت کس خطرناک طریقے سے کر رہا ہے۔“

یونس نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ ”خنسا! مجھے اپنے آپ پر اعتماد ہے۔ یہ معرکہ جہد البقا ہے اور یہ بات میں بڑے اعتماد اور پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ لیث میرے مقابلے میں اناڑی، ناتجربے کار اور کمزور ہے۔ وہ میرا سہارا لے کر تو کوئی بڑا کام کرسکتا ہے لیکن اگر وہ سمجھتا ہے کہ مجھ سے مقابلہ کرے اور مجھے نیچا دکھادے تو یہ ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔“

خنسا نے کہا۔ ”خیر ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتی کہ کون طاقت ور ہے کون کمزور لیکن بظاہر یہی نظر آتا ہے کہ لیث طاقت ور اور تو خلا میں کھڑے ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔“

یونس نے خنسا سے صاف صاف کہہ دیا۔ ”بہر حال میں یہ چاہتا ہوں کہ اب تو مجھے سمجھانے کی بجائے لیث کو سمجھائے اور میری طرف سے اس پر یہ واضح کردے کہ اس مقابلے میں لیث کو شرمندہ ہونا پڑے گا۔ وقت اور قسمت میرے ساتھ ہیں۔“

خنسا کو غصہ آگیا کہ یونس کچھ سمجھ ہی نہیں رہا۔ اپنی ہانکے جارہا ہے۔ اسے اس بات کا ملال بھی تھا کہ یونس اس کا خیال بالکل نہیں کر رہا ہے۔ اگر خنسا کا بس چلتا تو وہ عنان، اس کی ماں اور ان کی جائداد اور کاروبار تینوں کو زمین کی اتنی گہرائی میں دفن کردیتی۔ اب خنسا کی نظر میں لیث ہی ایک معقول نوجوان تھا۔

لیث نے مغرب کے بعد فانوسوں کی روشنی میں یونس کو اپنی.. سوتیلی ماں کے کمرے میں جاتے دیکھا اور اس کے کچھ ہی دیر بعد اس نے ایک خدمت گار عورت کے ساتھ عنان کو بھی اسی کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ لیث کا مارے غصے کے برا حال ہوگیا۔ اس کے سینے میں آگ کی بھٹی جل رہی تھی۔ اس نے خنسا کے پاس جاکر پُرجوش لہجے میں کہا۔

”خنسا! اب میں برداشت نہیں کرسکتا اور میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ اگر میں یونس کو نقصان نہ پہنچا سکا تو میں خودکشی کرکے اس اندرونی عذاب سے نجات حاصل کرلوں گا۔“

خنسا نے جواب دیا۔ ”میرے آقا! اب واقعی صبر کی گنجائش نہیں رہ گئی۔ میں تو یہ کہتی ہوں کہ تجھے جو کچھ کرنا ہے ابھی اسی وقت ہوجانا چاہیے اور میں نہیں جانتی کہ یونس کی گردن کیوں تنی ہوئی ہے۔“

اسی وقت اس نے ایک خدمت گار عورت کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس نے قریب آکر مطلع کیا۔ ”اس قصر کی مالکہ آپ کو یاد کر رہی ہیں۔“

لیث نے پوچھا۔ ”کس کو، مجھے؟“

”ہاں، آپ ہی کو۔“

لیث نے پوچھا۔ ”وہاں کون کون ہے؟“

عورت نے جواب دیا۔ ”مالکہ، عنان اور یونس۔“

لیث نے خنسا سے کہا۔ ”ذرا تو بھی چل میرے ساتھ اور جب مذاکراتی جدال کا آغاز ہو تو وقفے وقفے سے میری تائید کرتے رہنا کیونکہ میں ہمیشہ تیرا خیال رکھوں گا اور میں تجھ سے محبت بھی کرتا ہوں۔“

خنسا نے جواب دیا۔ ”لیث میرے آقا! اب اس قصر میں تیرے سوا ہے ہی کون جو میری پروا کرے۔ میں تو یہاں تک فیصلہ کرچکی ہوں کہ میں ناجائز باتوں میں بھی تیرا ساتھ دوں گی۔“

لیث نے کہا۔ ”اچھا، اب چل میرے ساتھ۔“

☆☆☆

کمرے کے آخری سرے پر دیوار سے ملا ہوا سا گوان کا تخت بچھا تھا۔ اس پر بچھی ہوئی سفید چادر پر گاؤ تکیے کے سہارے عنان کی ماں نیم دراز تھی۔ ایک ہاتھ میں پھلوں

کے عرق سے لبریز پیالہ تھا اور دوسرے ہاتھ کی کہنی تخت پر اس طرح ٹکی ہوئی تھی کہ ہاتھ کی ہتھیلی پر سر کنپٹی کے سہارے لگا ہوا تھا۔ وہ پھلوں کا عرق گھونٹ گھونٹ پی رہی تھی۔

اس کے سامنے تخت کے قریب چھوٹی چھوٹی تپائیاں بچھی تھیں۔ ان تپائیوں پر رنگین کپڑے چڑھے ہوئے تھے اور ان کے پائے منقش تھے۔ دو تپائیوں پر آمنے سامنے، قریب قریب عتان اور یونس بیٹھے تھے۔ عتان کا سر جھکا ہوا تھا مگر یونس گاہے گاہے عتان کو پُرشوق نظروں سے دیکھ لیتا تھا۔

عتان کی ماں نے خنسا کے آنے پر اعتراض کیا، بولی۔ ”لیث! میں نے تجھے بلایا تھا خنسا کو نہیں پھر یہ کیوں آ گئی؟“

لیث نے جواب دیا۔ ”اسے میں لایا ہوں اس لیے اس کی آمد پر کسی کو اعتراض بھی نہیں ہونا چاہیے۔“

عتان کی ماں کے چہرے کا بدلتا ہوا رنگ اس کے اندرونی اشتعال کی غمازی کر رہا تھا پھر بھی تحمل سے کام لیا، بولی۔ ”خیر اب آ گئی ہے تو کوئی بات نہیں مگر اس سے کہہ دو کہ یہ ہمارے گھریلو معاملات میں دخل نہیں دے گی کیونکہ میں یہ پسند نہیں کرتی کہ آقاؤں کے مباحثوں میں کنیزیں دخل اندازی کریں۔“

لیث نے جواب دیا۔ ”وہ تو بالکل درست لیکن اگر میں خود اس سے یہ کہوں کہ میری طرف سے کسی بات کا جواب دے تو ضرور بولے گی کیونکہ اسے بولنے کا حق میں دوں گا۔“

عتان کی ماں کو غصہ تو بہت آیا لیکن وہ بڑے تحمل سے کام لے رہی تھی۔ اس نے کچھ دیر سکوت اختیار کیا۔ خنسا، یونس کو قہر کی نظروں سے دیکھ رہی تھی اور عتان کسی کسی لمحے لیث پر نظریں ڈالتی تو ان میں بڑی محبت ہوتی، بڑا پیار ہوتا۔ اس کے برعکس لیث صرف یونس کو دیکھ رہا تھا اور لیث کی نظروں ہی سے اس کے اندرونی عناد اور غصے کا پتا چلایا جا سکتا تھا۔ لیث کے مقابلے میں یونس تھا۔ جس کا چہرہ بالکل سپاٹ اور غیر جذباتی تھا اور کسی طرح بھی یہ نہیں معلوم ہو رہا تھا کہ اس کے دل میں لیث کے خلاف کسی قسم کا عناد پایا جاتا ہے۔ وہ اب بھی لیث کا مخلص دوست بلکہ بھائی نظر آ رہا تھا۔

عتان کی ماں خاموش تھی لیکن کسی کسی لمحے پھلوں کے مشروب کی چسکی لے کر وہ کن انکھیوں سے لیث اور خنسا کو دیکھتی بھی جا رہی تھی۔

لیث ماحول کو خاموش دیکھ کر پریشانی محسوس کرنے لگا، آخر اکتا کر پوچھا۔ ”مجھے کیوں بلایا گیا ہے؟“

عتان کی ماں نے پوچھا۔ ”خنسا تیری کنیز ہے یا محبوبہ؟“

لیث نے جواب دیا۔ ”محبوبہ..... کیوں اس سوال کا مطلب؟“

ماں نے کہا۔ ”اگر خنسا تیری لونڈی ہے تو، تو اس کو آزاد کر کے نکاح کر لے۔“

لیث نے ترشی سے جواب دیا۔ ”یہ میرا مسئلہ ہے اور میں خوب جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔“ ”اگر آپ مجھے نہ بلواتیں تو میں خود بھی یہاں آنے ہی والا تھا۔“

ماں نے پوچھا۔ ”کیوں آنے والا تھا؟“

لیث نے جواب دیا۔ ”اس لیے کہ اب میں عتان اور اپنے مسئلے کو مزید طول نہیں دے سکتا۔“

ماں نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا، پوچھا۔ ”آخر تو کس مسئلے کی بات کر رہا ہے؟“

لیث نے جواب دیا۔ ”تیرا شوہر اور میرا باپ جب زندہ تھا تو یہی کہا کرتا تھا کہ بیٹے لیث تیری دلہن بغداد میں ہے جب تو بڑا ہو جائے گا تو تیری دلہن تیرے حوالے کر دی جائے گی۔ اب میرا باپ تو موجود نہیں لیکن میں اپنی دلہن کے لیے بغداد آ گیا ہوں۔ میری دلہن کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیجیے۔“

ماں نے ترشی سے کہا۔ ”لیکن مجھ سے تیرے باپ نے اس قسم کی کوئی بات نہیں کی تھی اور پھر یہ کہ عتان میری بیٹی ہے اور اس کی قسمت کا فیصلہ میں کروں گی۔“

لیث نے کہا۔ ”چلیے یہی سہی، اب میں کہتا ہوں کہ عتان کا فیصلہ کر دیجیے۔“

ماں نے دو ٹوک جواب دیا۔ ”میں نے عتان کی قسمت کا فیصلہ کر دیا ہے اور اب اس میں کسی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں۔“

لیث کی سانس رکنے لگی، پوچھا۔ ”کیا فیصلہ کر دیا؟ کس کے حق میں فیصلہ کر دیا؟“

ماں نے یونس کی طرف دیکھا اور لیث کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ ”یونس کے حق میں۔ یونس، عتان کا ہونے والا شوہر ہے۔“

لیث نے بڑے جوش و خروش سے مخالفت کی، بولا۔ ”ایسا نہیں ہو سکتا، کسی قیمت پر، کسی طرح نہیں ہو سکتا۔“

ماں نے خالی پیالہ یونس کی طرف بڑھا دیا،

بولی۔ ”ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟ آخر یونس میں کیا خرابی ہے؟ اس میں کون سا نقص ہے؟“

لیث نے جواب دیا۔ ”اس کا نقص خود اسی سے پوچھ لیجیے۔ پہلی بات تو یہ کہ یونس میرا حقیقی بھائی نہیں ہے۔“

ماں کو اس انکشاف پر ذرا بھی تعجب نہیں ہوا، بولی۔ ”اگر یہ تیرا بڑا بھائی نہیں ہے تو یہ کوئی خرابی کی بات تو نہیں۔“

لیث اور زیادہ مشتعل ہو گیا، بولا۔ ”یونس اپنے باپ کی نالائق اور گستاخ اولاد ہے اس نے اس کو عاق کر دیا تھا۔“

اب یونس بھی برداشت نہیں کر سکا، غصے میں کھڑا ہو گیا، بولا۔ ”بس لیث! اب زبان کو لگام دے۔ میں نے ابھی تک کسی سے بھی تیری برائی نہیں کی لیکن اب شاید کرنا پڑے۔“

لیث نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر عاق نامہ نکال لیا اور اسے اپنی ماں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”لیجیے، اسے ملاحظہ فرمایئے، تب آپ کو شاید ہوش آ جائے۔“

ماں نے عاق نامے کو نہ تو دیکھا اور نہ ہی اس میں کسی قسم کی دلچسپی لی، بولی۔ ”یہ وہ عاق نامہ تو نہیں جو قاضی لبیب بخدی نے دیا تھا!“

لیث نے جلدی جلدی جواب دیا۔ ”ہاں، یہ وہی عاق نامہ ہے جو قاضی لبیب بخدی نے یونس کو دیا تھا۔“

ماں نے بڑی بے نیازی سے کہا۔ ”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یونس نے مجھے سب کچھ پہلے ہی بتا دیا ہے۔“

لیث چکرا گیا، بڑی مغموم آواز میں بولا۔ ”میں جس شخص پر بڑے احسان کر چکا ہوں اور جو بدطینت بھی ہے آپ نے اس پر اعتبار کر لیا۔ آپ کو مجھ سے مشورہ ضرور کرنا چاہیے تھا۔“

ماں نے کہا۔ ”میں بیمار پڑی، یونس نے میری تیمارداری بھی کی اور علاج بھی کیا۔ جب میرے بچنے کی کوئی امید نہیں رہی تو یونس معلوم نہیں کس طرح سلطان عضد الدولہ کے طبیب خاص کو لے کر آیا اور بالآخر اس کے علاج سے میں ٹھیک بھی ہو گئی۔ تیرے بقول یونس بدطینت اور غیر ہے لیکن اس بدطینت اور غیر نے میرا اتنا ساتھ دیا ہے کہ تو بھی نہیں دے سکتا۔ اس لیے میں نے یہ قطعی فیصلہ کر لیا ہے کہ میں عتان کا ہاتھ یونس کے ہاتھ میں دے دوں گی۔“

اب خنسا بھی چپ نہ رہ سکی، بولی۔ ”یونس نے جو کچھ بھی کیا ہے لالچ میں کیا ہے کہ اس طرح یہ آپ کا دل جیت کر عتان کو حاصل کر لے گا اور یہ عتان کو کیوں حاصل کرنا چاہتا ہے کوئی اس راز سے واقف ہو یا نہ ہو لیکن میں جانتی ہوں، یونس ایک حریص شخص ہے اور یہ خوب جانتا ہے کہ اگر اس نے کسی طرح عتان کو حاصل کر لیا تو اس کو کاروبار و مال وزر کی کوئی فکر نہ رہے گی۔ سب کچھ پلک جھپکتے ہی حاصل ہو جائے گا۔“

ماں نے خنسا کو ڈانٹ دیا۔ ”او ابنِ جاریہ! تو خاموش ہو جا۔ تیری مداخلت برداشت نہیں کر سکتی۔“

لیکن لیث نے خنسا کا ساتھ دیا، بولا۔ ”خنسا کو میرا ساتھ دینے کا حق ہے اور یہ میری طرف سے ضرور بولے گی۔“

ماں نے کہا۔ ”اگر یہ بات ہے تو میں یہ بھی مانے لیتی ہوں کہ عتان کا مسئلہ طے شدہ ہے۔ یونس اس کا ہونے والا شوہر ہے اور قصر میں یونس کی تجھ سے زیادہ حیثیت ہے۔“

عتان نے جواب دیا۔ ”بھائی لیث! میں ماں کی طرح یہ نہیں کہہ سکتی کہ اس قصر میں تجھ سے زیادہ یونس کی حیثیت اور عزت ہے۔ تو بہرحال ماں کے شوہر کا بیٹا ہے اس لیے تو زیادہ باعزت ہے اور رہی یہ بات کہ میں یونس کو پسند کرتی ہوں یا نہیں تو یہ ایک الگ سوال ہے اور یہ میں پہلے ہی واضح کر چکی ہوں کہ میں اپنی ماں کے فیصلے کی مخالفت نہیں کروں گی۔“

لیث نے بڑے افسوس سے کہا۔ ”تو اس کا مطلب ہوا کہ تو نے یونس کو پسند کر لیا ہے۔“

عتان نے ناگواری سے کہا۔ ”پھر وہی بات۔ میں کتنی بار یہ بات کہوں کہ میں اپنی ماں کے فیصلے کے خلاف نہیں جا سکتی۔ ہاں، یہ بات یونس کو بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ میں ماں کی خواہش پر اس کی دلہن تو بن سکتی ہوں، لیکن اس سے محبت نہیں کر سکتی۔“

ماں نے فوراً توجہ دی، بولی۔ ”عتان! یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟ جب تو یونس کی دلہن بنے گی تو محبت بھی یونس ہی سے کرے گی۔“

یونس نے ماں کو منع کر دیا۔ ”آپ خاموش رہیے اور یہ سمجھ لیجیے کہ آپ کا کام ختم ہو گیا۔ میں اگر عتان سے شادی کر سکتا ہوں تو میں اس گُر سے بھی واقف ہوں کہ عتان سے محبت کس طرح کروائی جائے۔“

لیث شکست خوردہ انسان کی طرح سر جھکائے بیٹھا رہا۔ خنسا، یونس پر برہم تھی اور عتان کو لیث پر رحم آ رہا تھا

لیکن ماں مطمئن تھی کہ اس نے لیث کے ڈنک کو توڑ کر رکھ دیا ہے۔

خنسا نے لیث کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ دیا، بولی۔ ”اب یہاں کیوں رکا جائے۔ میں اپنے کمرے میں جارہی ہوں۔“

لیث نے جواب دیا۔ ”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ حالات نے جو کروٹ بدلی ہے اس میں دو ہی تجویزوں پر عمل کرسکتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ میں یہ سب کچھ خاموشی سے برداشت کرتا رہوں اور وقت کے فیصلے کا انتظار کروں اور دوسری تجویز یہ ہے کہ میں ان جھگڑوں میں ہی نہ پڑوں اور اپنا حصہ لے کر مستقلاً کنارہ کشی اختیار کرلوں کیونکہ یونس نے جو کچھ کیا ہے اس سے میرے دل و دماغ دونوں ہی متاثر ہوئے ہیں اور اس غیر یقینی حالت میں میرے لیے یہی بہتر ہے کہ میں اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دوں۔“

عنان کی ماں نے لیٹتے ہوئے بے زاری سے کہا۔ ”اب میں آرام کرنا چاہتی ہوں، اب تم جاسکتے ہو۔“

یونس نے اعلان کیا۔ ”عضد الدولہ کے طبیب نے کہہ دیا ہے کہ اب ماں بالکل صحت یاب ہوچکی ہیں اس لیے میں اسی خوشی میں ایک جشنِ طرب منعقد کرنا چاہتا ہوں۔“

ماں کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

عنان نے بڑی افسردگی سے کہا۔ ”اب میں بھی تھک چکی ہوں۔“

ماں نے آنکھیں بند کرلیں اور یونس نے کہا۔ ”بہتر ہے تو جشنِ طرب کا انتظام کر۔ اس میں معززین شہر کو ضرور مدعو کرنا کیونکہ میں اسی جشن میں تیری اور عنان کی شادی کا اعلان کردوں گی۔“

یونس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”اب ہمیں یہاں سے چلے جانا چاہیے۔“ گویا یہ اس بات کا اعلان تھا کہ یہاں سے ہر شخص کو چلے جانا چاہیے لیث اور خنسا بھی کھڑے ہوگئے۔

☆☆☆

اس تبدیلی نے لیث کو تھکا ڈالا۔ خنسا اسے موقع بے موقع یہی مشورہ دیتی رہتی کہ حالات جس رخ پر جارہے ہیں چونکہ اب انہیں اپنی مرضی کے مطابق موڑنا ممکن نہیں رہا اس لیے یا تو باعزت پسپائی اختیار کی جائے یا پھر یونس کو کوئی ایسا سبق دینا چاہیے کہ وہ شادی کے بعد وہ سب نہ حاصل کرسکے جس کی امید میں وہ عنان سے شادی کررہا ہے۔

دوسری طرف عنان تذبذب میں تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اپنی ماں کے فیصلے کو کس طرح بدلوائے۔

قصر میں جشن طرب کی تیاریاں جاری تھیں۔ حمدون مغیث کی بیوہ کے اس جشن طرب میں کاروبار اور دربار کے معززین کو بلوایا گیا تھا۔ خنسا کو اس موقع پر یہ عجیب ترکیب سوجھی کہ اس نے لیث کو مشورہ دیا۔

”تو اپنی ماں کو مشورہ دے کہ اس جشن میں یونس کے باپ قاضی لبیب بخدی کو بھی مدعو کیا جائے اور نہ صرف مدعو کیا جائے بلکہ کچھ ایسا کیا جائے کہ وہ اس جشن میں شریک ضرور ہوں۔“

لیث بھی اس تجویز پر اچھل پڑا، بولا۔ ”تیری تجویز تو بڑی اچھی ہے لیکن پتا نہیں کہ ماں میری اس تجویز کو مانے گی یا نہیں۔“

خنسا نے پوچھا۔ ”اچھا تو سچ بتا کہ تیرا عنان پر کتنا اثر ہے؟ کیا وہ تجھ پر اتنی مہربان ہے کہ اگر تو یہ بات عنان سے کہلوائے تو وہ اپنی ماں سے کہہ دے گی؟“

لیث نے جواب دیا۔ ”عنان میری باتیں مان تو سکتی ہے لیکن وہ اپنی ماں کے خلاف کچھ نہیں کرسکتی۔ اگر اس کی ماں نے یہ کہہ دیا کہ وہ یونس کے باپ کو نہیں مدعو کرے گی تو عنان بھی خاموش ہوجائے گی۔“

خنسا نے کہا۔ ”تو کہہ کر تو دیکھ، اگر اس نے یہ بات منوالی تو میں کسی حد تک یہ دعویٰ کرسکتی ہوں کہ یونس کو اس کے دعوؤں میں ناکام کیا جاسکتا ہے......“

لیث نے کہا۔ ”اچھا میں کوشش کرتا ہوں لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ ابھی میرا ذہن صاف نہیں ہے۔ چلو، میں نے فرض کرلیا کہ قاضی لبیب بخدی کو مدعو کرلیا گیا اور وہ آ بھی گیا تو اس کے بعد پھر کیا ہوگا؟ یونس کو اس سے کیا نقصان پہنچے گا؟“

خنسا نے جواب دیا۔ ”اب تجھے ایک جوا کھیلنا ہے اور اپنے مال و زر کو خرچ کرنا پڑے گا۔ قاضی آئے گا تو اس کے ساتھ قاضی کے آدمی بھی آئیں گے۔ تو ان آدمیوں میں اس بااثر شخص کو فوراً دریافت کرلے گا جو قاضی پر قابو رکھتا ہو پھر تو اس آدمی کو اپنے اعتماد میں لینے کی کوشش کرے گا اور اس اعتماد کے لیے اگر تجھے کچھ خرچ بھی کرنا پڑے تو بخل نہ اختیار کرنا پھر اگر یونس کا باپ یونس کے خلاف اس معاملے میں دخیل ہوگیا تو، تو یقین کرلے کہ پھر یونس زندگی بھر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوگا۔“

لیث نے محسوس کیا کہ منصوبہ جامع نہ ہونے کے باوجود اس لائق ضرور ہے کہ اس پر خوب سوچ بچار کرکے

اسے زیادہ سے زیادہ کارآمد اور مفید بنایا جاسکتا ہے۔

اس منصوبے کا پہلا مرحلہ یہ تھا کہ جشن طرب میں قاضی کو بھی مدعو کرلیا جائے۔ اس کے بعد کیا کرنا ہے؟ یہ غور کرنے کے لیے بڑا وقت موجود تھا چنانچہ لیث، عنان سے باتیں کرنے کا موقع تلاش کرنے لگا۔

جشنِ طرب میں چار دن باقی تھے۔ یونس کی مصروفیت عروج پر تھی وہ معززین کے علاوہ گانے والوں اور گانے والیوں کا بھی انتظام کرتا پھر رہا تھا۔ عنان اداس تھی۔ اس کی ماں اس کی اداسی پر ناخوش تھی۔ وہ بار بار اسے خوش رہنے کی تلقین کرتی رہتی۔ لیث نے کچھ عرصے سے یہ محسوس کرنا شروع کردیا کہ عنان اپنی مرضی کی مالک نہیں رہی۔ ماں اس کی نگرانی کرتی رہتی ہے۔ وہ اس نگرانی سے اکتا گیا اور ماں کی موجودگی میں عنان سے کہا۔ ”عنان! میں تجھ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں لیکن تو موقع ہی نہیں دیتی۔“

عنان نے ہکا بکا صورت بنا کر دریافت کیا۔ ”کس قسم کی باتیں؟ یہ موقع بے کرباتیں۔“

ماں نے مداخلت کی۔ ”لیث! میں چاہتی ہوں کہ تو یونس سے عناد دور کردے اور اس کا بھائی بن جا۔ اس کے بعد تو عنان سے آزادانہ باتیں کر ان باتوں پر نہ میں اعتراض کروں گی نہ یونس۔“

لیث نے جواب دیا۔ ”ماں! میں نے یونس کی مخالفت ختم کردی ہے، اب میں یونس کو ہمیشہ بھائی سمجھوں گا۔“

ماں کی خوشی کی انتہا نہ رہی، بے ساختہ بولی۔ ”اگر یہ بات ہے تو میں اپنے جشن طرب کو بڑے شاندار طریقے سے مناؤں گی۔“

لیث نے عنان سے کہا۔ ”عنان! اب میں نے اپنے آپ کو بدل دیا ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تیری وجہ سے میں یونس کو اپنا بڑا بھائی بنالوں۔“

عنان کو لیث کی بات پر یقین نہیں آیا، حیرت سے پوچھا۔ ”کیا سچ؟“

لیث نے جواب دیا۔ ”آ ذرا میرے ساتھ چل۔ میں اپنا زر و مال بھی دو حصوں میں تقسیم کردینا چاہتا ہوں بشرطیکہ تم لوگ بھی مجھے اپنے کنبے میں شامل رکھو۔“

عنان کی ماں کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ لیث کے سامنے آکھڑی ہوئی، بولی۔ ”اگر یہ بات ہے تو وہ کون ہے جو تجھے اس کنبے سے جدا کرے۔“ پھر عنان سے کہا۔ ”عنان! میں یہ خوش خبری یونس کو سنانا چاہتی ہوں تو لیث سے باتیں کر میں ابھی آتی ہوں۔“

ماں کے جاتے ہی لیث بدلنے لگا، بولا۔ ”عنان! تیرا کیا خیال ہے میں نے جو کچھ کہا ہے تو خود اس کی سچائی پر کس حد تک یقین رکھتی ہے؟“

عنان نے جواب دیا۔ ”ابھی میں کچھ نہیں سمجھی لیکن میں حیرت زدہ ضرور ہوں۔“

لیث نے کہا۔ ”میں یونس کو بھائی بنا رہا ہوں اور اسے چند دن مزید طفل تسلیاں دوں گا، اس کے بعد جو کچھ ہوگا میں نہیں جانتا لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ میری کوششوں کا جو نتیجہ نکلے گا اس سے یونس طرز کے بہت سے دوستوں کو یہ سبق مل جائے گا کہ دوستی میں چھل فریب کا یہی انجام ہونا چاہیے۔“

عنان بڑی مایوس تھی پھر بھی مسکرانے لگی، بولی۔ ”تو نے میری ماں کو بھی دھوکے میں لے لیا۔“

لیث نے جواب دیا۔ ”کیا کروں، میں مجبور ہوں اس کے بغیر کام بھی نہیں چلتا۔“

عنان نے کہا۔ ”میری ماں یونس کو یہ خوش خبری سنا رہی ہوگی کہ تو نے سچ مچ یونس کو اپنا بھائی بنانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ یونس تو اس خوش خبری سے پاگل بھی ہوسکتا ہے کیونکہ اس نے یونس کو دو بڑے فائدے حاصل ہوجائیں گے۔“

لیث نے پوچھا۔ ”دو فائدے کیسے؟“

عنان نے جواب دیا۔ ”ایک تو یہ کہ اس طرح وہ تیری خفگی اور ناراضی کے بغیر مجھ سے شادی کرنے میں کامیاب ہوجائے گا اور دوسری یہ کہ وہ اب بھائی بن کر تیرے زر و مال میں حصے دار بھی بن جائے گا۔“

لیث نے مسکرا کر کہا۔ ”تو سچ کہتی ہے تیرا تجزیہ بالکل درست ہے۔“

عنان نے مسکرا کر کہا۔ ”میں تو تجھے بہادر سمجھتی تھی شیر کی طرح لیکن تو تو روباہ نکلا، بالکل لومڑی کی طرح۔“

لیث نے جواب دیا۔ ”عنان! مجھے اپنی زندگی میں جو تھوڑے بہت تجربات حاصل ہوئے ہیں ان کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں کہ انسان چونکہ اشرف المخلوقات ہے اس لیے جانوروں کے اوصاف بھی اس میں شامل کردیے گئے ہیں۔ انسان ہی شیر بھی ہے اور انسان ہی بھیڑیا بھی۔ انسان سانپ بھی ہے اور انسان بچھو بھی۔“

عنان خاموش ہوگئی لیکن وہ ذہنی الجھنوں کا شکار تھی۔

لیث خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔

دوسری طرف عنان کی ماں یونس کو یہ خوش خبری سنا چکی تھی کہ لیث نے مفاہمانہ روش اختیار کرلی ہے اور اب وہ یونس کو واقعی بھائی بنانے پر آمادہ ہے۔ وہ اپنے مال کا نصف یونس کو دے دینا چاہتا ہے لیکن اس خوش خبری کا یونس پر کوئی خاص اثر نہ ہوا۔

☆☆☆

عنان اور اس کی ماں نے یونس پر زور دیا کہ وہ جشن طرب میں اپنے باپ کو بھی مدعو کرے لیکن یونس نے ایسا کرنے سے انکار کردیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ اس کا باپ چونکہ اسے عاق کرچکا ہے اس لیے نہ وہ باپ کو بلا سکتا ہے اور اگر بلا بھی لے تو یہ ضروری نہیں کہ وہ آ بھی جائے۔ یہ عذر عنان کی ماں کے لیے قابلِ قبول تھا لیکن عنان نے یونس کے اس عذر کو تسلیم ہی نہیں کیا۔ وہ دلیلوں سے یہ ثابت کرتی رہی کہ اگر قاضی کو بھی اس جشن میں بلا لیا جائے تو بالکل ممکن ہے کہ اسے عاق نامہ پھاڑ دینے پر مجبور کردیا جائے۔ عنان کے غیر معمولی دباؤ نے یونس کو بے بس اور مجبور کردیا۔ اس نے کہا۔ ”میں کوشش تو کروں گا کہ اپنے والد کو یہاں لے آؤں لیکن اگر میں ناکام ہوجاؤں تو آپ لوگ مجھے معاف کردیجیے گا کیونکہ میں اپنے باپ کے مزاج سے دوسروں کی نسبت زیادہ واقف ہوں۔“

عنان نے کہا۔ ”اگر تو اپنے باپ کو لانے میں کامیاب ہوگیا تو میں بڑی خوشی محسوس کروں گی اور شاید تیرے باپ کو اس کی غلطی پر نادم کیا جاسکے۔“

یونس نے زیادہ بحث نہیں کی اور خاموش ہوگیا۔

لیث کو یقین تھا کہ یونس اپنے باپ کو نہیں مدعو کرے گا چنانچہ جب عنان نے لیث کو یہ خوش خبری سنائی کہ یونس اپنے باپ کو مدعو کرنے پر رضامند ہوگیا ہے تو اسے یقین نہیں آیا۔ اس نے عنان سے کہا۔ ”یونس کتنا ہی یہ یقین نہ دلائے کہ وہ جشن طرب میں اپنے باپ کو بھی مدعو کرے گا، اس پر یقین نہیں کیا جاسکتا۔“

عنان نے جواب دیا۔ ”اس نے وعدہ تو کرلیا ہے۔“

”وہ تو درست ہے لیکن معلوم نہیں کیوں میرا دل اندر سے یہ کہہ رہا ہے کہ وہ ایسا نہیں کرے گا اور تجھے خوش کرنے کے لیے وہ یہ وعدہ ضرور کرلے گا۔“

”مگر ایسے وعدے سے اسے حاصل کیا ہوگا۔ سوائے شرمندگی کے کیونکہ جشن طرب میں جب اس کا باپ نہیں آئے گا تو وہ ہم سب سے آنکھیں ملانے کے لائق نہیں رہے گا۔“

لیث نے اسی اعتماد سے کہا۔ ”لیکن یونس اس کے باوجود اپنے باپ کو نہیں لاسکے گا۔“

عنان نے تھک کر ہار مان لی۔ ”پھر میں کیا کروں؟ میں اس کے باپ کو کس طرح بلاؤں؟“

لیث نے جواب دیا۔ ”یونس اپنے باپ کو مدعو کرے یا نہ کرے لیکن وہ اس جشنِ طرب میں شرکت ضرور کرے گا کیونکہ میں اسے میں لاؤں گا۔ قاضی لبیب بغدادی اس جشنِ طرب میں ضرور شریک ہوگا۔“

لیث یہ کہہ کر چلا گیا۔

☆☆☆

قصر کا وسیع و عریض دیوان نما کمرا گاؤ تکیوں اور چھوٹے تکیوں سے آراستہ کردیا گیا تھا۔ سفید اور رنگین چادروں اور چاندنیوں سے کمرا بہار کا سماں پیش کررہا تھا۔ دیواروں میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر طاقوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ چھوٹی چھوٹی ننھی منی طاقیں جن سے اگردان اور عوددان کا کام لیا جاتا تھا۔ ان میں عود اور لوبان سلگ رہا تھا اور طاقوں میں سے اٹھنے والا ہلکا ہلکا دھواں پورے دیوان کو معطر کیے ہوئے تھا۔ فرش کے بیچوں بیچ کی پٹی پر نبیذ کے خم اور پیالے رکھ دیے گئے تھے۔

دیوان کے سرے پر داہنی طرف عورتوں کے لیے خاص انتظام کیا گیا تھا۔ یہاں ایک خاص اور نمایاں جگہ پر نیلے گاؤ تکیے کے سہارے عنان کی ماں بیٹھ گئی۔ اس کے پاؤں میں عنان نے اپنے لیے جگہ بنائی۔ دوسری خواتین آتی گئیں اور ادھر ادھر بیٹھتی گئیں۔ ان خواتین میں امرا کی بہو بیٹیاں بھی تھی اور فوجی سرداروں کی عزیز اور رشتے دار خواتین بھی۔ ان میں تجارتی عورتیں بھی تھیں اور عنان کی ماں ان سب سے بہت اچھی طرح پیش آرہی تھی۔ دوسری طرف مردوں میں یونس نے وہ مقام حاصل کر رکھا تھا جو اندر عنان کی ماں کو حاصل تھا۔ لیث کے لیے کوئی خاص جگہ نہیں تھی وہ کہیں بھی بیٹھ سکتا تھا۔ معززین آرہے تھے اور اپنی اپنی جگہ سنبھالتے جارہے تھے۔ یونس بڑی رعونت سے ان سب کو خوش آمدید کہہ رہا تھا۔

مغنی اور مغنیائیں دیوان سے ملحق کمرے میں جمع تھیں اور یونس کے حکم کا انتظار کررہی تھیں۔

لیث کی بے چین نظریں قاضی لبیب کا انتظار کررہی تھیں اور یونس لیث کی بے چینی سے لطف اندوز ہورہا تھا۔ آخر جب لطف اندوزی برداشت سے باہر ہوگئی تو یونس نے خود ہی چھیڑا۔ لیث سے پوچھا۔ ”لیث! میں بڑی دیر سے بے چینی اور کیفیت انتظار دیکھ رہا ہوں۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ایسا کیوں ہے؟“

لیث نے جواب دیا۔ ”کسی کی تلاش یا انتظار میں ہرگز

نہیں۔ میں تو اس بات پر حیران ہو رہا ہوں کہ بغداد کے اتنے بہت ساروں سے تیرے تعلقات کس طرح قائم ہو گئے اور اس پر اور زیادہ حیرت ہے کہ اگر ان سب سے کسی طرح تیری واقفیت بھی ہو گئی تھی تو اس واقفیت کو پُراثر کس طرح بنا لیا؟''

یونس نے خوشی سے پھولے نہ سماتے ہوئے جواب دیا۔''مجھے میرے اسی کمال نے تو یہاں تک پہنچایا ہے جو لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔''

لیث نے خوش اخلاقی سے کہا۔''خوب، بہرحال میں تیرے اس کمال کا تو ایک عرصے سے معترف ہوں۔''

یونس نے پوچھا۔''لیث! عنان کو کیا تو نے یہ مشورہ دیا تھا کہ میں اس جشن طرب میں اپنے باپ قاضی کو بھی مدعو کروں؟''

لیث نے جواب دیا۔''میں کیوں مشورہ دوں گا جب سے تو عنان کا مستقبل کا شوہر قرار پا چکا ہے، میں نے یہ قطعی فیصلہ کر لیا ہے کہ میں عنان کو تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ میں اسے تیری امانت سمجھتا ہوں۔''

یونس مسکرانے لگا، بولا۔''جو کچھ تو کہہ رہا ہے، کیا تو نے غور کیا کہ اس میں پریشانی اور گھبراہٹ کتنی اور کیوں شامل ہے۔ تو کہنا کچھ چاہتا ہے لیکن زبان سے نکلتا کچھ اور ہے، آخر کیوں؟''

لیث نے جواب دیا۔''میں گھبرایا ہوا بالکل نہیں ہوں۔ تو ایسا محسوس کر رہا ہے خوامخواہ۔''

یونس اپنے پہلے سوال کی طرف پھر واپس آ گیا۔''کیا تو نے عنان کو اس پر مجبور نہیں کیا تھا کہ میں اس جشن میں اپنے باپ کو بھی مدعو کروں؟''

''یہ غلط ہے، میں نے عنان سے کچھ بھی نہیں کہا۔''

''اور کیا یہ بھی غلط ہے کہ اس وقت بھی تو اس جشن کے شامل ہونے والوں میں بڑی بے چینی سے میرے باپ کا انتظار کر رہا ہے؟''

لیث نے سختی سے تردید کی۔''غلط، بالکل غلط۔ ایسی کوئی بات نہیں۔''

یونس نے فاتحانہ شان سے کہا۔''میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، اس کی ایک ایک بات درست ہے لیکن افسوس کہ اس طرب گاہ میں میرا باپ نہیں آئے گا کیونکہ میں نے اسے مدعو ہی نہیں کیا۔''

لیث نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔''یونس! یہ طرب گاہ ہم دونوں کی مقابلہ گاہ بھی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب تو خود سچ بولنے پر اتر آیا ہے اور اپنے شبہات کا برملا اظہار کر رہا ہے تو میں اپنے حقیقی خیالات کو کیوں چھپاؤں۔ تیرا خیال درست ہے کہ عنان کی یہ خواہش میری اپنی خواہش تھی کہ اس جشن طرب میں تیرا باپ بھی شامل ہو۔ تو نے ہم سب کو جھوٹے آسرے میں رکھا کہ قاضی لبیب اس جشن میں شریک ہوگا حالانکہ تیرے ساتھ ہی مجھے بھی یقین ہے کہ تو جھوٹا ہے۔ جب قاضی لبیب کو مدعو کیا ہی نہیں گیا تو وہ شریک کیونکر ہوگا۔''

یونس نے قطع کلام کیا، بولا۔''لیث! تو کتنا ہی چالاک اور عقل مند سہی لیکن مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔''

لیث نے جواب دیا۔''یہی بات میں خود بھی کہوں گا کہ یونس! تو کتنا ہی چالاک اور ہوشیار کیوں نہ ہو لیکن مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتا اور میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ اس جشن طرب میں تیرا باپ ضرور شامل ہوگا۔''

یونس ہنس کر بولا۔''پھر کرتا رہ انتظار۔''

ابھی یہ فقرہ مکمل بھی نہ ہوا تھا کہ پوری محفل کسی کے احترام میں کھڑی ہو گئی۔ غیر ارادی طور پر یونس اور لیث بھی کھڑے ہو گئے۔ ان دونوں نے جشن گاہ کے دروازے سے قاضی لبیب بغدادی کو اندر داخل ہوتے اور اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ لیث مارے خوشی کے اچھل پڑا مگر یونس کا دل بیٹھنے لگا۔

قاضی لبیب مسکراتا ہوا لیث کی طرف اور لیث قاضی کی طرف بڑھا۔ قاضی کے پیچھے پیچھے اس کے خدمت گار اور مصاحبین چل رہے تھے۔

یونس کو محسوس ہوا کہ اس کا دل سینے میں بیٹھا جا رہا ہے۔ ڈوب رہا ہے۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا اور اس کو سکتہ سا ہو رہا تھا۔ اس کا سارا بنا بنایا کھیل بگڑ چکا تھا۔ وہ بری طرح کانپنے لگا۔ وہ اپنے جسم میں بخار کی کپکپاہٹ اور تکان محسوس کر رہا تھا اور لیث فاتحانہ شان سے مسکرا مسکرا کر کبھی قاضی کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی یونس کی طرف۔

اس کہانی کا بقیہ حصہ اگلے ماہ ملاحظہ کیجیے

ماخذات

تاریخ طبری، ابن جریر الطبری۔ تاریخ ابن خلدون، ابن خلدون۔ فتوح البلدان، بلاذری۔
تاریخ اسلام، معین الدین ندوی۔ تاریخ الخلفا، جلال الدین سیوطی۔
الفخری، ابن طباطبا۔ مسلمانوں کی سیاسی تاریخ، ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن

برف کے جذبے

کاشف زبیر

دشمن کی شناخت ہو تو جنگ لڑنا آسان ہو جاتی ہے لیکن... جب کوئی خونی قاتل دوست کے روپ میں سایا بن جائے تو ایسے میں ہوشیاری غفلت کا کوئی وار نہیں سہہ سکتی... ایسی ہی دلچسپ معرکہ آرائی یہاں بھی جاری تھی... جو مسیحا کے بھیس میں زندگی سے آنکھ مچولی کھیلتا رہا اور اس کہانی کے کرداروں کی آنکھ میں دھول جھونکتا رہا... وہ بلا کا ذہین تھا لیکن ذہانت کی بلا کا وار نہ سہہ سکا... جس نے محض اس کی چال سے اس کے چلن کا اندازہ کر لیا تھا۔

برفانی فضاؤں میں لہو کی گردش تیز کرنے والی بلاؤں کا قصہ

یہ چھوٹا ٹرانسپورٹر طیارہ تھا جو تقریباً بیس ہزار فٹ کی بلندی پر محوِ پرواز تھا۔ کاک پٹ میں دو پائلٹ تھے۔ وہ آپس میں بات کر رہے تھے اور لہجے سے امریکی لگ رہے تھے۔ ان کے انداز میں تشویش تھی۔ پھر ان میں سے ایک نے کہا۔''میں پیچھے جا رہا ہوں ہوشیار رہنا۔''

دوسرا پائلٹ فکر مندی سے بولا۔''کیا یہ ضروری ہے؟''

''ہاں ہمیں طے شدہ پلان پر عمل کرنا ہے۔ ان

چاروں کو لے جانے کا مطلب ہے ہم اپنے لیے ہمیشہ کی پریشانی مول لیں۔ ان کو یہیں چھوڑ کر جانا ہوگا۔" پہلے پائلٹ نے سرد لہجے میں کہا اور اٹھ کر پیچھے کیبن میں آیا جہاں چار افراد موجود تھے۔ انہوں نے اپنے ہتھیار ایک طرف رکھے ہوئے تھے اور واڈکا کی بوتلیں کھول کر جشن منا رہے تھے۔ وہ آپس میں روسی زبان میں گندے مذاق کر رہے تھے اور پاگلوں کی طرح قہقہے لگا رہے تھے۔ اسے دیکھ کر ایک نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا۔

"ہے...... تم کیوں نہیں پی رہے؟"

"ہم پائلٹ ہیں اگر پی تو یہ سفر ہمارا آخری سفر بھی ہو سکتا ہے۔" پائلٹ نے دزدیدہ نظروں سے ایک کونے میں رکھے فولادی سلینڈروں کی طرف دیکھا۔ ان سلینڈروں کو سرکنے سے بچانے کے لیے فولادی زنجیروں سے باندھا ہوا تھا۔ وہ سات گھنٹے پہلے سائبیریا کے ایک چھوٹے سے ائر پورٹ سے روانہ ہوئے تھے اور ان کی منزل قطب شمالی کے پاس امریکی سرزمین تھی۔ پائلٹ نے سلینڈروں سے توجہ ہٹاتے ہوئے میز پر رکھا ہوا پستول دیکھا۔ وہ اس شخص کے زیادہ نزدیک تھا جو اب واڈکا کی بوتل سے منہ لگا کر پی رہا تھا۔ اس نے پائلٹ سے کہا۔ "اگر ہم نے یہ سفر کامیابی سے طے کر لیا تو ہم میں سے ہر شخص کروڑ پتی بن جائے گا۔"

"ہاں میں بھی ذرا چکھ لوں۔" پائلٹ نے ہاتھ آگے کیا جیسے واڈکا کی بوتل اٹھا رہا ہو لیکن اس نے اچانک پستول اٹھا لیا اور سامنے بیٹھے شخص کو شوٹ کر دیا۔ پھر اس نے ذرا دور بیٹھے دوسرے شخص پر گولی چلائی مگر وہ بچ گیا اور باقی دو اب پاگلوں کی طرح اپنے ہتھیاروں کی طرف لپک رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے اپنی کلاشنکوف رائفل اٹھائی اور پائلٹ پر برسٹ مارا۔ وہ میز کی آڑ میں بچ گیا۔ پھر اس نے جوابی فائر کیا تو کلاشنکوف والا ڈھیر ہو گیا مگر اتنی دیر میں باقی دو ہتھیار سنبھال کر پوزیشنیں لے چکے تھے۔ ایک پستول کے مقابلے میں دو خودکار رائفلیں تھیں۔ یک طرفہ مقابلہ تھا۔ گولیاں اتنے تواتر سے برس رہی تھیں کہ اس کے لیے میز کی آڑ سے نکلنا بھی دشوار تھا۔ اگر یہ میز مضبوط فولادی چادر کی نہ ہوتی تو وہ اب تک چھلنی ہو چکا ہوتا۔ وہ خود کو کوس رہا تھا کہ اس نے تیزی سے کام کیوں نہیں کیا اب خود اس کی اور اس کے ساتھی کی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔

اس پر گولیاں برسانے والے نشے میں اور بے حد خوف زدہ تھے اس لیے وہ اس بات کی پروا کیے بغیر فائرنگ کر رہے تھے کہ کاک پٹ سامنے تھا۔ کوئی گولی پائلٹ یا پینل پر لگ جاتی تو ان کا کیا انجام ہوتا اور پھر وہی ہوا۔ اچانک ایک گولی دوسرے پائلٹ کے سر میں لگی اور وہ اوندھے منہ فلائنگ پینل پر گر گیا۔ تھروٹل آگے گیا تو ہوائی جہاز منہ کے بل زمین کی طرف جانے لگا۔ پہلا پائلٹ اڑ کر کاک پٹ کی دیوار پر گرا اور اس پر گولیاں برسانے والے اب اپنی اپنی جگہوں پر دبکے ہوئے تھے اور خود کو گرنے سے بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ پہلے پائلٹ نے بہ مشکل خود کو بچانے کی کوشش کی اور جھانک کر دیکھا تو ونڈ شیلڈ کے سامنے بادل نظر آ رہے تھے۔ پھر اچانک ہی سفید زمین دکھائی دی وہ بہت نزدیک تھی۔ ایک دھماکا ہوا اور دوسرے لمحے طیارہ برف میں دھنستا چلا گیا تھا۔

☆☆☆

شیری جونز اسٹیشن ٹو نائن فائیو کے ہیلی پیڈ پر اتری تو موسم خوفناک حد تک سرد تھا۔ ہیلی کاپٹر کا کیبن معقول حد تک گرم تھا لیکن اس سے باہر درجۂ حرارت منفی چالیس ڈگری سینٹی گریڈ تک گرا ہوا تھا۔ شمال سے تیز اور سرد کاٹ دار ہوا جیسے پانی کی طرح بہہ رہی تھی۔ وہ نیچے اتری تو ایک لمحے کو ہوا کے زور سے لڑکھڑائی اور لرز اٹھی۔ حالانکہ اس نے مکمل گرم لباس پہن رکھا تھا۔ قطب شمالی پر اسٹیشن دو پچانوے امریکا کا تھا۔ اس تحقیقاتی اسٹیشن پر درجن سے زیادہ عمارتیں اور تنصیبات تھیں۔ جہاں ڈھائی سو سے زیادہ سائنس دان اور ان کی مدد کے لیے دو ہزار افراد پر مشتمل عملہ ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ آس پاس چھوٹے چھوٹے بے شمار ریسرچ سب اسٹیشن تھے جنہیں ضرورت کے وقت استعمال کیا جاتا تھا۔ ایک چھوٹا ایٹمی ری ایکٹر یہاں بجلی اور گرمائش مہیا کرتا تھا۔ پاس ایک رن وے اور ہیلی پیڈ تھا۔ ایک طرف بنے ہینگر میں بیک وقت کئی طیارے اور ہیلی کاپٹر کھڑے کرنے کی گنجائش تھی۔

سال میں چھ مہینے کام کرنے کے بعد پندرہ نومبر کو اسٹیشن شٹ ڈاؤن کر دیا جاتا تھا اور اس کا سارا عملہ واپس امریکا یا ان ملکوں میں چلا جاتا جہاں سے وہ تعلق رکھتا تھا۔ پھر پندرہ اپریل کو اسٹیشن دوبارہ کھولا جاتا اور سارا عملہ واپس آ جاتا۔ اگلے چھ مہینے یہاں گرما ہوتا تھا۔ سورج تقریباً ہر وقت نکلا رہتا تھا اور آسمان بھی زیادہ تر صاف ہوتا تھا۔ اس کے باوجود شاذ ہی ایسا کوئی دن آتا تھا جب درجۂ حرارت صفر سے اوپر جاتا تھا۔ کیونکہ یہ اسٹیشن قطب شمالی سے صرف چار سو میل جنوب میں تھا۔ یہ جگہ قطبی زون میں آتی تھی۔ سمندر پر بہت موٹی برف کی تہ تھی جس پر یہ اسٹیشن قائم تھا۔ آج تیرہ

نومبر کا دن تھا اور پرسوں یہاں سے آخری پرواز میں ایک ہی دن تھرٹی طیارہ باقی رہ جانے والے عملے کو لے کر روانہ ہو جاتا۔ اس وقت بھی ایک چھوٹا سیسنا طیارہ مسافروں اور سامان لے کر پرواز کے لیے پر تول رہا تھا۔ ہوا بہت تیز تھی۔ شیری سر جھکائے تیز قدموں سے مرکزی عمارت کی طرف بڑھی۔ المونیم اور فولاد سے بنی نصف لمبے سلینڈر جیسی اس عمارت میں اسٹیشن کے دفاتر تھے۔ کچھ عملہ یہیں قیام کرتا تھا جن میں شیری جونز بھی شامل تھی۔

وہ اندر آئی۔ بے حد سرد ہوا سے نجات ملی تو اس کی جان میں جان آئی تھی، اس نے جیکٹ کا ہڈ اور آنکھوں سے عینک اتار دی۔ ہاتھوں پر مٹانز تھے یہ بہت موٹے دستانے ہاتھوں کو فراسٹ بائٹ سے بچاتے تھے۔ راہداریوں میں جابجا سامان کے ڈھیر لگے تھے۔ جانے کی خوشی میں رات ہونے والی پارٹی کی تیاریاں بھی کی جا رہی تھیں۔ ایک نسبتاً کھلی جگہ آرکسٹرا لگایا جا رہا تھا اور مختلف ساز بجانے والے اپنے اپنے سازوں کو چیک کر رہے تھے۔ گٹارسٹ جان نے اسے پکارا۔ "ہے شیری ہمیں ایک ڈانس گرل کی ضرورت ہے۔"

"شٹ اپ۔" وہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

"دیکھ کے روکی یہ شیرف ہے۔" کسی نے پکار کر کہا۔

"شیرف اور یہاں۔" تیسرے نے قہقہہ مارا۔ وہ ان سب کو نظر انداز کرتی ڈاکٹر میسن کے دفتر تک آئی۔ ڈاکٹر میسن اس کے باپ کا بچپن کا دوست تھا اور ہائی اسکول تک دونوں نے ساتھ تعلیم حاصل کی تھی۔ درحقیقت اسے یہاں لانے کا ذمے دار بھی ڈاکٹر میسن تھا۔ وہ نہ صرف اس کا انکل تھا بلکہ دوست بھی تھا۔ اس نے دستک دی اور پھر دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ دفتر خالی تھا مگر ڈاکٹر کی لیب میں روشنی تھی۔ وہ اندر آئی۔ ڈاکٹر میز پر پڑی ایک لاش کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس نے شیری کو دیکھا۔

"ریکر اولس ہے۔"

"اوہ۔" شیری نے کہا۔ ریکر اولس ایک سپلائر تھا۔ اس کا کام زیادہ تر ہوائی جہاز پر ہوتا تھا۔ اکثر وہ چند دن یا بعض اوقات چند گھنٹے کے لیے آتا تھا۔ یہاں اس کی کسی سے بات نہیں تھی اور نہ ہی وہ یہاں کسی سرگرمی میں شامل ہوتا تھا۔ وہ زیادہ تر ہینگر کے پاس سپلائرز کے لیے مخصوص بیرک میں رہتا تھا۔ یہ رپورٹ اسے ڈاکٹر میسن نے دی تھی۔ شیری نے لاش دیکھی جو سردی سے تقریباً سیاہ ہو گئی تھی۔

"پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کیا ہے؟"

"موت کی وجہ سردی ہے ممکنہ طور پر یہ زیادہ پی جانے کے بعد کسی وجہ سے باہر نکلا اور پھر وہیں رہ گیا۔ سردی نے اسے جما دیا۔" ڈاکٹر میسن نے اس کے سینے پر ٹانکے لگاتے ہوئے کہا۔ پوسٹ مارٹم اسی نے کیا تھا۔ ڈاکٹر میسن اسٹیشن کا انچارج ڈاکٹر تھا۔ لیکن اس کا عملہ اور نائب ڈاکٹر جا چکا تھا۔ وہ آخری پرواز میں جاتا۔

"غیر طبعی موت کا کوئی امکان؟"

"نہیں کوئی امکان نہیں ہے۔" ڈاکٹر میسن نے حتمی انداز میں کہا۔ "چوٹ یا زہر کا کوئی نشان نہیں ہے، صرف خون میں الکوحل کی مقدار زیادہ ہے اسی سے شبہ ہے کہ یہ نشے میں تھا۔ تم کہاں تھیں؟"

"سب اسٹیشن نائن سے ایک ریڈیائی پیغام آیا تھا۔ پیغام واضح نہیں تھا اس لیے مجھے وہاں جانا پڑا۔"

"لیکن تمام سب اسٹیشن خالی ہیں۔"

"ہاں، اسی لیے تو میں گئی تھی۔" شیری نے کہا۔ "اسٹیشن پرسوں شٹ ڈاؤن ہو جائے گا اس لیے یہاں موجود ہر فرد کی روانگی کو یقینی بنانا ہوگا۔"

"یہ کام راجر کا ہے۔" ڈاکٹر نے اسٹیشن انچارج کا نام لیا۔

"لیکن ہم سب کو دیکھنا ہوگا۔ میری بھی ذمے داری ہے۔"

"اس بار حادثات زیادہ ہوئے ہیں۔" ڈاکٹر نے لاش کو پلاسٹک کفن میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "یہ دوسری لاش ہے اور اب اسے لے جانے کا وقت نہیں رہا ہے، یہ اگلے گرما تک یہیں رہے گی۔"

"دوسری لاش...؟" شیری چونکی۔ "وہ بھی یہیں ہے؟"

ڈاکٹر نے سر ہلایا۔ "اتفاق سے اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے اور یہاں سے جانے والی کسی پرواز میں جگہ نہیں تھی۔"

"اسے آٹھ دن ہو گئے ہیں۔" شیری نے منہ بنایا۔ "حد ہوتی ہے بد انتظامی کی۔"

"شاید میرا ذکر ہو رہا ہے۔" دروازے کی طرف سے راجر کلین کی آواز آئی۔ وہ اندر جھانک رہا تھا۔ شیری نے پوچھا۔

"لاشیں ابھی تک یہیں ہیں یہ کب جائیں گی؟"

"اگر لاشیں یہاں رہ گئیں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" راجر کا لہجہ سرد ہو گیا۔ "میں زندہ انسانوں کی فکر میں

ہوں ان میں سے کوئی رہ نہ جائے۔"

"پھر کوئی مسئلہ ہوا ہے؟"

"نہیں لیکن ایک پیغام اور آیا ہے۔" راجر نے اس بار نرمی سے کہا۔ "میرے ساتھ آؤ۔"

راجر شیری کو کنٹرول روم میں لایا۔ اس نے ریڈیو آفیسر سے کہا۔ "پیغام سناؤ۔"

اس نے ایک ریکارڈ شدہ پیغام چلایا۔ ہواؤں کے شور میں کوئی شخص چلا رہا تھا مگر آواز واضح نہیں تھی۔ پیغام ایک منٹ کا تھا۔ شیری نے پوچھا۔ "لوکیشن کیا ہے؟"

ریڈیو آفیسر نے اسکرین پر بنے نقشے کی طرف اشارہ کیا۔ "اسٹیشن آٹھ سے... ممکنہ طور پر ایک کلومیٹر آگے سے۔"

"پہلے سب اسٹیشن تو۔" شیری نے ایک گہری سانس لے کر راجر کی طرف دیکھا۔ "کوئی آدمی غائب تو نہیں ہے؟"

اس نے شانے اچکائے۔ "تقریباً سوا دو ہزار افراد میں سے کتنے لوگ یہاں ہیں اور کتنے نہیں ہیں میں کیسے بتا سکتا ہوں۔ فرداً فرداً ہر فرد کو چیک کرنا ناممکن ہے۔"

"تمہارے پاس ان کی کوئی فہرست ہوگی۔ اس میں دیکھ کر یہ تو بتا سکتے ہو کہ کتنے افراد جا چکے ہیں؟"

"پندرہ سو افراد جا چکے ہیں اور باقی کل چلے جائیں گے۔ صرف انتہائی ضروری افراد پرسوں صبح میرے ساتھ روانہ ہوں گے۔"

"کتنی تنصیبات اور عمارتیں بند کی جا چکی ہیں؟"

"سات عمارتیں اور تنصیبات بند کی جا چکی ہیں۔" راجر نے بتایا۔ "چار آج بند کر دی جائیں گی اور یہ اسٹیشن آخر میں بند ہوگا۔"

"انہیں چیک کیا گیا ہے؟"

"مکمل طور پر۔" راجر نے یقین سے کہا۔ "میرے سپروائزر تجربے کار آدمی ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" شیری نے گہری سانس لی۔ "اس کا مطلب ہے مجھے پھر جانا ہوگا۔"

"میں آدمی بھیج رہا ہوں۔"

"نہیں یہ میری ذمے داری ہے۔"

"تم ابھی آئی ہو۔" راجر نے کہا۔ "اتنی جلدی جانا مناسب نہیں ہے۔"

کنٹرول روم کے موسم کی نگرانی کرنے والے آفیسر نے کہا۔ "جو کرنا ہے جلدی کرنا ہے۔" اس نے اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔ "طوفان تیس میل فی گھنٹے کی رفتار سے بڑھ رہا ہے اور صرف نو سو میل دور رہ گیا ہے۔"

"یعنی ہمارے پاس صرف تیس گھنٹے ہیں۔" شیری نے کہا۔

"درحقیقت وقت اس سے بھی کم ہے۔ کیونکہ جیسے جیسے طوفان آگے بڑھ رہا ہے اس کی طاقت اور رفتار میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔"

"میں دو گھنٹے بعد جاؤں گی۔" شیری نے کہا۔ "کونز سے کہو وہ طیارہ تیار رکھے۔"

کونز اسٹیشن کا بہترین پائلٹ تھا۔ قریبی جگہوں کے لیے ان کے پاس دو چھوٹے طیارے تھے۔ شیری اپنے کمرے میں آئی۔ یہاں ایک طرف کارنس پر اس کے باپ کارنر جونز کی تصویر بھی رکھی تھی۔ وہ منی سوٹا میں کاؤنٹی شیرف تھا۔ مگر جب شیری نے پولیس اکیڈمی سے امتحان پاس کیا تو اسے کوئی کاؤنٹی ڈپٹی شیرف لینے کو بھی تیار نہیں تھی۔ اس لیے جب اسے یہاں مارشل کی پیشکش ہوئی تو اس نے اسے چیلنج سمجھ کر قبول کر لیا۔ وہ اس وقت منی سوٹا میں پولیس جاب کر رہی تھی۔ مگر یہاں آ کر اسے پتا چلا کہ یہاں اس کے لیے کوئی کام نہیں تھا؛ ورنہ ہی اسٹیشن کے لوگ اسے قابل توجہ سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں یہاں کسی شیرف کا کوئی کام نہیں تھا۔ اکثر شیری کو ان لوگوں کی طرف سے تضحیک آمیز رویے کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ راجر نے بھی اس کا مذاق نہیں اڑایا تھا مگر وہ بھی یہی سمجھتا تھا کہ اس کی یہاں کوئی ضرورت نہیں تھی۔ چند مہینے بعد شیری خود بھی ایسا ہی سمجھنے لگی کہ یہاں کسی شیرف کی ضرورت نہیں تھی۔ مگر اسے امریکی حکومت نے تعینات کیا تھا اس لیے وہ ملازمت جاری رکھنے پر مجبور تھی۔ دوسری صورت میں اسے استعفیٰ دینا پڑتا۔ استعفیٰ اس کی ناکامی ہوتی اور وہ ناکام ہونا نہیں چاہتی تھی۔

شیری نے شاور لیا اور چینج کر کے باہر آئی۔ اس نے باہر کے لحاظ سے تیاری شروع کر دی۔ بہت بھاری اور موٹی پینٹ پھر بھاری جیکٹ، پاؤں میں مخصوص جوتے اور ہاتھوں کے لیے مٹانز۔ اس کے باوجود وہ باہر نکلنے والے دروازے تک آئی تو اسے ایک لمحے کو ہمت کرنا پڑی تھی۔ پھر وہ باہر آئی اور سردی سے لرز اٹھی تھی۔ پھر وہ تیز قدموں سے ہینگر کی طرف بڑھی۔ کونز طیارے میں موجود تھا۔ وہ سیاہ فام اور نوجوان تھا۔ اس کی ہنسنے ہنسانے کی عادت اور ہر وقت مستعد رہنے سے شیری اسے پسند کرتی تھی۔ پھر وہ پائلٹ تو اچھا تھا ہی مگر جب وہ طیارے میں آئی

تو اس میں جیف کو دیکھ کر ٹھٹکی تھی پھر اس نے کونز کی طرف دیکھا تو اس نے شانے اچکائے یعنی اسے کچھ نہیں معلوم تھا۔ جیف پیٹرسن اسٹیشن کا سیکیورٹی انچارج تھا۔ وہ تقریباً تیس برس کا خوش شکل مگر کسی قدر سخت مزاج شخص تھا۔ ظاہر ہے شیری اسے پسند نہیں کرتی تھی کیونکہ دونوں پیشہ ور حریف تھے۔ شیری نے سرد لہجے میں پوچھا۔

"تم کس لیے اس فلائٹ میں موجود ہو؟"

"مجھے راجر نے بھیجا ہے۔"

"راجر۔" شیری نے ہونٹ بھینچ لیے۔

جیف نے جلدی سے وضاحت کی۔ "میں صرف سیکیورٹی کے لیے ہوں تمہارے کسی کام میں مداخلت نہیں کروں گا۔"

شیری نے سوچا اور سر ہلایا پھر اس نے کونز کو پرواز کا حکم دیا۔ انجن اسٹارٹ تھا۔ اس نے اسے ہینگر سے نکالا اور وہ اسکیز پر پھسلتا ہوا رن وے پر دوڑ کر ہوا میں بلند ہو گیا۔ ہوا خاصی تیز تھی۔ طیارہ چند لمحے کے لیے بے قابو ہوا تھا مگر پھر کونز نے اسے قابو کر لیا۔ سب اسٹیشن نمبر آٹھ یہاں سے کوئی چالیس میل شمال میں تھا۔ شیری نے کونز کو خبردار کیا۔ "طوفان اسی طرف آ رہا ہے ممکن ہے تمہیں نمبر آٹھ کے پاس تیز ہواؤں سے واسطہ پڑے۔"

"تم فکر مت کرو۔" اس نے اعتماد سے کہا۔ "میں نے موسم کی رپورٹ لے لی ہے۔"

پندرہ منٹ بعد وہ سب اسٹیشن آٹھ کے نزدیک رن وے پر اتر رہے تھے، یہاں ہوا بھی تیز تھی اور یقیناً سردی بھی زیادہ تھی۔ وہ طیارے سے نکلے اور سب اسٹیشن کی عمارت تک آئے مگر وہ اندر سے خالی تھی۔ ریڈیائی پیغام بھی سب اسٹیشن سے باہر سے آیا تھا۔ شیری نے جی پی ایس پر لوکیشن دیکھی اور شمال کی طرف اشارہ کیا۔ "ہمیں اس طرف جانا ہوگا۔"

وہاں برف پر چلنے والی ایک ٹینک نما گاڑی موجود تھی۔ یہ ٹینک کی طرح چین پر چلتی تھی تاکہ ٹائر برف میں نہ پھنسیں۔ طاقت ور ڈیزل انجن اسے برف پر پچاس میل فی گھنٹے کی رفتار سے چلا سکتا تھا۔ اس کا بلند اور چاروں طرف شیشے سے بنا کیبن اندر سے مناسب حد تک گرم تھا اور اس سے دور تک صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ کونز نے ڈرائیور کی سیٹ سنبھالی اور وہ پانچ منٹ بعد مذکورہ مقام پر تھے۔ شیری جی پی ایس ریسیور لے کر نیچے اتری۔ وہ چند قدم چلی اور رک گئی۔ یہ ٹھیک وہی لوکیشن تھی جہاں سے آخری پیغام آیا تھا۔ مگر یہاں کوئی نہیں تھا۔ دور تک برف کا ہموار میدان تھا۔ جو کچھ آگے جا کر ذرا بلند ہو رہا تھا۔ جیف بھی اتر کر نیچے آ گیا۔ اس نے شیری سے کہا۔ "یہاں دور تک کوئی نہیں ہے۔"

"ہو سکتا ہے پیغام دینے والا آس پاس ہو۔" شیری نے کہا اور کونز کی طرف دیکھ کر اسے گاڑی کا ہارن بجانے کا اشارہ کیا۔ اس نے حکم کی تعمیل کی۔ یہ پریشر ہارن جیسی اونچی آواز رکھتا تھا اور یقیناً اس کی آواز دور تک گئی ہوگی۔ کونز نے کئی بار ہارن بجایا اور پھر رک گیا۔ شیری آگے دیکھ رہی تھی پھر وہ برف کے ابھرے حصے کی طرف بڑھی۔ جیف اپنی جگہ کھڑا تھا۔ شیری زمین دیکھ رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ یہاں کسی کی آمد و رفت رہی ہے۔ کیونکہ برف پر مٹ جانے والے معمولی سے نشانات رہ گئے مگر ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ یہ نشانات ہوا نے بنائے ہوں۔ وہ ایک جگہ رکی اور آس پاس دیکھ رہی تھی کہ اچانک اس کے پیروں تلے سے زمین لرزی اور پھر وہاں برف ٹوٹ گئی اور شیری نمودار ہونے والے گڑھے میں گر گئی۔ وہ سیدھی نہیں گری تھی بلکہ یہ کسی قدر ترچھی کھدی ہوئی سرنگ تھی اور وہ اس میں پھسلتی ہوئی ایک کسی قدر کھلی جگہ گری۔ اسی لیے اسے زیادہ چوٹ نہیں لگی ورنہ وہ تقریباً تیس فٹ نیچے آئی تھی۔ گرتے ہوئے اس نے ہلکی سی چیخ ماری تھی۔

جیف نے اسے گرتے دیکھا تو بے اختیار دوڑا اور گڑھے کے پاس آ کر وہ اوندھے منہ گرا اور نیچے جھانکتے ہوئے چلایا۔ "ہے شیرف تم ٹھیک ہو؟"

"میں ٹھیک ہوں۔" شیری نے کہا۔

"میں رسا لا رہا ہوں ہم ابھی تمہیں اوپر نکال لیں گے۔" جیف نے کہا اور مڑ کر کونز کی طرف دیکھا مگر وہ پہلے ہی رسا لیے چلا آ رہا تھا۔ جیف نے اس سے رسا لے کر نیچے پھینکا اور بولا۔ "شیرف اسے پکڑ لو ہم تمہیں اوپر کھینچ لیں گے۔"

"نہیں بلکہ تم لوگ نیچے آؤ۔" شیری نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "یہاں ایک چیز ہے۔"

دس منٹ بعد وہ گاڑی قریب لا کر اس سے رسا باندھ کر نیچے اتر آئے تھے۔ کسی قدر کھلی جگہ کے ایک طرف گول دیوار تھی اور اس میں ایک دروازہ بھی تھا۔ کونز حیران ہو کر بولا۔ "ہوائی جہاز... تیس فٹ برف کے نیچے۔"

"یہ یقیناً یہاں کئی سالوں سے ہے۔" شیری نے کہا۔

"مگر یہاں حال ہی میں کوئی آیا ہے۔" جیف نے کہا۔ "یہ سرنگ اسی نے بنائی ہے۔ تم لوگوں نے دیکھا نہیں سرنگ پر خون کے نشانات بھی ہیں۔"

''ہمیں دیکھنا ہوگا کہ اندر کیا ہے۔'' شیری نے کہا۔

ان دونوں نے مل کر دروازہ کھول لیا جو کسی قدر جام ہو رہا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئے جہاں ہر طرف ملبا بکھرا ہوا تھا۔ کوزنے کہا۔

''یہ روسی طیارہ ہے... میرا خیال ہے انٹونوف ایک سو بارہ ہے۔ یہ چھوٹا کارگو طیارہ ہے۔''

وہ درمیانی کیبن میں تھے۔ انہوں نے ٹارچیں روشن کر لی تھیں۔ وہ ملبے کے درمیان چل رہے تھے۔ اچانک جیف کا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا۔ اس نے ٹارچ کا رخ نیچے کیا اور چونک کر پیچھے ہٹا۔ پھر اس نے پکار کر کہا۔ ''یہ...... یہاں ایک لاش ہے۔''

شیری تیزی سے آگے آئی اس نے جھک کر دیکھا۔ ''اسے قتل کیا گیا ہے۔ یہ دیکھو گولیوں کے نشانات نمایاں ہیں۔''

''مبارک ہو شیرف۔'' جیف نے کسی قدر مزاحیہ انداز میں کہا۔ ''تمہیں اسٹیشن کے آخری دن ایک کیس مل ہی گیا۔''

''ممکنہ طور پر یہ بھی روسی ہے۔'' شیری نے اس کی وردی پر لگے نشانات دیکھے۔ ''شاید آرمی ایوی ایشن سے تعلق ہے۔''

''درست یہ آرمی ایوی ایشن کا طیارہ ہے۔'' کوزنے تصدیق کی۔

''سوال یہ ہے کہ روسی طیارہ یہاں کیا کر رہا تھا اور اس کی رپورٹ کیوں نہیں ہوئی۔'' شیری نے ادھر ادھر ٹارچ لہراتے ہوئے کہا۔ جلد انہوں نے باقی پانچ لاشیں بھی دریافت کر لیں۔ پائلٹ پینل پر اوندھے منہ پڑا تھا۔ طیارے نے شاید نرم برف میں لینڈنگ کی تھی اس لیے اس کا ڈھانچا تقریباً سلامت تھا۔ اسی لیے وہ برف میں گہرائی میں دھنس گیا تھا۔ ابھی وہ کیبن دیکھ رہے تھے کہ اچانک اوپر سے عجیب سی آواز آئی۔ جیف جھپٹ کر دروازے کے پاس آیا۔ اس نے باہر دیکھا اور چلایا۔

''یہاں سے نکلو برف گرنے والی ہے۔''

ابھی اس کا جملہ منہ میں تھا کہ اوپر سے برف کا ریلا آیا اور اگر کوزنا اسے پیچھے نہ کھینچ لیتا تو جیف اس کی زد میں آجاتا۔ برف اتنی زیادہ تھی کہ وہ دروازے سے اندر گھس آئی تھی۔ تینوں کو صورت حال سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ کھدی سرنگ کی دیواریں گر گئی تھیں اور راستہ بند ہو گیا تھا۔ تیس فٹ تک برف کھود کر اوپر جانا ممکن نہیں تھا۔ وہ عملاً اس قبر میں زندہ دفن ہو گئے تھے جس میں پہلے ہی سے چھ عدد لاشیں موجود تھیں۔ پہلے اوپر سے جو تھوڑی بہت روشنی آرہی تھی وہ بھی بند ہو گئی تھی اور اب سارا انحصار ٹارچوں پر تھا۔ وہ فکرمند ہوئے مگر بہت زیادہ نہیں۔ انہیں معلوم تھا کہ جب وہ واپس نہیں جائیں گے تو ان کی تلاش میں ٹیم بھیجی جائے گی۔ وہ سب اسٹیشن آٹھ کے پاس برفانی گاڑی کو تلاش کرلے گی اور باقی اس سے بندھا رسا اور گری ہوئی برف ان کی نشان دہی کرے گی۔ اس لیے انہوں نے پھر سے کیبن کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ کوزکو واڈکا کی ایک صحیح سلامت بوتل مل گئی اس نے اسے کھول کر ایک گھونٹ لیا۔

''خالص ہے۔'' اس نے تعریفی انداز میں کہا اور بوتل جیف کی طرف بڑھا دی۔ وہ خود کو بے پروا ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جیف نے بھی ایک گھونٹ لیا۔

''اس موسم کے لحاظ سے بہترین چیز ہے آدمی گرم ہو جاتا ہے۔'' جیف نے تائید کی۔ اس دوران میں شیری ایک طرف زنجیروں سے بندھے ہوئے فولادی سلینڈروں کا معائنہ کر رہی تھی۔ مگر یہ خالی تھے اور ان کے اندر موجود چیز نکال لی گئی تھی۔ اس نے جیف کو آواز دی۔

''ادھر آنا یہ سلینڈرز دیکھو۔''

جیف نے سلینڈرز دیکھے اور فکرمند ہو گیا کیونکہ ان پر وہ مخصوص نشان بنا ہوا تھا جو تابکار اشیا کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ''کیا ان سلینڈرز میں تابکار مواد لے جایا جا رہا تھا۔''

''خاص بات یہ ہے کہ وہ مواد غائب ہے۔ یہ دیکھو سلینڈرز کے لاک ابھی حال میں توڑے گئے ہیں۔'' شیری نے روشنی ڈالی۔ ''یہ ان لوگوں کا کام ہے جنہوں نے سرنگ کھودی ہے۔''

''مگر وہ یہاں تک کیسے پہنچے؟'' جیف سوچ میں پڑ گیا۔ ''یہ طے ہے کہ ان لوگوں کا تعلق اسی اسٹیشن سے ہے، باہر سے کوئی فرد نہیں آسکتا ہے۔''

''شاید کچھ لوگوں نے اتفاقاً یہ طیارہ تلاش کر لیا۔'' شیری بہ دستور ٹارچ کی روشنی سے تلاش کا کام جاری رکھے ہوئے تھی۔ ایک سلینڈر کے پاس اسے فرش پر اچھا خاصا خون دکھائی دیا تھا۔ اس نے اسے چیک کیا یہ تازہ تھا یعنی اسے گرے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے خون جم گیا تھا مگر اس کی سرخی برقرار تھی۔ اس کے پاس ہی لوہے کی ایک نوکدار سلاخ بھی پڑی تھی جس کے سرے پر خون لگا ہوا تھا اور یہ بھی تازہ تھا۔ شیری نے غور کیا اور سمجھ گئی کہ خون کیسے

اس سلاخ اور فرش پر لگا۔ کوئی سلاخ سے سلینڈرز پر لگے لاک توڑ رہا تھا اور سلاخ اچٹ کر اس کے اپنے جسم میں اتر گئی۔ کونر سامنے والے حصے میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ اچانک اس نے قہقہہ لگایا۔ جیف اس کے پاس آیا۔

''کیوں ہنس رہے ہو؟''

''یہ دیکھو۔'' اس نے انہیں ڈائنامائٹ اسٹک کا بنڈل دکھایا۔ ''اب ہم راستہ کھول سکتے ہیں۔''

''یہ بہت خطرناک ہوگا۔'' شیری نے خبردار کیا۔

''نہیں، محفوظ طریقے سے استعمال کیا جائے تو کچھ نہیں ہوگا۔'' جیف نے کہا۔ ''کاک پٹ والا حصہ ذرا اوپر کی طرف ہے اگر ہم اس کی چھت پر رکھ کر ڈائنامائٹ اڑائیں تو شاید برف ہٹ جائے۔''

''اس کا بھی امکان ہے کہ طیارہ ہی تباہ ہو جائے۔''

''نہیں، یہ بہت مضبوط باڈی والا طیارہ ہے۔'' کونر بولا۔ ''پھر ہم پیچھے چلے جائیں گے۔''

ان دونوں نے مل کر کاک پٹ کے اوپر والا خانہ کھولا۔ فوراً ہی ڈھیروں برف اندر آ گری تھی لیکن اس سے کام آسان ہو گیا۔ کونر نے باہر نکل کر برف کے اوپری حصے میں ڈائنامائٹ لگایا پھر اس نے لائٹر سے اس کے فیتے کو آگ دکھائی اور کود کر اندر آیا۔ شیری اور جیف پہلے ہی طیارے کے دم والے حصے میں آ گئے تھے۔ ابھی کونر آ کر اپنی جگہ دبکا ہی تھا کہ دھماکا ہوا اور جب برف کی برسات رکی تو پھٹ جانے والی چھت کے اوپر کھلا آسمان نظر آ رہا تھا۔ دس منٹ بعد وہ باہر آ چکے تھے اور گاڑی میں بیٹھ کر سب اسٹیشن کی طرف جا رہے تھے۔ موسم خراب ہو چکا تھا اور ہوا کے بہت تیز جھکڑ چل رہے تھے۔ کونر نے کسی نہ کسی طرح طیارہ اڑا لیا۔ جب وہ واپس پہنچے تو طوفان کا اثر اسٹیشن تک پہنچ گیا تھا اور اسی لیے راجر نے صبح کے بجائے بارہ گھنٹے پہلے روانگی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دوسری صورت میں امکان تھا کہ وہ تیز ہواؤں کی وجہ سے روانہ نہ ہو سکیں۔ اس نے شیری کی بات سنی مگر زیادہ توجہ نہیں دی۔ اس نے کہا۔ ''ہم واپس جا کر حکام کو بتا دیں گے۔ آگے ان کی مرضی کہ وہ کیا کرتے ہیں۔''

''طیارے میں چھ لاشیں ہیں اور اس میں تاب کار مواد لے جانے والے خالی سلینڈرز ہیں۔''

''بہ قول تمہارے وہ کئی سالوں سے یہاں ہیں۔'' راجر نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اس لیے چند مہینے اور رہ جائیں تو اس سے کیا فرق پڑے گا۔''

''دیکھو سلینڈرز میں موجود تاب کار مواد یہاں موجود کسی فرد نے نکالا ہے اسی نے طیارہ دریافت کیا اور وہاں تک پہنچنے کا راستہ بنایا۔ بلکہ مجھے یقین ہے یہ ایک فرد کا کام نہیں ہے اس میں کئی افراد ملوث ہوں گے۔''

راجر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کوئی فرد یہاں تاب کار مواد نہیں لا سکتا ہے، وہ فوراً پکڑا جائے گا۔ یہاں ریڈی ایشن گائیگر لگے ہیں۔''

''ٹھیک ہے لیکن وہ کہیں باہر تو چھپا سکتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ بہت اہم معاملہ ہے اور براہ راست ملکی سلامتی سے تعلق رکھتا ہے۔''

''میں نے کہا نا یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے تب میں اپنی اتھارٹی استعمال کروں گی۔'' شیری نے سخت لہجے میں کہا۔ ''مجھے ان تمام افراد کی فہرست چاہیے جو سب اسٹیشن آٹھ پر جاتے رہے ہیں۔''

''یہ بہت مشکل......''

''کوئی مشکل کام نہیں ہے تم اپنے ریکارڈ کیپر سے کہو وہ کمپیوٹر سے چند منٹ میں معلوم کر لے گا۔''

راجر ہچکچایا۔ ''بہت سے دورے ریکارڈ نہیں ہوتے ہیں اس لیے کمپیوٹر سے بھی مدد نہیں ملے گی۔''

شیری نے اسے بے یقینی سے دیکھا۔ ''دورے ریکارڈ نہیں ہوتے، مگر کیوں؟...... یہ تو غیر ذمے داری ہے۔ اگر کسی سے کوئی غلطی ہو تو اس کا کیسے پتا چلے گا کہ غلطی کس نے کی ہے؟ کس کام کا ذمے دار کون ہے۔''

راجر زچ لہجے میں بولا۔ ''خدا کے لیے یہ ایک ریسرچ اسٹیشن ہے میں کوئی جیل نہیں چلا رہا ہوں جو ہر فرد کے ایک ایک عمل پر نظر رکھی جائے۔''

''تب بھی مینول پر تو عمل ہونا چاہیے تھا۔ تم نے وہ بھی نہیں کیا۔ میں اسے بھی اپنی رپورٹ کا حصہ بناؤں گی۔''

''تمہاری جو مرضی کرو۔'' راجر نے غصے سے کہا۔ ''اب مجھے کام کرنے دو ہمیں اسٹیشن شٹ ڈاؤن کرنا ہے۔ طوفان توقع سے زیادہ تیزی سے آ رہا ہے اور ہمیں بارہ گھنٹے پہلے یہاں سے نکلنا ہے۔''

شیری نے گھڑی دیکھی۔ ''یعنی تمہاری روانگی میں صرف اٹھارہ گھنٹے رہ گئے ہیں۔''

راجر نے سر ہلایا اسی لمحے اس کا واکی ٹاکی بولا، اس نے نکال کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

دوسری طرف کنٹرول سینٹر سے ریڈیو آپریٹر تھا۔ ''روسی اسٹیشن سے ایک پیغام آیا ہے۔''

روسی اسٹیشن یہاں سے کوئی بارہ کلومیٹرز کے فاصلے پر تھا۔ شیری راجر کے ساتھ کنٹرول روم میں آئی۔ پیغام ریکارڈ کر لیا گیا تھا۔ دوسری طرف سے کوئی روسی لہجے میں انگریزی بول رہا تھا۔ ''پلیز مجھے مدد کی ضرورت ہے۔ میرے ساتھی مارے جا چکے ہیں اور میں مدد کے لیے پیغام بھیج رہا ہوں۔ یہاں کوئی قاتل ہے جس نے ایک ایک کر کے میرے سارے ساتھیوں کو مار دیا ہے، میں نے چھپ کر اپنی جان بچائی ہے۔''

''مجھے جانا ہوگا۔'' شیری نے کہا۔

''اس وقت کوئی چھوٹا طیارہ پرواز نہیں کر سکتا۔'' راجر نے کہا۔

''میں اسنو بائک پر جاؤں گی۔ یہ بہت سنگین معاملہ ہے، روسی کو مدد کی ضرورت ہے۔''

''یہ معاملہ امریکی مارشل کے تحت نہیں آتا۔'' راجر نے اسے یاد دلایا۔

''ہاں لیکن انسانیت کے تحت ضرور آتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے دونوں واقعات کا آپس میں کوئی تعلق ہو۔''

''میرا نہیں خیال کہ ایسا ہے۔''

''کیا تمہارا اس معاملے میں کوئی خیال ہے۔'' شیری نے باہر جاتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا۔ راجر نے عقب سے آواز دی۔

''اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں جیف کو ساتھ لے جاؤں۔''

شیری نے سر ہلایا تھا جیف اسے کنسرٹ والی راہداری میں ملا، وہ بانسری بجا رہا تھا اور بہت اچھی بجا رہا تھا۔ شیری نے حیرت سے کہا۔ ''مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ تم اتنی اچھی بانسری بھی بجاتے ہو۔''

''اگر مجھے اس جاب سے نکال دیا جائے تو میں بانسری بجا کر زیادہ اچھا کما سکتا ہوں۔'' جیف نے فخر سے کہا۔ پھر اس نے غور سے شیری کو دیکھا۔ ''کیا تم پھر کہیں جا رہی ہو؟''

''ہاں روسی اسٹیشن کی طرف سے مدد کا پیغام آیا ہے وہاں کسی قاتل نے لوگوں کو قتل کیا ہے اور ایک ہی فرد بچا ہے۔ میں نے راجر سے تمہیں ساتھ لے جانے کی اجازت لے لی ہے۔''

''یعنی پیغام دینے والا...... اس صورت میں ہمیں پوری تیاری کے ساتھ جانا چاہیے۔''

جیف نے اور شیری نے ہتھیار لیے تھے۔ جیف کے پاس ایک شاٹ گن بھی تھی۔ وہ اسنو بائک پر روانہ ہوئے۔ ہوا بہت تیز اور سرد تھی اور اڑتے ذرات کی وجہ سے دس بارہ گز سے آگے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا ویسے بھی رات ہو چکی تھی۔ یہاں اس وقت چار گھنٹے کا دن اور بیس گھنٹے کی رات تھی لیکن درحقیقت زیادہ وقت تاریکی چھائی رہتی تھی اور ایک مہینے بعد یہاں مستقل رات چھا جاتی جس میں سورج بالکل نہیں نکلتا اور تب یہاں کا درجۂ حرارت منفی اسی سے ایک سو بیس تک ہو جاتا تھا جس میں کوئی انسان نہیں رہ سکتا تھا۔ دوپہر دو بجے رات ہو چکی تھی۔ اسنو بائک کی تیز روشنی کے باوجود راستہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا اور وہ بہت سست روی سے بائک چلانے پر مجبور تھے۔ بارہ میل کا فاصلہ طے کرنے میں انہیں آدھے گھنٹے سے زیادہ کا وقت لگ گیا تھا۔ وہ روسی اسٹیشن کے پاس پہنچے جس میں کل دو عمارتیں تھیں۔ ایک ریسرچ اسٹیشن تھا اور دوسری رہائش کے لیے مخصوص تھی۔ ان کے درمیان رسیاں بندھی ہوئی تھیں کیونکہ شدید تند ہواؤں میں باہر نکلنے والے کسی سہارے کے بغیر اڑ جاتے۔ انہوں نے اسنو بائکس ایک اسٹینڈ پر روکیں یہاں ان کو باندھنے کا انتظام تھا۔ پھر وہ رسے کا سہارا لے کر سینٹر کی عمارت میں داخل ہوئے۔ شیری کا خیال تھا کہ پیغام وہاں سے آیا ہے اس لیے بھیجنے والا وہیں ہوگا۔ اندر آ کر انہوں نے اپنے چشمے اور ہڈ اتارے۔ یہاں سردی نسبتاً کم تھی۔ انہوں نے اپنے ہتھیار نکال لیے تھے اور مختلف کمروں میں جھانکتے پھر رہے تھے۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا حتیٰ کہ ریڈیو روم بھی خالی تھا۔

''یہاں تو کوئی نہیں ہے۔'' جیف نے کہا۔

''تم یہاں چیک کرو میں رہائشی عمارت کی طرف جا رہی ہوں۔'' شیری نے کہا اور باہر نکل آئی۔ وہ رسی کا سہارا لیتے ہوئے رہائشی عمارت تک پہنچی۔ اندر داخل ہو کر اس نے آواز دی۔ ''ہیلو کوئی یہاں ہے، میں امریکی اسٹیشن سے مدد کے پیغام کے جواب میں آئی ہوں۔''

مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ محتاط قدموں سے اس طویل راہداری میں آگے بڑھی جس کے دونوں طرف کئی راہداریاں نکل رہی تھیں۔ یہ سوویت یونین کے زمانے کا اسٹیشن تھا اس وقت یہاں سیکڑوں کی تعداد میں عملہ ہوتا تھا مگر اب یہاں مشکل سے تیس چالیس افراد کام کرتے تھے اور وہ بھی سرما کی آمد سے پہلے یہاں سے رخصت ہو جاتے تھے۔ حفاظت اور نگرانی کے لیے یہاں چند افراد چھوڑ دیے جاتے تھے۔ حالانکہ وہاں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس کی حفاظت

یا نگرانی کی جاتی۔ راہداری کے آخر میں لاؤنج تھا جہاں شاید تفریح کے لیے سب جمع ہوتے ہوں گے۔ وہاں ٹی وی اور میوزک کی سہولت تھی۔ اس وقت بھی وہاں سے ہلکی کلاسیکی روسی موسیقی کی آواز آرہی تھی۔ شیری چلتے ہوئے وہاں آئی تو اسے لیدر کے صوفے پر کوئی لیٹا نظر آیا۔ وہ آگے آئی تو یہ سیاہ بالوں والا نوجوان تھا جو دوسری طرف منہ کیے لیٹا ہوا تھا۔

شیری کی چھٹی حس نے خبردار کیا وہ ذرا آگے آئی تو اسے صوفے سے ٹپکتا خون نظر آگیا۔ نوجوان کا گلا کسی تیز دھار چیز سے کاٹ دیا گیا تھا اور وہ مر چکا تھا۔ شیری نے چوکنا ہو کر چاروں طرف دیکھا اور اسی چیز نے اسے بچا لیا۔ ایک صوفے کے پیچھے سے ایک آدمی اٹھ کر جھپٹا۔ اس کے ہاتھ میں گھاس کاٹنے والا تیز دھار آلہ تھا۔ اس نے چہرے پر شیشے والا ماسک لگا رکھا تھا۔ یہ اصل میں گیس ماسک تھا۔ جس نے اس کا چہرہ مکمل طور پر چھپا لیا تھا۔ شیری نے بچنے کی کوشش کی اور وہ نیچے گری۔ ایک لمحے کی دیر سے اس کی گردن الگ ہو جاتی۔ شیری کا پستول گرتے ہوئے ہاتھ سے چھوٹ کر صوفے کے نیچے جا گرا تھا۔ اسے اٹھانے کا وقت نہیں تھا، وہ پلٹ کر دیوار کی طرف آئی اور پھر اٹھ کر بھاگی۔ حملہ آور صوفے کے دوسری طرف تھا جب تک وہ بھاگ کر آتا شیری راہداری میں آگئی تھی۔ وہ درمیان میں تھی کہ عقب سے فائر ہوا اور گولی اس کے پاس سے گزری۔

وہ بے ساختہ ایک راہداری میں مڑ گئی۔ حملہ آور کے پاس آتشیں ہتھیار بھی تھا۔ شیری راہداری میں دروازے کھول کھول کر دیکھ رہی تھی مگر وہ سب لاک تھے۔ اتنے میں حملہ آور نمودار ہوا اور شیری نے ایک دروازے کو زور سے دھکیلا اور وہ کھل گیا۔ وہ بر وقت اندر آئی دوسری گولی دروازے پر لگی۔ اس نے دروازہ اندر سے لاک کیا اور کمرے کا جائزہ لیا۔ ایک کھڑکی باہر کی طرف کھل رہی تھی لیکن اس پر مضبوط شیشے کا پٹ تھا۔ اس نے آس پاس دیکھا اور ایک کرسی اٹھا کر اسے کھڑکی پر مارا۔ دوسرے وار پر شیشہ ٹوٹ گیا۔ حملہ آور نے دروازے کے لاک پر فائر کیا۔ دوسرے فائر نے اسے کھول دیا مگر اس سے پہلے کہ وہ اندر آتا، شیری باہر نکل گئی تھی۔ وہ دیوار کا سہارا لیتے ہوئے آگے جا رہی تھی۔ یہ بہت مشکل کام تھا۔ ہوا اسے اڑا لے جانے کے لیے زور لگا رہی تھی اور اگر وہ دیوار سے الگ ہو جاتی تو پھر اس کا بچنا محال تھا۔

اسے رسی تک پہنچنا تھا اسی صورت میں وہ سینٹر کی عمارت تک جا سکتی تھی۔ اگر حملہ آور اس سے پہلے رسی تک پہنچ جاتا تو وہ ماری جاتی۔ اس نے اندر مٹانز اتار دیے کیونکہ ان کے ہوتے پستول پکڑنا ممکن نہیں تھا۔ کھڑکی سے باہر آتے ہی اس نے انہیں پہن لیا ورنہ منفی چالیس سے کا درجۂ حرارت چند سیکنڈ میں اس کے ہاتھ کو ناکارہ کر دیتا۔ وہ بہ مشکل عمارت کے سامنے والے حصے میں آئی۔ ابھی تک حملہ آور باہر نہیں آیا تھا۔ اس نے جلدی سے رسی پکڑی اور سینٹر کی طرف جانے لگی۔ ہوا میں بے پناہ تیزی اور شور تھا۔ سوائے اس شور کے اور کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ یہ اس کی چھٹی حس تھی جس نے ایک بار پھر اسے بچایا۔ اس نے ایک بار مڑ کر دیکھا تو حملہ آور اس سے کچھ ہی دور تھا۔ اس کی بھی وہی مجبوری تھی وہ باہر مٹانز اتارے بغیر پستول استعمال نہیں کر سکتا تھا اسی لیے درانتی لیے آرہا تھا۔ وہ اس سے چند گز پیچھے تھا۔

اسے دیکھتے ہی شیری نے اپنی رفتار تیز کر دی تھی۔ اچانک اس کا پاؤں کسی چیز سے الجھا اور وہ نیچے گری جب تک وہ اٹھتی حملہ آور سر پر آگیا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے رسی تھامتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے درانتی بلند کی پھر جیسے ہی اس نے وار کیا شیری نے دونوں ہاتھوں سے رسی تھام کر اس کے سامنے کر دی۔ درانتی کے وار نے رسی کاٹ دی۔ حملہ آور کو جھٹکا لگا اور وہ ہوا کے زور سے تیزی سے پیچھے گیا۔ خود شیری بھی لڑھک رہی تھی مگر اس نے اپنے حواس بحال رکھے اور رسی نہیں چھوڑی۔ پھر رسی تنی اور اسے شدید جھٹکا لگا۔ اس کے الٹے ہاتھ کا دستانہ اتر گیا۔ لمحے سے بھی پہلے اسے ہوا اڑا کر لے گئی تھی۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے رسی تھامی اور اٹھ کر اس کے سہارے سینٹر کی طرف بڑھنے لگی۔ جب وہ خالی ہاتھ سے رسی پکڑتی تو قیامت کا درد اٹھتا تھا۔ شدید سردی پر اس کی انگلیاں چپک رہی تھیں۔ اس کی انگلیوں سے کھال اتر رہی تھی۔ سینٹر کی عمارت تک پہنچتے پہنچتے اس کا برا حال ہو گیا تھا۔ اس نے بہ مشکل دروازہ کھولا اور اندر آئی۔ جیف سامنے ہی موجود تھا، وہ تیزی سے اس کے پاس آیا۔

"کیا ہوا؟"

"قاتل دوسری عمارت میں تھا۔ اس نے بچنے والے واحد آدمی کو بھی قتل کر دیا ہے۔" شیری نے ہانپتے ہوئے کہا۔ اسی لمحے جیف نے اس کا زخمی ہاتھ دیکھ لیا۔ اس نے شیری کا ہاتھ تھاما جس کی دو انگلیوں سے کھال اتر گئی تھی۔ اس نے جلدی سے اپنی جیکٹ سے گرم پٹی نکال کر اسے شیری کے ہاتھ پر لپیٹ دیا۔ اس دوران میں شیری نے

حملہ آور کے بارے میں بتایا۔ "وہ باہر موجود ہے۔"

"رسی کٹنے سے اس کے بچنے کا امکان کم ہے اور اگر وہ بچ بھی گیا تو یہاں تک نہیں آسکتا ہے۔ ہمیں فوری واپس جانا ہو گا تمہارے ہاتھ کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔"

شیری کو بھی اپنے ہاتھ کی فکر ہو رہی تھی مگر ساتھ ہی وہ سوچ رہی تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ پہلے انہیں سب اسٹیشن آٹھ کے پاس سے نامعلوم پیغام ملا اور جب وہ وہاں پہنچے تو انہیں حادثاتی طور پر روسی کارگو طیارہ مل گیا۔ یہ یقیناً پراسرار طیارہ تھا کیونکہ روس کی جانب سے اس کی گمشدگی کی کوئی اطلاع نہیں تھی اور اس پر تابکار مواد رکھنے والے سلینڈرز کی موجودگی معاملے کو مزید پراسرار بنا رہی تھی۔ ان سلینڈرز سے مواد غائب تھا۔ پھر کسی نے روسی اسٹیشن پر حملہ کیا اور یہاں موجود لوگوں کو قتل کر دیا۔ اگرچہ شیری کو صرف ایک لاش نظر آئی تھی اور باقی افراد کا کچھ پتا نہیں تھا۔ اگر وہ زندہ تھے تو پتا نہیں کہاں تھے۔ البتہ قاتل والی بات درست نکلی تھی۔ وہاں اضافی مٹانز نہیں تھے اس لیے شیری کو ایسے ہی باہر آنا پڑا۔ تکلیف ہر گزرتے لمحے شدید ہوتی جا رہی تھی مگر جب وہ واپس اسٹیشن پہنچے تو اس کا ہاتھ بے حس ہو چکا تھا اور تکلیف محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ یہ زیادہ خطرناک بات تھی۔ وہ اندر آئے تو راہداریوں میں سامان کے انبار جمع تھے جنہیں طیارے میں منتقل کیا جانا تھا۔ شیری سیدھی ڈاکٹر میسن کے پاس آئی مگر وہ اپنے دفتر میں نہیں تھا۔ شیری نے پبلک ایڈریس سسٹم پر اسے پکارا۔ تو وہ چند منٹ بعد وہاں پہنچ گیا تھا۔

"کیا ہوا؟" اس نے شیری کے ہاتھ پر پٹی بندھی دیکھ کر کہا۔

"ممکنہ طور پر فراسٹ بائٹ۔" وہ بولی اور مختصراً بتایا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ ڈاکٹر میسن فکر مند ہو گیا۔ وہ اسے آپریشن روم میں لایا۔ ہیٹر کے پاس لا کر اس نے آہستہ سے شیری کے ہاتھ سے پٹی اتاری اور فوراً ہی اس کے چہرے پر مایوس تاثر آیا۔ شیری کا دل ڈوبنے لگا وہ ہاتھ کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔ ڈاکٹر میسن نے آہستہ سے کہا۔

"یہ دونوں انگلیاں الگ کرنا ہوں گی اور فوراً کرنا ہوں گی ورنہ فراسٹ بائٹ اوپر جائے گا۔"

شیری نے پہلی بار دیکھا اس کے انگوٹھے کے ساتھ والی اور درمیانی انگلیاں بالکل سیاہ پڑ چکی تھیں۔ ڈاکٹر میسن نے اپنی تسلی کی اس نے دونوں انگلیوں میں جگہ جگہ سوئی چبھو کر شیری سے تکلیف کا پوچھا مگر اسے ذرا بھی احساس نہیں ہوا۔ آخر ڈاکٹر میسن نے سوئی رکھ دی۔ اس نے ایک طرف رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "اس پر آجاؤ... میں یہیں آپریٹ کروں گا۔"

ڈاکٹر نے اس کا ہاتھ کرسی کے ساتھ ایک اسٹینڈ پر نصب المونیم کی ٹرے پر رکھا۔ اس نے اس کے ہاتھ پر سن کرنے والے دو انجکشن دیے کیونکہ انگلیوں کو جڑوں سے کاٹنا تھا اور وہاں اسے تکلیف ہوتی۔ سارا کام دس منٹ میں مکمل ہو گیا اور ڈاکٹر نے الگ کی جانے والی انگلیاں ایک جار میں ڈال دیں جس میں اسپرٹ بھری تھی۔ شیری اپنے آنسو ضبط کر رہی تھی۔ وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ صرف اس کی دو انگلیاں نہیں اس کا کیریئر بھی اس سے جدا ہو گیا ہے۔ اگر وہ پولیس میں رہی بھی تو اسے ایکٹو ڈیوٹی سے ہٹا دیا جائے گا اور وہ ایسا نہیں چاہتی تھی۔ اسے ڈپریشن اور تکلیف سے بچانے کے لیے ڈاکٹر میسن نے اسے نیند کا انجکشن بھی دے دیا اور وہ وہیں کرسی پر سو گئی۔

آنکھ کھلی تو وہ کمبل میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس کا ذہن ہلکا ہو رہا تھا اور ہاتھ میں تکلیف کا بہت معمولی سا احساس تھا۔ ڈاکٹر نے بینڈیج کر دی تھی۔ اب یہ تین دن بعد ٹانکے کھولنے کے لیے بتائی جاتی۔ صبح کے نو بج رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ روانگی کے وقت میں صرف چند گھنٹے رہ گئے تھے۔ شیری اپنے کمرے میں آئی اس کے پاس کچھ ہی سامان تھا جو سارا ایک بیگ میں آگیا۔ باہر اب بہت کم لوگ نظر آرہے تھے اس کا مطلب تھا کہ بیشتر عملہ روانہ ہو چکا تھا۔ اس نے شیلف پر رکھی باپ کی تصویر دیکھی اور آہستہ سے کہا۔

"سوری ڈیڈ اب میں پولیس کی جاب نہیں کر سکوں گی۔"

دروازے پر دستک ہوئی تو اس نے بلند آواز سے کہا۔ "یس۔"

آنے والا راجر تھا۔ اس نے پہلے افسوس کیا اور پھر اسے اطلاع دی۔ "دو بجے روانگی ہے... طوفان اندازے سے زیادہ تیزی سے اس طرف آرہا ہے۔"

"اب کتنے لوگ رہ گئے ہیں؟"

"سو سے کم ہیں یہ آخری طیارے میں جائیں گے۔" راجر نے کہا۔ "مجھے جیف نے روسی اسٹیشن کے بارے میں رپورٹ دی ہے۔ میں نے امریکی حکام کو اطلاع دے دی ہے۔"

"روسیوں کی طرف سے کوئی رابطہ کیا گیا؟"

جیف نے سر ہلایا۔ "ان کا کہنا ہے اسٹیشن میں ان کا

بس ایک ہی آپریٹر تھا۔“

شیری حیران رہ گئی۔ ”پھر اس نے غلط بیانی کیوں کی؟“

راجر ہچکچایا۔ ”میرا خیال ہے قاتل نے اسے اس غلط بیانی کے لیے مجبور کیا ہوگا اور اس سے کال کرا کے اسے قتل کر دیا ہوگا۔“

”ممکن ہے۔“ شیری نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”یہ بات طے ہے، قاتل کا تعلق امریکی اسٹیشن سے ہے۔“

”شاید، مجھے ایک خیال اور آیا تھا کہ وہ تمہیں نشانہ بنانے کی کوشش کر رہا ہے اس نے دو بار ریڈیو سے رابطہ کیا۔ دونوں بار تم گئیں مگر کیونکہ تمہارے ساتھ دوسرے بھی تھے اس لیے وہ ناکام رہا۔“

”دوسری بار میں نے اس سے اکیلے مقابلہ کیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا۔“ شیری نے ہاتھ بلند کر کے دکھایا۔ ”لیکن میری جان بچ گئی۔ کیا تم نے چیک کیا کہ کوئی فرد کم تو نہیں ہے؟“

”یہاں ہر فرد کو نام کے بجائے ایک مخصوص کوڈ سے جانا جاتا ہے۔ جیسے میں اے ون ہوں اور تم اے سینتیس ہو۔ اس سے آسانی ہوتی ہے کیونکہ ایک ہی نام کے متعدد شخص ہوتے ہیں اور اس سے کنفیوژن پیدا ہوتی ہے۔ اب تک میں نے جو لسٹ چیک کی ہے۔ کوئی شخص مس نہیں ہے۔ تمام افراد جا چکے ہیں۔“

”اور جو رہ گئے ہیں؟“

”طیارے میں سوار ہونے کے بعد میں انہیں چیک کر سکوں گا اور پھر پتا چل جائے گا کہ کون کم ہے مگر اس کا امکان نہیں ہے قاتل کو کسی نے نہیں دیکھا اور وہ ہمارے ساتھ جانے کے لیے آزاد ہوگا۔“

شیری نے کہنے سے گریز کیا کہ راجر اور اس کے آدمیوں کی جانب سے بے پروائی کی وجہ سے اب قاتل کا پتا چلانا بہت ہی مشکل ہو گیا تھا۔ اگر تمام افراد کے معمولات پر نظر رکھی جاتی تو اس سے پتا چلانا بہت آسان ہو جاتا کہ مخصوص اوقات میں کون اسٹیشن سے غیر حاضر تھا۔ یہ معما تھا کہ قاتل کا اصل مقصد کیا تھا؟ یقیناً اس کے پس پشت اس کا مفاد تھا مگر یہ مفاد کیا تھا؟ کیا اسی کے پاس تاب کار مواد تھا۔ یہ بہت قیمتی چیز تھی۔ اگر وہ کسی ملک کا ایجنٹ تھا تب بھی اس کا پتا چلانا ضروری تھا۔ شیری نے پوچھا۔ ”کیا طیارے میں کسی تاب کار چیز کی موجودگی چیک کی جا سکتی ہے؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”گائیگر صرف یہاں تنصیبات میں ہیں لیکن طیارہ جہاں اترے گا وہاں لازمی سامان چیک ہوگا۔ ویسے یہاں ہینڈ ہیلڈ گائیگر بھی ہیں لیکن ان کی رینج کم ہے۔“

شیری جانتی تھی کہ یہاں سے سامان کسی اور طریقے سے لے جانا ممکن نہیں تھا۔ اگر تاب کار مواد فی الحال نہیں لے جایا جا رہا تھا تو وہ یقیناً اسٹیشن میں کہیں موجود تھا۔ قاتل نے اسے محفوظ جگہ رکھا ہوگا تاکہ بعد میں معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے تو وہ آ کر لے جائے۔ آج سب چلے جاتے تو آنے والے چھ مہینے تک کے لیے یہاں کوئی نہ ہوتا۔ گویا تاب کار مواد محفوظ رہتا۔ اس کے بعد اسے یہاں سے لے جایا جا سکتا تھا۔ راجر افسوس کر کے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد شیری اپنا سامان سمیٹنے لگی۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ دیکھا۔ اس میں سے دو انگلیاں کم ہو گئی تھیں۔ اس نے گہری سانس لی۔ اس کا دکھ کم ہو رہا تھا۔ ایسے حادثات زندگی کا ایک حصہ تھے۔ وہ حقیقت پسند تھی اس لیے اس نے اپنے دکھ پر جلدی قابو پا لیا تھا۔ کچھ دیر بعد جیف نے اندر جھانکا اور پھر اندر آیا۔ اس کا ہاتھ پشت پر تھا۔

”اب کیسی ہو؟“

”ٹھیک ہوں۔“ وہ مسکرائی۔

”گڈ۔“ اس نے ہاتھ آگے کیا تو اس میں ٹیولپ کا ایک پھول مع ڈنڈی تھا اور یہ بالکل تازہ تھا۔ وہ حیران ہوئی۔

”تھینک یو... یہ کہاں سے آیا؟“

”تم مائیکل شرمین کو جانتی ہو اس نے یہاں باغ بنا رکھا ہے وہ جانے سے پہلے سب ختم کر رہا ہے میں اس سے لایا ہوں۔“

”ایک بار پھر شکریہ۔“ شیری بولی۔

جیف ہچکچایا۔ ”تم نے راجر سے بات کی تھی؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”ہاں میرا خیال ہے قاتل اسی اسٹیشن سے تعلق رکھتا ہے۔“

”لیکن اس کا مقصد؟“

”یہی تو معلوم کرنا ہے۔ مجھے یقین ہے سلینڈرز کا مواد اس کے پاس ہے اور اس نے یہیں کہیں چھپایا ہے۔ وہ دوبارہ آ کر لے جائے گا۔“

”یہ تھیوری دل کو لگ رہی ہے۔“

”اب دیکھنا ہے کہ وہ کیا کرتا ہے... یہ معاملہ دوسرا آنے والا مارشل دیکھے گا۔“ شیری نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے افسوس ہے۔“ جیف نے کہا اور بیگ کی طرف دیکھا۔ ”تم تیار ہو؟“

”ہاں۔“ وہ بولی اور بیگ اٹھا کر شانے پر لاد لیا۔ ”مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“

”دیکھتے ہیں کیفے ٹیریا میں کچھ مل جائے گا۔“

کیفے ٹیریا بھی بند ہونے والی پوزیشن میں تھا۔ انہیں بس چند سینڈوچز اور نوڈلز کے پیالے مل سکے تھے۔ لوگ ایک ایک کر کے اپنے سامان سمیت سی ون تھرٹی کی طرف جا رہے تھے۔ باہر ہوا کی شدت پچاس میل فی گھنٹا تک جا پہنچی تھی۔ طیارے تک رسائی میں ہی مشکل پیش آ رہی تھی۔ اس لیے راجر نے فیصلہ کیا تھا کہ جیسے ہی سب طیارے تک پہنچیں گے وہ روانہ ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر میسن اپنے سامان سمیت ان کے پاس سے ہیلو ہائے کرتا گزرا تھا۔ کونر کے پاس کوئی سامان نہیں تھا اس لیے وہ ان کے پاس آ بیٹھا، اس نے شیری سے کہا۔ ”تمہیں میں لے جاؤں گا۔“

”سامان میں پکڑ لوں گا۔“ جیف نے پیشکش کی۔ ”تمہیں اپنے ہاتھ کی حفاظت کرنی ہوگی۔“

کچھ دیر بعد راجر نے لاؤڈ اسپیکر پر کہا۔ ”روانگی کا وقت ہو گیا ہے جو بھی طیارے تک نہیں پہنچا ہے وہ آدھے گھنٹے میں وہاں پہنچ جائے۔ ورنہ وہ یہیں رہ جائے گا۔“

”بس ہمیں روانہ ہو جانا چاہیے۔“ جیف نے کہا۔ وہ تینوں کھڑے ہو گئے۔ وہ باہر کی طرف جا رہے تھے کہ شیری کو خیال آیا۔ اس نے کہا۔

”ایک منٹ رکو... ایک چیز رہ گئی ہے میں وہ لے کر آتی ہوں۔“ اس نے اپنا بیگ جیف کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

”وقت نہیں ہے۔“ وہ بولا۔

”میں بس پانچ منٹ میں آئی۔“ شیری نے کہا اور تیزی سے واپس آئی۔ اس کا رخ ڈاکٹر میسن کے دفتر کی طرف تھا اور وہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ اس نے دفتر لاک نہ کیا ہو ویسے یہاں کوئی دفتر لاک نہیں کرتا تھا۔ سوائے ریسرچ والی جگہوں کے۔ اس کی امید پوری ہوئی دفتر کھلا ہوا تھا۔ وہ آپریشن روم میں آئی اور ایک شیلف پر رکھے ہوئے جار اٹھا کر دیکھنے لگی۔ بالآخر اسے وہ جار مل گیا جس میں اس کی دو انگلیاں تھیں۔ اس نے جار اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا اور باہر آ رہی تھی کہ اسے کہیں کھٹکا سنائی دیا۔ شیری ٹھٹکی۔ اس نے پکارا۔ ”ہیلو، یہاں کوئی ہے؟“

مگر جواب میں خاموشی رہی۔ شیری نے اپنا پستول نکال لیا۔ وہ دبے قدموں دفتر میں آئی۔ یہاں کوئی نہیں تھا۔ مگر اس نے آواز واضح سنی تھی اور وہ اسے اپنا وہم سمجھنے کو تیار نہیں تھی۔ اس نے دروازہ کھولتے ہوئے راہداری میں جھانکا۔ وہ خالی تھی مگر کچھ آگے ایک اسٹور کا دروازہ بہت آہستہ سے بند ہوا تھا۔ شیری دبے قدموں اس تک آئی اور اس نے اچانک جھٹکے سے دروازہ کھولتے ہوئے پستول سامنے کر لیا۔ اندر تاریکی تھی۔ اس نے ہاتھ اندر کر کے ٹٹول کر بٹن تلاش کرنا چاہا کہ کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اندر کھینچ لیا۔ شیری نے گولی چلائی تھی مگر وہ اسے لگی نہیں۔ حملہ آور نے اس کا پستول والا ہاتھ پکڑتے ہوئے لات مار کر اسے گرا دیا اور اب ہاتھ مروڑ کر پستول گرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اس کوشش میں کامیاب رہا مگر جب اس نے شیری کو چھوڑنا چاہا تو اس نے اس کے پیروں پر لات لگا کر اسے گرا دیا۔ وہ ہاتھوں سے ٹٹول رہی تھی کہ اسے پستول مل جائے۔ مگر پستول حملہ آور کو مل گیا تھا۔ اس نے اچانک ہی شیری پر فائر کیا اور گولی اس کے سر کو تقریباً چھوتی گزری تھی اس نے چیخ ماری اور پیچھے گری۔ حملہ آور اس کی گرفت سے نکل گیا تھا۔ شیری کی چیخ کے باوجود حملہ آور مطمئن نہیں ہوا، وہ اس پر پھر فائر کرنے جا رہا تھا۔ اسی لمحے کونر دروازے پر نمودار ہوا اور حملہ آور نے بے دریغ اس پر فائر کر دیا وہ الٹ کر راہداری میں جا گرا اور حملہ آور اٹھ کر بھاگ نکلا۔ شیری بہ مشکل اٹھ کر باہر آئی تو وہ اس کی بس ایک جھلک دیکھ سکی تھی۔ کونر دیوار سے ٹکا ہوا تھا اور اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ گولی دل سے ذرا نیچے لگی تھی اور خون بہہ رہا تھا۔ اسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔ شیری بھاگی اس کا رخ کنٹرول روم کی طرف تھا۔ اس نے ریڈیو سے راجر سے رابطہ کر کے اسے بتایا تو وہ غرایا۔ ”لعنت ہو یہ کیا ہو رہا ہے تم وہاں کیا کر رہی تھیں؟“

شیری اسی کے لہجے میں بولی۔ ”تم فضول باتیں کرنے کے بجائے ڈاکٹر میسن کو یہاں بھیجو، فوری۔“

وہ واپس آئی تو جیف بھی آ چکا تھا اور وہ کونر کے سینے پر گدی رکھ کر خون روک رہا تھا۔ کونر ہوش میں تھا، اس کا مطلب تھا کہ زخم بہت مہلک نہیں تھا مگر اسے فوری طبی مدد کی ضرورت تھی ورنہ زخم جان لیوا ہو سکتا تھا۔ ڈاکٹر میسن دس منٹ میں آ گیا تھا۔ اس کے پاس واکی ٹاکی تھا۔ اس نے کونر کا زخم دیکھا اور اسے فوری آپریشن روم میں لے جانے کا کہا۔ جیف اور شیری اسے سہارا دے کر آپریشن روم کی میز تک لائے تھے۔ ڈاکٹر میسن واکی ٹاکی پر راجر کو بتا رہا تھا کہ اس کی روانگی ممکن نہیں ہے کیونکہ کونر کا آپریشن کرنا ہے اور وہ ابھی نہیں جا سکتا۔ راجر نے کہا کہ اس صورت میں طیارہ روانہ ہو رہا ہے جس نے جانا ہے وہ دس منٹ میں طیارے

میں پہنچ جائے۔شیری نے انکار کر دیا۔ "قاتل یہیں ہے میرا رکنا لازمی ہے۔"

"میں بھی رکوں گا۔" جیف نے کہا تو ڈاکٹر میسن نے واکی ٹاکی اس کی طرف بڑھا دیا۔ جیف نے بات کی تو شیری نے کہا۔ "میرا پستول اس کے ہاتھ لگ گیا ہے، اب مجھے ہتھیار چاہئیں۔"

"مل سکتے ہیں۔ میرے ساتھ آؤ۔" جیف نے کہا اور ڈاکٹر میسن سے کہا۔ "دروازہ اندر سے بند کر لو جب تک میری یا شیرف کی آواز نہ سننا، کھولنا مت وہ قاتل یہیں کہیں گھوم رہا ہے۔"

ڈاکٹر میسن نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ وہ دونوں بہت محتاط تھے۔ کیونکہ دونوں نہتے تھے۔ ہتھیار اسٹیشن کے آرم روم میں موجود تھے اور اس کے دروازے پر نمبروں والا لاک تھا۔ جیف نے نمبر ملا کر اپنا کارڈ پنچ کیا تو دروازہ کھل گیا۔ انہوں نے وہاں سے دو عدد پستول اور ان کے اضافی میگزین لیے۔ جیف نے ایک چھوٹی شاٹ گن بھی لی تھی۔ مختصر فاصلے کے لیے یہ موثر ہتھیار تھا۔ وہ باہر آئے تو زیادہ پراعتماد تھے۔ شیری نے جیف سے کہا۔ "اسٹیشن بہت بڑا ہے پھر آس پاس کی عمارتیں بھی ہیں اسے تلاش کرنے کے لیے ہمیں کنٹرول روم سے کیمروں کی مدد لینا ہوگی۔"

"کنٹرول روم بند کر دیا گیا ہے۔"

"جزوی طور پر اس کے بعض کیمرے اور فنکشن اب بھی کام کر رہے ہیں۔" شیری نے کہا۔ "میرے ساتھ آؤ۔"

وہ کنٹرول روم میں آئے۔ شیری نے کچھ مانیٹرز آن کیے تو ان پر اسٹیشن کے بعض حصے دکھائی دے رہے تھے۔ جیف نے ایک واکی ٹاکی لیا اور شیری سے کہا۔ "تم یہاں رک کر اسے تلاش کرو میں اسے باہر دیکھتا ہوں۔ اگر وہ کہیں نظر آئے تو مجھے خبردار کرنا۔"

شیری نے سر ہلایا اور جیف باہر چلا گیا۔ شیری ان چند مانیٹرز پر مختلف کیمروں کی ویڈیو دیکھ رہی تھی۔ اس نے اسٹیشن کے باہر دکھانے والا کیمرا مستقل ایک مانیٹر پر لگا دیا تھا۔ اس پر ایک آدمی تیزی سے طیاروں کے ہینگر کی طرف بڑھتا دکھائی دیا۔ شیری نے جلدی سے واکی ٹاکی پر جیف کو خبردار کیا۔ "یہ وہی ہے اس نے سر پر وہی گیس ماسک پہن رکھا ہے۔"

"میں دیکھتا ہوں۔" جیف نے کہا۔

"رکو میں بھی آرہی ہوں۔" شیری بولی۔

"نہیں تمہارا زخم ابھی اس قابل نہیں ہے۔ میں اسے قابو کر لوں گا۔" جیف نے اعتماد سے کہا۔

"وہ تیسرے دروازے سے نکلا ہے یہ ہینگر کی طرف کھلتا ہے۔" شیری نے کہا۔ چند منٹ بعد جیف بھی اسی دروازے سے باہر نکلا تھا۔ باہر نکلتے ہی واکی ٹاکی سے شیری کا رابطہ ختم ہو گیا۔ باہر موسم بہت خراب تھا اور کسی قسم کی ریڈیائی کمیونیکیشن ممکن نہیں تھی۔ وہ بیرونی دنیا سے رابطہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ شیری کو کونز کا خیال تھا مگر اس نے ڈاکٹر میسن سے رابطہ نہیں کیا کہ وہ مصروف ہوگا۔ اس وقت اس کی ساری توجہ کونز کی جان بچانے پر مرکوز ہوگی۔ وقت گزر رہا تھا اور جیف کو گئے ہوئے بیس منٹ ہونے کو آئے تھے۔ وہ یا قاتل دوبارہ کسی کیمرے میں نہیں آئے تھے۔ شیری نے تینوں مانیٹرز پر تینوں بیرونی دروازوں کے کیمرے سیٹ کر لیے تھے۔ ہر لمحے اس کی بے چینی بڑھ رہی تھی اور اب یہ بے چینی جیف کی سلامتی کے بارے میں تھی۔ بالآخر اس نے بھی باہر جانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے گرم جیکٹ اور مفلر پہنے اور ایک نمبر دروازے سے باہر نکل آئی یہاں سے ایک رسی ہینگر کے عقبی حصے تک جا رہی تھی۔

باہر ہوا پاگلوں کی طرح چنگھاڑ رہی تھی اور بے پناہ اڑتے ذرات میں چند قدم آگے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ شیری نے کمر سے بندھی ڈوری کا کلپ رسی سے منسلک کر لیا۔ اب اس کا ہاتھ چھوٹ بھی جاتا تو وہ رسی سے الگ نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ ایک ہی ہاتھ استعمال کر سکتی تھی۔ ہوا کی مخالف سمت میں وہ خود کو دھکیلتے ہوئے بڑی مشکل سے آگے بڑھ رہی تھی کسی نہ کسی طرح وہ ہینگر کے عقبی حصے تک پہنچی اور اس کے اسٹور کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ ہوا کے دباؤ کی وجہ سے اسے دروازہ بند کرنے میں بہت زور لگانا پڑا تھا اور وہ اسے بند کر کے فرش پر ڈھیر ہو گئی، اس کا سانس قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ ہانپتے ہوئے اٹھی اور دبے قدموں ہینگر کی طرف بڑھی۔ یہاں دو چھوٹے طیارے موجود تھے اور فی الحال ان کو کپڑے سے ڈھانپا ہوا تھا۔ اسے ایک طیارے کا کور اترا دکھائی دیا اور وہی ماسک پوش انجن کے ساتھ کچھ کر رہا تھا۔ شیری کا دل ایک لمحے کو رکا، اس کا مطلب تھا کہ جیف خیریت سے نہیں تھا۔ اسے قریب میز پر اوزار دکھائی دیے اس نے ایک رنچ پانا اٹھا لیا، یہ ڈیڑھ فٹ لمبا اور تقریباً ڈھائی کلوگرام وزنی تھا۔ وہ دبے قدموں ماسک مین تک آئی اور عقب سے اس کی گدی پر وار کیا۔ شیری نے خیال رکھا تھا کہ یہ وار اسے موت کے گھاٹ نہ اتار دے اسی لیے وہ لڑکھڑا کر گرا اور دوسرے وار میں وہ بے ہوش ہو گیا۔ پانا

پھینک کر شیری نے جیف کو تلاش کیا تو وہ ایک طرف بے ہوش ملا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا لیکن اس کی نبض ٹھیک چل رہی تھی۔ شیری نے سکون کا سانس لیا اور اس کی کوشش سے وہ جلد ہوش میں آ گیا۔

"اس نے اچانک عقب سے وار کیا۔" جیف نے بے ہوش ماسک مین کو دیکھا اور پھر اس کے منہ سے ماسک اتار لیا۔ شیری کو وہ جانا پہچانا لگا مگر جیف نے اسے فوراً شناخت کر لیا تھا۔ "یہ ڈاگ مین ہے، ویبر اسکاٹ۔"

شیری چونکی۔ "یعنی یہ کتے لے کر مختلف سب اسٹیشنوں تک جاتا ہوگا؟"

"لازمی بات ہے۔" جیف نے کہا۔ "اب اسے اسٹیشن تک لے جانا ہوگا، یہ بھی ایک مسئلہ ہے۔"

"اس مسئلے کا حل ہے۔" جیف نے کہا۔ وہ پہلے اسے ہوش میں لائے اور پھر وہ تینوں اسٹیشن میں آ گئے۔ جیف نے اسے لاک اپ میں بند کر دیا اور وہ ڈاکٹر میسن کے پاس آئے جو کونز کا آپریشن کر کے فارغ ہوا تھا اور اس نے دستانے تک نہیں اتارے تھے۔ وہ بیئر پی رہا تھا۔ کونز آپریشن ٹیبل پر تھا اور اس کے ایک بازو سے ڈرپ اور دوسرے سے خون کی بوتل لگی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر میسن نے کہا۔ "اب ٹھیک ہے لیکن اگر دس منٹ اور دیر ہوتی تو اس کا خون بہت بہہ جاتا۔"

"اسے یہیں رکھنا ہے؟" شیری نے پوچھا۔

"یہیں ٹھیک ہے، یہاں گرمائش زیادہ ہے باقی جگہوں پر شٹ ڈاؤن کی وجہ سے کم ہو گئی ہے۔"

شیری نے اسے بتایا کہ قاتل پکڑا گیا ہے اور وہ لاک اپ میں ہے۔ ڈاکٹر پریشان ہو گیا۔ "یعنی اب ہم ایک قاتل کے ساتھ آنے والے چھ ماہ یہاں رہیں گے؟"

"لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔" شیری نے کہا۔ "اسے عدالت میں پیش کیا جائے گا۔"

جیف نے کہا۔ "ہمیں خوراک کا اسٹاک نکالنا ہوگا۔ کیونکہ سب پیک کر دیا گیا ہوگا۔"

شیری نے اس سے اتفاق کیا۔ انہوں نے کچن کے اسٹور روم سے خوراک نکالی۔ اس میں گوشت اور سبزیوں سے لے کر تمام چیزیں موجود تھیں۔ سبزیاں ایک خاص انداز سے محفوظ کی گئی تھیں۔ اسٹاک اتنا زیادہ تھا کہ وہ چند افراد اس سے چھ مہینے کیا چھ سال بھی گزارا کر سکتے تھے۔ یہاں خوراک خراب ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کونز کو چھ گھنٹے بعد ہوش آ گیا تھا اور دو دن بعد وہ اٹھ کر چلنے پھرنے لگا تھا۔ ایک

انجیر کے خواص

قسم ہے انجیر کی "القرآن"

حضور مرسلین ﷺ نے فرمایا۔ "اگر کوئی پھل جنت سے زمین پر آسکتا ہے تو وہ انجیر ہے۔"

اسے کھاؤ کہ یہ بواسیر کو ختم کر دیتا ہے۔

گٹھیا، جوڑوں کے درد میں مفید ہے۔

گردہ، پتا اور مثانے سے پتھری کو نکالتا ہے۔

زہر کے اثر سے محفوظ رکھتا ہے۔

حلق کی سوزش میں مفید ہے۔

جگر کو اور تلی کو صاف کرتا ہے۔

سینے کی سوزش میں مفید ہے۔

کھانسی اور دمے میں مفید ہے۔

مٹاپا کم کرتی ہے۔

بہترین ٹانک ہے۔

اور تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟

مرسلہ۔ رضوان تنولی کریڑوی، کراچی

ہفتے بعد وہ ان لوگوں کے ساتھ انڈور باسکٹ بال اور ٹیبل ٹینس کھیل رہا تھا۔ ان کے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا کیونکہ ویبر نے سختی سے اپنا منہ بند کر لیا تھا اور شیری کے ہر سوال کا جواب اس نے خاموشی سے دیا تھا۔ اس لیے شیری نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ اسے لاک میں ہی دو وقت کھانا دیا جاتا اور جیف کے مشورے پر کوئی اس سے بات نہیں کرتا تھا۔ جیف کا کہنا تھا کہ شاید اس طرح قید تنہائی سے گھبرا کر وہ زبان کھول دے۔ مگر اب شیری کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ واپسی پر وہ اسے حکام کے حوالے کرتی اور اس کیس سے دست بردار ہو جاتی۔

شیری کے ہاتھ کے ٹانکے تیسرے دن کھول دیے گئے تھے۔ زخم بھرنے والی پوزیشن میں تھا اور پانچ دن بعد صرف کھرنڈ رہ گیا تھا۔ یہ بھی دو دن بعد ہٹ گیا۔ مگر وہ جب اپنا ہاتھ دیکھتی اسے ویبر پر طیش آتا۔ وہ قاتل ہی نہیں تھا اس کے نقصان کا ذمے دار بھی وہی تھا۔ مگر وہ اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ وہ قانون کی محافظ تھی، اسے قانون اپنے ہاتھ میں لینے کا اختیار نہیں تھا۔ اس کا زیادہ تر وقت کنٹرول روم میں گزرتا تھا جہاں وہ ریکارڈ شدہ پیغام بھیجتی تھی۔ اس نے اپنی رپورٹ بھی اسی طرح انٹرنیٹ کے ذریعے بھیجی تھی۔ اسے

بتایا گیا تھا کہ قطب شمالی سے مسلسل طوفان اٹھ رہے تھے اور آنے والے چھ مہینے تک اس کا امکان بہت ہی کم تھا کہ ان کے لیے کوئی پرواز بھیجی جا سکے۔ خود شیری اور باقی سب بھی سمجھتے تھے کہ انہیں چھ مہینے یہاں رہنا ہے۔ یہاں تفریح کی تمام سہولیات تھیں۔ وہ ٹی وی نہیں دیکھ سکتے تھے مگر یہاں موویز اور میوزک کا بہت بڑا کلکشن تھا۔ انٹرنیٹ کے ذریعے وہ حالات حاضرہ سے بھی باخبر رہتے تھے۔ جسمانی سرگرمیوں کے لیے بہت کچھ تھا۔ ایک لائبریری تھی جس میں ایک لاکھ سے اوپر کتابیں تھیں۔ اس کے باوجود وقت گزارنا ایک مسئلہ تھا۔ شیری نے ڈاکٹر میسن سے اپنی انگلیوں کے متبادل کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا۔

"ہاں اب ایسی مصنوعی انگلیاں آ گئی ہیں جو ہاتھ کے ساتھ لگ کر بالکل اصل کا تاثر دیتی ہیں انہیں سرجری سے فکس کیا جاتا ہے یہ محدود طور پر کام بھی کرتی ہیں لیکن اصل انگلیوں کا متبادل نہیں ہو سکتیں۔"

شیری کی کسی قدر تسلی ہوئی تھی۔ بے شک وہ یو ایس مارشل تھی مگر ایک عورت بھی تھی اور اسے اپنی جسمانی خوب صورتی بہت عزیز تھی۔ وہ کمرے سے باہر دستانہ پہن کر رکھتی تھی، جس سے یہ عیب چھپ جاتا تھا۔ وہ سب مل بانٹ کر کام کرتے تھے۔ کھانا شیری اور کونزل کر بناتے تھے۔ صفائی اور چیزوں کی دیکھ بھال جیف نے اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ ڈاکٹر میسن بہت بوڑھا تھا آنے والے اپریل میں وہ پینسٹھ برس کا ہو کر ریٹائر ہو جاتا، اس لیے اس سے کوئی کام نہیں لیا جاتا تھا۔ مگر وہ ان کے ساتھ لگا کچھ نہ کچھ کرتا رہتا تھا۔ درحقیقت وہاں کرنے کو کچھ تھا نہیں وہ زیادہ تر فارغ رہتے تھے۔ کونز نے ویبر کے لیے تجویز دی۔ "اسے بلاوجہ قید کر رکھا ہے۔"

"بلاوجہ؟" شیری نے اسے گھورا۔ "اس نے تمہیں گولی ماری تھی اور تمہاری قسمت تھی کہ تم بچ گئے۔"

"میرا مطلب ہے اس سے کام لیا جائے... الٹا ہم اس کی خدمت کرتے ہیں۔"

"کہہ تو یہ ٹھیک رہا ہے۔" جیف نے کہا۔

شیری نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ کئی افراد کا قاتل ہے اور وہ بہت خطرناک ہے۔ صرف کام کے لیے اسے باہر نکالنا ایسا ہی ہے جیسے کسی شیر کو تفریح کے لیے پنجرے سے نکالا جائے۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔" ڈاکٹر میسن نے اس کی تائید کی۔ وہ سب ڈنر کی میز پر تھے۔ "اسے صرف انتہائی ضرورت کے وقت باہر نکالا جائے اور اس پر کڑی نظر رکھی جائے کہ وہ کسی طریقے سے خود کو آزاد نہ کر لے۔"

وہ روز ہی اسے دیکھتے تھے۔ لاک اپ پختہ کمرے پر مشتمل تھا اور اس کا دروازہ بہت مضبوط فولاد کا تھا۔ اسے توڑنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کے اوپری حصے میں ایسی جالی لگی تھی جس سے انگلی بھی باہر نہیں نکالی جا سکتی تھی اور اس کے وسط میں ایک سرک کر کھلنے والا خانہ تھا۔ اسے بھی باہر سے لاک کیا جا سکتا تھا یہ خانہ کھانا یا کوئی چیز دینے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ عام طور سے اسے کھانا کونز دیتا تھا۔ کبھی کبھی جیف یا شیری بھی لا دیتے تھے۔ اس روز کونز اسے صبح کا ناشتا دینے گیا تو اس نے دروازہ بجانے پر خانہ کھول کر ٹرے نہیں لی۔ کونز نے دوبارہ بجایا اور پھر اوپر سے جھانک کر دیکھا۔ اسے جو نظر آیا اسے دیکھ کر وہ تیزی سے کچن کی طرف بھاگا تھا۔ چند منٹ میں سب وہاں جمع تھے۔ جیف نے چابی سے لاک کھولا اور وہ اندر آئے۔ جہاں ویبر فرش پر اس طرح پڑا تھا کہ اس کی گردن میں پنسل گھسی ہوئی تھی اور فرش پر خون ہی خون تھا۔ ویبر کا ہاتھ پنسل کے سرے پر جما ہوا تھا جیسے وہ اسے نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے مر گیا۔ اسے مرے ہوئے یقیناً خاصی دیر ہو گئی تھی۔

"اس کے پاس پنسل کہاں سے آئی؟" جیف نے سوال کیا۔ ویبر کو یہاں قید کرتے ہوئے اس سے ہر چیز لے لی گئی تھی۔ اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ ڈاکٹر میسن نے جھک کر اس کا معائنہ کیا اور بولا۔

"یہ خودکشی ہے اس نے پنسل پکڑ کر نیچے سے اوپر کی طرف گھسائی ممکنہ طور پر دماغ بھی متاثر ہوا ہے لیکن موت بہت زیادہ خون بہنے سے ہوئی ہے۔"

شیری نے لاش کی تصویریں لیں اور پھر اسے ڈاکٹر میسن کے آپریشن روم میں منتقل کیا جہاں اس کا پوسٹ مارٹم ہوا تھا۔ موت خون بہنے سے واقع ہوئی تھی اور دماغ بھی متاثر ہوا تھا۔ ڈاکٹر میسن نے اپنی رپورٹ میں خودکشی ہی لکھی تھی۔ مگر شیری مطمئن نہیں تھی اس نے جیف سے کہا۔ "یہ قتل بھی ہو سکتا ہے۔"

جیف چونک اٹھا۔ "کون کر سکتا ہے اسے قتل؟"

"میں، کونز، تم..."

"میں نے نہیں کیا۔" جیف نے سرد لہجے میں کہا۔

"میں نے بھی نہیں کیا۔" کونز نے شانے اچکائے۔

"اب رہ جاتی ہوں میں یا ڈاکٹر میسن۔" شیری نے کہا۔

"جب ڈاکٹر اسے خودکشی قرار دے رہا ہے تو تم اسے

قتل کیوں سمجھ رہی ہو؟"

شیری کچھ دیر سوچتی رہی پھر اٹھ گئی۔ اس کا رخ لاک اپ کی طرف تھا۔ اس کا لاک کھلا تھا وہ اندر آئی اور کمرے کا جائزہ لیا۔ یہ آٹھ بائی دس کا کمرا تھا، دروازے کے ساتھ ہی تین بائی سات فٹ کا فکس لوہے کا بیڈ تھا۔ اس کے سرہانے لوہے کی ہی الماری بنی تھی جس میں سامان رکھا جا سکتا تھا۔ آخر میں ایک کموڈ اور ایک واش بیسن تھا جس کے اوپر دھات کا پالش شدہ آئینہ لگا ہوا تھا۔ یہاں کوئی چیز ایسی نہیں تھی جسے قیدی بہ طور ہتھیار یا آلۂ خودکشی کے طور پر استعمال کر سکتا۔ لاش کمرے کے عین وسط میں پڑی تھی اور یہ بیڈ کے پیروں والے حصے کے پاس تھی۔ ویبر گول مول ہو کر گرا ہوا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ اپنی گردن پر تھے ایک نے پنسل کا سرا پکڑ رکھا تھا اور دوسرا اس پر جما ہوا تھا۔ شیری نے تصور کیا اس نے بیڈ کے کنارے بیٹھ کر یہ کام کیا تھا اور پھر وہ لڑھک کر نیچے گر گیا اور یہیں اس نے دم توڑ دیا۔ خون سے بھی یہی ثابت ہو رہا تھا۔

شیری دروازے کے پاس آئی اور اس کا باریک بینی سے جائزہ لیا۔ اس نے اپنی چھوٹی سی لیکن بہت تیز روشنی والی ٹارچ استعمال کی جس سے چھوٹی سی چیز بھی واضح نظر آتی۔ وہ چونکی اسے سرک کر کھلنے والے خانے کی سلائڈ میں گہرا رنگ دکھائی دیا تھا۔ اس نے اسے انگلی سے چھوا مگر وہ خشک تھا۔ پھر اس نے اسے انگلی پر تھوک لگا کر رگڑا تو اس بار اس کی انگلی پر سرخ رنگ آیا تھا اس نے سونگھ کر دیکھا واضح طور پر خون کی مہک تھی۔ اگر یہ ویبر کا خون تھا تو یہاں کیسے آیا جب کہ وہ اس جگہ سے کم سے کم چھ فٹ دور پڑا ہوا تھا۔ فرش پر بھی جہاں خون گرا تھا اس کے سوا نہ تو کہیں خون پھیلا تھا اور نہ ہی چھینٹے تھے۔ ویبر تڑپا نہیں تھا ورنہ خون اور جگہوں پر بھی پھیلتا یا اڑتا۔ شیری نے فرش کا معائنہ کیا مگر کہیں خون کا معمولی سا قطرہ بھی نہیں تھا اور فرش بالکل صاف تھا۔ وہ وہاں سے نکلی اور اس نے جیف سے چابی طلب کر کے اس جگہ کو لاک کر دیا اور چابی اپنے قبضے میں کر لی۔ البتہ اس نے دوسروں کو سرکنے والے خانے پر پائے جانے والے خون کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ ویبر کی لاش اسٹیشن کے اسٹور والے حصے میں پلاسٹک کفن میں ڈال کر منتقل کر دی گئی تھی۔ جہاں پہلے ہی دو لاشیں موجود تھیں۔ وہاں درجۂ حرارت منفی سے خاصا نیچے ہوتا تھا اس لیے لاشوں کے خراب ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

شیری محسوس کر رہی تھی کہ اس حادثے کے بعد وہ ذہنی طور پر اپنی جاب سے ہٹ گئی تھی۔ حالانکہ وہ اب بھی جاب پر تھی۔ شاید اسی لیے ویبر کی موت واقع ہوئی۔ شیری کو اسے اپنی تحویل میں رکھنا چاہیے تھا اور لاک اپ کو چیک کرتے رہنا چاہیے تھا۔ اگر یہ خودکشی تھی تب بھی اسے کسی نے پنسل تو دی تھی۔ وہ اپنی بے پروائی کا ازالہ اسی طرح کر سکتی تھی کہ ویبر کی موت کی تہ تک پہنچے۔ اسے لگ رہا تھا، اگر اس نے ویبر کی موت کا معما حل کر لیا تو شاید طیارے سے گم شدہ تاب کار مواد اور روسی اسٹیشن کے آپریٹر کے قتل کا معما بھی حل ہو جائے گا۔ اس نے اسٹیشن میں موجود تاب کاری کا پتا لگانے والا گائیگر حاصل کیا۔ بڑے ریڈیو کے سائز کا یہ آلہ آواز سے تاب کاری سے خبردار کرتا تھا۔ اگر پاس تاب کاری ہوتی تو یہ چرچراہٹ کی آواز پیدا کرتا تھا اور تاب کاری جتنی زیادہ ہوتی آواز اتنی ہی تیز ہو جاتی۔ اسٹیشن کے دروازوں پر بڑے گائیگر نصب تھے جو کنٹرول روم میں خبردار کرتے تھے۔

یہاں ہمہ وقت رات ہو گئی تھی مگر وہ واشنگٹن کے وقت کے حساب سے چلتے تھے۔ رات ہوتے ہی جب سونے کے لیے اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے تو شیری دبے قدموں باہر نکل آتی اور اسٹیشن کے مختلف حصوں میں پھرتی اور تاب کار مواد کا سراغ لگانے کی کوشش کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ اس نے اسٹیشن کا بیشتر حصہ چیک کر لیا تھا۔ اب صرف رہائشی کمرے اور اسٹور والا حصہ باقی رہ گیا تھا۔ کمرے بھی اس نے مختلف اوقات میں چیک کر لیے جب ان کے مکین وہاں نہیں ہوتے تھے۔ اب صرف اسٹور روم والا حصہ بچا تھا۔ شیری نہیں چاہتی تھی کہ دوسروں کو اس کی سرگرمیوں کا علم ہو۔ اس لیے وہ راتوں کو یہ کام کر رہی تھی۔

اسٹور خاصا بڑا تھا اور اس کی تلاشی لینا آسان کام نہیں تھا کیونکہ وہاں اسٹیشن کی ضرورت سے متعلق ہر چیز موجود تھی۔ بے شمار سامان مکمل پیک حالت میں رکھا تھا اور اسے کھول کر چیک کرنا ممکن نہیں تھا۔ وہاں مشینری اور آلات کے ساتھ ایندھن کا ذخیرہ بھی تھا۔ اس رات شیری نے ذرا دیر لگائی جب اسے یقین ہو گیا کہ سب سو گئے ہیں تو اس نے اپنی بھاری جیکٹ اور مٹانز پہنے۔ اسٹور میں گرمائش کا بندوبست نہیں تھا اس لیے وہاں درجۂ حرارت تقریباً باہر جتنا ہوتا۔ وہ گائیگر لے کر اسٹور میں آئی۔ شٹ ڈاؤن ہونے کی وجہ سے یہاں کی روشنیاں بند تھیں۔ وہ بڑی ٹارچ ساتھ لائی تھی۔ اس نے اندر آ کر ٹارچ جلائی اور گائیگر کا ہیڈ فون کانوں پر چڑھا کر سامان کے درمیان گھومنے لگی۔ اس کا انٹینا اس نے

آ کے کیا ہوا تھا اور گھما کر دیکھ رہی تھی۔ بعض اوقات معمولی سی چرچراہٹ آتی تھی مگر یہ خاص نہیں تھی کیونکہ معمولی سی تاب کاری بہت سی چیزوں میں پائی جاتی ہے۔ غیر معمولی تاب کاری کی صورت میں آلے پر ایک سرخ بلب بھی جل اٹھتا۔
گھومتے ہوئے وہ لاشوں کے پاس آئی۔ یہ ایک بڑے فولادی ریک پر اوپر تلے سٹیلفس پر رکھی تھیں۔ اچانک اسے خیال آیا اور اس نے گائیگر اس امید کے ساتھ لاشوں کی طرف کیا کہ شاید آواز آئے مگر اسے مایوسی ہوئی گائیگر اس بار بھی خاموش تھا۔ یہ تین لاشیں تھیں۔ اس نے ایک لاش نہیں دیکھی تھی یہ دوسرا فرد تھا جو کسی حادثے میں مارا گیا تھا۔ شیری نے جھک کر دیکھا تینوں بیگز کے ساتھ لگے ٹیگوں پر نام کے بجائے نمبر لکھے تھے اور وہ حیران رہ گئی۔ یہ ایک ہی سیریز کے متواتر نمبر تھے۔ ویبر اسکاٹ کا نمبر ایف بارہ تھا۔ دوسری لاش رائن کریچن کی تھی اس کا نمبر ایف تیرہ تھا اور تیسری لاش ریکراوٹس کی تھی جس کا نمبر ایف چودہ تھا۔ شیری تیزی سے کنٹرول روم میں آئی اس نے کمپیوٹر آن کر کے مرکزی ڈیٹا تک رسائی حاصل کی۔ اس کے پاس اس کا پاس ورڈ تھا۔ اس نے ملازمین کا ڈیٹا کھولا اور اس میں ایف سیریز نکالی۔ وہ حیران ہوئی تینوں ملازم ڈاگ مین تھے اور ریکراوٹس بھی سپلائر نہیں تھا۔ ہاں کبھی کبھی وہ ہینگر میں بھی کام کر لیتا تھا مگر اس کی اصل ڈیوٹی ڈاگ مین کے طور پر تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ڈاکٹر میسن کو اس کے بارے میں غلط بتایا گیا تھا۔
اس نے اس امید پر ان کی سرگرمیوں کا ریکارڈ چیک کیا کہ شاید کچھ معلوم ہو اور فوراً ہی کام کی بات سامنے آ گئی۔ ایک مہینے پہلے یہ تینوں سب اسٹیشن آٹھ کے لیے سپلائی لے کر گئے تھے۔ ایک معمول کے تحت ہر تین مہینے بعد تمام سب اسٹیشنوں پر تازہ سپلائی بھجوائی جاتی تھی اور پرانی سپلائی واپس منگوائی جاتی تھی۔ اس میں خوراک اور دوسرا سامان ہوتا تھا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ سب اسٹیشن پر جانے والے کسی وجہ یا ہنگامی حالات میں کئی دن رک جاتے تھے۔ اس لیے وہاں سپلائی رکھی جاتی تھی۔ یہ اس وقت کام آتی تھی۔ ریکارڈ کے مطابق وہ تینوں ایک دن وہاں رکے تھے۔ کیونکہ ایک سلیج ٹوٹ گئی تھی اور انہیں مرمت میں وقت لگا تھا۔ یہ سب پڑھتے ہوئے شیری کا غصے سے برا حال ہونے لگا۔ اگر راجر اس وقت ریکارڈ چیک کر لیتا تو ویبر پہلے پکڑا جاتا اور اس کے ساتھ یہ نہ ہوتا۔ کہانی رفتہ رفتہ سامنے آ رہی تھی۔ یقیناً طیارہ ان تینوں نے تلاش کیا تھا اور روسی تاب کار مواد کے سلینڈر نکال کر لائے تھے۔ مگر ان کے پیچھے بھی کوئی تھا۔ اس نے ویبر سے باقی دو کو ٹھکانے لگوایا اور پھر خود ویبر کو ٹھکانے لگا دیا۔
وہ واپس اسٹور روم میں آئی۔ آتے ہوئے وہ ڈاکٹر کے دفتر سے ایک سرجیکل چاقو بھی اٹھا لائی تھی۔ اس نے سب سے پہلے رائن کی لاش کھولی۔ اس کے عریاں جسم پر پوسٹ مارٹم کے نشانات تھے اور اس کے سر پر بھی ٹانکے لگے ہوئے تھے۔ اس کی موت سر کی چوٹوں کی وجہ سے ہوئی تھی۔ شیری نے کفن نیچے تک کھولا اور رائن کی ران کا معائنہ کیا۔ اس کی توقع کے عین مطابق اس کی ران پر زخم کا نشان تھا یہ زخم یقیناً اسے سلینڈر کا لاک توڑتے ہوئے آیا تھا۔ اس کے سینے سے لے کر پیٹ تک پوسٹ مارٹم کا مخصوص وائی کی شکل کا کٹ موجود تھا جسے ٹانکے لگا کر بند کیا گیا تھا۔ شیری کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے ہمت کر کے چاقو سے ٹانکے کاٹنا شروع کیے۔ ٹانکے کاٹنے پر بھی کھال الگ نہیں ہوئی تھی کیونکہ وہ منجمد ہو گئی تھی۔ شیری کو زور لگا کر اس کا سینہ اور پیٹ کھولنا پڑا تھا۔ بہ مشکل اور خود پر جبر کر کے اس نے یہ کام کیا اور پھر ٹارچ کی روشنی اندر ڈالی تو کوئی چیز چمکی تھی۔ یہ پلاسٹک شاپر میں تھی۔ اس نے جلدی سے گائیگر اٹھا کر چیک کیا مگر وہ تاب کار نہیں تھی۔
"یہ تاب کار نہیں ہے۔" عقب سے آواز آئی۔ "تم غلط سمجھ رہی ہو۔ روسی طیارے میں تاب کار مواد نہیں تھا۔"
شیری نے مڑ کر دیکھا کچھ فاصلے پر ڈاکٹر میسن کھڑا تھا۔ "تو یہ تم ہو؟"
"یقیناً تم بہت ذہین ہو۔"
"نہیں میں ذہین نہیں ہوں۔ اگر ایسا ہوتا تو میں پہلے تم تک پہنچ جاتی۔"
"اگر تم ذہین نہیں ہو تب بھی مستقل مزاج ضرور ہو اپنے باپ کی طرح... وہ میرے مقابلے میں ذہین نہیں تھا۔ اوسط درجے کا طالب علم تھا مگر وہ کاؤنٹی شیرف بن گیا۔ ریٹائرمنٹ تک اس نے اچھی خاصی دولت جمع کر لی اور ریٹائرمنٹ پر بھی اسے بہت کچھ ملا۔ جب کہ میں جو اس سے زیادہ ذہین تھا ڈاکٹر بنا... سرکاری اسپتالوں میں جھک مارتا رہا اور پھر یہاں بھیج دیا گیا اس سرد جہنم میں جہاں ہر وقت فراسٹ بائٹ کا خطرہ لگا رہتا ہے۔" ڈاکٹر میسن کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "اگلے سال ریٹائرمنٹ کے بعد مجھے ڈیڑھ لاکھ ڈالرز دے کر گھر بھیج دیا جائے گا۔ اس رقم میں ایک ڈھنگ کا گھر نہیں آتا باقی ساری عمر میں سوشل سیکیورٹی کی رقم سے

گزاروں گا۔ میرے اکلوتے بیٹے کو کیا ملے گا؟"
"تو تم نے یہ سب مائیکل کے لیے کیا ہے؟"
"ہاں۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "وہ میرا بیٹا ہے میں ساری عمر اس کے لیے کچھ نہیں کر سکا لیکن اب میں نے اس کے لیے بہت کچھ کر دیا ہے۔ یہ سائبیریا کی کان سے نکلے ناتراشیدہ ہیرے ہیں۔ ان کی لاٹ چرا کر امریکا لائی جا رہی تھی کہ طیارہ کریش ہو گیا۔"
"تمہارا کیا خیال ہے یہ ہیرے اسے مل جائیں گے۔" شیری نے کہا۔ "جو پہلے ہی دس افراد کی جان لے چکے ہیں۔ کیا یہ مائیکل کو راس آئیں گے۔"
"لڑکی مجھ سے احمقانہ باتیں مت کرو۔" ڈاکٹر میسن نے کہتے ہوئے پستول نکال لیا۔ "یہ سب کتابی باتیں ہیں۔ ان ہیروں کی مالیت کروڑوں ڈالرز میں ہے اور اگلے گرما میں یہ لاشیں میرے ساتھ ہی واپس جائیں گی میں وہاں پہنچ کر ان سے ہیرے نکال لوں گا۔"
"اور میں...؟ کیا تم مجھے مار دو گے؟"
ڈاکٹر میسن خاموش ہوا پھر اس نے سر ہلایا۔ "مجبوری ہے میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا... اگر بات میری ہوتی تو شاید میں تمہیں چھوڑ دیتا لیکن میں مائیکل کے لیے کوئی رسک نہیں لینا چاہتا۔" اس نے پستول سیدھا کیا تھا کہ عقب سے جیف کی آواز آئی۔ "ڈاکٹر پستول پھینک دو تم شاٹ گن کی زد پر ہو۔"
ڈاکٹر میسن ساکت ہو گیا۔ اس نے ہاتھ اوپر کیا اور پستول ایک طرف پھینک دیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ بازی ہار گیا ہے۔ شیری نے جلدی سے آگے بڑھ کر پستول اٹھا لیا۔ جیف آڑ سے نکل کر سامنے آ گیا، اس نے شیری کی طرف دیکھا۔ "میں کئی دن سے تمہاری نگرانی کر رہا تھا۔"
شیری حیران ہوئی۔ "مجھے بالکل پتا نہیں چلا۔"
"مجھے خطرہ تھا کہ کوئی تمہیں بھی نقصان نہ پہنچا دے۔ میرا اندیشہ درست نکلا۔" جیف نے ڈاکٹر میسن کی طرف دیکھا۔ "مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ یہ بوڑھا آدمی اتنا خطرناک نکلے گا۔ ہیروں کا معاملہ تمہارے علم میں کیسے آیا؟"
"میں بتاتی ہوں، یہ لوگ یقیناً رائن کو علاج کے لیے اس کے پاس لائے ہوں گے۔ سلینڈر کھولتے ہوئے وہ سلاخ سے اپنی ران زخمی کر بیٹھا تھا۔ یہاں سے ڈاکٹر اس کھیل میں شامل ہوا۔" شیری نے اس کی طرف دیکھا۔ "میں نے ٹھیک کہا نا ڈاکٹر؟"
ڈاکٹر میسن نے شکست خوردہ انداز میں سر ہلایا۔ "یہ لوگ ناتجربے کار تھے آسانی سے میری باتوں میں آ گئے۔ ان میں ویبر ہی زیادہ ہوشیار تھا۔ میں نے اسے استعمال کیا اور ان دونوں کو مروا دیا۔"
"پھر ویبر کو تم نے مار دیا۔"
"ہاں اسے میں نے مار دیا۔ یہ کتا مجھے راز فاش کرنے کی دھمکی دے رہا تھا۔ میں نے اسے دروازے کے باہر درمیان میں کھلنے والے خانے سے پنسل گردن میں اتار کر ہلاک کر دیا۔ کسی کا شبہ مجھ پر نہیں گیا۔"
"لیکن اب تم رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہو۔" جیف نے اپنا آئی فون اسے دکھایا۔ "اس میں سب ریکارڈ ہو گیا ہے۔ تم اس سے مکر نہیں سکتے۔"
"ویسے ثبوت کے لیے یہ لاشیں ہی کافی ہیں جن میں اس نے ناتراشیدہ ہیرے بھرے ہیں۔"
"اس سے قتل کا الزام ثابت نہیں ہو گا۔" جیف نے کہا "لیکن اب میرے پاس اس کا اقبال جرم ریکارڈ ہے۔"
ڈاکٹر میسن کا جھریوں زدہ چہرہ ست گیا تھا۔ اس نے آہستہ سے پوچھا۔ "اب تم میرے ساتھ کیا کرو گے؟"
"تمہیں قانون کے حوالے کریں گے اور تمہیں سزا ہو گی۔" شیری نے کہا۔
"اگر میں خود کو سزا دے لوں تو؟" ڈاکٹر میسن نے کہا اور رفتہ رفتہ پیچھے ہٹنے لگا۔ وہ چوکنا ہو گئے۔
"کیا مطلب؟" شیری نے پوچھا۔
"میں باہر چلا جاتا ہوں۔ تم لوگ مجھے مفرور کہہ سکتے ہو۔ میں اس عمر میں جیل کی ذلت اور سختیاں برداشت نہیں کر سکتا۔"
"یہ تو تمہیں اس چکر میں پڑنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔" جیف نے کہا۔ "ہم تمہیں اس کی اجازت نہیں دے سکتے۔"
"پلیز۔" اس نے التجا کی۔ "تمہارے پاس لاشیں اور ہیرے ہیں۔ بے شک مجھ پر الزام لگا دو مگر میں اس عمر میں عدالت کا سامنا نہیں کرنا چاہتا۔ شیری تمہیں اپنے باپ کا واسطہ مجھے جانے دو۔"
باپ کا نام سن کر شیری کا پستول والا ہاتھ جھک گیا تھا۔ ڈاکٹر میسن ایمرجنسی ڈور تک پہنچ گیا تھا، اس نے نمبر ملا کر دروازے کا لاک کھول دیا اور ہینڈل گھما کر دروازہ کھولا۔ فوراً ہی قیامت خیز ہوائیں اندر آنے لگی تھیں اور جیسے ہی ڈاکٹر نے ایک قدم آگے بڑھایا ہوائیں اسے اچک کر لے گئی تھیں۔ دروازہ خود بہ خود بند ہونے لگا اور چند لمحے بعد وہاں سناٹا تھا۔

پسِ زنداں

طاہر جاوید مغل

آخری حصہ

عکس منظر کا ہو یا پس منظر کا، بعض اوقات اتنا پُرکشش ہوتا ہے کہ سوچ کے انداز بدل جاتے ہیں مگر... یہ بھی حقیقت ہے کہ عکس بن کر تعاقب کرنے والے کبھی سائے کی ٹھنڈک نہیں دیتے۔ ان سے تنہائی دور ہوتی ہے اور نہ ہی اذیتوں میں کمی آتی ہے۔ ایسے میں جب ہجر کا موسم طاری ہو اور پل پل دل پر بھاری ہو تو ان بھید بھرے لمحات میں کوئی دریافت کرتا ہے یا کسی کو برباد کرتا ہے۔ لیکن اس کا شمار دریافت کرنے اور تسخیر کرنے والوں میں ہوتا تھا کیونکہ اسے کٹھن کام کا جنون تھا جبکہ کسی انسان کو سمجھنا شاید دنیا کا مشکل ترین کام ہے اور اگر وہ انسان عورت ہو جو پہیلی بن کر جستجو بھڑکاتی ہے اور جو لفظوں میں بند ہو کر کتاب کی صورت کسی کے من میں گھر کر جائے تو کیسے ورق ورق کرکے لفظ بہ لفظ اسے کھوجنے کی لگن اس میں پیدا نہ ہو... مگر ایسا اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب آپ کی سوچ کے زنداں میں کوئی قید ہو جائے... وہ بھی منظر اور پس منظر کے درمیان الجھ گیا تھا... جو کچھ اس نے دیکھا اس کی تہ میں اترنا چاہتا تھا مگر... حدود و قیود کا حامی آگے بڑھنے سے قاصر تھا۔ ایسے میں بے بسی نے اسے آنسوئوں کے سمندر میں دھکیل دیا جہاں وہ تنکا تنکا بہتا رہا اور وحشتوں کے طوفان اسے اپنے گھیرے میں لیتے رہے لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ چڑھنے والا سورج اپنے دامن میں کیا کچھ سمیٹ لایا ہے۔ بالآخر پتھر سے ٹکراتے ٹکراتے اسے یہ ادراک ہوا کہ جہاں عمل ہے وہاں کہیں ردِ عمل بھی چھپا ہوا ہے... بس اسی فراست نے اسے مطمئن کردیا... یہ اور بات کہ اس اطمینان نے بہت سوں کا چین برباد کر ڈالا تھا۔

حجاب کی اُلجھی سوچیں ایک طرف جبکہ ... دوسری جانب ڈاکٹر عطا، ہادی کے ساتھ پورا تعاون کر رہے تھے۔ انہیں بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ حجاب کو جلال کے چنگل سے نکالنے کا واحد راستہ یہی ہے کہ سب سے پہلے اس کا قرض چکایا جائے۔ اگر ایسا نہ ہوسکتا تو پھر جلال کو "بلیک میلنگ" کی بہترین پوزیشن میں رہتا تھا اور وہ اس پوزیشن کو کامیابی سے استعمال بھی کر رہا تھا۔

ہادی نے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی تھی...... اسکیم میں اس کا پلاٹ آناً فاناً ہی فروخت ہوگیا تھا اور وہ بھی کیش پر۔ یہ پلاٹ 30 لاکھ میں بکا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اب وہ عطا صاحب کو ٹوٹل 80 کے بجائے تقریباً 90 لاکھ فراہم کر سکتا تھا۔ باقی سب کچھ ٹھیک ہوجاتا تو صرف ایک کروڑ دس پندرہ لاکھ کی کمی رہ جاتی تھی یعنی قریباً ایک لاکھ سات ہزار یورو۔ ہادی کو امید تھی کہ یہ کام بھی کسی نہ کسی طرح ہوجائے گا۔ اس کے سینے میں وبا دبا جوش لہریں لے رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ حجاب کی خوب صورت کلائیوں میں پڑی ہوئی زنجیروں کو ٹوٹ کر نیچے گرتے دیکھ رہا ہے۔ ان زنجیروں کے گرتے ہی اس کی بے مثال پیشانی کا چاند روشن ہونے لگا ہے، اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کا سونا چمکنے لگا ہے، یہ سب کچھ ہوجاتا تو یہ جلال کی اس جارحیت کا مؤثر جواب تھا جو اس نے ہادی کے خلاف اسلامک سینٹر کے صحن میں دکھائی تھی۔

ایک دو دن یہ کیفیت رہی..... لیکن پھر ایکا ایکی صورت حال تبدیل ہونے لگی۔ ہادی اور ڈاکٹر عطا نے جو بھی جمع تفریق کی تھی اس میں رخنے پڑنے لگے۔ سب سے پہلی نا امیدی تو حجاب کے ابو کی طرف سے ہی سامنے آئی۔ انہوں نے ڈاکٹر عطا کو بتایا کہ اس وقت وہ یکسر تہی دست ہیں۔ وہ اس تگ و دو میں لگے ہوئے ہیں کہ اگر ایک دو دن میں حجاب کی ای کو اسپتال سے فارغ کر دیا جاتا ہے تو اسپتال کا وہ ڈھائی ہزار یورو کا بل ادا کیا جاسکے..... اس کا مطلب تھا کہ وہ فی الحال قرض کی ادائیگی میں مزید کوئی کردار ادا نہیں کرسکتے۔ دوسری مایوس کن خبر شیخو صاحب کی طرف سے تھی۔

ہادی ہوٹل میں تھا۔ اپنے کمرے کی کھڑکی کھولے بیٹھا تھا اور روم کی رواں دواں ٹریفک کو دیکھ رہا تھا۔ اس ٹریفک میں اسکوٹرز کی بھرمار تھی۔ چھوٹے بڑے ہر طرح کے اسکوٹر نمایاں نظر آتے تھے۔ اس کے علاوہ کہیں کہیں بغیر چھت کے کاریں بھی تھیں۔ وینس میں ایسی ہی ایک اوپن کار کے پیش منظر میں ہادی نے حجاب کو پہلی بار دیکھا تھا۔ وینس کی اس نیم تاریک سڑک کا وہ منظر جیسے ہادی کے ذہن میں نقش ہو کر رہ گیا تھا۔

اچانک اس کے فون کی بیل ہوئی۔ دوسری طرف لاہور سے شیخو صاحب تھے۔ پژمردہ آواز میں بولے۔ "یار ہادی۔ کل وہ گجرات والا پلاٹ دیکھ لیا ہے میں نے۔ وہ تو بالکل پیسے رو ہڑنے (بہانے) والی گل ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"یار! وہ تو کوئی بارہ فٹ ڈونگی زمین ہے، کئی لکھ کی تو مٹی ہی پڑ جانی ہے اس میں۔ اور اب ایک مسئلہ اور بھی ہوگیا ہے اس کے ساتھ۔ وہاں سے سڑک نکلنے والی ہے۔ اگر واقعی سڑک نکل گئی تو آدھے سے زیادہ پلاٹ تو سڑک میں ہی آجانا ہے۔"

"شیخو بھائی! اگر سڑک نکلی تو محکمہ پے منٹ بھی تو کرے گا نا اور پھر......"

"نہیں یار!" شیخو بھائی نے بات کاٹی۔ "میرا دل بالکل نہیں مان رہا اس سودے پر۔ اگر تو نے ویسے ہی پندرہ دی لکھ مزید ایڈوانس میں لینے ہیں تو میں کوشش کر کے بھیج دیتا ہوں۔"

"پندرہ وی سے کیا بنے گا شیخو بھائی؟"

"تو پھر یار! تھوڑا سا ویٹ کر لے۔ اس ویلے تو بالکل ٹیٹ ہوگیا ہوں میں۔ سچی کہتا ہوں۔ تجھ سے بھی جھوٹ نہیں بولا میں نے۔" شیخو بھائی واقعی پریشان لگ رہے تھے۔

شیخو بھائی سے بات کرنے کے بعد ہادی سوچ میں پڑ گیا۔ خوشی کی وہ لہر جو پچھلے دو تین روز سے اس کے سینے میں دوڑ رہی تھی ایک مایوس کن نقاہت میں بدلنے لگی۔ زندگی میں پہلی دفعہ اسے احساس ہو رہا تھا کہ کبھی کبھی معاشی معاملات کتنے پیچیدہ اور ناقابل حل ہوجاتے ہیں۔ اگر حقیقت پسندی سے دیکھا جاتا تو اب بھی مطلوبہ ٹارگٹ تک پہنچنے کے لیے قریباً پونے دو کروڑ روپے کی ضرورت تھی اور یہ ضرورت فوری طور پر پوری ہوتی نظر نہیں آرہی تھی۔ اسی دوران میں ہادی کے فون کی بیل دوبارہ ہوئی۔ یہ بیل اس کے پہلے والے پرانے نمبر پر ہوئی تھی۔ اندازہ ہوا کہ کسی پی سی او سے کال کی جارہی ہے۔ ہادی نے کال ریسیو کی مگر احتیاطاً بولا کچھ نہیں۔ دوسری طرف بھی خاموشی رہی، بس بھاری سانسوں کی آواز آرہی تھی اور ٹریفک کا مدھم شور تھا۔ تب شریفاں کی ڈری ڈری آواز ابھری۔ "ہیلو۔"

"ہیلو شریفاں۔" ہادی نے کہا۔

"آ...... آپ کیسے ہو صیب جی؟"

"خیریت ہے، تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟"

"خیریت کیسے ہے صیب جی! آپ نے خیریت رہنے ہی نہیں دی ہے۔ صیب جی! برا نہ ماننا۔ آپ نے چنگا نہیں کیتا ہے باجی کے ساتھ۔ وہ تو پہلے ہی دکھوں کی ماری تھی، آپ کی وجہ سے وہ بالکل ہی رُل گئی ہے۔ میں کیا بتاؤں آپ کو، اس گھر میں اس دے نال کیا ہو رہا ہے۔ مینوں نہیں لگتا کہ وہ اس گھر وچوں زندہ نکلے گی۔" شریفاں کی آواز بھرا گئی۔ وہ شاید رو پڑی تھی۔

ہادی کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ "اب کیا ہوا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"پرسوں مجھ کو ڈرائیور بٹ نے تھوڑا سا بتایا تھا۔ وہ کہندا ہے کہ کدی کدی رات کو باجی کی آوازیں آتی ہیں۔ وہ روتی ہے اور کلثوم یا وڈے بھائی جان کو بلاتی ہے۔ کہیں آلے دوالے سے دروازہ کھڑکانے کی آوازیں بھی بار بار آتی ہیں۔ صاف پتا چلتا ہے کہ وہ کرماں ماری کسی وڈی مصیبت میں ہے۔ میں نے بہت پچھا ہے پر بٹ نے گل کھل کر نہیں بتائی ہے۔" شریفاں کی آواز پھر بھرا گئی۔

"تم آج کل کہاں ہو؟"

"میں فیر توں گھر وچ ہی ہوں۔ آپا خانم اور ارم بی بی کو بڑا غصہ ہے مجھ پر۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ لوک مجھے چھیتی ہی پاکستان واپس بھیج دیں گے۔" وہ گلوگیر آواز میں بولی۔ پھر ذرا توقف سے کہنے لگی۔ "ابھی کوئی دو گھنٹے پہلے میں نے اوپر والے کمرے میں وڈے بھائی جان (جلال) کو باتیں کرتے ہوئے سنا ہے۔ مجھے پکا یقین ہے کہ درس والے گھر سے اس خبیث کلثوم کا فون تھا۔ وہ کسی کی بے ہوشی کی گل کر رہی تھی۔ میں نے ذرا کن لگا کر سنا تو پتا چلا کہ باجی حجاب کے بے ہوش ہونے کی گل ہے..... اس کے بعد وڈے بھائی جان تنافٹ تھلے گئے اور بٹ کو کہیں بھیجا۔ شاید درس والے گھر ہی بھیجا ہے...... مجھے پکا یقین ہے، باجی وچاری ڈھاڈی مصیبت میں ہے۔" شریفاں کا گلا رندھ گیا اور وہ ایک بار پھر چپ ہوگئی۔ اس کے سسکنے کی آواز ہادی نے صاف سنی۔

"شریفاں! تمہارا کیا مشورہ ہے، مجھ کو کیا کرنا چاہیے۔"

"میں آپ کو کیا مشورہ دے سکتی ہوں جی۔ میری کیا حیثیت ہے۔ اگر آپ ہور کچھ نہیں کرسکتے تو کم از کم باجی کے گھر والوں تک ہی کسی طریقے سے یہ گل پہنچا دیں۔ ان کے خاندان میں بھی سیانے لوک ہوں گے......"

"اچھا شریفاں، تم رونا بند کرو۔ تم نے بڑا اچھا کیا ہے کہ مجھے فون کیا۔ مجھ سے جو کچھ ہوسکا میں کروں گا۔ اور مجھے امید ہے کہ کچھ بہتر ہی ہوگا۔"

"بس جی، مجھ وچاری کا نام کہیں نہیں لینا آپ نے۔ ورنہ بے موت مرجاؤں گی میں۔ اب بھی آپ کو دس نہیں سکتی کہ کتنی مشکل سے یہ فون کر رہی ہوں۔"

"تم بے فکر رہو شریفاں۔ کوئی حرف نہیں آئے گا تم پر۔" ہادی نے تسلی تشفی کی دو چار باتیں کیں اور فون بند کر دیا۔

اس کا دماغ کھول اٹھا تھا۔ جو کچھ ہادی اور ڈاکٹر عطا نے سوچا تھا اس کو عملی شکل دینے کے لیے کچھ وقت چاہیے تھا۔ ابھی کافی بڑی رقم کم پڑ رہی تھی۔ دوسری طرف یوں لگ رہا تھا کہ حجاب کے پاس واقعی ٹائم کم رہ گیا ہے۔ وہ شدید جسمانی اور ذہنی اذیت جھیل رہی تھی۔ جلال غالباً اس سے اگلے پچھلے بدلے چکانے کے موڈ میں تھا اور اپنے جنون میں اس کے ساتھ کچھ بھی کرسکتا تھا۔

ہادی نے اسی وقت کمرا بند کیا اور ٹیکسی پکڑ کر ڈاکٹر عطا کے پاس جا پہنچا...... وہ گھر ہی میں تھے اور کھانے کے بعد چہل قدمی کر رہے تھے۔ ہادی نے پہلے تو انہیں گجرات والے پلاٹ کے بارے میں آگاہ کیا اور بتایا کہ اس کا فوری طور پر بکنا مشکل نظر آرہا ہے۔ تب اس نے شریفاں کا نام لیے بغیر درس والے گھر میں حجاب کی حالت زار سے عطا صاحب کو آگاہ کیا۔

وہ بھی ایک دم گم صم نظر آنے لگے۔ ان کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ انکل فیاض کے گھرانے سے ان کے روابط اتنے گہرے تھے کہ وہ ان کے دکھ کو اپنے دکھ کی طرح سمجھتے تھے اور محسوس کرتے تھے۔ ان کی باتوں سے ہادی کو اندازہ ہوا کہ جو کچھ سامنے آرہا تھا اس کے اندیشے عطا صاحب کے ذہن میں پہلے سے موجود تھے

ہادی اب راست اقدام پر آمادہ نظر آرہا تھا۔ کسی وقت تو اس کا دل چاہتا تھا کہ سارے اندیشے ایک طرف رکھے۔ ڈپٹی انسپکٹر ہاشم ایرک کو اپنے ساتھ لے اور دندناتا ہوا درس والے گھر میں گھس جائے۔ حجاب کو اس پنجرے سے نکال لائے جہاں وہ پھڑپھڑا رہی تھی اور زخمی ہو رہی تھی۔

اس نے ڈاکٹر عطا سے کہا۔ "عطا صاحب! اگر اس

گھر میں حجاب، واقعی حبس بے جا میں ہیں اور ان پر تشدد ہو رہا ہے تو ہم پولیس کی مدد لے سکتے ہیں۔"

"لیکن اس کے لیے تو باقاعدہ، پولیس میں رپورٹ کرنا پڑے گی اور باقی سارا پروسیجر فالو کرنا ہوگا۔ اب پتا نہیں کہ فیاض اور فیصل وغیرہ اس حد تک جانا چاہتے ہیں یا نہیں۔"

"آپ کا کیا خیال ہے، انہیں اس میں کیا اعتراض ہوگا۔"

"سب سے پہلے تو یہی بدنامی والی بات ہے۔ ایک دم ہر طرف چرچا ہو جائے گا۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک بار قانونی چکر شروع ہو جائے تو آسانی سے رکتا نہیں۔ بہت کچھ سہنا اور جھیلنا پڑتا ہے۔ خاص طور سے فی میل کو۔"

"لیکن وہ اب بھی تو جھیل رہی ہے عطا صاحب! بلکہ جھیلتے جھیلتے اس کی جان بھی جا سکتی ہے۔ بینش کے قاتل فیروز الدین کا کیا بگڑا تھا جو اب جلال الدین کا بگڑ جائے گا...... ویسے...... میرے ذہن میں ایک اور بات بھی آ رہی ہے۔" ہادی نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر عطا سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"میں جن کے لیے لکھ رہا ہوں، ان کے ایک جاننے والے ہیں یہاں روم کے پولیس ڈیپارٹمنٹ میں۔ ڈپٹی انسپکٹر ہیں، کیوں نہ ان سے مشورہ کر لیا جائے۔ ان سے آف دی ریکارڈ ہر بات کی جا سکتی ہے اور وہ طریقہ کار سے ہٹ کر بھی ہمارے لیے کچھ کر سکتے ہیں۔"

"اگر بھروسے کا بندہ ہے تو پھر بات کر کے دیکھ لو۔"

ہادی نے ہاشم ایرک کا نمبر ملایا۔ کال فوراً ریسیو ہو گئی۔ ڈاکٹر عطا کمرے سے باہر چلے گئے تاکہ ہادی تسلی سے بات کر سکے۔ ہادی نے سب سے پہلے پوچھا کہ کیا اس طرح فون پر ایک اہم بات کرنا مناسب رہے گی؟

ہاشم ایرک نے کہا۔ "ہاں، یہ بالکل محفوظ ہے۔ آپ کھل کر بات کریں۔"

اگلے چار پانچ منٹ میں ہادی نے مختصر الفاظ میں حجاب اور جلال والی ساری صورت حال ہاشم کے سامنے بیان کر دی اور یہ بھی بتایا کہ حجاب کی والدہ سخت بیمار ہیں جس کی وجہ سے حجاب بہت تکلیف میں ہونے کے باوجود جلال سے کسی طرح کا Clash نہیں چاہتی اور مسلسل اس کا جبر سہہ رہی ہے۔

"آپ کیا چاہتے ہیں؟" ہاشم نے انگلش میں پوچھا۔

"کیا ہم پروسیجر کو فالو کیے بغیر جلال الدین پر کسی طرح کا دباؤ ڈال سکتے ہیں؟ اور اسے آمادہ کر سکتے ہیں کہ وہ حجاب کو اس طرح حبس بے جا میں نہ رکھے؟"

ہاشم ایرک نے ایک طویل سانس لی اور امریکن اسٹائل میں بولا۔ "میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔ آپ قانون کا راستہ اس لیے اختیار نہیں کر رہے کہ آپ کو ڈر ہے حجاب آپ لوگوں کے حق میں بیان نہیں دے گی۔"

"جی ہاں اور اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ اپنے والدین کو ایک بڑی مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتی۔ پھر مزید بدنامی کا رسک بھی ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ طریقہ کار سے ہٹ کر بھی حجاب کی بہتری کے لیے کچھ کیا جا سکتا تھا۔ مگر جس شخص کا آپ نام لے رہے ہیں، اس کے خلاف کچھ کرنے سے پہلے آپ کو دس دفعہ سوچنا پڑے گا۔ یہ وہی جلال الدین ہے نا جو جلال شاپنگ سینٹر کا اونر ہے۔"

"جی ہاں۔"

"یہ بڑا بارسوخ شخص ہے مسٹر ہادی۔ آپ اس کو کبھی بھی آسان نہیں لے سکتے۔ میرا آفیسر "ٹاپ انسپکٹر" ڈیوڈ بون اس کا گہرا دوست ہے اور اس کے علاوہ بھی روم کی پولیس میں اس کے کافی لنکس ہیں...... بلکہ معاف کرنا...... میں آپ کو مایوس کرنا نہیں چاہتا، آپ قانونی طریقہ اختیار کر کے بھی اتنی جلدی خاتون کو جلال الدین کی کسٹڈی سے نہیں نکال سکتے۔ وہ اس کی بھی سخت مزاحمت کرے گا اور وہ کر سکتا ہے۔"

ہاشم ایک دبنگ آفیسر تھا لیکن آج اس کی باتیں ہادی کا حوصلہ توڑ رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی جلال کا قد کاٹھ ہادی کو کچھ اور بڑا لگنے لگا تھا۔

ہاشم کی باتیں سن کر وہ سخت بے چین ہو گیا۔ ان کا مطلب تھا کہ وہ بے بسی سے سب کچھ دیکھتے رہیں گے۔ ان کوششوں میں لگے رہیں گے کہ حجاب کے گھر والوں کو قرضے کے بوجھ سے نکالا جا سکے اور اس دوران میں حجاب کے ساتھ کچھ بھی ہو جائے گا...... یا وہ اپنے ساتھ کچھ بھی کرا لے گی۔

نہیں، ایسا نہیں ہوگا...... ایسا نہیں ہوگا۔ اس کے دل میں سے کسی نے پکار کر کہا...... میں اس سے پیار کرتا ہوں۔ وہ میری رگِ جان میں بسنے لگی ہے۔ مجھے اپنے بدن سے اور اپنی سانسوں سے اس کی خوشبو آتی ہے۔ میں صدیوں سے

ڈھونڈ رہا ہوں اسے۔ اس کے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں۔ اسے یوں تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ اس کے کانوں میں صدا گونجنے لگی۔ لگن لاگی...... موہے لگن لاگی۔

اور وہ سوچنے لگا۔ لگن یعنی محبت میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ اس نے وہیں چمڑے کے اٹالین صوفے پر بیٹھے بیٹھے اور سامنے دیوار پر آویزاں کسی قدیم فرنچ ڈاکٹر کی تصویر دیکھتے دیکھتے ایک اہم فیصلہ کر لیا۔ اہم اور فوری۔ اس کے پاس ترپ کا ایک پتا تھا...... اور یہ پتا ارم تھی۔ مسز ارم جلال۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ حجاب کو جلال کے چنگل سے نکالنے کے لیے یہ پتا استعمال کرنا ضروری ہو گیا ہے۔

☆☆☆

ارم اپنے کمرے میں لیٹی تھی۔ آج کل سب کچھ اس کی مرضی کے مطابق جا رہا تھا۔ حجاب زیرِ عتاب تھی۔ آپا خانم اس کے قصیدے پڑھ رہی تھیں۔ جلال دن بدن اس کی مٹھی میں آتا جا رہا تھا اور شریفاں کو وہ جی بھر کر ذلیل کر رہی تھی۔ اس کے باوجود دل میں ایک گہرا کانٹا چبھا ہوا تھا۔ یہ کانٹا سوتے جاگتے اس کو اپنی موجودگی کا احساس دلاتا تھا۔ یہ ہادی سے ہونے والی ملاقات کا کانٹا تھا۔ ہادی کا اگلا فون کب آئے گا اور وہ اس سے کیا چاہے گا، وہ کچھ نہ جانتی تھی۔ مگر اتنا اسے پتا تھا، یہ فون آئے گا ضرور اور اس کے چین سکون کو ایک بار تو غارت کر دے گا۔

اب کبھی کبھی اسے شبہ ہونے لگتا تھا کہ کہیں اس صورتِ حال میں گلزاری کا ہاتھ تو نہیں۔ کیا پتا اس نے کسی ڈبل ایجنٹ کا سا کردار ادا کیا ہو اور کسی بڑے لالچ میں ہادی کا آلۂ کار بنا ہو۔ بہرحال ابھی تک اس کی تصدیق نہیں ہو سکی تھی۔

چند روز پہلے جو فون نمبر اس نے ہادی کو دیا تھا وہ اکثر بند رہتا تھا مگر وہ کبھی کبھی اس پر ایس ایم ایس چیک کر لیتی تھی، آج اس نے ایس ایم ایس چیک کیے تو بری طرح چونک گئی۔ ہادی کا پیغام موجود تھا۔ "مجھے کال کرو۔ جلدی۔"

ارم نے پریشان ہو کر گھڑی دیکھی۔ رات کے بارہ بجے تھے۔ ایس ایم ایس ریسیو ہوئے دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ ارم کے پہلو میں جلال سو رہا تھا۔ بیڈ روم میں اس کے خراٹوں کی مدھم گونج تھی۔ اس نے بہ آہستگی اس کا وزنی ہاتھ اپنے پیٹ پر سے ہٹایا اور اپنے نہایت مختصر لباس پر نائٹی درست کرتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔ کچن کا دروازہ بند کر کے اس نے یونہی فریج کھول لیا اور ہادی کو کال کی۔ کال کرتے ہوئے اس کی پیشانی پر پسینا تھا۔

"ہیلو۔" جلد ہی ہادی کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

"کیا بات ہے؟" ارم نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ انداز سرگوشی کا تھا۔

"کل دوپہر ساڑھے بارہ بجے سے ایک بجے کے درمیان "شانزا" والے کیفے میں پہنچ جاؤ۔ ضروری بات کرنی ہے۔" ہادی کا لہجہ حکمیہ اور حتمی تھا۔

"لیکن......"

"لیکن کی کوئی گنجائش نہیں۔" وہ پھنکارا۔ "ساڑھے بارہ اور ایک کے درمیان اور پہلے کی طرح تمہیں بالکل اکیلے ہونا چاہیے۔" اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔

ارم کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ کبھی خوف کی لہر سینے سے اٹھتی تھی کبھی کشمکش کی۔ کسی وقت تو اس کا دل چاہتا تھا کہ اس بلیک میلنگ کے سامنے سر جھکانے سے بالکل انکار کر دے۔ جلال کے سامنے اپنے ماضی کی اس غلطی کا اعتراف کر لے۔ اس کے لیے کوئی قابلِ قبول جواز دینے کی کوشش کرے۔ مثلاً یہ کہ کسی وقت اسے بے ہوشی کی حالت میں زیادتی کا نشانہ بنایا گیا یا اس طرح کی کوئی اور بات۔ مگر جب وہ ایسی باتوں کے بارے میں سوچتی تھی تو فوراً جلال کے کئی خیالات اس کے ذہن میں آ جاتے تھے۔ کچھ معاملوں میں وہ انتہائی تنگ نظر تھا۔ اس کی اسی تنگ نظری سے تو فائدہ اٹھا کر ارم نے اسے آناً فاناً اپنانے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ ارم کو پتا تھا کہ اگر اس نے جلال کے سامنے کسی طرح کا کوئی اعتراف کر لیا تو پھر ایک پنڈورا باکس کھل جائے گا۔ اپنے اطالوی دوست اسٹیل کے ساتھ اس کا جو معاملہ چلا تھا وہ سارے کا سارا آشکار ہوگا اور بہت سے ڈھکے چھپے گوشے بھی عیاں ہوں گے۔ کوئی ایک سال پہلے اسٹیل امریکا کی ریاست فلوریڈا میں ایک ٹریفک حادثے میں زخمی ہوا اور پھر چل بسا تھا۔ لیکن وہ جو کہانی اپنے پیچھے چھوڑ گیا تھا وہ تو اپنی جگہ موجود تھی۔

وہ دوبارہ بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ یہ بستر بڑی کوشش سے حاصل کیا تھا اس نے، لیکن اب یہ کانٹوں کا بستر بنا ہوا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ وہ اس سے کیا چاہ رہا ہے۔ اس کے دل میں یقیناً نفرت بھری ہوئی تھی۔ کہیں وہ اسے ٹریپ کر کے کہیں اور لے جانے کی کوشش تو نہیں کرے گا۔ اس پر ذہنی اور جسمانی تشدد کرنے کے لیے؟ لیکن وہ اس ٹائپ کا لگتا نہیں تھا اور شاید ایک پرائے دیس میں وہ اس طرح کا

حوصلہ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ تو کیا وہ اس سے کسی بڑی رقم کا مطالبہ کرے گا۔ دو تین ہزار یورو کی بات تو اور تھی لیکن کوئی بھاری رقم وہ اسے دینے کے قابل نہیں تھی۔ ابھی گھر کے مالی معاملات پر اسے کوئی کنٹرول حاصل نہیں تھا اور شاید ہونا بھی نہیں تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ جلال بہت مالدار ہونے کے باوجود بنیا ذہنیت رکھتا ہے۔ اس کی کفایت شعاری کبھی کبھی کنجوسی کی حدوں سے بھی آگے نکل جاتی تھی۔ گھر میں کوئی فالتو لائٹ آن ہونے کی صورت میں یا ٹونٹی کھلی ہونے کی صورت میں بھی وہ قیامت برپا کرسکتا تھا۔ اس نے نکاح پر جو جیولری وغیرہ ارم کو دی تھی وہ اس کی نظر اور تحویل میں رہتی تھی۔ غرضیکہ وہ مرضی سے لاکھوں خرچ تو کرلیتا تھا مگر مرضی کے بغیر ایک روپے کا ادھر ادھر ہونا بھی اسے قبول نہیں تھا۔ وہ سوچتی رہی اور الجھتی رہی۔

☆☆☆

"میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ ایک لفظ بھی نہیں۔" ہادی نے پرتپش لہجے میں کہا۔ "بات بالکل کلیئر ہے۔ تم کل دوپہر تک یہ کام کروگی۔ یا پھر میں وہ سب کچھ کردوں گا جو کرسکتا ہوں۔ کوئی تیسرا آپشن ہے ہی نہیں۔ تمہارے لیے نہ میرے لیے۔"

"لیکن...... مجھے نہیں لگتا کہ وہ میرے ساتھ چل پڑے گی۔ وہ کوئی نہ کوئی نکتہ اٹھائے گی۔ میں جانتی ہوں اسے۔" ارم تھکے تھکے لہجے میں بولی۔

"کوئی نکتہ نہیں اٹھائیں گی وہ۔ وہ دو ہفتے سے بند ہیں وہاں۔ باہر نکلنے کے لیے رو چلا رہی ہیں۔ سورج کی روشنی کو ترسی ہوئی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بیمار ہیں۔ تم نے ان کی بیماری کو ہی بہانہ بنانا ہے۔ جب تم ہمدردی کے دو بول بولوگی اور کہوگی کہ تم انہیں ڈاکٹر کو دکھانا چاہتی ہو تو کوئی وجہ ہی نہیں کہ وہ نہ چل پڑیں۔"

"وہ کہے گی کہ جلال سے میری بات کراؤ فون پر۔"

"تم کہنا کہ مجھے جلال ہی نے بھیجا ہے۔ ابھی اس کا موڈ اتنا اچھا نہیں کہ فون پر بات کرسکے۔"

"مجھے...... ڈر لگ رہا ہے۔" وہ ماتھے پر تیوری ڈال کر بولی۔

"تم تو اب ملکہ عالیہ ہو۔ تمہیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ بادشاہ سلامت دو روز کے لیے "راجدھانی" سے باہر ہیں۔ ملازم اور گارڈز وغیرہ میں اتنی جرأت نہیں کہ تمہیں روک سکیں۔ تم جتنی آسانی سے اندر جاؤ گی اتنی ہی آسانی سے حجاب کو لے کر باہر آجاؤ گی۔"

"اور پھر بعد میں کیا ہوگا؟" ارم نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

"بعد میں بھی کچھ نہیں ہوگا۔ تم جلال سے کہوگی کہ حجاب کی بے ہوشی کا سن کر تمہارے دل میں ہمدردی پیدا ہوئی۔ تم ورس والے گھر میں پہنچیں۔ اس کی حالت زار دیکھ کر تم نے اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا فیصلہ کیا۔ راستے میں ایک ٹریفک جام پر حجاب نے اچانک کار کا دروازہ کھولا اور بھیڑ میں گم ہوگئی۔"

"تم...... کہاں لے کر جاؤ گے حجاب کو؟"

"یہ تمہارے سوچنے کی بات نہیں ہے۔ میرا معاملہ ہے۔ ہاں میں اپنا یہ وعدہ پھر دہراتا ہوں کہ جیسے ہی میں نے خود کو اور حجاب کو محفوظ سمجھا۔ جلال کی دسترس سے دور ہوگیا۔ میرا اور تمہارا جھگڑا بالکل ختم ہوجائے گا۔ میں تمہارے خلاف سارے ثبوت ختم کردوں گا اور میری طرف سے تمہیں یہ گارنٹی ہوگی کہ اس معاملے کی وجہ سے تمہیں میری طرف سے کبھی کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔"

"تمہاری طرف سے نہ ہوگی لیکن اگر کسی اور کی طرف سے ہوگئی تو پھر؟" ارم نے ٹشو کے ساتھ پیشانی سے پسینا پونچھتے ہوئے کہا۔

"تمہارا مطلب ہے، میرا کوئی ساتھی۔ جس نے ثبوت حاصل کرنے میں میری مدد کی ہے؟"

"میرا یہی مطلب ہے۔" ارم نے کہا۔

"ایسا کوئی چکر نہیں ہے اور اگر تمہیں یہ غلط فہمی ہے کہ ایسا ہے، تو اس حوالے سے بھی میری پوری گارنٹی ہے۔"

اس نے بے چینی سے پہلو بدلا اور خواہ مخواہ اسکارف کو درست کرنے لگی۔ اس چھوٹے سے کیفے میں ہر کوئی اپنے حال میں مگن تھا۔ کسی طرب یہ اطالوی گیت کی دھن، تمباکو اور کافی کی خوشبو کے ساتھ گڈمڈ ہورہی تھی۔ وہ گہری سانس لے کر بولی۔ "جو کچھ تم کہہ رہے ہو...... یہ کہنا آسان لیکن کرنا اتنا آسان نہیں۔ سب سے پہلے تو جلال یہی پوچھیں گے کہ ان کی اجازت کے بغیر میں ورس والے گھر میں کیوں گئی اور اگر گئی ہی تھی اور ڈاکٹر کی طرف جانے کا پروگرام بھی بن گیا تھا تو پھر میں نے اپنے ساتھ کوئی گارڈ کیوں نہ لیا جبکہ مجھے سارے حالات کا پتا بھی تھا۔ تم سب کو پتا ہی ہے کہ وہ کتنے شکی ہیں۔"

"وہ شکی نہ ہوتا تو تمہارے ستارے اتنی جلدی عروج پر کیسے پہنچتے...... اب ان ستاروں کو عروج پر رکھنے کے لیے تمہیں تھوڑا بہت رسک تو لینا ہی پڑے گا۔ غور کرو تو تمہیں

اندازہ ہوجائے گا کہ تمہاری جان بڑے سستے میں چھوٹ رہی ہے۔ کوئی اور ہوتا تو بدلے چکانے کے لیے تمہیں تگنی کا ناچ نچا دیتا۔" آخری الفاظ کہتے کہتے ہادی کا لہجہ پھر زہرناک ہوگیا۔

ارم نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ وہ ایک عیار اور چرب زبان لڑکی تھی مگر اس وقت گنگ ہورہی تھی اور لاچار بھی نظر آتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ اب نیم رضامند بھی دکھائی دینے لگی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کا دماغ ایک اور انداز سے بھی سوچ رہا تھا، جو کچھ ہونے جارہا تھا اس میں امید تھی کہ حجاب اس کی نظروں سے ہمیشہ کے لیے دور ہوجائے گی۔ یا اسے کم از کم طلاق تو ضرور ہوجائے گی اور دل سے وہ یہی چاہتی تھی لہٰذا اس کے لیے خطرہ بھی مول لے سکتی تھی۔

☆☆☆

یہ ایک بہت اہم دن تھا۔ ہادی نے سارے خدشات اور مصلحتیں ایک طرف رکھ کر راست اقدام کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ دراصل اسی وقت ہوگیا تھا جب ہاشم ایرک نے اسے بتایا تھا کہ اگر حجاب کو قانونی طریقے سے بھی جلال کے چنگل سے نکالنے کی کوشش کی جائے تو وہ اس میں بڑی کامیابی سے رکاوٹ ڈالے گا اور تاخیری حربے استعمال کرے گا۔

جبکہ ہادی کے خیال کے مطابق وہاں ورس والے گھر میں اب حجاب کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ وہ سخت مصیبت بلکہ شاید موت کی طرف بڑھ رہی تھی اور ڈاکٹر عطا بھی اس سے متفق تھے۔ ڈاکٹر عطا نے ایک اور بات بھی ہادی کو بتائی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ اگر جلال نے حجاب کو تنہا کسی کمرے میں بند کررکھا ہے تو وہ بڑی بری حالت میں ہوگی۔ وہ بچپن سے ہی بند جگہوں سے خوف کھاتی ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں تنہائی اور گھٹن کے حوالے سے ایک طرح کا فوبیا ہوتا ہے۔

ہادی، ہاشم ایرک کے ساتھ ایک پرائیویٹ کار میں بیٹھا تھا۔ ہاشم ایرک سادہ لباس میں تھا۔ بہرحال اس کی جیکٹ میں بھرا ہوا کولٹ پستول موجود تھا۔ ہاشم کا ساتھی تھامس بھی کچھ فاصلے پر ایک بک اسٹال پر موجود تھا۔ ہاشم ایرک اور اس کے ساتھی کو ہادی نے احتیاطاً ہی ساتھ لیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہو تو اس سے نمٹا جاسکے۔ ویسے اس کی توقع کم ہی تھی۔ پروگرام کے مطابق ہاشم نے اپنی کار اس سہ منزلہ پرائیویٹ اسپتال کے سامنے کھڑی کی تھی جہاں ارم نے حجاب کو لے کر پہنچنا تھا۔

یہ بڑے سنسنی خیز لمحے تھے۔ انتظار کا ایک ایک پل

ایک ایک دن کی طرح تھا۔ سب سے اہم سوال یہی تھا کہ ارم، حجاب کو درس والے گھر سے نکالنے اور یہاں تک لے جانے میں کامیاب ہو جائے گی یا نہیں؟ باقی باتیں بعد کی تھیں۔ گھڑی کی سوئیاں اپنی مخصوص رفتار سے حرکت میں تھیں۔ ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ ارم نے کہا تھا کہ وہ جیسے ہی گھر سے نکل کر اسپتال کی طرف روانہ ہوگی۔ اسے فون پر اطلاع دے گی۔ یہ اطلاع بارہ بجے کے لگ بھگ آنا تھی۔ اب آدھ پون گھنٹا اوپر ہو چکا تھا۔ ہادی اپنی نشست پر بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ پھر اس نے سوچا کہ خود ہی ارم سے رابطہ کر کے دیکھے۔ اس نے سیل فون اٹھایا اور یہی وقت تھا جب ارم کی کال موصول ہوگئی۔

''ہیلو، کہاں ہو تم۔'' ارم نے پوچھا۔

''میں کلینک کے سامنے پہنچ چکا ہوں۔ اور تم؟''

''میں گھر سے نکلنے والی ہوں۔ تم تیار رہو۔'' اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔

ہاشم سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ہادی نے کہا۔ ''وہ بس روانہ ہونے والی ہے گھر سے۔''

وہ بے قراری سے انتظار کرتے رہے۔ ہادی مسلسل عقب نما آئینے میں دیکھ رہا تھا۔ چوڑا چکلا ہاشم ڈرائیونگ سیٹ پر تھا اور اس کی نظر بھی بار بار گھڑی کی طرف اٹھتی تھی...... اور پھر ہادی کو ارم کی سفید فیاٹ کار نظر آئی۔ کار نے ٹرن لیا اور سیدھی اسپتال کے پارکنگ لاٹ میں جا کر رکی۔ ہادی کا دل جیسے اس کے پورے جسم میں دھڑک رہا تھا۔ فیاٹ کی فرنٹ سیٹ پر ارم کے ساتھ حجاب موجود تھی۔ اس کی سیاہ رنگ کی شال وہ دور ہی سے دیکھ سکتا تھا۔

حجاب کو گاڑی میں چھوڑ کر ارم باہر نکلی اور متوازن قدموں سے اسپتال کے داخلی دروازے کی طرف بڑھی۔ حسب معمول وہ ایک گاؤن نما کھلے لبادے اور اسکارف میں تھی۔ اونچی ایڑی پر ٹھک ٹھک کرتی وہ دروازے میں داخل ہوگئی......

''احتیاط سے۔'' ہاشم ایرک نے انگریزی میں کہا۔

ہادی نے اثبات میں سر ہلایا اور بغلی سڑک سے نکل کر مین روڈ پر آ گیا۔ مین روڈ پار کرتے ہی وہ اسپتال کی پارکنگ میں تھا۔ اپنی سرپٹ دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے اس نے فیاٹ کا دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر حجاب کے برابر بیٹھ گیا۔ حجاب نے بری طرح چونک کر اسے دیکھا۔ ''سوری حجاب...... ویری سوری۔ میں نے آپ کو دیکھا اور اندر آ گیا...... میں بس دو منٹ آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں...... پلیز......''

حجاب کے زرد چہرے پر اور اس کی آنکھوں میں خوف و ہراس کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ چند لمحوں کے لیے یوں لگا کہ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل جائے گی اور چلانا شروع کر دے گی۔ یہ بڑے نازک لمحے تھے۔ ہادی نے اس کا وہ ہاتھ تھام لیا جو وہ دروازے کے ہینڈل کی طرف بڑھا رہی تھی۔ ''پلیز حب۔ میں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا تمہیں...... کچھ نہیں کہوں گا۔ بس میری ایک بات سن لو۔''

''چلے جاؤ یہاں سے...... نکل جاؤ گاڑی سے ورنہ میں شور مچاؤں گی۔'' وہ لرزتی کانپتی آواز میں بولی۔

''ٹھیک ہے میں چلا جاتا ہوں، لیکن......''

''ہاتھ چھوڑو میرا...... میں کہتی ہوں ہاتھ چھوڑو۔''

ہادی نے جلدی سے ہاتھ چھوڑ دیا۔ ''پلیز حب۔ صرف دو منٹ میری بات سن لو۔ میں قسم کھاتا ہوں۔ چلا جاؤں گا۔ پھر کبھی آپ میری شکل نہیں دیکھیں گی۔''

''میں نے آپ کی کوئی بات نہیں سننی۔ میں آپ کی شکل دیکھنا نہیں چاہتی۔ آپ نکل جائیں یہاں سے ورنہ...... ورنہ میں پولیس کو بلاتی ہوں۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا ہاتھ پھر دروازے کے ہینڈل کی طرف بڑھایا۔

ہادی نے پھر اس کی کلائی تھام لی۔ اس نے کلائی چھڑانے کی کوشش کی۔ پھر چلائی۔ ''چھوڑ دیں میرا ہاتھ۔ میں کہتی ہوں چھوڑ دیں۔''

ہادی نے ہاتھ نہیں چھوڑا۔ اس نے دوسرے ہاتھ کا زوردار طمانچہ ہادی کے رخسار پر مارا۔

طمانچہ کھانے کے بعد ہادی نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ پتا نہیں اتنی جرأت کہاں سے آ گئی اس کے اندر، وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر سخت لہجے میں بولا۔

''حب! میں کہہ رہا ہوں آپ سے...... صرف دو منٹ بات کرنی ہے مجھے۔ اگر آپ تماشا بنائیں گی تو تماشا بن جائے گا۔ اگر بات سن لیں گی تو ابھی چلا جاؤں گا یہاں سے۔''

ہادی کے لہجے میں کچھ ایسی توانائی اور ایسی فیصلہ کن کیفیت تھی کہ حجاب ٹھٹک گئی۔

''اب کیا بات کرنی ہے۔ اب کیا کسر رہ گئی ہے۔'' وہ خشک لبوں پر زبان پھیر کر بولی۔

''میں اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتا ہوں حب۔ اور ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں آپ سے۔'' (طمانچے سے اس کے ہونٹ سے خون رس آیا تھا)

وہ روہانسی ہو کر بولی۔ ''جو کچھ کہنا ہے جلدی کہیں

یہاں ارم میرے ساتھ ہے۔ اندر کلینک میں گئی ہے۔''

''میں نے دیکھ لیا ہے، وہ ''کیو'' میں ہے۔ ابھی پندرہ بیس منٹ سے پہلے باری نہیں آئے گی اس کی۔'' ہادی نے کہا۔ پھر اچانک اسے خیال آیا کہ اس نے ابھی بھی بڑی سختی سے حجاب کی کلائیوں کو پکڑ رکھا ہے۔ اس نے کلائیوں پر سے اپنی گرفت ختم کر دی...... اور ایک بار پھر التجا آمیز نظروں سے حجاب کو دیکھنے لگا۔

وہ پرنم آنکھوں سے بولی۔ ''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

ہادی نے اسے سرتاپا دیکھا۔ وہ پہلے سے بہت کمزور دکھائی دیتی تھی۔ خاص طور سے چہرہ کمزور اور زرد تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نظر آتے تھے۔ بال منتشر اور الجھے ہوئے۔ ہونٹوں پر پپڑیاں، ہادی کا دل کٹ کر رہ گیا۔ وہ کیا سے کیا ہو گئی تھی۔

''یہ کیا حالت بنالی ہے آپ نے؟'' اس نے بے حد تاسف سے کہا۔

''میری حالت کو چھوڑیں۔ کیا کہنا ہے آپ نے؟'' اس کے انداز میں انتہا درجے کی رکھائی تھی۔

''حب! پہلے تو مجھے آپ سے معافی مانگنی ہے۔ میری غلطیوں کی وجہ سے آپ کے معاملات خراب سے خراب تر ہوئے اور ان میں سب سے بڑی غلطی وہی فوٹوگراف والی تھی۔ میں نے آپ کو بتائے بغیر وہ تصویر اتاری اور......''

''ٹھیک ہے، جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب اس کے ذکر کا فائدہ نہیں۔'' وہ بات کاٹتے ہوئے بولی۔ چہرے کی طرح اس کی آواز بھی نقاہت سے بھرپور تھی۔ جیسے برسوں کی بیمار ہو۔ اب ہادی دیکھ رہا تھا کہ اس کا ایک ہاتھ بھی زخمی ہے۔

''حب! میری نیت ہرگز بری نہیں تھی لیکن میری وجہ سے جو کچھ ہوا وہ بہت برا ہوا۔ میں سب جانتا ہوں، یہاں آپ کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ کچھ بھی ڈھکا چھپا نہیں۔ جلال بہت نچلی سطح پر اتر آیا ہے۔ معاف کرنا...... اپنی دولت کے زور پر وہ آپ کو زر خرید لونڈی کی حیثیت دینا چاہتا ہے۔ انکل فیاض کو دیا ہوا قرض وہ جس شرمناک بلیک میلنگ کے لیے استعمال کر رہا ہے وہ کوئی پوشیدہ بات نہیں۔''

''ان باتوں سے آپ کا کوئی تعلق نہیں، مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجیے۔''

''بات صرف آپ کے حال کی نہیں حب! میں جانتا ہوں آپ جو کچھ جھیل رہی ہیں اس سے زیادہ بھی جھیل سکتی ہیں لیکن اس جھیلنے سے انکل فیاض اور خالہ صوفیہ کی مصیبتیں کم نہیں ہوں گی۔ آپ کی حالت زار کی خبریں ان تک بھی پہنچ رہی ہیں اور مزید پہنچیں گی۔ خدانخواستہ...... خدانخواستہ آپ کو کچھ ہو گیا تو کیا آپ کی والدہ جیتی رہ سکیں گی۔ وہ تو پہلے ہی بستر پر ہیں۔ آپ کو یہ زنجیریں توڑنی ہوں گی حب۔''

''یہ سب کچھ میرے مقدر میں ہے، میں اس کو نہیں بدل سکتی۔ بس دعا کر سکتی ہوں۔''

''کوئی چیز ایسی نہیں جو بدلی نہ جا سکے۔ دیکھیں حب! یہ بات میں صرف آپ کو بتا رہا ہوں اور اس کو صرف اپنے تک ہی رکھیے گا۔ میں اور ڈاکٹر عطا مل کر پوری کوشش کر رہے ہیں کہ جلال کا دیا ہوا قرض اسے لوٹایا جا سکے۔ کافی انتظام ہو چکا ہے لیکن ابھی کچھ ہونا باقی بھی ہے۔ اس میں وقت لگ سکتا ہے۔ مہینا ڈیڑھ مہینا یا پھر دو تین مہینے بھی۔ لیکن جس طرح آپ کو وہاں درس والے گھر میں رکھا جا رہا ہے، آپ یہ وقت نہیں گزار سکتیں۔ آپ نے شاید آئینے میں اپنی صورت نہیں دیکھی۔ دیکھیں...... یہ دیکھیں، کیا ہو گئی ہیں آپ۔''

ہادی نے عقب نما آئینہ اس کی طرف پھیرا۔ اس نے آئینے کی طرف دیکھا اور چند لمحے کے لیے واقعی دیکھتی رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جمع ہو رہے تھے۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی ہادی نے بات پھر شروع کر دی۔ ''حب! میں جو کچھ کہہ رہا ہوں ڈاکٹر عطا کے مشورے سے کہہ رہا ہوں۔ آپ میرے ساتھ چلیں۔ ہم آپ کو ایسی جگہ رکھیں گے جہاں جلال یا اس کا کوئی کارندہ آپ تک نہ پہنچ سکے گا۔ آپ وہاں سے جلال کو فون کر دیں کہ آپ اپنی مرضی سے آئی ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ ہے ہم خود سنبھالیں گے۔ اگر جلال نے کوئی الٹا راستہ اختیار کیا تو اس کا منہ اس طرح بند ہوگا کہ ساری زندگی یاد رکھے گا اور یہ سب کچھ قانونی طریقے سے ہوگا...... اور یہ کوئی ایسی بری بات نہیں، یہ ہو سکتا ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں حب، آپ کو یا آپ کے گھر والوں کو کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ اور ہم نے اس سے کسی طرح کی لڑائی کرنی بھی نہیں۔ صرف دو ڈھائی ماہ کی مہلت مانگنی ہے اس سے، قریباً آدھی رقم ہم اسے ابھی ادا کر دیں گے۔ آدھی دو ڈھائی ماہ بعد مل جائے گی اسے۔ یہ ساری باتیں ڈاکٹر عطا اور میرے درمیان طے ہو چکی ہیں۔ اگر آپ کہیں تو میں ڈاکٹر عطا سے آپ کی بات بھی کرا سکتا ہوں۔''

ہادی نے سیل فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ''نہیں

ہادی صاحب! مجھے کسی سے بات نہیں کرنی اور نہ مجھے کسی بھی طرح آپ کی مدد چاہیے۔ آپ کے پہلے ہی بڑے "احسان" ہیں مجھ پر اب مجھے معاف کر دیجیے۔"

"اچھا، آپ عطا صاحب سے بات تو کیجیے....."

"پلیز نہیں۔ میں جانتی ہوں، سب کچھ اچھی طرح جانتی ہوں۔ اگر عطا انکل کچھ کہیں گے تو آپ کے کہنے پر ہی کہیں گے۔ جس طرح آپ مجھے مجبور کر رہے ہیں۔ انہیں بھی کر دیا ہوگا۔ آپ یہاں کے حالات کے بارے میں نہیں جانتے اور نہ ہی جلال کی "حیثیت" کا پتا ہے آپ کو۔ آپ..... آپ مسلسل ہماری مصیبتوں میں اضافہ کر رہے ہیں۔ خدا کے لیے آپ پیچھا چھوڑ دیجیے ہمارا۔ یہ میرے پرابلمز ہیں، میں انہیں خود حل کر لوں گی۔ مجھے آپ کی ضرورت نہیں۔ آپ کی سب سے بڑی مہربانی یہی ہوگی کہ یہاں سے چلے جائیں..... اور دوبارہ اپنی صورت نہ دکھائیں..... اور ایک بات اور یاد رکھیں۔ مجھے ورس والی کوٹھی سے صرف جلال نکال سکتے ہیں یا میرے ابو نکال سکتے ہیں۔" اس کا لہجہ پھر درشت ہوتا چلا جا رہا تھا۔ کسی وقت لگتا تھا کہ وہ پھٹ پڑے گی۔ وہ بار بار ہراساں نظروں سے اسپتال کے داخلی دروازے کی طرف بھی دیکھ رہی تھی جہاں سے ارم کو لوٹنا تھا۔

ہادی نے پھر اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔ "حب! اپنا نہیں تو اپنے والدین کا خیال کریں۔ جو کچھ آپ کے ساتھ ہو رہا ہے، آپ کو پتا نہ کچھ ہو جاتا ہے۔ کسی قیدی کی طرح کال کوٹھری میں گھٹ گھٹ کر ختم ہو رہی ہیں آپ۔ اللہ نہ کرے، آپ کو کچھ ہوا تو آپ کی امی کا کیا ہوگا۔ انہیں ابھی تک آپ کے حالات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا۔ آپ کے ابو بھی اتنے سخت جان نہیں کہ کوئی ایسا صدمہ برداشت کر سکیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، آپ کے گھر والے فی الحال اس قابل نہیں کہ آپ کے چھٹکارے کے لیے کچھ کر سکیں اور وہاں جلال کی طرف بھی کسی کو آپ پر رحم نہیں آئے گا۔ جلال اس وقت بدبختی کی ہر حد سے گزرا ہوا ہے۔ یہ دو بار باقاعدہ مجھ پر ہاتھ اٹھا چکا ہے، اور یہ ارم؟ یہ سارے فساد کی جڑ ہے۔ اس کی بھی کسی ظاہری بات پر نہ جائیے گا۔ یہ بات..... صرف اپنے تک رکھیے گا کہ اس وقت ارم اگر آپ کو یہاں ڈاکٹر کے پاس لے کر آئی ہے تو میرے ہی مجبور کرنے پر آئی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ مجھے کسی طرح آپ سے بات کرنے کا موقع مل سکے۔ میں آپ کو تفصیل نہیں بتا سکتا کہ وقت بہت کم ہے۔ معاملات بہت بگڑے ہوئے ہیں۔ اس وقت آپ کے پاس بہترین چانس یہی ہے کہ آپ ورس والے گھر سے اور اس خطرناک صورتِ حال سے نکل چلیں۔" وہ ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا۔

حجاب پریشان نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ کسی وقت لگتا تھا کہ اس کی باتوں پر ایک دم یقین کر لینا چاہتی ہے۔ کسی وقت محسوس ہوتا تھا کہ اسے ہادی کا ایک پل بھی گاڑی میں ٹھہرنا گوارا نہیں۔

ہادی بولا۔ "وہ دیکھیں۔ وہ سائڈ کی سڑک پر نیلی گاڑی کھڑی ہے۔ اس کا پچھلا حصہ نظر آ رہا ہے۔ میں اسی پر یہاں آیا ہوں۔ ڈرائیور بھی موجود ہے۔ ہم پندرہ بیس منٹ کے اندر بالکل محفوظ جگہ پر پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد آپ کے لیے سب کچھ..... سب کچھ ٹھیک کرنا میری ذمے داری ہے حب! پلیز میری بات پر یقین کیجیے۔ میں آپ پر ایک ہلکی سی آنچ بھی آنے نہ دوں گا۔" ہادی کے لب و لہجے میں سچائی و توانائی کا ایک سمندر موجزن تھا۔ یہ بے پناہ بہاؤ حجاب کی ہستی کو تہ و بالا کر رہا تھا۔

یہی وقت تھا جب ہادی کے فون کی بیل ہوئی۔ یہ ارم کا وہی نمبر تھا جس پر وہ اس سے رابطہ کرتی تھی۔ ہادی نے کال ریسیو کی۔ "ہیلو کیا بات ہے؟" ہادی نے پوچھا۔

"گڑبڑ ہو گئی ہے۔" ارم کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"کیا مطلب؟ کہاں ہو تم؟"

"میں اسپتال کے اندر ہوں۔ "انٹرنس" کے پاس ہی کھڑی ہوں۔ مجھے سڑک کے پار جلال کا ایک گارڈ نظر آیا ہے۔ وہ اپنے اسکوٹر کے پاس کھڑا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ باسٹرڈ ہمارا پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچا ہے۔ وہ فون پر کسی سے بات کر رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اپنے سینئر واسٹو کو بلا رہا ہے۔ تمہارے پاس وقت نہیں اگر تم نے یہاں سے نکلنا ہے تو جلدی نکل جاؤ۔ ورنہ پھر بہت تماشا لگ جاتا ہے۔ پلیز جلدی کرو۔" ارم کی آواز کانپ رہی تھی۔

ہادی نے مڑ کر دیکھا۔ گاڑی ایسی جگہ کھڑی تھی کہ اسے اسکوٹر سوار گارڈ نظر نہیں آیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ ارم غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ "او کے۔" ہادی نے کہا اور فون بند کر دیا۔

"کیا بات ہے؟" حجاب نے بے حد سراسیمہ لہجے میں پوچھا۔

"حجاب! پلیز میری بات مان لیں۔ یہ موقع آپ کو پھر نہیں ملے گا۔ وہ سامنے گاڑی کھڑی ہے۔ بیس پچیس قدم

کا فاصلہ ہے۔ ہم اس مشکل سے نکل سکتے ہیں..... پلیز حجاب۔"

حجاب کا رنگ بالکل ہلدی ہو گیا تھا۔ "کیا بات ہے؟ کس کا فون تھا؟" اس نے پوچھا۔

ہادی نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر بولا۔ "حب! لگتا ہے کہ جلال کے ایک گارڈ نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کو بلا رہا ہے۔ ان کے پہنچنے سے پہلے ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں۔ یہ وقت ہمارے ہاتھ سے نکل گیا حب! تو بہت نقصان ہو جائے گا۔ ہمت کیجیے۔ ہم مل کر ہر چیز کو فیس کر لیں گے..... میرا وعدہ ہے آپ سے۔"

حجاب پیچھے ہٹ کر گاڑی کے دروازے کے ساتھ لگ گئی۔ آنکھوں میں خوف و ہراس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ دو تین منٹ پہلے اس کے رویے میں جو تھوڑی سی لچک نظر آئی تھی اب اس کا دور دور پتا نہیں تھا۔ وہ لرزاں آواز میں بولی۔ "آپ ہمیں برباد کر کے چھوڑیں گے۔ آپ چلے جاؤ یہاں سے، دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔ مجھے کہیں نہیں جانا..... مجھے کہیں نہیں جانا۔" آخری الفاظ اس نے بالکل چلّانے والے انداز میں کہے۔

تب اس نے پھر دروازہ کھولنے کے لیے ہینڈل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ہادی نے اس کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی، اس نے بری طرح ہاتھ جھٹک دیا اور چلائی۔ "میں پولیس کو بلاؤں گی..... پولیس..... پولیس۔"

اب ہادی کے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ فوراً گاڑی سے باہر نکل جائے۔ وہ جیسے بے ہوش ہونے کے قریب تھی۔ ہادی نے دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ یہی وقت تھا جب دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا..... اور پھر ایک بھاری بھرکم ہاتھ ہادی کے گریبان پر تھا۔ اس نے ٹھٹک کر دیکھا۔ یہ ایک یکیم شحیم اطالوی گارڈ تھا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں جیسے نیلے شعلے بھڑک رہے تھے۔ اس نے ایک زوردار جھٹکا دیا اور ہادی لڑکھڑاتا ہوا سا سڑک پر آن گرا۔ اس کا سر سڑک کے پانچ چھ انچ اونچے کنارے سے ٹکرایا تھا۔ یونیفارم والا یکیم شحیم گارڈ ہادی پر جھپٹا۔ ہادی کو لگا جیسے وہ کسی جنگلی بھینسے کے نیچے دب گیا ہے۔ گارڈ نے اس کے منہ پر مکا رسید کیا جواب میں ہادی نے بھی نیچے سے ایک طوفانی مکا اس کی ناک پر مارا۔ اس کے کانوں میں حجاب کے چلّانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ ابھی تک گاڑی کے اندر تھی۔

تب ہادی نے دیکھا کہ ایک اور شخص اس پر جھپٹ رہا ہے۔ یقیناً یہ بھی حملہ آور کا ساتھی تھا۔ یہ یونیفارم میں نہیں تھا مگر شکل و صورت سے گارڈ ہی دکھائی دیتا تھا۔ اس نے آتے ہی ہادی کی پسلیوں میں زوردار ٹھوکر رسید کی اور پھر اس پر پل پڑا۔ ناک پر مکا کھانے والے یکیم شحیم گارڈ کا منہ رنگین ہو گیا تھا اور ہادی پر اس کی گرفت قدرے کمزور پڑ گئی تھی۔ ہادی نے اسے اپنی ٹانگوں کے پورے زور کے ساتھ پیچھے کی طرف اچھال دیا۔ وہ پشت کے بل سڑک پر گرا۔ ساتھ ہی ایک کار کے ٹائر خوفناک آواز سے چرچرائے..... کار کی ٹکر سے یکیم شحیم گارڈ دور تک لڑھک گیا۔ اس کی کمر کے ہولسٹر سے پستول بھی نکل کر سڑک پر پھسلتا نظر آیا، دوسرا گارڈ جو شکل سے انڈین یا پاکستانی لگ رہا تھا مغلظات بک رہا تھا اور ہادی کو لمبے بالوں سے پکڑ کر اس کا سر پختہ سڑک سے ٹکرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی صورت کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی تھی۔

یہی وقت تھا جب ہاشم ایرک اور اس کا ماتحت تھامس، ہادی کی مدد کو لپکے۔ انہوں نے حملہ آور گارڈ کو ہادی کے اوپر سے ہٹایا اور گھما کر اوندھے منہ سڑک پر پٹخ دیا۔ گاڑیاں رک رہی تھیں، درجنوں لوگ اردگرد جمع ہو چکے تھے۔ ان میں سے کچھ اس یکیم شحیم گارڈ کو دیکھ رہے تھے جو کار کی ٹکر سے بے ہوش ہو گیا تھا۔ کچھ دوسرے گارڈ کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ ہاشم ایرک اس کے ہاتھ پیچھے موڑ کر اسے ہتھکڑی پہنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہتھکڑی دیکھ کر لوگ سمجھ گئے تھے کہ یہ پولیس آفیسر ہے۔ اسی ہنگامے میں ہاشم ایرک کے ماتحت تھامس نے ہادی کو اشارہ کیا۔ مطلب یہ تھا کہ ہادی کھسک جائے۔ ہادی نے گاڑی کی طرف مڑ کر دیکھا۔ ہراساں چہرے والی ارم بھی اب گاڑی میں حجاب کے پاس موجود تھی۔ ان دونوں نے گاڑی غالباً اندر سے لاک کر لی تھی۔ ہادی نے دیکھا..... دور سے ایک اور اسکوٹر سوار گارڈ موقع پر پہنچ رہا تھا۔ ہادی نے تیزی سے سڑک پار کی اور ایک بغلی گلی میں داخل ہو گیا۔ گلی کے آخری سرے پر پھر ایک سڑک تھی۔ اسے ایک بس نظر آئی۔ وہ سگنل پر رکنے کے بعد سست روی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ ہادی لپک کر اس میں سوار ہو گیا۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی اور سینے میں ناکامی اور مایوسی کا دھواں بھر رہا تھا۔ وہ حجاب میں وہ ہمت پیدا نہیں کر پایا تھا جو اسے ساتھ چلنے پر آمادہ کر دیتی۔ شاید کہیں ایک آنچ کی کسر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

حجاب ورس والے گھر میں تھی۔ جلال اس پر چلا رہا تھا۔ "اس نے تم سے ہمدردی کی بلکہ بے وقوفی کی اور تم نے

اس کی بے وقوفی کا فائدہ اٹھایا۔ وہ تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی تھی اور تم نے وہیں پر اس حرامی کو بھی بلالیا۔ بتا، کس طرح بلایا تو نے اسے وہاں۔ بتا۔''

''میں نے نہیں بلایا۔'' وہ بلکی۔ ''میں کیسے کسی کو بلا سکتی تھی۔ میرے پاس کوئی فون نہیں تھا۔ ارم سارا وقت میرے ساتھ رہی ہے۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھا سکتی ہوں۔''

''تیری قسمیں اب اعتبار کے قابل نہیں رہیں۔ ارم تجھے گاڑی میں بٹھا کر کلینک میں چلی گئی۔ تو نے اس وقت اسے کال کی ہوگی۔''

''میں نے نہیں کی جلال! میرا یقین کریں۔'' وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔ ''وہ تو مجھے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ امی ابو کے پاس پہنچانا چاہتا تھا۔ اگر میں نے آپ کی نافرمانی کرنی ہوتی تو میں چلی جاتی۔ میں نے اسے روکنے کے لیے پولیس کو بلایا۔ شور مچایا۔''

''یہ سب کچھ تم نے اس وقت کیا جب گارڈز آگئے۔ تم بہت بڑی دھوکے باز ہو۔ تمہارے اس نئے دھوکے کو ایک طرف رکھ دیا جائے تو تمہارے پہلے فراڈ ہی کچھ کم نہیں ہیں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں، میں کسی دن ماردوں گا اس حرامی کتے کو اور ساتھ تجھے بھی۔ تو کسی رعایت کے لائق نہیں ہے۔ چل نیچے...... میں کہتا ہوں چل نیچے۔''

''خدا کے لیے جلال! مجھ پر یہ ظلم نہ توڑیں۔ بے شک مجھے بند کردیں، لیکن اسی کمرے میں رہنے دیں، وہاں نہ لے جائیں۔''

وہ پھنکارا۔ ''مجھے تو اب وہ جگہ بھی تیرے لیے زیادہ محفوظ نہیں لگتی۔ تیری جیسیوں کو تو کسی کنویں میں پھینک دینا چاہیے، زنجیریں ڈال کر...... چل نیچے۔''

وہ کھینچ کھینچ کر سانس لینے لگی۔ اس بیسمنٹ میں جانا ہی اسے ''موت'' لگ رہا تھا۔ وہ رونے بلکنے لگی۔ وہ دہاڑا۔ ''دو ہی راستے ہیں تیرے سامنے۔ چپ چاپ بیسمنٹ میں چلی جا...... یا پھر ابھی طلاق لے کر اپنے باپ کے گھر پہنچ جا۔''

وہ ایک ایسے دوراہے پر تھی جہاں سے کسی بھی طرف قدم اٹھانا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ کچھ دیر پہلے تک اسے یہ غلط فہمی تھی کہ شاید ہادی کی شدید مزاحمت کر کے اور اس کے ساتھ نہ جا کر اس نے جلال کی جارحیت کے سامنے جس طرح سر جھکایا ہے اس کے صلے میں وہ کچھ نرمی برتے گا۔ لیکن یہاں تو ہر بات کا مطلب الٹ تھا، ہر عاجزی کا بدل جبر تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ایک بار پھر بیسمنٹ کی منحوس سیڑھیاں اترنے پر مجبور ہو رہی تھی۔ وہ اس کے عقب میں آرہا تھا۔ دروازے کے سامنے پہنچ کر وہ ایک بار پھر تڑپ گئی۔ بارہ فٹ ضرب چودہ فٹ کے اس بیسمنٹ کی چار دیواریں اسے موت کے چار خوفناک فرشتوں کی طرح لگتی تھیں۔ یہاں کی ہر شے ایک عفریت تھا جو اس کا خون چوسنے کے لیے لپکتا تھا۔ وہ مڑی اور دل فگار، ہیجانی انداز میں بولی۔ ''فار گاڈ سیک جلال! رحم کریں، مجھے یہاں بند نہ کریں۔ میں آپ سے کچھ نہیں مانگتی۔ مجھے جس طرح رکھیں گے رہوں گی۔ کبھی کچھ نہیں کہوں گی۔''

اب جلال کی برداشت کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ وہ اندھا دھند اس پر پل پڑا۔ اس کے زخمی ہاتھ اور اس کی خستہ حالی کی پروا کیے بغیر۔ اس نے اس پر ٹھوکروں اور تھپڑوں کی بارش کردی۔ وہ اندر ٹائیلوں کے پھولدار فرش پر گری۔ اس کے چلانے کی آوازیں دلدوز تھیں۔ اس کے پورے جسم پر جیسے ہتھوڑوں اور آتشیں طمانچوں کی بارش ہوگئی تھی۔ اسے بے دردی سے پیٹ کر اس نے بیسمنٹ کا دروازہ دھماکے سے بند کیا اور اسے مقفل کر کے چلا گیا۔ وہ وہیں آنکھیں بند کیے پڑی رہی اور سسکتی رہی۔ وہ آنکھیں کھولنا نہیں چاہتی تھی۔ اگر کھولتی تو پھر وہی بیسمنٹ کے ہیبت ناک در و دیوار نظر آتے۔ گرنے سے اس کا زخمی ہاتھ پھر سنسنا اٹھا تھا، اس کے علاوہ کندھے اور رخسار پر بھی چوٹ آئی تھی۔ شاید الماری کا کوئی ہینڈل لگا تھا۔ کچھ دیر بعد اسے اپنے رخسار پر نمی کا احساس ہوا تو پتا چلا کہ خون بہہ رہا ہے۔ مگر اس نے پھر بھی آنکھیں نہیں کھولیں۔ اس میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی۔

قریباً پندرہ منٹ بعد تہ خانے کا دروازہ پھر کھلا اور جلال اندر آگیا۔ اپنی نم پلکیں اٹھا کر حجاب نے دیکھا۔ اس کے غیظ و غضب کا دریا ذرا سا اترا ہوا نظر آتا تھا۔

''بیڈ پر بیٹھو۔'' وہ پھنکارا۔

وہ جلدی سے اٹھ کر بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئی۔ وہ اس کی طرف انگلی اٹھا کر زہریلے انداز میں بولا۔ ''یہ بھی مت کہنا کہ میں نے تمہیں یہاں قید کر رکھا ہے۔ دوسری شادی سے لے کر تمہیں یہاں رکھنے تک میں نے کوئی ناجائز کام نہیں کیا ہے۔ تم اپنی مرضی سے ہو یہاں...... مکمل طور پر اپنی مرضی سے ہو۔ اور ابھی تم اس کا ثبوت بھی دو گی مجھے...... جب میں واپس جاؤں گا تو تم ثبوت دو گی۔''

وہ کچھ نہ بولی اور نہ کچھ پوچھا۔ اس نے ٹیبل لیمپ کی روشنی میں دھیان سے اس کے رخسار کا زخم دیکھا اور کندھے کا بھی۔ غالباً وہ انہی تازہ چوٹوں کو دیکھنے یہاں آیا تھا۔ اس نے روئی رکھ کر حجاب کے رخسار سے بہنے والا خون بند کیا، پھر کندھے سے قمیص ہٹا کر وہاں بھی روئی کا پھایا رکھا۔ وہ رخسار والے زخم کے سلسلے میں زیادہ فکر مند نظر آرہا تھا۔ حجاب نے اندازہ لگایا کہ یہ زخم ''کٹ'' سے زیادہ چھلنے جیسا ہے۔

جلال نے وہیں بیٹھے بیٹھے ڈرائیور بٹ کو فون کیا اور اسے فوراً میڈیکل اسٹور سے ایک آئنٹمنٹ لانے کو کہا۔ یہ زخموں کے لیے ایک بہت مہنگی دوا تھی اور حال ہی میں مارکیٹ میں آئی تھی۔ دس پندرہ منٹ بعد وہ باہر گیا اور آئنٹمنٹ لے آیا۔ اس نے اپنے ہاتھ سے حجاب کے رخسار کا زخم پائیوڈین سے صاف کیا اور مرہم لگا کر چپکنے والی ڈریسنگ کردی۔

بہ ظاہر یہ نرمی اور ہمدردی نظر آتی تھی مگر حجاب جانتی تھی یہ کیسی ہمدردی ہے۔ یہ وہی ہمدردی اور توجہ تھی جو انسان اپنی زیر استعمال اشیا سے رکھتا ہے۔ اگر جلال کی گاڑیوں میں سے کسی گاڑی پر بدنما خراش آجاتی تو بھی وہ ایسی ہی فکر مندی اور توجہ کا مظاہرہ کرتا۔ وہ اس کی ملکیت تھی۔ اس نے اسے استعمال کرنا تھا۔ آج نہیں تو کل...... کل نہیں تو پرسوں یا پھر ایک دو ماہ بعد۔

آہ یہ کیا رشتہ ہے؟ حجاب نے بڑے درد سے سوچا۔ بے شک آج کل حجاب کو دیکھتے ہی جلال کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں چھوٹنے لگتی تھیں۔ لیکن یہ چنگاریاں حجاب کے لیے ہوتی تھیں۔ اس کی جسمانی خوب صورتی اور شادابی کے لیے نہیں۔ وہ سب کچھ یقیناً اسے ابھی تک مرغوب تھا۔ اب نہ سہی، مستقبل قریب میں سہی...... وہ بحیثیت شوہر اس سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ شاید...... شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اسے طلاق کی پرزور دھمکی تو دیتا تھا لیکن اس دھمکی کے ساتھ اس کے ابو اور بھائی کے سنگین نقصانات کو بھی نتھی کر دیتا تھا۔ وہ اس کی ''ملکیت'' کھونا نہیں چاہتا تھا اور وہ اس میں کامیاب تھا۔

اس کی مرہم پٹی کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور تحکم سے بولا۔ ''اٹھو۔''

وہ کسی معمول کی طرح کھڑی ہوگئی۔ ''دیکھو، آج میں تمہیں آخری بار...... بالکل آخری بار کہہ رہا ہوں، اب اگر تم نے واویلا کیا یا یہاں سے جانے کی ''بات'' بھی کی تو میں تمہاری طلاق کے کاغذات تمہارے منہ پر ماردوں گا۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں ہوگا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوگا وہ تمہاری ذمے داری ہوگی۔''

وہ سکتہ زدہ کھڑی رہی۔ اب فریاد کرنے کی ہمت بھی نہیں رہی تھی...... وہ دانت پیس کر بولا۔ ''اب مجھے اس بات کا ثبوت دو کہ میں نے تمہیں یہاں زبردستی بند نہیں کیا ہوا...... چلو یہ دروازہ اپنے ہاتھوں سے بند کرو۔''

''جج...... جی؟'' وہ مردہ آواز میں ہکلائی۔

''میں لاطینی نہیں بول رہا۔ میں باہر جا رہا ہوں، تم یہ دروازہ خود بند کرو تاکہ تمہیں اپنے اختیار کا احساس ہو۔ چلو۔'' وہ تحکم سے بولا۔ پھر اس کا بازو پکڑ کر دروازے کی طرف لے آیا۔ خود باہر نکل گیا اور بولا۔ ''بند کرو دروازہ اپنے ہاتھوں سے۔''

اس کی سانس سینے میں اٹکنے لگی۔ پہلے تو اس کے جی میں آئی کہ جلال کے سامنے ہاتھ جوڑ دے۔ ایک بار پھر اس کی منت سماجت کرے۔ مگر پھر اس نے اس کا سرخ ہوتا چہرہ دیکھا۔ وہ سمجھ گئی کہ اگر اس نے اس کی مرضی پوری نہیں کی تو وہ شاید پھر تشدد پر اتر آئے۔ کچھ حاصل نہیں تھا۔ اب کچھ حاصل نہیں تھا۔ اب پسپائی تھی اور مسلسل پسپائی۔ اس نے ہچکیوں سے روتے ہوئے دروازہ بند کرلیا۔ اس نے باہر سے بولٹ لگا کر لاک کردیا۔ جب وہ سیڑھیاں چڑھ کر واپس جا رہا تھا، اس کے قدموں کی چاپ میں ایک فاتحانہ دھمک تھی۔

☆☆☆

ہاشم ایرک کے مشورے پر ہادی نے ہوٹل تبدیل کرلیا تھا۔ یہ درمیانے درجے کا ہوٹل شہر کے ساحلی علاقے میں تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ یہاں جو کمرا ہادی کو ملا وہ اس کے اصلی نام سے بک نہیں تھا۔ یہ بکنگ ہاشم ایرک نے ہی کروائی تھی (اور اس کے لیے پاسپورٹ کے بغیر ہی کام چلا لیا تھا) ہاشم ایرک نے بتایا تھا کہ واسٹو نام کا جو ہٹا کٹا گارڈ لڑائی کے دوران میں کار کی ٹکر سے زخمی ہوا وہ اسپتال میں ہے۔ اس کی دو پسلیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ اس سلسلے میں کسی طرح کا مقدمہ تو درج نہیں کرایا گیا تھا مگر ہاشم کو یقین تھا کہ جلال جیسا شخص خاموش نہیں بیٹھے گا اور اس کے کارندے ہادی کو تلاش کر رہے ہوں گے۔ ہادی نے اس دوسرے گارڈ کو پہچان لیا تھا جو واسٹو کے ساتھ مار پیٹ میں شریک ہوا۔ ہوٹل واسکوڈے کے سامنے کچھ عرصہ پہلے ہادی پر جو حملہ ہوا تھا یہ شخص اس میں شریک تھا۔ یعنی اب اس بات میں شبہے کی گنجائش نہیں رہی تھی کہ ہادی کے ساتھ وہ مار پیٹ

بھی جلال نے ہی کروائی تھی۔

ہادی اس پراؤڈ نامی ساحلی ہوٹل کے کمرے میں خاموش بیٹھا تھا۔ اسے سگریٹ کی طلب ہو رہی تھی مگر اس نے سگریٹ بھی تقریباً چھوڑ دیا تھا۔ بات الکحل یا سگریٹ کی ہی نہیں تھی۔ ان دو چار ماہ میں اس کے اندر حیرت ناک تبدیلیاں آئی تھیں۔ وہ ایک بدلا ہوا شخص بن گیا تھا اور ان تبدیلیوں کی بنیاد کسی کی ''خاموش محبت'' تھی۔ وہ عشق تھا جو کسی نایاب خوشبو کی طرح اس کے رو ئیں روئیں میں سما گیا تھا۔ کسی نے کہا تھا۔

تم عشق کی منزل میں قدم سوچ کے رکھنا
دریائے محبت کے کنارے نہیں ہوتے

اس وقت بھی ہادی کے ـــ دل و دماغ میں حجاب کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس کا زرد چہرہ، ڈھلی ڈھلی آنکھیں اور نحیف آواز۔ یہ سب کچھ اس کے دل میں کھب کر رہ گیا تھا۔ کہاں تھی وہ روشن پیشانی، کہاں تھے وہ پنکھڑیوں سے ہونٹ جنہیں وہ نرمی سے دانتوں تلے دباتی تھی اور ایک حسین ادا کو وجود دیتی تھی۔ وہ دھوپ میں رکھی ہوئی برف کی طرح پگھل رہی تھی...... ختم ہو رہی تھی اور وہ اس کے لیے کچھ نہ کرسکا تھا۔ اس کے سینے میں دھواں بھرنے لگا۔ اسے لگا کہ حجاب کو کچھ ہو گیا تو وہ بھی زندہ نہیں رہ سکے گا۔ بڑی تیزی سے بہت دور جا چکا تھا وہ۔ کسی کے عشق میں خود کو گم کر چکا تھا۔ وہ اس کی ''جان'' بن چکی تھی اور یہ لفظی بات نہیں تھی۔ اسے حقیقت میں یہی لگتا تھا اور ستم کی بات یہ تھی کہ اسے کچھ خبر ہی نہیں تھی۔ اس سے آخری ملاقات میں ایک بار تو ہادی کا دل چاہا تھا کہ وہ اس کی دونوں کلائیوں کو زور سے تھامے اور ہر مصلحت ایک طرف رکھنے کے بعد پکار کر کہہ دے...... حجاب! میں تم سے محبت کرتا ہوں...... اور شاید یہ لفظ چھوٹا ہے۔ شاید عشق کا لفظ بھی اتنا بڑا نہیں۔ میں اس جذبے کو کیا نام دوں حب...... جو مجھے تمہارے لیے مار چکا ہے، ختم کر چکا ہے۔ لیکن وہ کہہ نہ سکا تھا اور اسے لگتا تھا کہ وہ کبھی کہہ بھی نہ سکے گا۔ لیکن کیا اس نے بھی کچھ محسوس نہیں کیا تھا۔ اس دیوانگی اور اس والہانہ پن کی وجہ نہیں سوچی تھی جو وہ اس کے لیے رکھتا تھا۔

فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف ڈاکٹر عطا تھے۔

''ہیلو ہادی! یہ نئی جگہ کیسی ہے؟''

''مناسب ہے عطا انکل۔ آپ سنائیں انکل فیاض سے بات ہوئی؟''

''ہاں ہوئی۔'' ان کی آواز میں ایک بار پھر مایوسی کا عنصر تھا۔

''کیا کہتے ہیں؟''

''ہادی! اصل میں کوئی ڈھائی ہزار یورو تو انہوں نے ایک ہفتہ پہلے اسپتال کا بل ادا کیا ہے۔ ابھی مزید خرچا بھی ہو رہا ہے۔ ابھی تو وہ اس معاملے میں ہاتھ ہی کھڑے کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی طرح وہ گجرات والا پلاٹ بک جائے، چاہے کتنے کا بھی بکے۔''

''انکل! مجھے یہ بات بالکل سمجھ میں نہیں آرہی۔ وہ پلاٹ بکنے والا ہوتا تو اب تک بک چکا ہوتا...... انکل...... یہ ان کی بیٹی کا معاملہ ہے۔ کیا اس سلسلے میں ان کی ساری بھاگ دوڑ اس پلاٹ سے شروع ہو کر وہیں پر ختم ہو جاتی ہے؟ یا پھر وہ کسی طرح کی ''چین'' لینا ہی نہیں چاہ رہے۔''

''ایسی بات نہیں ہے ہادی۔ یہ حالات بندے کو کئی دفعہ بے بس کر چھوڑتے ہیں۔ سیانوں نے ٹھیک کہا ہے کہ بیماری اور مقدمہ بندے کو جال کی طرح جکڑ لیتے ہیں۔ وہ بے چارے بھی بیماری کے جال میں ہیں۔''

ہادی نے ایک آہ بھری۔ پژمردہ آواز میں بولا۔ ''عطا انکل...... بچپن سے ہر فلم اور ڈرامے میں ہم ایسے ہی سین دیکھتے رہے ہیں۔ باپ کو دل کے دورے سے بچانے کے لیے یا ماں کی سلامتی کی خاطر اولاد ناپسندیدہ فیصلوں کی بھینٹ چڑھتی ہے۔ کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ حقیقت میں بھی یہی ہوتا ہے...... رومانی یا ازدواجی معاملات میں اکثر اولاد کو قربانیاں دینا پڑتی ہیں۔''

''لیکن یہاں تو صورتِ حال واقعی مخدوش ہے ہادی۔ صوفیہ کی حالت ایسی ہے کہ ذرا سا صدمہ بھی نہیں سہہ سکتی۔ ابھی تک اس سے ہر بات پوشیدہ رکھی گئی ہے۔ وہ بار بار حجاب سے ملنے پر اصرار کر رہی ہے۔ اسے بتایا گیا ہے کہ وہ جلال کے ساتھ وینس میں ہے۔ جلال نے اسے کہیں بھی فون کرنے سے منع کیا ہوا ہے، اس لیے وہ فون نہیں کرسکتی۔ جلد ہی خود آکر ملے گی۔ جلال کی دوسری شادی کا بھی ابھی صوفیہ کو پتا نہیں۔''

''لیکن کب تک انکل۔ کب تک آپ لوگ یہ سب کچھ چھپا سکیں گے؟''

''کم از کم حجاب اس شکنجے سے تو نکل آئے جس میں پھنسی ہوئی ہے۔ جلال سے رہائی مل جائے اسے۔''

''کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے انکل کہ وہ اسے آزاد کرنا ہی نہیں چاہتا۔ قرض چکا بھی دیا گیا تو وہ رکاوٹیں ڈالے گا۔''

''یہ ہوسکتا ہے، لیکن قرض کی ادائیگی کے بعد اس کی پوزیشن بہت کمزور ہو جائے گی۔ دو دن کے اندر پولیس اس کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا دے گی۔ وہ کچھ نہیں کرسکے گا۔''

''لیکن انکل...... وہ تب تک زندہ رہے گی تو ایسا ہوگا نا۔ آپ نے اسے نہیں دیکھا لیکن میں نے دیکھا ہے، برسوں کی بیمار نظر آتی ہے۔ مجھے تو لگتا تھا کہ کسی بھی وقت گاڑی میں ہی بے ہوش ہو جائے گی۔ کاش...... میں کسی طرح...... اسے ساتھ لا سکتا۔ بہت دکھ ہو رہا ہے مجھے۔''

''اس نے نہیں آنا تھا ہادی۔ میں نے تمہیں پہلے ہی بتایا تھا، وہ نہیں آئے گی۔ اس کے باپ نے اسے جہاں کھڑا کیا ہے، وہ کھڑی رہے گی، چاہے جان چلی جائے۔ اب وہی کہے گا تو وہ وہاں سے ہلے گی۔ وہ مر کر بھی حکم عدولی نہیں کرسکتی۔ لیکن...... لیکن میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی ہادی۔''

''جی فرمائیں۔''

''یہ ارم تیار کیسے ہوگئی، حجاب کو ورس والے گھر سے نکالنے کے لیے؟''

''بس اس کی ایک دکھتی رگ میرے ہاتھ میں تھی۔ اس سے فائدہ اٹھایا میں نے مگر افسوس کہ حاصل کچھ نہ ہوا۔''

ہادی نے گول مول سا جواب دیا تھا۔ دوسری طرف عطا صاحب یقیناً سمجھ گئے کہ وہ تفصیل بتانا نہیں چاہتا۔ ہادی نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''عطا انکل! جو کچھ ہوا ہے اس کے بعد لگتا ہے کہ شاید حجاب کو وہاں مزید پابندیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ہوسکتا ہے کہ اس پر سختی بھی بڑھا دی جائے۔ ہم اس معاملے کو زیادہ ملتوی نہیں کرسکتے۔ ہمیں جو کچھ کرنا ہے جلدی کرنا ہے۔ میں ابھی گجرات میں ایک جاننے والے کو فون کر رہا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ پلاٹ لینے پر راضی ہو جائیں۔ ان سے تھوڑا بہت ادھار بھی لیا جاسکتا ہے۔''

''میں بھی اپنے طور پر پوری کوشش کر رہا ہوں۔ ہمارے اختیار میں کوشش کرنا ہے۔ کامیابی دینا اوپر والے کا کام ہے۔ لیکن اب ایک بات تمہارے دھیان میں رہے۔ جلال یا اس کے کسی کارندے سے تمہارا براہ راست ٹکراؤ نہیں ہونا چاہیے۔ اس معاملے میں بہت احتیاط رکھو۔''

ڈاکٹر عطا سے بات ختم کرنے کے بعد ہادی سوچ میں پڑ گیا۔ اب اس کا دھیان رہ رہ کر ارم کی طرف جا رہا تھا۔ وہ اس پوزیشن میں تھا کہ ارم پر دباؤ ڈال کر اس سے ایک بڑی رقم حاصل کرسکے۔ لیکن پتا نہیں کیوں یہ سب کچھ اسے گوارا نہیں ہو رہا تھا۔ کیا وہ حجاب کو بلیک میلنگ کے روپے سے رہائی دلائے گا؟ کیا اس کی جان سے پیاری ہستی آزاد فضا میں سانس لینے کے لیے بلیک میلنگ کی مرہونِ منت ہوگی۔ اس سوال کا جواب ہادی کے دل نے ہر بار نفی میں دیا تھا۔ وہ سوا تین کروڑ روپے کی اس رقم میں بلیک میلنگ یا غیر قانونی طریقے سے حاصل کیا ہوا ایک پیسا بھی شامل نہیں کرسکتا تھا۔ وہ جو پھولوں اور شبنم کی طرح پاک تھی اس پر غلاظت کا ایک چھینٹا بھی اسے گوارا نہیں تھا...... تو پھر کیا وہ اپنا مکان فروخت کر دے؟ وہ حجاب کے لیے سب کچھ کرسکتا تھا۔ ہر بڑی سے بڑی آزمائش سے گزر سکتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں اپنے بھائی فہد سے کھل کر بات کرے گا۔ ایک دوست کی طرح اسے اپنی ہر قلبی واردات سے آگاہ کر دے گا۔ اسے بتا دے گا کہ پچھلے چند ماہ میں اس کی زندگی کیا سے کیا ہوگئی ہے۔ پتا نہیں کیوں اب اسے رہ رہ کر انکل فیاض اور فیصل کا خیال بھی آرہا تھا۔ ان سے وابستہ توقعات ہرگز پوری نہیں ہوئی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ڈر سہم کر دبک گئے ہیں۔ وقتی طور پر ہی سہی مگر انہوں نے حجاب کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کرلی ہیں۔ انکل فیاض تو چلو بوڑھے اور کمزور سہی لیکن کیا فیصل بھی بالکل لاچار ہوگیا تھا۔ اس بے چاری کا تو منہ سوکھتا تھا فیصل اور ابو کا نام لیتے ہوئے۔ خاص طور پر اپنے ابو پر تو بڑا مان تھا اسے۔ ان بدترین حالات میں بھی اس کی آنکھیں گواہی دیتی تھیں کہ اسے اپنے ابو اور بھائی کے قدموں کی چاپ کا انتظار ہے لیکن وہ چاپ کہیں نہیں تھی۔

اس رات اس نے درد میں ڈوب کر ایک اور یادگار نظم لکھی، اس نظم کا ماخذ جولائی 1798ء کو پیش آنے والا ایک یادگار واقعہ تھا۔ یہ واقعہ پہلے بھی ''کاسابیانکا'' کے عنوان سے منظوم ہو چکا تھا۔ ہادی کی نظم کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔ ''اور تم جانتے ہو کاسابیانکا کون تھا...... کاسابیانکا اطاعت اور فرمانبرداری کی لازوال مثال تھا۔ وہ فرنچ بحری جہاز کے آفیسر کا لختِ جگر تھا اور جب کھلے ویران پانیوں میں انگریزوں نے حملہ کیا۔ جب جہاز کو آگ لگی...... اور ہر طرف تہلکہ مچا۔ لشکریوں کی آہ و بکا سے عرشے لرزنے لگے تو باپ نے کاسابیانکا کو ایک جگہ کھڑا کیا اور کہا...... کاسا! یہاں کھڑے رہنا، جب تک میں نہ کہوں۔''

اور وہ کہہ کر چلا گیا۔ اور وہ بارود کی بارش میں موت کا

شکار ہوا۔ اور بیٹا باپ کے حکم پر اسی جگہ کھڑا رہا۔ اس کے گرد موت نے اپنے گھیرے تنگ کیے لیکن وہ ہلا نہیں۔ وہ کیسے ہلتا۔ ابھی اس کے باپ کا حکم نہیں تھا اور وہ اسی جگہ کھڑا کھڑا مر گیا...... اور وہ اطاعت کی لازوال مثال تھا۔

میں نے کاسابیانکا کو نہیں دیکھا لیکن میں نے روم کی روشنیوں میں چمکتی دمکتی ہوئی ایک لڑکی کو دیکھا ہے وہ بھی اپنے باپ کے حکم پر ایک جلتی ہوئی چار دیواری میں کھڑی رہی۔ اس کے نازک پاؤں جل گئے۔ اس کا کومل بدن جھلس گیا۔ وہ درد سے کراہتی رہی اور کراہتی رہی...... ہاں میں نے کاسابیانکا کو نہیں دیکھا لیکن روم کی اس لڑکی کو دیکھا ہے۔"

نظم لکھنے کے بعد اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس نے پارکر کا قلم اپنے ہونٹوں سے لگایا اور سوچنے لگا۔ ہمارے اردگرد حجاب جیسی نجانے کتنی لڑکیاں ہوں گی...... جن کے پاؤں جھلس رہے ہوں گے، جن کی سانسیں رک رہی ہوں گی مگر وہ اپنے والدین کو دکھوں اور مصیبتوں سے بچانے کے لیے اپنے سسرالی گھروں میں سب کچھ سہہ رہی ہوں گی۔ اپنی آن بان، انا اور پندار کی قربانی دے رہی ہوں گی۔

یہ تیسرے روز کی بات ہے وہ فون پر عطا انکل سے رابطے کی کوشش کر رہا تھا مگر رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ اسی دوران میں گلزاری کی کال آ گئی۔ بات شروع کرتے ہی اس نے فلیٹ کے کرایے اور اپنی بائیک کی خرابی کا رونا، رونا شروع کر دیا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا۔ اس کے پاس کوئی اہم خبر تھی اور وہ خبر ڈیلیور کرنے سے پہلے "پے منٹ" کی راہ ہموار کر رہا تھا۔ ہادی نے اسے اس حوالے سے تسلی دی تو وہ اصل موضوع کی طرف آ گیا۔ سب سے پہلے تو اس نے یہ بتایا کہ جلال اور ارم میں لڑائی کی اطلاع ہے اور ارم کو پہلی بار جلال کی ڈانٹ پھٹکار سننا پڑی ہے۔ ظاہر ہے اس کی وجہ ارم کی وہی "بے وقوفی" تھی جو اس نے حجاب کو اس کے زنداں سے نکال کر کی تھی۔

گلزاری کی دوسری خبر زیادہ اہم تھی، اس نے بتایا۔ "آج کل حجاب کا بھائی ایک گرل فرینڈ کے ساتھ نظر آ رہا ہے۔ میں نے ان کو دو تین بار گاڑی میں اکٹھے دیکھا ہے، لڑکی انڈین یا پاکستانی ہے۔ پرسوں دونوں نے مین اسکوائر کے قریب ایک آئس کریم پارلر کے باہر کار پارک کر رکھی تھی اور آئس کریم کھا رہے تھے، کافی شوخی میں تھے دونوں اور لڑکی اسے چٹکیاں وغیرہ بھی کاٹ رہی تھی۔ لیکن بات صرف چٹکیوں کی ہی نہیں ہے، وہ دونوں عنقریب ایک دوسرے کو ایک بہت بڑی چٹکی بھی کاٹنے والے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"نکاح کر رہے ہیں دونوں۔ بالکل کنفرم اطلاع ہے جی۔ اپنے خاص ذریعے سے ملی ہے مجھ کو۔ جمعے کے روز وحدت اسلامک سینٹر میں سہ پہر تین بجے ان کا نکاح ہو رہا ہے۔ بالکل سادگی والا کام ہے۔ بس آٹھ دس قریبی لوگ شرکت کریں گے۔"

گلزاری نے واقعی حیران کن خبریں سنائی تھیں۔ نکاح والی خبر وہ پورے وثوق اور ساری جزئیات کے ساتھ دے رہا تھا۔

یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ ایک طرف ماں بیمار پڑی تھی، دوسری طرف بہن ناکردہ گناہوں کے عذاب بھگت رہی تھی اور بھائی صاحب بیاہ رچا رہے تھے۔ پتا نہیں کہ عطا انکل کو بھی خبر تھی یا نہیں۔ فیصل کے حوالے سے ہادی کے دل میں عجیب سا غم و غصہ جمع ہونے لگا...... اس نے کچھ دیر تک گلزاری سے اس موضوع پر بات کی پھر پوچھا۔ "کیا فیصل سے کسی طرح ملاقات ہو سکتی ہے؟"

گلزاری بولا۔ "ہو کیا سکتی ہے...... ابھی ہو جائے گی اگر آپ چاہیں تو۔ اس وقت ساڑھے گیارہ بجے ہیں۔ ساڑھے بارہ بجے کے لگ بھگ جناب فیصل صاحب لنچ فرمانے کے لیے نکلتے ہیں اپنے آفس سے۔ آفس کے بالکل پاس ہی ترک کیفے ٹیریا ہے حلال فوڈ والا۔ آپ ابھی آ جائیں تو ابھی کے ابھی شرف ملاقات حاصل ہو جائے گا۔"

"واقعی؟"

"ہنڈرڈ پرسینٹ جی۔"

ہادی نے چند لمحے کے لیے سوچا۔ انکل عطا نے اسے ایسی جگہوں اور لوگوں سے دور رہنے کا مشورہ دیا تھا جن کی وجہ سے جلال یا اس کے کسی کارندے سے مڈبھیڑ ہو سکتی تھی۔ مگر وہ کمرے میں بند ہو کر تو نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اس کے سینے میں آگ سی سلگ رہی تھی۔ وہ انکل فیاض سے تو نہیں مل سکتا تھا لیکن فیصل سے تو مل سکتا تھا اور اسے جھنجوڑ سکتا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

ٹھیک ایک گھنٹے بعد وہ ترک کیفے ٹیریا میں ایک آرام دہ کرسی پر فیصل کے روبرو بیٹھا تھا۔ فیصل تھری پیس سوٹ میں تھا۔ سنہری فریم والی عینک میں بڑا تیس سالہ لڑکا لگ رہا تھا۔ وہ یوں ہادی کو اپنے سامنے دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ اس کے سرخ و سپید چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ پھر وہ

سنبھل کر بولا۔ ''آپ یہاں کس لیے آئے ہیں...... آپ کو پتا ہے، ہم سب آپ سے دور رہنا چاہتے ہیں۔''

''کیوں دور رہنا چاہتے ہیں؟'' ہادی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑیں۔

''اس سوال کا جواب بڑا تلخ ہے، آپ چپ ہی رہیں تو بہتر ہے۔''

''میں چپ رہنے کے لیے نہیں بات کرنے کے لیے آیا ہوں۔''

''میں بات کروں گا تو پھر بات بہت بڑھ جائے گی۔ آپ کو شرم آنی چاہیے اس پر...... جو کہا جا رہا ہے آپ کے بارے میں۔''

''یعنی تمہیں دنیا کی باتوں پر یقین ہے۔ اپنی بہن پر یقین نہیں ہے۔''

''آپ نے بدنام کیا اسے۔ اس کی گھریلو زندگی خراب کی...... اس کی منت سماجت پر بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ کیا نہیں کیا آپ نے۔ آپ نے چوری چھپے اس کی تصویر بنائی اور اس ایک تصویر کی وجہ سے ہم سب کے سر شرم سے جھکے۔''

''تم لوگوں کو بس ایک تصویر نظر آئی۔ ایک جیتی جاگتی لڑکی نظر نہیں آئی۔ اس کی پوری زندگی، اس کا کردار، اس کی سچائی...... اور کچھ نظر نہیں آیا؟ یا پھر...... نظر آنے کے باوجود تم لوگوں نے آنکھیں بند کرلی ہیں۔ راؤ نیکی سے ڈر کر بیٹھ گئے ہو۔ جلال سے سہم کر چپ ہو گئے ہو۔ میں تمہیں اتنا گیا گزرا نہیں سمجھتا تھا فیصل اور نہ اتنا بے حس۔ وہاں تمہاری بہن سسک سسک کر ختم ہو رہی ہے اور یہاں تم سب کچھ بھول کر عیاشیاں کر رہے ہو؟''

''آپ، اپنی زبان بند رکھیں تو اچھا ہے۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''تم کچھ نہیں کر سکتے۔ اگر کر سکتے تو بہن کے لیے کچھ کرتے۔ وہاں سسرال میں اب اس کے لیے کچھ نہیں بچا۔ وہاں اگر وہ جلال کے پاؤں تلے روندی جا رہی ہے تو صرف اس لیے کہ تم نے قرض اٹھا رکھا ہے۔ وہ تمہیں ہتھکڑیوں اور عدالتوں سے بچانا چاہتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی گناہ نہیں اس کا۔''

فیصل پھنکارا۔ ''تم اس کی صفائیاں پیش کرنے والے کون ہوتے ہو...... تمہیں کس نے اجازت دی اس کے بارے میں بولنے کی...... وہ میری بہن ہے، میں اس کا نام سننا نہیں چاہتا تمہاری زبان سے۔'' وہ آپ سے تم پر آ گیا۔

اس کی آنکھیں سرخ ہوتی جا رہی تھیں۔

ہادی بولا۔ ''اتنا دم خم کہیں اور دکھایا ہوتا تو آج اسے کھو کر نہ بیٹھے ہوتے تم لوگ۔ کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ تم نے جلال کے ڈر سے اسے گھر میں گھسنے نہیں دیا۔ دھکے دے کر نکال دیا......''

''تم اپنی زبان بند کرو۔'' فیصل غصے سے لرزتے ہوئے بولا۔

چند لمحے کے لیے یوں لگا کہ وہ ہادی پر جھپٹ پڑے گا مگر پھر اچانک ایک شخص آگے آیا۔ ''کیا کرتے ہو؟'' وہ دونوں کے درمیان رکاوٹ بنتے ہوئے بولا۔

وہ براؤن سوئٹر والا ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ ہادی نے غور سے دیکھا اور حیران ہوا وہ عطا انکل تھے۔ وہ نجانے یہاں کیسے آن پہنچے تھے۔ انہوں نے فیصل کو دھکیل کر پیچھے ہٹایا۔ پھر ہادی کو بھی چند قدم دور کر دیا۔ ''دونوں پڑھے لکھے ہو، یہ گنواروں جیسی حرکتیں کیوں کر رہے ہو۔'' وہ بلند آواز سے بولے۔

فیصل، ہادی کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔ ''اس شخص کو میری نظروں سے دور کر دیں۔''

ہادی نے کہا۔ ''ہاں جی، دور کر دیں۔ اس کو میری وجہ سے اوقات یاد آ رہی ہے۔''

انکل عطا نے دونوں کو ڈانٹا، سمجھایا۔ پھر عجیب جوشیلے لہجے میں بولے۔ ''تم دونوں اس طرح کیوں جھگڑتے ہو...... تم دونوں دراصل ایک ہی کام میں لگے ہوئے ہو۔ ایک ہی مسئلے کو حل کر رہے ہو...... ایک دوسرے کو جانو گے تو تعریف کرو گے ایک دوسرے کی۔ سراہو گے ایک دوسرے کو۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا ڈاکٹر انکل؟'' فیصل نے کہا۔

''تم ابھی چپ رہو فیصل، جا کر ایک گلاس ٹھنڈا پانی پیو اور لنچ مکمل کروانا۔ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔''

اس کے بعد انہوں نے ہادی کو ساتھ لیا اور ریستوران سے باہر نکل آئے۔ باہر ان کی ٹویوٹا کار کھڑی تھی۔ انہوں نے ہادی کو اپنے ساتھ اگلی نشست پر بٹھایا۔ گاڑی کے ڈیش بورڈ پر کچھ کاغذات رکھے تھے۔ غالباً کوئی رجسٹری وغیرہ تھی۔

وہ گاڑی چلا کر ایک کشادہ سڑک پر لے آئے اور پھر ایک پارک کے سامنے روکتے ہوئے بولے۔ ''میں اتفاقاً ادھر نکل آیا۔ ورنہ تم دونوں پتا نہیں کیا کر بیٹھتے...... یہ لڑنے

کا موقع نہیں بھائی...... خوش ہونے کا اور ایک دوسرے کی ستائش کرنے کا موقع ہے۔'' ان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

''کیا مطلب انکل؟''

''سمجھو ہمارا مسئلہ تقریباً حل ہو گیا ہے۔ انشا اللہ پرسوں تک ہم اس قابل ہوں گے کہ جلال کی رقم یکمشت اس کے منہ پر مار سکیں۔ کتنی کمی آ رہی تھی ہمارے ٹوٹل میں؟''

''یہی کوئی ایک لاکھ ساٹھ ہزار یورو۔''

''تقریباً ہو گئے ہیں۔'' انہوں نے کہا۔

''لل...... لیکن کیسے؟''

عطا انکل نے نشست کی پشت سے ٹیک لگائی اور ذرا ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''جمعے کے روز فیصل کا نکاح ہے، اپنی تایازاد نمرہ سے، وہ لوگ چھ سات روز پہلے ہی پاکستان سے یہاں پہنچے ہیں۔''

ہادی حیرت زدہ تھا۔ ''آپ اس لڑکی کی بات کر رہے ہیں...... میرا مطلب ہے، جس کے بارے میں آپ نے بتایا تھا کہ عمر کی بڑی ہے اور شکل صورت بھی......''

''ہاں ہادی وہی۔'' عطا انکل کی آواز ذرا بھرا گئی۔ ''میں سمجھتا ہوں فیاض نے بڑی قربانی دی ہے اور فیصل نے بھی۔ حجاب کی خاطر اس نے نمرہ کو قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور شاید اس سے بھی بڑی قربانی فیاض کی ہے۔ فیاض نے زندگی میں کسی کے سامنے سر نہیں جھکایا تھا۔ روپے پیسے پر ہمیشہ آن بان کو ترجیح دی تھی۔ لیکن بیٹی کی خاطر اس نے بھی اپنا سر جھکایا ہے۔ صلح کے لیے اس کی بھاوج کی شرط تھی کہ فیاض اس سے باقاعدہ معافی مانگے۔ فیاض نے معافی بھی مانگی ہے اور رشتہ بھی قبول کیا ہے۔ شاید تم نہ سمجھ سکو لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب کچھ اس کے لیے کتنا مشکل تھا۔ اس نے اپنے آپ کو مارا ہے ہادی۔ اپنی بچی کی خاطر خود کو مٹایا ہے۔ وہ سب سمجھتا ہے کہ اس کی بچی اب جلال کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی لیکن رہنے پر مجبور ہے۔''

ہادی سناٹے میں تھا۔ فیصل کا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوم رہا تھا اور انکل فیاض کا بھی۔ اس نے عطا انکل کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''تو آپ کا مطلب ہے، انکل فیاض کی بھاوج مکان فروخت کرنے پر آمادہ ہو گئی ہے؟''

''نہ صرف آمادہ ہو گئی ہے بلکہ انہوں نے اسے خود ہی خرید لیا ہے۔ یعنی اب وہ آدھے کی نہیں پورے حصے کی مالک ہوں گی۔ یہ کاغذات وغیرہ اسی سلسلے میں تیار ہو رہے ہیں۔ پے منٹ میں تھوڑی سی کمی تھی وہ بھی آج آ گئی ہے۔ فیاض کو پاکستانی کرنسی کے حساب سے تقریباً سوا دو کروڑ روپے ملتے ہیں۔ اس میں تقریباً ساٹھ لاکھ تو وہ پہلے ہی گروی میں حاصل کر چکا ہے۔ اب لگ بھگ ایک کروڑ پینسٹھ لاکھ اس کے ہاتھ میں آ جائیں گے۔ اُمید ہے کہ پرسوں تک یہ ساری کارروائی مکمل ہو جائے گی۔''

انکل فیاض اور فیصل کے حوالے سے ہادی کے ذہن میں جو غبار سا آ گیا تھا وہ ایک حوصلہ بخش ہوا کے جھونکے سے اوجھل ہونے لگا۔ عطا انکل کی باتیں ہر غلط فہمی کا خاتمہ کر رہی تھیں۔ ہادی کے دل میں خوشگوار دھڑکنیں جاگنے لگیں۔ اس نے ایک بار پھر تصور کی نگاہ سے حجاب کی کومل کلائیاں دیکھیں اور ان کلائیوں سے ٹوٹ کر گرتی ہوئی زنجیروں کو دیکھا۔

☆☆☆

وہ حسبِ معمول فرش پر لیٹی تھی۔ اس کے نیچے غالیچہ تھا جو سمعت کے دروازے کے بالکل پاس بچھا تھا۔ وہ اپنا چہرہ دروازے کی نچلی درز کے بالکل پاس کر لیتی تھی۔ یہاں سے اسے نسبتاً تازہ ہوا کی آمد محسوس ہوتی تھی۔ کبھی کبھی وہ اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیاں اس درز میں سے باہر نکال دیتی۔ اسے لگتا کہ اس کی انگلیاں آزادی کا لمس محسوس کر رہی ہیں۔ پھولدار ٹائیلوں کی بناوٹ، ان کی ترتیب، ان کے پھولوں کی تعداد، الماری کے دروازوں کے نقش و نگار، ریفریجریٹر کا رنگ اور اس کے دروازے پر کمپنی کا زرد مونوگرام...... مونوگرام کے ترچھے حروف...... ہر چیز اسے چبھتی تھی، اور اس کے حافظے پر نقش ہو چکی تھی، وہ ان میں سے کچھ دیکھنا نہیں چاہتی تھی، اس لیے دو دو گھنٹے آنکھیں بند کیے پڑی رہتی تھی۔ پورے دن میں وہ بہ مشکل پانچ چھ لقمے لیتی ہوگی۔ باقی کھانا کلثوم دروازے کی درز میں سے اٹھا کر لے جاتی تھی۔ نقاہت دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ سب سے بڑا مسئلہ سانس کا تھا۔ اس کا سانس گھٹنے لگتا تھا۔ کبھی کم اور کبھی بہت زیادہ۔ ایسے میں جسم سے جان نکلتی محسوس ہوتی اور ٹھنڈے پسینے آنے لگتے، اب بھی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔ اسے لگا، وہ بے ہوشی کے کسی ایسے طویل دورے میں جانے والی ہے جس کے بعد شاید آنکھیں ہی نہ کھل سکیں۔ اس نے آنکھیں کھولنا چاہیں لیکن پھر وہی منحوس چھت نظر آئی جو کسی عفریت کی طرح اس پر جھکتی چلی جاتی تھی اور اپنے پنجے اس میں گاڑ کر اس کا خون چوسنے لگتی تھی۔ اس نے اپنے زخمی ہاتھ کو ہولے سے سینے پر رکھا اور آنکھیں پھر بند

کر لیں۔

”ابو! کہاں ہیں آپ...... کیوں مجھ تک نہیں پہنچے؟ آپ نے تو کبھی مجھے اس طرح تنہا نہ چھوڑا تھا۔ امی مجھے سزا کے طور پر روم منٹ کے لیے بند کر دیتی تھیں تو آپ ہفتوں ان سے خفا رہتے تھے۔ اب تو مجھے سزا کاٹتے کئی ہفتے گزر چکے ہیں۔ آپ کی بیٹی مر رہی ہے ابو! کیا آپ اس کی پیشانی نہیں چومیں گے۔ اتنی دیر کیوں لگا رہے ہیں ابو؟“

وہ سوچتی رہی اور آنکھوں کے گوشے نم ہوتے رہے۔ ابو کا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے آیا۔ بالکل جیتا جاگتا۔ جیسے وہ سامنے کھڑے ہوں، چہرے پر جھریاں، آنکھوں میں نقاہت، کمر خمیدہ اور ہونٹ خشک۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں اپنا حال اسے سنا رہے تھے۔

وہ تڑپ اٹھی...... نہیں ابو! میں تو صرف اپنا دکھ بیان کر رہی تھی۔ مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں۔ میں جانتی ہوں آپ نے میرے لیے اپنی سی کوشش ضرور کی ہوگی۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر حساب کتاب والی سیاہ ڈائری میں سر کھپایا ہوگا۔ خود کو گھسیٹتے ہوئے دوستوں کے دروازوں تک بھی گئے ہوں گے، ان گنت فون کالیں کی ہوں گی۔ وہ سب کیا ہوگا جو کر سکتے ہیں۔ مجھے کوئی شکوہ نہیں۔ اگر کوئی شکوہ ہے تو صرف ایک بات کا ہے ابو...... آپ نے مجھ سے بات کیوں نہ کی۔ مجھ سے منہ کیوں پھیرا ابو۔ ایسا تو نہیں کرنا تھا آپ نے۔ آپ کو پتا ہے آپ کی بیٹی یہ نہیں جھیل سکتی۔ اب اگر وہ مر گئی تو کیا کریں گے آپ؟ کس طرح مداوا کریں گے۔ اس کی میت کے سرہانے بیٹھ کر کتنی بھی باتیں کر لیں گے آپ، لیکن وہ کمی تو پوری نہ ہوگی۔ مجھے اتنا اپنا نہیں جتنا آپ کا غم ہے۔ اگر مجھے کچھ ہوا تو آپ کیسے جھیلیں گے سب......“ وہ سسکنے لگی۔ گرم آنسو زخمی رخساروں پر رینگنے لگے اور آنسوؤں میں نمک ہوتا ہے۔ وہ خراشوں پر تکلیف دیتا ہے، یعنی تکلیف سے آنسو نکل رہے تھے اور آنسوؤں سے تکلیف ہو رہی تھی۔

پھر وہ دل ہی دل میں خود کلامی کے انداز میں بولی۔ ”ہاں ابو! مجھے خود سے زیادہ آپ کی...... اور امی کی فکر ہے۔ آپ کو بہت زیادہ برداشت کرنا پڑے گا...... آپ کو بہت زیادہ دکھ ہوگا۔ میری یاد آئے گی۔ میری باتیں اور میری بدنصیبیاں آپ کو رلائیں گی۔ ہاں، اگر مجھے کچھ ہو گیا تو یہی سب کچھ ہوگا نا۔ بولیں ابو۔“

ابو خاموش رہے۔ اسی طرح خشک ہونٹوں کے ساتھ سر جھکائے کھڑے رہے۔ وہ بولی۔ ”اگر...... کچھ ہو گیا تو آپ ایسا کیجیے گا...... میری ساری نشانیاں ختم کر دیجیے گا۔ اپنے گھر سے میرا ہر نشان مٹا دیجیے گا۔ آپ کے گھر میں میری جو کتابیں پڑی ہیں، اور میرے کپڑے اور میرے بچپن کے کھلونے...... سب کسی کو دے دیجیے گا...... پھینک دیجیے گا اور میری وہ چھوٹی الماری جسے آپ نے اپنی اسٹڈی میں سجا کر رکھا ہوا ہے اسے بھی گھر سے نکال دیجیے گا۔ وہ بھی بہت ”ہانٹ“ کرے گی آپ کو...... بہت زیادہ ہانٹ کرے گی۔ اور پھر ابو...... آپ ایسا کیجیے گا...... آپ فیصل اور امی کو لے کر کچھ دنوں کے لیے روم سے کہیں دور چلے جائیے گا۔ کسی ایسی جگہ جہاں ہم اکٹھے کبھی نہ گئے ہوں۔ بہت دن وہاں رہیے گا۔ بہت زیادہ دن۔“

پھر فیصل کا خیال اس کے ذہن میں آیا۔ ”فیصل...... مجھے معاف کرنا۔ میں تمہارے لیے شرمندگی کا باعث بنی۔ میری وجہ سے تمہیں دکھ پہنچے۔ اپنی باجی کی پہلی اور آخری غلطی سمجھ کر یہ سب معاف کر دینا۔ اور اگر مجھے کچھ ہو گیا تو بھول جانا مجھے۔ سنبھال لینا خود کو۔ مجھے پتا ہے تم اندر سے بہت مضبوط ہو، خود کو سنبھال سکتے ہو۔ تم خود سنبھلو گے تو امی ابو کو سنبھالو گے نا اور بڑی باجی کو بھی...... اور...... بہت دنوں تک امی کو کچھ نہ بتانا...... اور جب بتانا تو بہت آہستہ آہستہ...... سنبھل سنبھل کر...... مجھے پتا ہے تم ایسا کر سکتے ہو......“

اس کے تصور نے منظر بدلا۔ ایک دم ایک ہیولا اس کے سامنے آ گیا۔ ایک سایہ سا۔ چوڑے شانے، لہراتے بال، لمبا قد۔ اس کی صورت نظر نہیں آ رہی تھی، لیکن وہ وہاں موجود تھا۔ اس نے کہا۔ ”تم مرنے کی بات کیوں کرتی ہو۔ جینے کی بات کیوں نہیں کرتی ہو، تمہیں زندہ رہنا ہے، تمہیں آزاد ہونا ہے ہم سب کے لیے۔ کیونکہ ہم سب کوشش کر رہے ہیں۔ ہمارے قدم تمہاری طرف اٹھ رہے ہیں۔ ہماری نگاہیں اس بیسمنٹ کے دروازے کو تلاش کر رہی ہیں۔ ہم تم تک پہنچنے والے ہیں۔“

”کون ہو تم؟“ حجاب نے پوچھا۔

”تمہیں پتا ہے، میں کون ہوں۔ تمہیں پتا ہے۔ ہم ہمیشہ ملتے رہے ہیں...... ہر زمانے میں، ہر خطے میں...... ہزار بار کا وعدہ توڑ کر۔ اس نے کہا اور اوجھل ہو گیا۔

وہ سکتہ زدہ لیٹی رہی۔ یہ آواز جانی پہچانی تھی۔ یہ آواز اس نے وینس کی جھلملاتی شب میں سنی تھی...... اور بحیرۂ روم کے ریتیلے ساحل پر اور کولیسیم نام کے اس قدیم جنگی اکھاڑے کی سیڑھیوں پر۔

لیکن یہ آواز یہاں کیوں سنائی دے رہی تھی اور یہ آخر میں اس نے کیا الفاظ کہے تھے؟ وہ کیا چاہتا تھا؟ کیوں مسلسل اس کے تعاقب میں تھا...... مصیبتیں جھیل رہا تھا، زخم کھا رہا تھا، توہین برداشت کر رہا تھا۔ پھر بھی منہ نہیں پھیر رہا تھا...... وہ اسے کیا دے سکتی تھی، وہ اس سے کیا لے سکتا تھا؟ پھر بھی...... پھر بھی...... کیسا دیوانہ تھا وہ۔ اسے اس پر غصہ آیا اور ترس بھی۔ بیک وقت وہ اسے بہت برا لگا اور اچھا بھی۔ اسے وہ طمانچہ یاد آیا جو اس نے اس کے منہ پر مارا تھا اور وہ پوری جان سے لرز گئی۔ اسے وہ دکھ آمیز حیرانی یاد آئی جو طمانچہ کھا کر اس کی نم آنکھوں میں ابھری تھی۔ اس نے کیوں کیا ایسا؟ اس نے تو زندگی میں کبھی کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ وہ لمبے سانس لینے لگی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اسے لگا کہ اس کے بائیں بازو سے ٹیسیں اٹھ رہی ہیں۔ یہ وہی بازو تھا جس کے ہاتھ پر چوٹ لگی ہوئی تھی۔ لیکن یہ ٹیسیں کیا اس چوٹ کی وجہ سے تھیں؟ اسے محسوس ہوا کہ اس کا دل ڈوبتا جا رہا ہے۔

☆☆☆

ہادی نے اپنے حصے کی ساری رقم عطا انکل کو فراہم کر دی تھی۔ دوسری طرف ایک قریبی اسلامک سینٹر میں بڑی خاموشی سے فیصل اور نمرہ کا نکاح ہو گیا تھا۔ اب وہ گھر جو فیاض صاحب نے بڑی چاہتوں سے بنوایا تھا، ان کی بھاوج یعنی نمرہ کی والدہ کا تھا۔ بہر حال ابھی انہیں اسی گھر میں رہائش پذیر رہنا تھا۔

انکل فیاض اور فیصل نے یقیناً حجاب کے لیے اپنی طاقت سے بڑھ کر قربانی دی تھی۔ بیٹیوں کے سکھ کے لیے باپ اور بھائی ہمیشہ سے ایسے ہی نیلام ہوتے رہے ہیں اور سکھ پھر بھی کبھی ملتا ہے کبھی نہیں۔ یہاں بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ حجاب کی زندگی کیا رخ اختیار کرے گی۔ ہادی کے اندازے کے مطابق اس کے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ وہ شدید ترین ڈپریشن کا شکار اور بری حالت میں تھی، کوشش کے باوجود اس کے بارے میں کسی طرح کی خیر خبر نہیں مل رہی تھی۔

کاغذی کارروائیوں میں دو دن مزید لگ گئے۔ آخر وہ دن آن پہنچا جب جلال کو اس کی رقم ادا ہونا تھی اور تنازع ختم ہونے کے بعد اسٹامپ پیپرز وغیرہ پر دستخط ہونا تھے۔

اگلے روز کرسمس تھا۔ ہادی ہوٹل کے کمرے میں تھا اور ایک ایک پل گن گن کر گزار رہا تھا۔ اسے عطا انکل کی کال کا انتظار تھا۔ یہ کال دوپہر ایک بجے کے لگ بھگ آنا تھی مگر تین بجے کے قریب آئی۔ عطا انکل نے بتایا کہ سارا معاملہ اچھے طریقے سے ہو گیا ہے۔ وکیل کی موجودگی میں کاغذات پر سائن وغیرہ ہو گئے ہیں۔ فیاض اور فیصل بھی موقع پر موجود تھے۔

ہادی نے پوچھا۔ ”حجاب کے بارے میں کیا بات ہوئی؟“

”جلال کا کہنا ہے کہ وہ بالکل خیریت سے ہے۔ بس ایک بار تھوڑی سی بے ہوشی ہوئی تھی اسے۔ اب دوا وغیرہ لے رہی ہے، وہ اسے چند روز کے لیے روم سے میلانو لے گیا ہے تاکہ اس کی طبیعت بہتر ہو سکے۔“

”جھوٹ بول رہا ہے، بکواس کر رہا ہے۔ وہ یہیں ہوں گی۔ وہیں ورس والے گھر میں۔ آپ اس سے کہیں کہ وہ ان سے فون پر بات کرائے۔“

”ہاں، اس نے کہا ہے کہ آج رات وہ فون پر بات کر کے اپنی خیر خیریت کا بتا دے گی۔“

”رات کو کیوں؟ ابھی کیوں نہیں۔ یہاں سے میلانو کی فلائٹ اتنی لمبی تو نہیں۔“

”چلو، رات ہونے میں کون سی دیر ہے ہادی...... ایک دفعہ فیاض اور فیصل سے اس کی بات ہو جائے تو صورت حال بڑی حد تک سامنے آ جائے گی۔ ویسے جلال کا رویہ بھی اب بہت بدلا ہوا نظر آ رہا ہے۔ اسے پتا چل گیا ہے کہ وہ اب زبردستی حجاب کو روک نہیں سکتا ہے۔“

”مجھے نہیں لگتا جی کہ حجاب روم میں نہیں ہوں گی۔ شاید وہ سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہ رہا ہے۔“

”نہیں...... میرے خیال میں ایسی بات نہیں۔ بہر حال جیسے ہی حجاب کی بات فیاض وغیرہ سے ہو جاتی ہے، میں تمہیں فون کرتا ہوں۔“

عطا انکل سے گفتگو کرنے کے بعد ہادی بے چینی سے کوریڈور میں ٹہلنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ حجاب جتنی جلد سے جلد آزاد فضا میں سانس لے اتنا ہی اس کے لیے بہتر ہے۔ انکل عطا اور انکل فیاض وغیرہ نے اسے دیکھا نہیں تھا۔ ہادی نے اسے دیکھا تھا اور اس کی ابتر حالت کو بڑی شدت سے محسوس کیا تھا۔ وہ جیسے کسی آہنی تابوت میں بند تھی اور تازہ ہوا کے لیے تڑپ رہی تھی۔

ہادی نے ارم کو اس کے خاص نمبر پر ایس ایم ایس کیا کہ وہ اسے کال کرے۔ دس پندرہ منٹ بعد اس کی کال آ گئی۔ ارم کی ساری اکڑفوں ختم ہو چکی تھی اور ہادی سے بات کرتے ہوئے اس کی آواز پر خوف کا غلبہ رہتا تھا۔

''ہیلو، کیا بات ہے اب؟'' وہ چھوٹتے ہی بولی۔
''ایک کام کرنا ہوگا تمہیں۔''
وہ اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ ''مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ تم اب بھی یہاں ہو، تم ضرور کوئی بڑا نقصان اٹھاؤ گے۔ جو کچھ وہاں اسپتال کے سامنے ہوا ہے، اس کے بعد تمہیں اب پاکستان میں ہونا چاہیے تھا۔ تم...... اب بھی...... ٹھیک سے جانتے نہیں ہو جلال کو۔''
''ہمدردی کا شکریہ...... لیکن میں اپنے وقت پر ہی جاؤں گا۔ فی الحال تم مجھے حجاب کے بارے میں بتاؤ، وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔''
''مجھے کچھ پتا نہیں۔ جلال ناراض ہیں مجھ سے۔ بات نہیں کرتے۔ تم نے اچھا نہیں کیا میرے ساتھ۔''
''تمہارے لیے اسے نارمل کرنا کچھ مشکل نہیں۔ نو بیاہتا بیوی ہو۔ پسند کی شادی ہے۔ دو چار ادائیں دکھاؤ گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے ایک گھنٹے کے اندر معلومات چاہئیں۔ پتا کرو کہ کہاں ہے حجاب۔ روم میں ہے یا روم سے باہر۔''
وہ لمبے توقف کے بعد بولی۔ ''کوشش کرتی ہوں لیکن اس کے بعد مجھ سے کچھ اور نہ کہنا۔ تم نے جو کہا تھا وہ میں نے کر دیا اب مجھے اور کانٹوں میں نہ گھسیٹو۔ میں بہت اپ سیٹ ہوں...... میں سچ کہہ رہی ہوں بہت اپ سیٹ ہوں۔'' اس کی آواز بلند ہو گئی (حالانکہ وہ سرگوشیوں میں بولتی تھی۔ اس کی آواز میں لڑکھڑاہٹ بھی تھی۔ جیسے کوئی نشہ آور دوا لی ہو)
''تم تو صرف اپ سیٹ ہو لیکن کچھ بے گناہ ایسے بھی ہیں جن کو تم نے تقریباً برباد کر چھوڑا ہے۔ تھوڑا بہت تو ان کے درد کا احساس ہو رہا ہوگا تمہیں...... اگر تن فن دکھاؤ گی تو یہ احساس اور بڑھانا پڑے گا۔''
''دیکھو تم حد سے گزر رہے ہو۔ میں زیادہ برداشت نہیں کر پاؤں گی۔ میں سچ کہتی ہوں زیادہ برداشت نہیں کر پاؤں گی۔'' اس کی آواز میں طیش کی بلند لہر تھی اور اس نے اس کی آواز کو بھی بلند کر دیا تھا۔
''مجھے ایک دو گھنٹے میں معلوم کر کے بتاؤ کہ وہ کہاں ہے...... بس۔'' اس کے ساتھ ہی بادی نے فون بند کر دیا۔

☆☆☆

موسم سرد ہوتا جا رہا تھا۔ حجاب کی نبضیں کمزور پڑتی جا رہی تھیں۔ کسی وقت وہ غالیچے سے اٹھتی تو اس کا سر بری طرح چکرانے لگتا۔ کسی وقت اسے دروازے کے قریب پڑے پڑے اچانک لگتا کہ کوئی سیڑھیاں اتر رہا ہے۔ اس کی مدد کے لیے آ رہا ہے۔ اس کے ابو، بھائی فیصل، ماموں یا ڈاکٹر انکل۔ وہ سراپا انتظار بن جاتی۔ مگر پھر قدموں کی چاپ سیڑھیوں کے قریب آ کر دور چلی جاتی، یا پھر اسے پتا چلتا کہ یہ تو کلثوم تھی جو کسی کام سے بیسمنٹ کی طرف آئی تھی۔ بیسمینٹ میں حرارت کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ حجاب کے جسم پر وہی بوسیدہ سے کپڑے تھے جو چند روز پہلے جلال نے اسے مہیا کیے تھے۔ پہلے تو کھانا بھی کھانے کے قابل نہیں ہوتا تھا لیکن اب دو تین دن سے نسبتاً بہتر کھانا آ رہا تھا...... کمزوری بہت زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا دوپہر کے بچے ہوئے چاولوں میں سے ایک دو نوالے لینے کی کوشش کرے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ سیڑھیوں کی طرف پھر قدموں کی چاپ ابھری۔ وہ اپنے سلامت ہاتھ پر زور دے کر بیٹھ گئی۔ سننے کی کوشش کرنے لگی۔ چاپ سیڑھیوں پر آئی اور پھر دروازے کے بالکل پاس پہنچ گئی...... اس کی اُمید کے چراغ ایک بار ٹمٹما کر بجھ گئے۔ یہ جلال تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں سن ہونے لگے۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بستر پر لیٹ گئی۔ جلال نے اسے دروازے کے قریب غالیچے پر لیٹنے سے منع کر رکھا تھا۔ ایک دم اٹھ کر بستر پر آنے سے اسے شدید چکر آیا اور سانس پھولنے لگی۔
وہ اندر آ گیا...... اور دروازہ بولٹ کرنے کے بعد اسے دیکھنے لگا...... دیکھتا رہا۔ آج اس کا موڈ عجیب تھا۔ شاید ڈائٹ ڈپٹ والا...... شاید جارحیت والا۔ کچھ دیر کے لیے تو حجاب کو لگا کہ وہ ایک بار پھر اس پر پل پڑے گا۔ مار مار کر نیل ڈال دے گا۔ لیکن پھر اس نے ایک گہری سانس لی اور اس کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ بھی بہ مشکل اٹھ کر بیٹھ گئی۔ جلال کے پاس لیپ ٹاپ بھی تھا جو اس نے میز پر رکھ دیا۔ اس نے اس کے رخسار کی چوٹ دیکھی اور تسلی بخش انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔ پھر بولا۔ ''ابھی تھوڑی دیر میں تمہارے ابو تم سے نیٹ پر بات کریں گے۔''
''مجھ سے بات کریں گے؟'' اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔
''ہاں، لیکن ان کے ساتھ کوئی رونے دھونے والی بات نہ کرنا۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا تم۔'' اس کا لہجہ بے حد تحکمانہ تھا۔
''جج...... جی...... جیسا آپ کہیں گے۔''
''ان سے خوش ہو کر بولنا۔ ان سے یہی کہنا ہے کہ تم میرے ساتھ کچھ دنوں کے لیے میلانو آئی ہوئی ہو۔ آٹھ دس دن کے لیے۔ ہوسکتا ہے کہ زیادہ دن بھی لگ جائیں۔ اپنی طرف سے انہیں پوری تسلی دینی ہے۔''
''جیسے آپ کہتے ہیں۔''
جلال نے اپنی سیاہ شیروانی کے کالر کو حسب عادت درست کرتے ہوئے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''تم اپنا رویہ درست کرو تو میں بھی بدل سکتا ہوں۔ لیکن اگر ٹکراؤ کی کوشش کرو گی تو پھر یہ رویہ اچھا نہیں ہوگا۔ دونوں طرف کا نقصان ہوگا۔''
''میں نے آپ سے کہا ہے جلال۔ میں آپ سے کوئی مطالبہ نہیں کروں گی۔ آپ مجھے جس طرح رکھیں گے، میں رہوں گی...... بس...... مجھے یہاں سے نکال لیجیے۔ یہاں میرے لیے ایک ایک پل گزارنا مشکل ہے۔''
جلال کی تیوری چڑھ گئی۔ لگا کہ وہ کچھ بہت سخت بولے گا لیکن پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ ''دیکھو حب! اب کیا کرنا ہے، مجھے اچھی طرح پتا ہے۔ مجھے زچ کرو گی تو پھر تمہیں بھی تکلیف ہوگی۔ ابھی چپ چاپ رہو یہاں۔ جب وقت آئے گا، تمہیں کہنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''
وہ سہم کر چپ ہو گئی۔
کچھ دیر بعد جلال نے لیپ ٹاپ آن کیا اور اسکائپ کھول کر بیٹھ گیا۔ حجاب کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ ''میں کال ملا رہا ہوں۔ میں نے جو کہا ہے وہ سب ذہن میں رکھنا۔ تم میلانو میں ہو اور میرے ایک دوست کی فیملی کے ساتھ ان کے اپارٹمنٹ میں ٹھہری ہوئی ہو اور یہ بھی یاد رہے کہ یہ صرف آڈیو کال ہوگی۔''
حجاب نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی دھڑکنیں تیز ہو چکی تھیں۔ اسے لگا کہ وہ کئی برسوں بعد اپنے کسی پیارے کی آواز سننے والی ہے۔ وہ سوچنے لگی، کیا ابو سے بات کرتے ہوئے وہ اپنے آنسوؤں کو روک سکے گی اور اگر نہ روک سکی تو جلال کا رویہ کیا ہوگا؟
کچھ ہی دیر بعد لیپ ٹاپ کے اسپیکر پر اس کے ابو کی آواز ابھری۔ ''ہیلو۔''
''ہیلو انکل! میں جلال بول رہا ہوں۔ کیسے ہیں آپ؟''
''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ حجاب کہاں ہے؟'' ابو کی لرزتی آواز حجاب کے کانوں میں پڑی اور اس کے پورے جسم میں جھرجھری دوڑ گئی۔
جلال نے حجاب کو اشارہ کیا۔ حجاب نے خود کو بہ مشکل کمپوز کیا اور آگے جھک کر کہا۔ ''ہیلو...... ابو جی...... میں حجاب بول رہی ہوں۔''
چند سیکنڈ دونوں طرف ایک نہایت جذباتی خاموشی طاری رہی، پھر حجاب کو ابو کی آواز آئی۔ ''کیسی ہو بیٹی؟''
''میں بالکل ٹھیک ہوں...... اور آپ؟''
''میں بھی ٹھیک ہوں۔ مم...... مجھے بہت دکھ ہے...... اس دن میں تم سے بات نہ کر سکا۔ میری طبیعت بالکل اچھی نہیں تھی۔ مجھے معاف کرنا حب۔''
حجاب کو لگا وہ بلند آواز سے رونا شروع کر دے گی۔ تاہم اس نے خود کو سنبھالا۔ موضوع بدل کر بولی۔ ''امی کیسی ہیں ابو جی؟''
''وہ اب بہت بہتر ہے، اسپتال سے گھر آ چکی ہے۔ طبیعت کچھ اور سنبھلے گی تو پھر تم سے بات بھی کراؤں گا۔ جلال بتا رہا تھا کہ تم میلانو میں ہو۔ واپسی کب تک ہے۔''
''ابھی ٹھیک سے پتا تو نہیں...... مگر آٹھ دس دن تو رہیں گے۔''
''کہاں ٹھہرے ہو؟''
''ان کے دوست کی فیملی ہے۔ کافی بڑا اپارٹمنٹ ہے۔'' حجاب نے کہا۔
''چلو، تم واپس آتی ہو تو پھر تفصیل سے بات کریں گے۔ پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں حب۔ غلطیاں انسانوں سے ہوتی ہیں، اصل بات یہی ہے کہ انسان غلطیوں سے سبق سیکھے۔ کچھ وقتی پریشانیاں ہیں۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ تمہاری زندگی ہے۔ تم نے گزارنی ہے۔ تم جس طرح چاہو گی، ویسا ہی ہوگا ان شاء اللہ۔''
''آپ بھی پریشان نہ ہوں ابو! امی اور فیصل بھائی کو میری طرف سے تسلی دیں، میں ٹھیک ہوں۔''
''مگر آواز سے بہت کمزور لگ رہی ہو۔ لگتا ہے کوئی اور بول رہا ہے۔''
''بس...... بس ایک دو دن بخار ہوا تھا۔ اب اچھی ہوں، مجھے زیادہ فکر امی کی ہے۔ ان کا بہت خیال رکھیں۔''
''وہ بھی اب ان شاء اللہ بہتر ہوتی جائے گی۔ جو تھوڑی بہت مالی پریشانیاں آ گئی تھیں وہ بھی اب دور ہو رہی ہیں۔ تمہارے ڈاکٹر انکل توقع سے زیادہ تعاون کر رہے ہیں اس سلسلے میں۔ وہ بھی تم سے ملنے کے لیے بے قرار ہیں۔ تم روم واپس آتی ہو تو پھر بات ہوتی ہے ان سے بھی۔''
جلال نے حجاب کو تحکمانہ اشارہ کیا کہ وہ اب بات ختم کر دے...... حجاب نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور گفتگو کو جلدی سے اختتام کی طرف لے آئی۔ رسمی کلمات کی ادائیگی

کے بعد باپ بیٹی نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ دیا۔

بات ختم کر کے حجاب بے دم سی ہوگئی۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی اداکار کوئی مشکل شاٹ دینے کے بعد نڈھال سا ہو کر گر جائے...... اسے کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ جلال جلدی سے پانی لے آیا۔ ''لو پیو۔''

اس نے چند گھونٹ لیے اور تکیے سے سر ٹکا کر لمبی سانسیں لینے لگی۔

کچھ دیر بعد وہ اس کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔ ''دیکھو حب! میں نے دوسری شادی کر کے کوئی غیر شرعی یا غیر اخلاقی کام نہیں کیا ہے۔ اگر اس وجہ سے تم مجھ سے علیحدہ ہونا چاہتی ہو تو میں یہ آسانی سے نہیں ہونے دوں گا۔ جو کچھ مجھ سے بن پڑا کروں گا۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا تم؟''

حجاب اثبات میں سر ہلانے کے سوا اور کچھ نہ کر سکی۔ حالانکہ وہ پوچھ سکتی تھی کہ دوسری شادی کر کے تو تم نے کوئی ناجائز کام نہیں کیا لیکن زبردستی مجھے اپنے ساتھ رہنے پر مجبور کر کے تو ناجائز کام کرو گے۔

وہ شیروانی کا کالر درست کر کے اور گردن کو ذرا تان کر بولا۔ ''تمہاری والدہ فیملی نے مجھے ہمیشہ انڈر اسٹیمیٹ کیا ہے۔ اب اگر وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ادھر اُدھر سے رقمیں پکڑ کر میرا قرضہ اتار دیں گے اور پھر تمہارے سلسلے میں من مانی کرنے کے لیے آزاد ہوں گے تو ایسا نہیں ہوگا۔ یہ معاملہ عدالتوں میں پہنچے گا اور تمہیں پتا ہی ہے عدالتوں میں عورت کی کتنی مٹی پلید ہوتی ہے۔ تمہارے لیے طلاق حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوگا حب! اس لیے میرا مخلصانہ مشورہ ہے تمہیں، حالات کو سمجھنے کی کوشش کرو، جو کچھ ہوا میں سب بھولنے کو تیار ہوں، تم بھی بھول جاؤ۔ میں تمہیں ارم سے بہت دور رکھوں گا۔ تم ایک بالکل مختلف اور اچھی زندگی گزارو گی۔ اس سارے معاملے پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرو۔''

''میں کیسے غور کروں جلال۔'' وہ سسکی۔ ''اس بند قبر میں، میں سوچنے کے قابل ہی نہیں ہوں۔ پلیز، پہلے مجھے یہاں سے نکالیں۔''

''میں نہیں نکال سکتا۔'' وہ ایک دم گرج کر بولا۔ ''ابھی نہیں نکال سکتا۔ وہ حرامی...... خنزیر کا بچہ...... جب تک یہاں ہے کوئی رسک نہیں لوں گا اور میں نے تمہیں کہا تھا کہ پھر اس بارے میں بکواس نہ کرنا۔ میں نے کہا تھا یا نہیں؟'' اس نے مشتعل ہو کر اس کے سر کے بال پکڑ لیے اور دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے منہ کو اتنے زور سے دبایا کہ اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ وہ بری طرح کراہ رہی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کے رخسار سے خون رسنا شروع ہو گیا ہے تو اس نے اسے چھوڑ دیا اور غصے میں کھولتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کی ذہنی حالت عجیب تھی۔ چند سیکنڈ بعد وہ ایک بار پھر دروازہ لاک ہونے کی منحوس آواز سن رہی تھی۔ یہ بھی آواز تھی جو سیدھی اس کے دل پر اثر کرتی تھی۔ اس کی دھڑکنیں بتدریج بڑھتی چلی گئیں۔ بازو میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ منہ خشک ہو رہا تھا، بالکل خشک۔ یہاں اسے کس نے پانی پلانا تھا۔ اس نے خود ہی پانی کا گلاس لینے کے لیے سائڈ ٹیبل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ لیکن گلاس اس سائڈ ٹیبل پر نہیں تھا۔ وہ شاید دوسری سائڈ ٹیبل پر تھا۔ لیکن بیڈ پر کھسک کر دوسری ٹیبل کی طرف جانا اسے بہت دشوار محسوس ہوا۔ جیسے کوئی طویل سفر ہو۔ وہ وہیں پڑی رہی۔ اس پر ایک بار پھر نقاہت آمیز غنودگی طاری ہونے لگی۔ جیسے جیسے کی تاریکی اس کے دل و دماغ میں گہرائی تک اتر رہی تھی۔ بیداری اور غنودگی کی درمیانی کیفیت میں اس کا تصور اسے کہیں سے کہیں لے گیا۔ وہ ایک خشک ویران گہرے کنویں میں تھی۔ اس میں سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ پھر کسی نے ہاتھ بڑھا کر اسے اوپر کھینچ لیا۔ اس نے دیکھا، تاریک کنویں سے باہر نیلا آسمان ہے، خوشگوار ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے، وہ اپنے گھر کے لان میں ہے۔ بچپن لوٹ آیا ہے۔ وہ دس بارہ سالہ لڑکی کے روپ میں ہے۔ اس نے پتلون شرٹ پہن رکھی ہے۔ اس کے ریشمی بال ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ وہ فیصل سے لڑ جھگڑ رہی ہے۔ امی آواز دیتی ہیں، ''چائے تیار ہے، آجاؤ۔'' وہ سب لان کی میز کے گرد بید کی کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ امی، ابو، باجی، فیصل...... سب کے چہرے بارونق ہیں۔ مسکراہٹیں ہونٹوں سے چھلکی پڑ رہی ہیں۔ ''میں چائے نہیں پیوں گی...... میں جوس لوں گی۔'' وہ ٹھنک کر کہتی ہے...... ابو لاڈ سے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہیں۔ سر چومتے ہیں، ٹھنڈے جوس کا گلاس اس کے ہونٹوں کی طرف بڑھاتے ہیں......

وہ جیسے تڑپ کر اپنے حواس میں واپس آگئی۔ گلے میں کانٹے سے پڑے ہوئے تھے۔ زبان منہ میں سوکھے چمڑے کا ٹکڑا ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے بے جان جسم کو بہ مشکل دوسری سائڈ ٹیبل کی طرف بڑھایا۔ یہاں پانی کا گلاس موجود تھا۔ نیم تاریکی میں اس نے گلاس پکڑنا چاہا۔ ہاتھ لگنے سے گلاس پھولدار ٹائلوں پر گرا اور چکنا چور ہو گیا۔ اس کے سینے میں درد بڑھتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

ہادی کا دل گواہی دے رہا تھا کہ حجاب سخت مصیبت میں ہے۔ اس کے ساتھ کچھ ہونے والا ہے۔ اس نے اس کی حالت دیکھی تھی اور وہ حالت اس کے حافظے پر نقش تھی۔ رات گیارہ بجے کے قریب عطا انکل کا فون آیا۔ انہوں نے کہا کہ حجاب میلانو میں ہے۔ فیاض نے نیٹ پر اس سے بات کی ہے۔ وہ ٹھیک ہے، ایک دو دن بعد وہ پھر بات کرے گی۔

ہادی یہ سب ماننے کو تیار نہیں تھا۔ پتا نہیں کیوں اس کے ذہن میں بار بار یہی آ رہا تھا کہ حجاب روم میں ہی ہے۔ بہت مشکل میں ہے۔ کوئی ہادی کے دل کو مٹھی میں لے رہا تھا۔ ورس والی کوٹھی کی طرف کھینچ رہا تھا۔

اس نے ایک بار پھر ارم سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ اس کا فون آف تھا۔ کل شام اس نے بتایا تھا کہ اسے حجاب کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلا۔ رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے جب ہادی نے ایک اہم فیصلہ کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ہاشم ایرک کا نمبر پریس کیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اس سے اہم موضوع پر بات کر رہا تھا۔

وقت تھا رات ایک بج کر چالیس منٹ۔ وہ روم کی ایک نسبتاً سرد رات تھی۔ سڑکیں ٹریفک سے خالی نظر آ رہی تھیں۔ ہادی اور ہاشم ایرک گاڑی پر سوار تیزی سے ''ایون ٹیو'' کے علاقے میں داخل ہوئے۔ یہ سرکاری گاڑی تھی۔ وہ ایک بڑا جوا کھیلنے جا رہے تھے۔ اگر ورس والی کوٹھی میں حجاب مل جاتی تو اور بات تھی ورنہ وہ ایک بڑی مصیبت میں پھنس سکتے تھے (تاہم، حجاب مل جاتی اور ان کے ساتھ آنے سے انکار کر دیتی تو بھی وہ مشکل کا شکار ہو جاتے) ہاشم باقاعدہ یونیفارم میں تھا۔ اس کا ماتحت تھامس بھی ساتھ تھا۔ گاڑی وہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ انہوں نے گاڑی عین ورس والی کوٹھی کے سامنے کھڑی کی۔ تیسری چوتھی بیل پر چھوٹا گیٹ کھلا اور اس میں سے گارڈ نے اپنی صورت دکھائی۔ پولیس کو دیکھ کر وہ الرٹ ہو گیا۔ ہاشم اور ہادی بھی باہر آگئے۔ ہاشم ایرک نے گارڈ سے کہا۔ ''ہمیں گھر کی تلاشی لینا ہے۔''

''وہ کیوں جناب؟'' گارڈ نے بھی انگلش میں پوچھا۔

''کچھ دیر پہلے، یہ مسٹر ہادی یہاں آئے تھے۔ یہاں کے ''اونر'' جلال الدین سے ملنے کے لیے۔ ابھی انہوں نے کال بیل نہیں دی تھی کہ اندر سے کسی خاتون کے چلانے کی آوازیں آئیں۔ وہ مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ انہوں نے ہمیں رپورٹ کیا ہے......''

''یہاں ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا...... نہ کوئی خاتون ہے سر۔''

''ہمیں یہی تو دیکھنا ہے کہ خاتون ہے یا نہیں۔'' ہاشم ایرک نے اندر داخل ہونا چاہا۔ گارڈ نے راستہ روکا۔

''سر آپ کے پاس سرچ وارنٹ ہے؟'' دوسرے گارڈ نے پوچھا۔

''پیچھے ہٹو، یہ ہنگامی صورتِ حال ہے۔ خاتون کی جان خطرے میں ہے۔''

''آپ مسٹر جلال الدین سے فون پر بات کر لیجیے۔'' پہلا گارڈ بولا۔

''ہمیں کسی سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم راستہ دو۔'' گرانڈیل ہاشم ایرک، گارڈ کو دھکیلتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ تھامس اور ہادی بھی اس کے پیچھے تھے۔ گارڈز بہت جز بز نظر آ رہے تھے لیکن پولیس کی مزاحمت کا مطلب بھی وہ اچھی طرح جانتے تھے۔

ہاشم ایرک، تھامس اور ہادی نے تیزی سے کوٹھی کو سرچ کرنا شروع کیا۔ نچلی منزل میں گارڈز کے علاوہ ڈرائیور اور خانساماں وغیرہ تھے۔ بالائی منزل پر دو ملازمائیں بھی نظر آئیں۔ نیند سے بیدار ہونے کے بعد وہ ہراساں دکھائی دے رہی تھیں۔ ہادی نے دونوں کو پہچان لیا۔ ان میں سے ایک ہٹی کٹی کلثوم تھی۔ شریفاں کی اطلاع کے مطابق کلثوم یہاں حجاب کی سخت گیر نگران کا کردار ادا کر رہی تھی۔

ہادی کے اشارے پر ہاشم ایرک نے کلثوم کو آڑے ہاتھوں لیا اور اس سے ''شور مچانے والی'' خاتون کے بارے میں پوچھا۔

کلثوم نے صاف انکار کیا اور کہا کہ یہاں ان دونوں کے سوا کوئی عورت موجود نہیں۔

دوسری ملازمہ ناہید بولی۔ ''آپ تلاشی لے لیجیے جی، پوری کوٹھی آپ کے سامنے ہے۔'' ناہید بری بھلی انگلش بول رہی تھی۔

تھامس گارڈز اور ملازمین کے پاس کھڑا رہا۔ وہ کسی کو فون ملانے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ ہاشم ایرک اور ہادی ایک بار پھر کوٹھی میں گھومنے لگے۔ پانچ دس منٹ میں انہوں نے چھت سمیت ہر جگہ دیکھ لیا مگر کہیں کوئی سراغ نہیں ملا۔

ہاشم ایرک کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اس نے ہادی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہاں تو کوئی نہیں۔“

”یہ ملازمہ کلثوم ضرور کچھ جانتی ہوگی۔ اس پر تھوڑی سی سختی کرکے دیکھا جائے۔“

”نہیں، یہ میرے اختیار میں نہیں۔ ہم حد سے تجاوز کر جائیں گے اور دوسری بات یہ کہ ہم زیادہ دیر یہاں رک بھی نہیں سکتے۔“ ہاشم نے قدرے روکھے لہجے میں کہا۔

چار پانچ منٹ بعد وہ پوری طرح مایوس ہو چکے تھے۔ ہاشم ایرک نے اسے اور تھامس کو اشارہ کیا کہ اب چلنا چاہیے۔ وہ سیڑھیاں اتر کر گراؤنڈ فلور پر آگئے۔ ہادی سب سے پیچھے تھا۔ اس کی بے قرار نگاہیں اب بھی چاروں طرف گردش کر رہی تھیں۔ پتا نہیں کیوں اس کا دل جکڑا جا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ باہر نکل آئے...... ہاشم اور تھامس صحن میں تھے جبکہ ہادی صحن میں پہنچنے والا تھا۔ اچانک اسے ایک مدھم آواز سنائی دی۔ جیسے کسی نے کسی دروازے پر کمزور سی دستک دی ہو۔ وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ چند لمحے بعد آواز دوبارہ سنائی دی۔ یہ آواز دستک جیسی ہی تھی۔ ہاشم کو پکارتے ہوئے وہ واپس مڑا اور آواز کی سمت بڑھا۔ آواز ایک چوبی دروازے کے عقب سے آئی تھی۔ یہ دروازہ وہ لوگ پہلے بھی کھول کر دیکھ چکے تھے۔ ایک چھوٹا سا کمرا تھا جو بہ ظاہر خالی نظر آیا تھا۔ اب ہادی نے پھر دروازہ کھولا۔ اندرونی لائٹ آن کی۔ مدھم آواز پھر ابھری، ہادی کو اندازہ ہوا کہ ایک بڑی الماری کی اوٹ میں تنگ سا زینہ بھی ہے جو نیچے اتر رہا ہے۔

”مسٹر ہاشم! ادھر آئیں۔“ وہ پکار کر بولا۔

ہاشم دوڑتا ہوا پہنچ گیا۔ آوازیں زینے کے نچلے سرے سے آئی تھیں۔ ہاشم نے اپنا سرکاری پستول نکال لیا۔ وہ دونوں تیزی سے زینے اتر کر نیچے پہنچے۔ یہاں ایک بیسمینٹ کا دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔

اندر سے اب کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی......

اس کے بعد جو کچھ ہوا بڑی تیزی سے ہوا۔ دروازہ کھلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ہاشم کو دروازہ ان لاک کرنے کے لیے پستول سے تین فائر کرنا پڑے۔ دھماکوں سے در و دیوار گونج گئے۔ وہ ایک نیم تاریک نیم سرد بیسمینٹ میں داخل ہوئے۔ ہادی کی حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آگئیں۔ اس نے دیکھا۔ بیسمینٹ کے دروازے کے بالکل پاس حجاب ایک غالیچے پر بے سدھ پڑی تھی۔ اس کے جسم میں کوئی حرکت نہیں تھی۔ بیڈ کے پاس ایک گلاس کے ٹکڑے پڑے تھے اور پانی پھیلا ہوا تھا۔ ”حجاب...... حجاب!“ ہادی نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔

ہاشم اور ہادی نے اسے اٹھا کر بستر پر ڈالا۔ وہ بے ہوش تھی۔ اس کی نبض اور سانسیں بہت دھیمی پڑ چکی تھیں۔ ہاشم نے اپنے دونوں ہاتھ بے ہوش حجاب کے سینے پر رکھے اور اسے ابتدائی طبی امداد دینے لگا۔ وہ اس کے دل کو پمپ کر رہا تھا۔ پھر اس نے ماؤتھ ٹو ماؤتھ ہیلپ دی۔ اس دوران میں تھامس نے ایمبولینس کو کال کر دی۔

ہاشم کی کوششیں رنگ لائیں اور حجاب کسمسانے لگی۔ وہ نیم بے ہوشی میں بڑبڑائی۔ ”پلیز جلال...... پلیز...... مجھے نکال دیں یہاں سے۔ میں وہی کروں گی جو آپ کہیں گے میں وعدہ کرتی ہوں۔“

ہادی نے اس کا ہاتھ تھاما۔ ”حوصلہ کرو حب! ہم نکال رہے ہیں تمہیں۔ ابھی نکال رہے ہیں۔“

اس نے ہادی کی آواز سنی ہی نہیں۔ یا سنی تو پہچانی ہی نہیں۔ وہ جلال کو ہی پکارتی رہی۔ ”دروازہ کھول دیں جلال...... میرا سانس رک رہا ہے۔ مجھے نکال لیں پلیز، میں مر جاؤں گی۔“

اسی دوران میں اوپر کوٹھی کے پورچ کی طرف ایمبولینس کے تیز سائرن سنائی دینے لگے۔ یہ آواز بہ آسانی اس تہ خانے تک بھی پہنچ رہی تھی۔

حجاب نے بے قراری سے دائیں بائیں سر ہلایا۔ جیسے کسی نئے خیال سے ڈر گئی ہو۔ نیم بے ہوشی میں کراہی ”......اور...... میرے امی ابو کو کچھ نہ کہنا جلال۔ میرے بھائی کو کچھ نہ کہنا...... وہ بڑے کمزور ہیں۔ میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں جلال......“

دو منٹ بعد اسٹریچر بیسمینٹ میں پہنچ گیا۔ ہادی نے حجاب کو اپنی گود میں بھر کر اسٹریچر پر لٹایا۔ وہ لوگ بڑی تیزی کے ساتھ اسٹریچر کو ایمبولینس کی طرف دوڑاتے چلے گئے۔

☆☆☆

حجاب کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ اسپتال کے سی سی یو میں تھی۔ دس بارہ گھنٹے میں اس کے درجنوں ٹیسٹ ہوئے تھے اور ابھی مزید ہو رہے تھے۔ ہادی اسے دیکھنے کے لیے تڑپ رہا تھا مگر اسے معلوم تھا کہ وہ اسپتال نہیں جا سکتا۔ ان کا رابطہ بس عطا انکل سے تھا اور وہ اسے ہر پل کی خبر دے رہے تھے۔ ڈاکٹروں نے ہارٹ پرابلم ڈائیگنوز کیا تھا۔ پھر انہوں نے بتایا کہ شدید ترین Anxiety اور گھٹن کا شکار

ہونے کے بعد وہ بے ہوش ہوئی ہے اور اب اس کے دل کا ایک حصہ درست فنکشن نہیں کر رہا۔

ڈاکٹر کبھی سرجری کی بات کر رہے تھے، کبھی ”پیس میکر“ لگائے جانے کا امکان ظاہر کر رہے تھے۔ سب سے بڑا مسئلہ حجاب کے سانس کی بحالی کا تھا۔ اس کی سانس ٹھیک نہیں تھی۔ وہ جیسے اب بھی خود کو اسی بیسمینٹ میں محسوس کرتی تھی اور کھینچ کھینچ کر ہوا اپنے پھیپھڑوں میں لے جاتی تھی۔ اسے اس سنگین ”ڈس آرڈر“ سے نکالنے کے لیے سائیکاٹرسٹ کی خدمات بھی حاصل کر لی گئی تھیں۔ مگر ابھی تک سب بے سود تھا۔

عطا انکل کے مطابق جلال بھی میلانو سے روم پہنچ چکا تھا۔ اسے پولیس نے پوچھ گچھ کے لیے بلایا تھا۔ وہ دو تین گھنٹے پولیس اسٹیشن میں رہنے کے بعد فی الحال واپس آگیا تھا۔ اس نے بیان دیا تھا کہ حجاب اس کی منکوحہ ہے اور وہ اپنی مرضی و رضا سے اس کے گھر میں رہ رہی تھی۔ چونکہ وہ آج کل بہت ڈپریشن میں تھی اور بالکل خاموش اور پُرسکون جگہ پر رہنا چاہ رہی تھی اس لیے اپنی مرضی سے بیسمینٹ میں شفٹ ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ کی چوٹ کو بھی جلال نے حادثاتی قرار دیا تھا، لیکن حقیقت کیا ہے یہ سب کو نظر آ رہا تھا۔

ہادی کو حجاب کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔ ہر طرف بس وہی تھی، اس نے حسن و عشق کے ان گنت پہلوؤں کو اپنے ہزارہا شعروں میں نظم کیا تھا، لیکن یہ کبھی نہ سوچا تھا کہ ایک دن وہ خود بھی کہانیوں جیسے بے پناہ عشق کی زد میں آجائے گا۔ اس نے دیومالائی کہانیوں میں پڑھا تھا کہ عشق سمندر میں ڈوب جانے والے کسی اور ہی روپ میں ڈھل جاتے ہیں...... وہ اپنے محبوب کے نام کی تسبیح پھیرتے ہیں اور جنگلوں میں نکل جاتے ہیں۔ اس نے تسبیح تو نہیں پھیری تھی لیکن یہ حقیقت تھی کہ آتی جاتی ہر سانس کے ساتھ حجاب کا نام بھی اس کے سینے میں داخل ہوتا اور نکلتا تھا۔

وہ جاگتا تو سب سے پہلے اسی کا خیال ذہن میں آتا۔ اس کے ذہن میں ہر وقت وہی بیسمینٹ کے اور ایمبولینس کے مناظر گھومتے رہتے تھے۔ پچھلے چند ہفتوں میں حجاب نے اس بیسمینٹ میں جو کچھ جھیلا وہ ناقابلِ بیان تھا۔ اس کے والد نے اسے اپنے سسرال واپس جانے کا حکم دیا اور وہ چلی گئی۔ اپنی جان پر ہزار مصیبتیں جھیل لیں لیکن وہاں سے ہلی نہیں۔ یہاں تک کہ موت کے سایوں نے اسے ڈھانپنا شروع کر دیا۔ وہ شبنم تھی اور دھوپ کی زد میں آگئی۔

پھول تھی اور لو میں جھلس گئی۔ وہی نظم...... اور تمہیں معلوم ہے کاسابیانکا کون تھا۔ کاسابیانکا اطاعت اور فرمانبرداری کی لازوال مثال تھا۔ وہ بحری جہاز کے آفیسر کا لختِ جگر تھا اور جب کھلے ویران پانیوں میں انگریزوں نے حملہ کیا، جب جہاز کو آگ لگی اور ہر طرف تہلکہ مچا تو باپ نے کاسابیانکا کو ایک جگہ کھڑا کیا اور کہا...... کاسا! یہاں کھڑے رہنا جب تک میں نہ کہوں......“

ایک روز عطا انکل کا فون آیا۔ انہوں نے کہا۔ ”ہادی! ڈاکٹر بڑے پریشان ہیں، حجاب کی بیماری انہیں الجھا رہی ہے۔ وہ دس بارہ گھنٹوں کے لیے بہتر ہو جاتی ہے لیکن پھر طبیعت میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ سانس کی تکلیف بڑھ جاتی ہے۔ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے جہاں تک میں سمجھا ہوں اس کی تکلیف نہ صرف کارڈک (قلبی) ہے اور نہ صرف سائیکالوجیکل ہے۔ دونوں طرح کے مسائل اس طرح الجھ گئے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا مشکل ہے۔“

”سائیکاٹرسٹس کیا کہتے ہیں؟“

”انڈیا کا ایک معروف سائیکاٹرسٹ ڈاکٹر سرفراز مسلسل حجاب سے کونسلنگ کر رہا ہے۔ کل بھی حجاب سے اس کی ایک لمبی نشست ہوئی ہے...... وہ آزاد گفتگو کے ذریعے اس کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ درحقیقت ان ڈھائی تین مہینوں میں حجاب نے جلال کا اتنا دباؤ برداشت کیا ہے کہ ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی ہے۔ چھوٹی بڑی باتیں اس کے ذہن میں میخوں کی طرح گڑی ہوئی ہیں۔ وہ خود کو اب بھی جلال کے شکنجے میں مجبور رہی ہے۔ کبھی کبھی ایک ڈری سہمی چھوٹی سی بچی کی طرح سوچنے لگتی ہے۔ اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ وہ اسے طلاق نہیں دے گا۔ اسے اور اس کے گھر والوں کو عدالتوں میں گھسیٹے گا۔ ڈاکٹر سرفراز تو یہ کہہ رہے تھے کہ اگر یہ طلاق والا عمل جلد مکمل ہو جائے اور حجاب کو یقین ہو جائے کہ وہ جلال سے آزاد ہو چکی ہے تو اس کی حالت سنبھل سکتی ہے۔“

”اس سلسلے میں آپ نے انکل فیاض وغیرہ سے بات کی ہے؟“

”ہاں، بلکہ میں اور فیاض نے اکٹھے ہی جلال سے ملاقات کی تھی۔ دوٹوک باتیں ہوئی ہیں۔ وہ پس و پیش سے کام لے رہا ہے۔“

”اب پس و پیش کیوں۔“ ہادی نے تڑخ کر کہا۔

”اب وہ حجاب کو کس طرح زبردستی ساتھ رکھ سکتا ہے۔“

”ہاں، اس کی پوزیشن تو اب بہت کمزور ہے۔ مگر

اپنی اوقات ظاہر کررہا ہے۔ عدالتی کارروائی سے ڈرانے کی کوشش کررہا ہے۔ مگر یہ چل نہیں سکے گا۔ میں اور فیاض کل ایڈووکیٹ سے بھی بات کررہے ہیں......"

ہادی کے ذہن میں شعلے سے بھڑک رہے تھے۔ وہ ایک تخلیق کار تھا۔ اس نے کبھی چیونٹی بھی نہیں ماری تھی۔ لیکن آج...... آج پتا نہیں کیوں اسے لگ رہا تھا کہ وہ جلال کو جان سے مار سکتا ہے......

اس نے رات کا بیشتر حصہ ہوٹل کی راہداریوں میں بے قراری سے گھومتے ہوئے گزارا۔ جلال کی صورت رہ رہ کر نگاہوں میں گھومتی تھی۔ اس نے رات دو بجے گلزاری کو فون کیا۔ وہ یقیناً کسی نائٹ کلب میں ہی تھا اور اپنے ناٹے قد کے ساتھ کسی دراز قد لڑکی کی تلاش میں تھا۔ ہادی کو پتا تھا کہ دراز قد لڑکیاں اس کا "کریز" ہیں۔ ہادی نے کہا۔

"گلزاری! ایک کام آن پڑا ہے تم سے۔"

"جناب! آپ تمہید نہ باندھا کریں، ڈائریکٹ حکم دیا کریں۔ آپ کا خادم ہر وقت حاضر جناب کہنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔"

"ایک چیز مہیا کرنی ہے۔"

"فرمائیں جناب۔"

"فون پر نہیں، اسی ریستوران میں پہنچو، ابھی اسی وقت۔" ہادی نے کہا۔

☆☆☆

اس واقعے کے ٹھیک دس گھنٹے بعد ہادی جلال شاپنگ سینٹر کے سامنے موجود تھا...... یہ دوپہر کا وقت تھا۔ کڑاکے کی سردی تھی، ہوا بھی چل رہی تھی۔ ہادی نے پی کیپ پہن رکھی تھی۔ چہرے کا کچھ حصہ مفلر میں چھپا ہوا تھا۔ وہ شاپنگ سینٹر میں داخل ہوا اور سیدھا اس پورشن کی طرف بڑھا جہاں جلال الدین کا شاندار آفس واقع تھا۔ جب وہ آفس کے بالکل قریب پہنچا تو یکے بعد دیگرے دو گارڈز نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ وہ ان کو دھکیلتا ہوا اور دندناتا ہوا جلال کے آفس میں داخل ہوگیا۔ جلال ایک وسیع و عریض میز کے عقب میں موجود تھا۔ اس کا فربہ اندام بھائی ظہیر الدین بھی ساتھ بیٹھا تھا۔ شاید کسی معاملے پر بحث ہو رہی تھی۔ وہ دونوں اس طرح ہادی کو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ خاص طور سے جلال کے چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے۔ جلال اور ہادی چند سیکنڈ یک ٹک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ گارڈز ہادی کی دونوں جانب موجود تھے اور اگلے حکم کے لیے جلال کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جلال کے ایک اشارے پر وہ اس پر جھپٹ سکتے تھے اور ایک ہنگامہ کھڑا ہوسکتا تھا۔ جلال نے اپنے دونوں ہاتھ پشت پر باندھے اور گارڈز کو باہر جانے کا حکم دیا۔

"میں تم سے بالکل اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔" ہادی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

ایک توقف کے بعد جلال نے ظہیر الدین اور سیکریٹری ٹائپ لڑکی کو بھی باہر جانے کی ہدایت کی...... وہ دونوں آفس میں تنہا رہ گئے۔

ہادی، جلال کے عین سامنے جا کھڑا ہوا۔ جلال اب سنبھل گیا تھا اور اس کی آنکھوں سے سرخی جھلکنے لگی تھی۔ ہادی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر کہا۔ "تمہیں ایک کام کرنا ہوگا جلال۔ حجاب کی طلاق کے کاغذوں پر دستخط کرنے ہوں گے۔ ابھی، اسی وقت۔"

"تم مجھے حکم دینے والے کون ہوتے ہو۔" وہ پھنکارا۔

"میں وہ ہوں، جو آج...... ابھی...... اسی جگہ...... تمہیں قتل کرسکتا ہے...... اور قتل ہو بھی سکتا ہے۔" ہادی نے خونخوار انداز میں کہا۔

اس کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ آفس کے در و دیوار میں ایک پرہول گونج پیدا ہوئی اور اس گونج نے جلال جیسے دبنگ بندے کو بھی بنیادوں سے ہلا دیا، اور تو اور اپنے لہجے کے آہنگ پر ہادی خود بھی حیران ہوا۔ کہاں سے آئی تھی یہ بے پناہ توانائی، کہاں سے آیا تھا یہ بے اماں دبدبہ۔ یہ محبت کی دین تھا، یہ عشق کا معجزہ تھا۔ وہ تو ایک شاعر تھا، ایک خاموش طبع نرم خو شخص۔ اس نے زندگی میں کسی سے جھگڑا نہیں کیا تھا لیکن آج وہ بولا تھا تو اس کی آواز میں منہ زور طوفانوں اور بپھرے سمندروں کی وحشتیں سمٹ آئی تھیں۔ جلال اس کو دیکھتا رہ گیا۔ پھر وہ نیچے جھکا۔ ہادی کو اندازہ ہوا کہ کسی کو بلانے کے لیے کال بیل کا بٹن دبانا چاہتا ہے۔ ہادی نے جیب میں سے بھرا ہوا پستول نکالا اور بے دریغ جلال کی چوڑی چکلی چھاتی پر رکھ دیا...... عین دل کے مقام پر (یہ پستول گلزاری نے فراہم کیا تھا)

"جلال! میں تجھے کہہ رہا ہوں۔ میں مار دوں گا تجھے۔ ابھی، اسی وقت، اس قالین پر تیری لاش گرے گی...... ابھی اسی وقت۔" وہ جنونی انداز میں بولا۔

جلال کا رنگ بالکل ہلدی ہوگیا۔ وہ ڈرنے والا شخص نہیں تھا مگر ہادی کا لہجہ پتھر کو پانی کردینے والا تھا۔ اس نے پستول کو دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا اور انگلی ٹریگر پر تھی

"تم بھی بچ نہیں سکو گے۔" جلال کمزور آواز میں بولا۔

"میں بچنا چاہتا بھی نہیں ہوں۔ بالکل تیار ہوکر آیا ہوں۔ مجھے پتا ہے ہم دونوں کی لاشیں گریں گی۔ لیکن پہلے تیری لاش گرے گی۔ پہلے تیری گرے گی۔" ہادی وحشی لہجے میں پھنکارا اور پستول والا ہاتھ اتنے زور سے جلال کی گردن پر مارا کہ وہ لڑکھڑا کر دیوار سے ٹکرایا اور دم بخود ہوگیا۔ اس کا پتا پانی ہوچکا تھا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ اگلے چند سیکنڈ میں وہی ہوگا جو ہادی کہہ رہا ہے۔ اس نے خوفزدہ نظروں سے سیاہ پستول کے خم دار ٹریگر پر رکھی ہوئی انگلی کو دیکھا اور اپنا بدن ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اس کے تاثرات گواہی دے رہے تھے کہ اس نے شکست تسلیم کرلی ہے۔

☆☆☆

حجاب آزاد ہوچکی تھی۔ طلاق کا "پراسس" مکمل ہوگیا تھا۔ کاغذات اسے مل چکے تھے۔ اس "آزادی" نے اس کی صحت پر مثبت اثرات ڈالے۔ وہ پہلے سے بہتر لگنے لگی۔ لیکن جو روگ دل کو لگ گیا تھا وہ اتنی آسانی سے جانے والا تو نہیں تھا۔ قید و بند کے شب و روز اس کے قلبی اور عصبی نظام کو بے طرح متاثر کرچکے تھے۔ کئی موقعوں پر تو ڈاکٹر بھی الجھن کا شکار ہوجاتے تھے۔ اس کی بیماری بڑی پیچیدہ تھی اور مہلک بھی۔ عام طور پر جواں عمری میں ہارٹ اٹیک اور دل کی دیگر شدید بیماریاں نہیں ہوتیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایسے کیسوں کی شرح بڑھ رہی ہے۔

کبھی کبھی دو چار دن کے لیے وہ بالکل ٹھیک بھی ہوجاتی تھی مگر پھر بیماری کا حملہ ہوتا تھا۔ دل کے فنکشنز متاثر ہوتے تھے اور سانس کی آمد و رفت بری طرح بگڑ جاتی تھی۔ ایک دن ڈاکٹر، عطا انکل کی زبانی ہی ہادی کو معلوم ہوا کہ اس کے ہارٹ کے الیکٹرانک سسٹم کو کمپوز کرنے کے لیے اس کے سینے کی جلد میں جو پیس میکر لگایا گیا تھا وہ اتار دیا گیا ہے اور وہ پہلے سے بہتر محسوس کررہی ہے۔ مگر یہ بہتری کب تک رہے گی ڈاکٹر یقین سے کچھ نہیں کہہ پاتے۔

ہادی کے قیام میں اٹالین ایمبیسی نے جو "ہنگامی توسیع" کی تھی وہ بھی اب ختم ہونے والی تھی۔ اس کے متبادل کاغذات تیار ہوچکے تھے۔ اب اسے ہر صورت میں اٹلی کو چھوڑنا تھا اور روم سے جانا تھا۔ وہ جانے سے پہلے صرف ایک بار حجاب کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک دن اس نے عطا انکل سے اس خواہش کا اظہار کیا۔ عطا انکل سے اب وہ بے تکلف گفتگو کرلیتا تھا۔ عطا انکل بھی ہادی کے دل کے معاملات کو کافی حد تک جان چکے تھے۔ اس سچی محبت کی خوشبو انہوں نے بڑی وضاحت سے محسوس کرلی تھی جو ہادی کے دل میں حجاب کے لیے موجود تھی۔ وہی محبت جو ہر مصلحت، ہر صورتِ حال سے بالاتر ہوتی ہے۔ وہ اب ان سے کبھی کبھی بالکل دوستانہ لہجے میں بات کرلیتا تھا۔ اس نے جب عطا صاحب کو بتایا کہ وہ جانے سے پہلے ایک بار حجاب کو دیکھنا چاہتا ہے تو انہوں نے خاموشی اختیار کی۔ مطلب یہ کہ وہ انکار نہیں کررہے تھے۔ کچھ سوچنا چاہتے تھے۔

وہ جنوری کی ایک سرد رات تھی۔ روم کا درجۂ حرارت دو تین درجے سے زیادہ نہیں تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ عطا صاحب کا فون آیا۔ "آج رات بارہ بجے کے بعد حجاب کے پاس اسپتال میں صرف میں ہوں گا۔ تم بارہ بجے کے بعد جب آنا چاہو آسکتے ہو، لیکن بہتر یہ ہے کہ حجاب کے سامنے نہ آؤ۔"

"نہیں انکل! آپ بے فکر رہیں، میں بس دور ہی سے دیکھ لوں گا۔"

وہ اسپتال پہنچا تھا...... اور اس نے حجاب کو دور سے دیکھا تھا، ایک کھڑکی میں سے۔ وہ سفید بستر پر سیدھی لیٹی تھی۔ کسی اجلے اجلے راج ہنس کی طرح۔ پیشانی کی چمک ماند تھی مگر بالکل اوجھل نہیں تھی۔ رخسار پر اب خراش کا بس نشان سا رہ گیا تھا۔ ہلکے رنگوں سے بنائی گئی وہ ایک نازک تصویر نظر آتی تھی...... اور ہادی اب واپس جا رہا تھا۔ اپنے دل کی بات دل میں لیے۔ اسے بتائے بغیر کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ ایسی محبت کہ جس کو لفظوں میں بیان کرنا اس جیسے قلم کار کے لیے بھی ممکن نہیں، وہ اپنی ساری توانائیاں جمع کرکے لفظوں کے انبار بھی لگا دیتا تو اس محبت کی میم کا حق بھی ادا نہ کر پاتا۔ وہ محبت کی اس حسین مورتی کے سامنے کسی پجاری کی طرح لب بستہ کھڑا رہا...... دیکھتا رہا اور پھر پیچھے ہٹ گیا۔ کیا یہ اس کا آخری خراجِ عقیدت ہے۔ کیا اب وہ اسے کبھی نہ دیکھ سکے گا؟ اس نے سوچا اور اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

کچھ دیر بعد عطا انکل بھی خاموشی سے اٹھ کر باہر آگئے۔ ہادی نے سرگوشی سے کہا۔ "انکل! آپ نے کھڑکیاں اور دروازے کھلے کیوں رکھ چھوڑے ہیں۔ میں تو کھڑکی کے شیشے میں سے بھی دیکھ سکتا تھا۔"

"اس کی وجہ تم نہیں ہو۔" عطا انکل نے کہا۔ "یہ ویسے ہی کھڑکیاں دروازے بند نہیں کرنے دیتی۔ اسے وحشت ہونے لگتی ہے۔ یہ اسی سختی کا نتیجہ ہے جو جلال نے اس پر روا رکھی ہے۔"

ہادی ایک آہ کھینچ کر رہ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتا۔ عطا انکل کے تاثرات سے بھی یہی ظاہر تھا۔ کسی وقت کوئی یہاں آسکتا تھا۔

ہادی نے ایک الوداعی نظر سوتی ہوئی حجاب پر ڈالی۔ تصور ہی تصور میں اس کے ہاتھ کو چھوا، اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور پلٹ گیا۔ اس کے دل میں نیک تمناؤں اور دعاؤں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

☆☆☆

ہادی اب پاکستان میں تھا۔ لاہور میں..... اپنے گھر والوں کے ساتھ۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ جو سیر و تفریح کے لیے پاکستان سے نکلا تھا، کتنا بڑا گھاؤ لے کر واپس آیا ہے۔

اب پھر وہی شب و روز تھے، وہی معمولات، وہی روزمرہ کے مسائل، وہی شنو بھائی کی Do more کی کالیں۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور پریشانیاں۔ فرق صرف ایک تھا۔ اب ہادی کا قلم روانی سے چل رہا تھا۔ وہ لکھ رہا تھا اور مسلسل لکھ رہا تھا۔ وہ بہت کچھ روم میں چھوڑ آیا تھا لیکن وہاں سے قلم لے آیا تھا اور قلم کی روانی لے آیا تھا اور یہ روانی موتی بکھیر رہی تھی۔ تخلیق کے خشک ہو جانے والے سوتے اب تازہ پانیوں کو اچھال دے رہے تھے۔ ایک درد تھا..... ایک کرب تھا..... ایک ٹیس تھی، جو شب و روز چلتی تھی اور اس کو لکھنے پر ابھارتی تھی..... اور وہ لکھتا تھا۔ کسی کی حسین مسکراہٹ کے قصیدے، روشن پیشانی کے نغمے، نچلا ہونٹ، ہولے سے دانتوں تلے دبانے کی ادا..... اور اس ادا کی سحر کاریاں۔ اور وہ ہزاروں میل دور بیٹھی تھی۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ اسے کبھی کچھ خبر نہ ہوتی تھی۔ کبھی منیر نیازی کے خوب صورت الفاظ، دکھ کی لہر بن کر اس کے کانوں میں گونجنے لگتے۔ پہلی بات ہی آخری تھی، اس سے آگے بڑھی نہیں..... ڈری ڈری ایک بیل تھی جیسے، دیوار پہ پوری چڑھی نہیں۔

گاہے بگاہے عطا انکل سے انٹرنیٹ پر یا فون پر اس کا رابطہ ہو جاتا تھا۔ حجاب کی حالت جوں کی توں تھی۔ کبھی کچھ دنوں کے لیے سنبھل جاتی لیکن پھر بیماری کا ایک دورانیہ آجاتا جو چند گھنٹے یا دو تین دن جاری رہتا۔ انکل فیاض اور فیصل اب اسے سرحد پار آسٹریا لے جانے کا سوچ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہاں اس کا بہتر علاج ہو پائے گا۔ اس کی نفسیاتی ٹریٹ منٹ بھی بدستور جاری تھی۔ حجاب کی والدہ کی صحت کے حوالے سے اب اچھی اطلاعات تھیں۔ ہادی کی کوشش سے گجرات میں انکل فیاض کے پلاٹ کا ایک اچھا گاہک مل گیا تھا۔ پلاٹ کا مختار نامہ یہیں گجرات میں انکل فیاض کے ایک بھائی کے پاس تھا لہٰذا رجسٹری وغیرہ میں کوئی دشواری نہیں تھی۔ ہادی نے اس گاہک کا رابطہ براہِ راست عطا انکل سے کروا دیا اور خود بیچ میں سے نکل گیا۔

حجاب کی صحت کی صورتِ حال کے علاوہ بھی روم سے چیدہ چیدہ خبریں عطا انکل کی زبانی ہادی تک پہنچتی رہتی تھیں۔ ظہیر الدین کا اپنے بڑے بھائی جلال الدین سے تنازعہ ہوا تھا اور وہ علیحدہ گھر خرید رہا تھا۔ اب اگلا قدم شاید کاروبار کی علیحدگی کا تھا۔

چند روز بعد ہادی کو جلال کے حوالے سے ایک اور اہم خبر ملی۔ پتا چلا کہ جلال اور اس کی نوبیاہتا ارم میں اختلافات پیدا ہو گئے ہیں جو دن بدن شدت پکڑ رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ جلال نے ارم سے مارپیٹ بھی کی ہے۔ اس کا سبب کوئی ایسا انکشاف بتایا جا رہا تھا جو حال ہی میں جلال پر ہوا تھا۔

ہادی کو پریشانی لاحق ہو گئی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہاں گلزاری نے اپنے وعدے کی خلاف ورزی کی ہو۔ ہادی نے اسے منہ مانگی قیمت دی تھی اور ساتھ ساتھ اسے پابند بھی کیا تھا کہ اب وہ ارم کے "ابارشن" والے معاملے کو ارم کے خلاف ہرگز ہرگز استعمال نہیں کرے گا اور اگر اس نے ایسا کیا تو پھر ناجائز پستول والا وہ کیس فوراً کھل جائے گا جو ہاشم ایرک کے پاس التوا میں پڑا ہے (وہ پستول بھی ابھی تک ہاشم کے پاس تھا اور فون پر بنائی گئی وہ وڈیو بھی جس میں گلزاری نے پستول کی ملکیت کا اعتراف کیا تھا)

ہادی نے اگلے روز روم میں گلزاری سے رابطہ کیا اور اس سے باز پرس کی۔ اس نے قسمیں کھا کر کہا کہ اس نے اس سلسلے میں اپنی زبان بالکل بند رکھی ہوئی ہے اور ہمیشہ رکھے گا۔ اس نے ہادی کو بتایا۔ "جناب! میری معلومات کے مطابق ارم اور جلال کے اختلافات کسی اور وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس جھگڑے کی بنیاد کوئی فون کال بنی ہے جو ارم کرسمس کی رات اپنے کسی جاننے والے کو کر رہی تھی۔ اس کی آواز جلال کے کانوں تک پہنچ گئی..... اور معاملہ بگڑتا چلا گیا۔ یہ باتیں ایک ملازمہ کے ذریعے معلوم ہوئی ہیں۔"

ہادی کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اسے وہ آخری فون کال یاد آگئی جو ارم نے اسے کی تھی۔ وہ اس وقت کسی نشہ آور دوا کے زیرِ اثر لگتی تھی۔ ایک دم اونچی آواز میں

بولنے لگی تھی۔ خود ہادی بھی حیران ہوا تھا۔ یقیناً یہی وہ فون کال تھی جس کا ذکر اب گلزاری کر رہا تھا..... ہادی سوچنے لگا..... تو کیا اسی کو مکافاتِ عمل کہتے ہیں..... ہادی، ارم کو اسی کے سکوں میں جواب دینا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے روم میں ارم کو یقین دلایا تھا کہ حجاب، جلال کے شکنجے سے نکل آئی تو وہ "ابارشن" والے معاملے کو بنیاد بنا کر ارم کو کسی کام پر مجبور نہیں کرے گا..... اور نہ کسی دوسرے کو ایسا کرنے دے گا اور وہ وعدے کا پاس کرنے والا بندہ تھا۔ ارم اب کسی اور کی نہیں اپنی غلطی کی وجہ سے مصیبتوں کا شکار ہو رہی تھی۔

اسی حوالے سے چار پانچ روز بعد ایک اور خبر ہادی کو ملی۔ یہ خبر عطا انکل نے ہی پہنچائی تھی اور یہ کافی اہم خبر تھی۔ عطا انکل نے فون پر بتایا۔ "جلال..... جیل میں ہے۔"

"وہ کیسے؟" ہادی حیران رہ گیا۔

"اس نے ارم سے مارپیٹ کی ہے۔ ارم کا جبڑا ٹوٹ گیا ہے۔ اسپتال میں Pins وغیرہ لگا کر اس کی ہڈی جوڑی گئی ہے۔ اس نے جلال پر کیس کرا دیا ہے۔ اب وہ جوڈیشنل ریمانڈ پر جیل میں ہے۔ لگتا ہے کہ ایک ڈیڑھ سال کی سزا تو اسے ضرور ہو جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ زیادہ ہو جائے۔ اس کا سابقہ ریکارڈ بھی اسے مشکل میں ڈالے گا۔ حجاب کے ساتھ اس کا سلوک اور اسے مسلسل بند رکھنے کا واقعہ بھی پولیس کے ریکارڈ پر ہے۔"

جلال کو اس کے کرموں کی سزا مل رہی تھی۔ اس نے مذہب کو موم کی ناک بنا رکھا تھا اور اسے اپنے مطلب کی سمت موڑتا تھا..... ورنہ اس کی فطرت اپنے بڑے بھائی فیروز سے کچھ مختلف نہیں تھی۔ لفافے دو تھے، اندر مضمون ایک ہی تھا۔

بینش کو مار کر فیروز تو سخت سزا سے بچ گیا تھا مگر اب لگ رہا تھا کہ جلال آسانی سے نہیں چھوٹ سکے گا۔

یہ کافی اہم خبریں تھیں لیکن ہادی کے لیے اتنی اہم نہیں تھیں۔ اس کے دل و دماغ میں تو بس ایک ہی لہر چل رہی تھی۔ ایک ہی خیال..... ایک ہی فکر..... ایک ہی دعا..... ایک ہی آس..... وہ ٹھیک ہو جائے..... وہ جی اٹھے..... پیشانی کا چاند چمک جائے، ہونٹوں کے پھول کھل جائیں..... اور پھر وینس کی کسی اور جگمگاتی رات میں، وہ ویسے ہی کسی خوش رنگ روشنی کی طرح جھلملائے، ہواؤں میں تیرے..... پانیوں کو کہکشاں بنائے۔

اور وہ ٹھیک نہیں ہو رہی تھی..... انکل فیاض اور فیصل اسے لے کر وینس چلے گئے تھے۔ وہاں عطا انکل نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے اسے ایک نیم پرائیویٹ اسپتال میں داخل کرا دیا تھا۔ کہا جا رہا تھا کہ اس امریکن اسپتال میں حجاب کو بہترین طبی سہولتیں فراہم کی جا رہی ہیں..... اور اگر خدانخواستہ ضرورت پڑی تو اسے اسی اسپتال سے آسٹریا یا پھر امریکا بھی شفٹ کیا جا سکے گا۔

ایک روز ایک ایسا فون آیا جس نے اسے حیران کر دیا۔ یہ اتفاق سے حجاب کے بھائی فیصل کا فون تھا۔ رسمی کلمات کی ادائیگی کے فوراً بعد اس نے کہا۔ "میں آپ سے معافی مانگنا چاہتا ہوں ہادی صاحب۔"

"کس بات کی؟"

"میں نے ریستوران میں آپ سے بدتمیزی سے بات کی۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اصل میں..... باتوں کے بتنگڑ بنا دیے گئے تھے۔ ایک عجیب سا ماحول پیدا ہو گیا تھا، میں بہت زیادہ ڈپریس تھا۔ مجھے کم از کم باجی کے ساتھ تفصیل سے بات کر لینی چاہیے تھی۔"

"ہاں فیصل! مجھے بھی یہی افسوس تھا۔ تم اگر ٹھنڈے دماغ کے ساتھ حجاب سے بات کر لیتے تو بہت کچھ واضح ہو جاتا۔ وہ بہت پاک صاف سوچ کی مالک ہیں فیصل۔ بہت آنسٹ اور سچی۔ مجھ سے وہ تصویر والی غلطی ضرور ہوئی لیکن اس کے علاوہ ہم صرف اچھے دوستوں کی طرح ملتے رہے ہیں۔ بہرحال فیصل! مجھے اپنے اوپر بھی بے حد افسوس ہے۔ میں نے بھی ریستوران میں تم سے غلط رویہ اختیار کیا۔"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں تھی۔"

"بات تھی فیصل۔ میں نے تمہیں اور انکل فیاض کو بے حسی کے طعنے دیے۔ مجھے شکوہ تھا کہ آپ کی طرف سے وہ کوششیں نہیں ہو رہیں جو ہونی چاہیے تھیں۔ راستے میں عطا انکل نے مجھے بتایا کہ آپ لوگوں نے حجاب کی خاطر اپنے سر کی چھت تک فروخت کر دی ہے۔ آئی ایم رئیلی ویری ساری فیصل۔"

"مینشن ناٹ ہادی صاحب۔ آپ کی طرف سے بہت اچھا بھی تو ہوا ہے۔ جو کام میرے کرنے والا تھا وہ آپ نے کیا۔ پاکستان آنے سے پہلے آپ جلال سے ملے۔ اس کو راہِ راست پر لائے، اسے پیپرز پر سائن کے لیے آمادہ کیا۔ مجھے تین چار روز بعد ہی اس واقعے کا پتا چل گیا تھا۔ میں اس کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں۔"

"وہ مجھے ایک اچھا دوست سمجھتی ہیں اور میں نے اسی دوستی کا تھوڑا سا..... معمولی سا حق ادا کرنے کی کوشش

کی......“ پھر وہ موضوع بدل کر بولا۔”اب ان کی طبیعت کیسی ہے؟“

”دو تین دن سے کافی بہتر ہیں۔لیکن اب پتا نہیں یہ بہتری کتنے دن...... یا گھنٹے اور چلے گی۔بس ہر وقت ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے۔تین چار روز تک ایک سینئر سرجن ڈاکٹر بھی فلوریڈا سے یہاں آرہا ہے۔وہ بھی باجی کا معائنہ کرے گا۔“ فیصل کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

ہادی نے اس سے تسلی تشفی کی باتیں کیں۔

فیصل کے فون کے بعد ہادی کو اپنے دل کے بے پناہ بوجھ میں سے کچھ بوجھ اترا ہوا محسوس ہوا۔ اس کی باتوں سے صاف پتا چلتا تھا کہ حجاب سے اس کی ایک طویل نشست ہوئی ہے اور اس نے اس کی غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش کی ہے۔وہ سب لغو باتیں تھیں۔انٹرنیٹ پر ہادی اور حجاب کے پرانے رابطے، ہادی کا حجاب سے ملنے کے لیے اٹلی آنا، وینس کے ہوٹل میں حجاب کے ساتھ رہنا...... اور پتا نہیں کیا کچھ۔جلال سے ہادی کی فیصلہ کن ملاقات والے واقعے نے بھی فیصل کو متاثر کیا تھا۔اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے بس اتنا ہی معلوم ہے۔اس کے علاوہ ڈاکٹر عطا اور ہادی نے مل کر حجاب کے لیے جو تگ و دو کی تھی وہ اسے معلوم نہیں تھی اور ہادی کے خیال میں یہ اچھا ہی تھا۔

وہ فروری کی ایک ٹھنڈی شام تھی۔مقامی ہوٹل میں ایک شاندار تقریب ہورہی تھی یہ ہادی کے گیتوں اور نظموں کی کتاب ”بے نوا“ کی رونمائی کی تقریب تھی۔اس تقریب کی ساری فنانسنگ شیخو بھائی نے کی تھی۔معززین شہر جمع تھے۔کیمروں کی فلش لائٹس چمک رہی تھیں۔ ہر طرف گہما گہمی تھی۔پچھلے چند ماہ میں بطور گیت نگار ہادی کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہوا تھا۔اسے خوشی سے پھولا نہیں سمانا چاہیے تھا مگر وہ اس رنگا رنگ تقریب میں بھی بالکل اداس اور کھویا ہوا تھا۔جیسے اسے زبردستی پکڑ کر یہاں بٹھایا گیا ہو۔اس کی سوچوں کے ہر دھارے کا رخ حجاب کی طرف تھا۔پچھلے کئی دن سے حجاب کی طبیعت اچھی نہیں چل رہی تھی۔

تقریب اختتامی مراحل میں تھی جب ہادی کے فون پر ڈاکٹر عطا کی کال آئی۔ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔انہوں نے کہا۔”ہادی! اس کی حالت اچھی نہیں۔وہ تم سے ملنا چاہتی ہے۔“

یہ فقرہ نہیں ایک بارودی دھماکا تھا جس نے ہادی کے دل و دماغ کو اڑا کر رکھ دیا۔وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

شیخو بھائی نے اپنے مخصوص لہجے میں پوچھا۔”کی ہویا اے لالے دی جان؟“

”میں جارہا ہوں، حجاب کی طبیعت بہت خراب ہے۔“ اس نے سرگوشی کی اور تقریب چھوڑ کر نکل کھڑا ہوا۔

سات آٹھ دن پہلے ہی اس کے پاسپورٹ پر نیا ویزا لگا تھا۔اسے صرف ٹکٹ کی ضرورت تھی۔شیخو بھائی نے بھاگ دوڑ کر کے سارا انتظام کر دیا۔اس نے اپنی والدہ اور بھائی کو صورتِ حال سے آگاہ کر کے جانے کی اجازت لی اور اگلے روز رات کو اٹلی کے لیے پرواز کر گیا۔

دوران پرواز اس کا دل مسلسل کسی بے رحم مٹھی میں جکڑا رہا...... اس کی آنکھیں نم تھیں اور سینے میں ایسا غبار تھا جو اس کا گلا گھونٹ رہا تھا۔بالکل جیسے حجاب کا دم گھٹتا تھا اور وہ بالکل زرد ہوجاتی تھی۔اس نے اسے کیوں بلایا تھا؟ یہ سوال بھی بار بار ہادی کے ذہن میں ابھرتا اور ڈوبتا تھا۔

جس وقت ہادی مارکو پولو ائرپورٹ پر اترنے کے بعد ایک انڈین سردار کی ٹیکسی میں وینس پہنچا، رات کے نو بج چکے تھے۔ویسی ہی جگمگاتی رات جب ہادی اور حجاب پہلی بار ایک سڑک پر ملے تھے۔لیکن آج سارے منظر بدلے ہوئے تھے۔ہر طرف روشنی جیسے سسکیاں بھر رہی تھی اور ان ہزار ہا روشنیوں کے آنسو آبی گزرگاہوں کی شکل اختیار کر گئے تھے۔حجاب کی حالت ایسی تھی کہ عطا انکل اسے لینے کے لیے ائرپورٹ بھی نہیں آسکے تھے۔وینس پہنچنے کے بعد فون پر عطا انکل سے رابطہ ہوا۔انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں اسپتال کا ایڈریس اور کمرے کا نمبر وغیرہ بتایا۔

ہادی اسپتال پہنچا۔اس کا دل جیسے پسلیاں توڑ کر باہر آجانا چاہتا تھا۔اس نے پتا نہیں حجاب کو کس حالت میں دیکھنا تھا۔کوریڈور میں اس کی نگاہ عطا انکل پر پڑی۔ان کی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔ایک طرف فیصل دیوار کے سہارے خاموش کھڑا نظر آیا۔اس کا چہرہ بھی دکھ کی آماجگاہ تھا۔انکل فیاض ایک کونے میں جائے نماز بچھائے نماز پڑھ رہے تھے۔

عطا انکل نے ہادی کو گلے سے لگایا۔”انکل کیسی ہے حجاب؟“

”خود دیکھ لو۔“ انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

اسپتال کا براؤن حفاظتی لباس پہن کر اور ماسک لگا کر وہ کمرے میں داخل ہوا۔اس کمرے کی کھڑکیاں بھی حجاب کی وجہ سے کھلی رکھی گئی تھیں۔ہادی کے تصور میں تھا کہ

زیادہ فرق نظر نہیں آیا۔ ہاں چہرے کا رنگ گواہی دیتا تھا کہ اس کی حالت بہت اچھی نہیں۔ وہ ہلکے سبز بستر پر نیم دراز تھی۔ بازو میں دو ڈرپس لگی تھیں۔ سرہانے کی طرف ہارٹ ریٹ مانیٹر اور دیگر ہیلپنگ ڈیوائسز رکھے تھے۔ آکسیجن ماسک جو شاید کچھ دیر پہلے اس کے منہ پر تھا اب ایک طرف پڑا تھا۔

عطا صاحب نے اسے ہادی کے آنے کی اطلاع پہلے ہی دے دی تھی۔ اس لیے وہ کچھ زیادہ حیران نہیں ہوئی۔ بس ڈبڈبائی آنکھوں سے یک ٹک اسے دیکھتی رہی۔ ہادی اس کے قریب کرسی پر جا بیٹھا۔ ''ہیلو حجاب۔''

''ہیلو ہادی...... کیسے ہیں آپ؟'' اس نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں اور اللہ نے چاہا تو آپ بھی ٹھیک ہو جائیں گی۔''

''اگر تکلیفوں سے چھٹکارا پانے کو ٹھیک ہونا کہتے ہیں تو میں ضرور ٹھیک ہو جاؤں گی۔'' وہ ایک بار پھر ہولے سے مسکرائی۔

ہادی کو معلوم تھا کہ اس کی بیماری میں ایسے وقفے آتے ہیں جب وہ ایک دم بھلی چنگی لگنے لگتی ہے، بلکہ خوراک بھی لینا شروع کر دیتی ہے۔ یہ بھی یقیناً ایسا ہی وقفہ تھا۔ ہادی نے نرمی سے اس کے ہاتھ کو چھوا اور تسلی تشفی کے بول بولے۔ وہ اس کے بولوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ ''میں نے آپ سے ایک دو باتیں کرنا ہیں، لیکن ابھی نہیں۔ ڈاکٹرز راؤنڈ پر آنے والے ہیں۔''

''ٹھیک ہے حجاب! میں ادھر ہی ہوں۔ ادھر ہی رہوں گا۔ جب تک آپ ٹھیک نہ ہو جائیں۔''

اس کے ہونٹوں پر ایک بار پھر شکستہ مسکراہٹ ابھری۔

چند منٹ بیٹھ کر ہادی باہر آ گیا۔ انکل فیاض غم کی تصویر بنے سامنے کھڑے تھے۔ ہادی نے ان سے ہاتھ ملایا اور تسلی کے بول بولے۔ فیصل ایک طرف بیٹھا ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ عطا انکل اسے دلاسا دے رہے تھے۔ ہادی بھی ان کے پاس جا بیٹھا۔ اس نے فیصل کو اپنے ساتھ لگایا اور اسے حوصلہ مندی کی تلقین کی لیکن حوصلہ اس کے اپنے اندر بھی نہیں تھا۔ فیصل کی آنکھیں تر بتر تھیں۔ بہن کے لیے اس نے کیا کچھ کیا۔ ان چاہی شادی تک کی لیکن وہ پھر بھی

انکل باہر اسپتال کی لابی میں بیٹھے تھے۔ عطا انکل نے دلگیر آواز میں کہا۔ ''ہادی! وہ ختم ہو رہی ہے۔ ڈاکٹروں کے خیال میں...... اب اس کے پاس چند دن سے زیادہ نہیں ہیں۔''

''کیا مطلب انکل؟'' ہادی کی دھڑکن تھم سی گئی۔

''اس کے ساتھ کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے۔ بیماری بہت سنگین صورت اختیار کر چکی ہے۔ امریکن سرجن نے بھی تفصیلی معائنہ کیا ہے۔ غالباً اب اسے...... کہیں باہر لے جانے سے بھی کوئی فائدہ نہیں۔ کوئی معجزہ ہی اب......'' عطا انکل کا گلا پھر رندھ گیا اور وہ جملہ مکمل نہ کر سکے۔

''لیکن اسے ہے کیا انکل......؟''

''یہ بہت پیچیدہ مسئلہ ہے۔ آسان لفظوں میں یہ سمجھو کہ ہمارے دل کا اپنا ایک الیکٹرک نظام ہوتا ہے۔ دل کے ایک حصے میں قدرت نے کچھ خلیے ایسے پیدا کر رکھے ہیں جو دل کو دھڑکنے کے لیے برقی توانائی دیتے ہیں۔ بالکل بجلی کے کرنٹ جیسی طاقت۔ ہماری زبان میں اسے Sa Node کہتے ہیں۔ یہ Node ہی دراصل وہ زندگی ہے جس پر ہماری سائنس آ کر اپنے ہاتھ کھڑے کر دیتی ہے۔ یہ ''زندگی'' قدرت کاملہ سے ماں کے پیٹ میں حمل کے تیسرے چوتھے ماہ اچانک وجود میں آتی ہے اور پھر انسان کی طبعی عمر تک جاری ساری رہتی ہے۔ یہ حیران کن ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں نا کہ انسان سائنس کو جتنا زیادہ جانتا ہے اتنا ہی خدا کے وجود کو زیادہ محسوس کرنے لگتا ہے۔''

''تو کیا حجاب کے ہارٹ کے اس نظام میں خرابی ہے؟''

''خرابی ہی نہیں۔ بہت بڑا بریک ہے ہادی۔'' عطا انکل نے بے حد افسردہ لہجے میں کہا۔

''مجھے کچھ بتائیں انکل۔ میں...... سب جاننا چاہتا ہوں۔''

''یہ تمہاری سمجھ سے بالا ہوگا ہادی! اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں۔ بس یوں سمجھو کہ Sa Node زندگی کا سرچشمہ ہے۔ اس کو قدرت کا پیس میکر بھی کہتے ہیں۔ یہاں سے پیدا ہونے والی لہریں ایک چھوٹے سے واسطے کے ساتھ باریک رگوں کے ایک اور نظام تک پہنچتی ہیں، جسے ہم آخر His Purkin کہتے ہیں۔ یہ نظام ہمارے دل کو دھڑکاتا ہے لیکن یہ نظام بھی تب ہی کام کرتا ہے جب Sa

انگیج سے پہلے بھی کئی چھوٹے چھوٹے اٹیک حجاب کو ہوئے ہوں گے۔''

''تو کیا پیس میکرز وغیرہ بھی ''ہیلپ'' نہیں دے رہے؟''

''نہیں ہادی! اس خاص کیس میں پیس میکر بھی بہت پیچیدگیاں پیدا کر رہا ہے۔ چند دن پہلے دوبارہ ایک پیس میکر لگایا گیا تھا لیکن اسے اتارنا پڑا ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ Sa Node کے سگنل بڑی تیزی سے کم ہوتے جا رہے ہیں۔ اب وہ کسی بھی وقت ختم ہو جائیں گے۔ کیوں ختم ہو جائیں گے اس کا جواب ہمارے پاس نہیں۔ جس چیز کی ابتدا کے بارے میں ہم آج تک نہیں جان سکے اس کی انتہا کے بارے میں کیسے جان سکتے ہیں۔''

وہ بڑی عجیب رات تھی۔ بہت سرد اور بوجھل۔ انکل فیاض مسلسل تین دن سے اسپتال میں تھے۔ عطا انکل نے کہہ سن کر انہیں گھر بھیج دیا تھا (یہاں وہ لوگ عطا صاحب کے ہی ایک پرانے دوست کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ تین دن پہلے تک حجاب کی والدہ صوفیہ بیگم بھی یہاں تھیں۔ اب انہیں سمجھا بجھا کر واپس روم بھیج دیا گیا تھا۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ حجاب سنبھل رہی ہے)

فیصل ''آرام گاہ'' میں کچھ دیر سونے کے لیے چلا گیا تھا۔ عطا انکل باہر لابی میں بیٹھے تھے۔ ہادی کمرے میں حجاب کے پاس تھا۔ وہ بستر پر نیم دراز تھی۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ وہ ٹھہری آواز میں بولی۔ ''ہادی! میں آپ سے معافی مانگنا چاہتی ہوں۔''

''کس بات کی؟''

''آپ کو پتا ہے۔''

''مجھے نہیں پتا اور نہ کوئی ایسی بات ہے۔''

''ہے ہادی...... ہے۔'' وہ کراہ کر بولی۔ ''میں نے آپ کے منہ پر طمانچہ مارا ہادی۔ میں اس وقت مر کیوں نہ گئی...... کیوں غرق نہ ہو گئی۔ کاش ایسا ہو جاتا۔'' وہ سسک پڑی اور اس نے اپنا ہاتھ ہادی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''بس اتنی سی بات کے لیے مجھے اتنی دور سے بھگایا ہے۔'' ہادی زبردستی مسکرایا۔

''یہ اتنی سی بات نہیں ہے ہادی۔ آپ مجھے معاف کریں...... یا مجھے سزا دیں۔ میں نے ایسا کیوں کیا۔ زندگی بھر کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا اور اگر اٹھایا تو کس پر۔ کیوں میرا

نہیں تھیں اور شاید میں بھی نہیں تھا۔ میں آپ کو زبردستی ساتھ لے جانا چاہ رہا تھا۔ میرے خیال میں آپ کی جگہ کوئی بھی ہوتا، اس کا ردعمل یہی ہوتا۔''

''نہیں ہادی! آپ مجھے دل سے معاف کر دیں اور اگر نہیں تو مجھے اس قصور کی سزا دیں۔''

ہادی نے گہری سانس لی اور اس کا ہاتھ تھپتھپا کر مسکرایا۔ ''اچھا سوچتے ہیں اس بارے میں بھی۔''

''نہیں ہادی! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں......''

ہادی نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''ایسی بات نہ کہنا حجاب! آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔ آپ کو کچھ نہیں ہو سکتا۔'' اس کے لہجے میں ایسی تڑپ تھی کہ حجاب بھی چونک کر رہ گئی۔

اس نے اس کے ہونٹوں سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ وہ کتنی ہی دیر گم صم اس کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ بھی دیکھتا رہا۔ کمرے کی گہری خاموشی میں وال کلاک کی نہایت مہین ٹک ٹک سنائی دیتی تھی۔ کمرے میں اور کوریڈور میں بہت مدھم سی دودھیا روشنی تھی۔ وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ایک بات پوچھوں...... سچ جواب دیجیے گا۔''

''ہاں پوچھیں۔''

''آپ مجھ سے پیار کرتے ہیں نا؟'' اس نے اچانک کہا۔

کتنی بڑی بات کتنی آسانی سے کہہ دی تھی اس نے۔ ہادی دم بخود رہ گیا۔ بے ساختہ ہونٹ تھرائے اور ساتھ ہی پورا جسم تھرا گیا لیکن وہ کچھ بول نہ سکا۔ ''کہیے ہادی...... یہ بات ''دوستی'' سے آگے کی ہے نا۔ آپ پیار کرتے ہیں نا مجھ سے؟''

''آپ سے کس نے کہا؟'' وہ بہ مشکل بولا۔

''آپ نے کہا۔''

''کب کہا؟''

''کئی بار۔ جگہ جگہ۔'' وہ عجیب سوئے ہوئے سے انداز میں بولی۔

''میں سمجھا نہیں حجاب؟''

''آپ نے اس وقت کہا ہادی...... جب آپ نے جلال کا قرضہ اتارنے کے لیے ڈاکٹر انکل کے ساتھ مل کر

دن رات بھاگ دوڑ کی۔ اپنی چیزیں تک فروخت کیں ---- اور آپ نے ...... اس وقت کہا ہادی! جب آپ پولیس کو لے کر درس والی کوٹھی میں گھسے۔ خود کو خطرے میں ڈالا اور مجھے وہاں سے نکالا اور اس وقت کہا جب آپ کو پتا چلا کہ جلال قرضہ وصول ہونے کے بعد بھی ابو اور فیصل کو تنگ کر رہا ہے، آپ اس کے دفتر میں چلے گئے، اسے مجبور کیا کاغذوں پر دستخط کرنے کے لیے۔ مجھے عطا انکل نے سب کچھ بتا دیا ہے ہادی۔ آپ کیا کیا چھپائیں گے...... آپ نے میرے لیے ارم سے ٹکر لی یا نہیں؟ جلال کے کارندوں سے چوٹیں کھائیں یا نہیں...... اور پھر جب میں بے ہوش ہو کر روم کے اسپتال میں پڑی تھی آپ مجھے خاموشی سے دیکھنے آئے یا نہیں؟ آپ آنسو لے کر خاموشی سے پاکستان واپس چلے گئے لیکن پاکستان واپس جا کر بھی آپ کی ساری سوچوں کا رخ یہاں ہماری طرف ہی رہا۔ آپ نے سیکڑوں فون کالیں کیں ڈاکٹر انکل کو...... وہاں بھی آپ ہمارے مسئلوں کے بارے میں ہی سوچتے رہے۔ اب یہاں جو میرا علاج ہو رہا ہے اس کے لیے رقم بھی آپ کی کوششوں سے ہی اکٹھی ہوئی ہے۔ آپ نے ابو کی گجرات والی جگہ فروخت کرائی۔ آپ نے......"

"پلیز...... پلیز حب، مجھے شرمندہ نہ کریں۔" ہادی نے اس کی بات کاٹی۔

"میں اور بہت سی باتیں گنوا سکتی ہوں ہادی! چھوٹی چھوٹی، بڑی بڑی بہت سی باتیں۔" حجاب کی آنکھوں میں جمع ہونے والے آنسو اس کے شفاف رخساروں پر پھسلنے لگے۔

وہ حجاب سے نظر چرا کر ان آنسوؤں کی حرکت کو دیکھتا رہا۔ چلتے، رکتے اور پھر چلتے آنسو۔ حجاب کی آواز پھر اس کے کانوں میں گونجی۔ "بولیں ہادی! بتائیں، پیار کرتے ہیں نا مجھ سے؟ پیار کرنے لگے ہیں نا؟"

اس نے ایک طویل سانس لی۔ ہونٹوں پر زبردستی ایک مدھم مسکراہٹ بکھیری اور اس کی آنکھوں میں دیکھ کر ہولے سے بولا۔ "ہاں حجاب...... تھوڑا...... تھوڑا۔"

"نہیں نہیں۔" اس نے پورے یقین سے نفی میں سر ہلایا۔ "تھوڑا نہیں۔ بہت زیادہ کرتے ہیں، بہت زیادہ۔" وہ سسک پڑی۔ "بتائیں ایسا ہی ہے نا؟"

ہادی کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ دو آنسوؤں نے بستر کی سبز چادر پر گر کر جیسے اثبات میں جواب دیا اور خاموشی سے چادر میں جذب ہو گئے۔

"اور میں نے آپ کو مارا...... آپ کی توہین کی...... بار بار بے عزت کیا۔"

اس نے حجاب کا سرد ہاتھ تھاما اور بولا۔ "حجاب، پلیز...... اگر آپ نے ایسی ہی باتیں کرنی ہیں تو میں اٹھ کر چلا جاتا ہوں۔"

اچانک قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ہادی نے ادھ کھلی کھڑکی میں سے دیکھا۔ عطا انکل آ رہے تھے۔ اس نے رومال نکال کر جلدی سے اپنی آنکھیں صاف کیں۔ دونوں خاموش ہو گئے۔

☆☆☆

اگلے روز دوپہر کے وقت حجاب کی طبیعت پھر بگڑ گئی۔ وہ اسی طرح کھینچ کھینچ کر سانس لینے لگی جیسے کسی حبس زدہ جگہ پر اس کا دم گھٹ رہا ہو۔ رنگ زرد ہو گیا۔ طبیعت کی خرابی کے دوران میں ڈاکٹروں کی ٹیم نے اس کے کچھ ٹیسٹ کیے...... جن کی رپورٹ بھی ڈیڑھ دو گھنٹے بعد آ گئی۔ سب کچھ ویسے ہی ہو رہا تھا جیسے ڈاکٹروں نے کہا تھا۔ اگلے دو چار دن میں ہونے والا بیماری کا دوسرا یا تیسرا حملہ SCD (اچانک قلبی موت) کا باعث بن سکتا تھا۔

آنسوؤں سے تر آنکھوں کے ساتھ ہادی نے بھی ایک دو رپورٹس دیکھیں۔ حجاب کی بیماری کو Arrhythmia کا نام دیا جا رہا تھا۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ وہ شدید قسم کے ڈس آرڈر Bradycardias کا شکار ہے، جس میں دھڑکن بلاوجہ سست تر ہوتی چلی جاتی ہے۔

اس واقعے کے ایک گھنٹے بعد اسپتال کے ہی ایک کمرے میں فیاض صاحب اور ڈاکٹر عطا گفتگو میں معروف تھے۔ یہ رہائشی کمرے اسپتال کی بلڈنگ کی آٹھویں منزل پر مریضوں کے لواحقین کے لیے بنے ہوئے تھے۔ دوسرے شہروں سے آنے والے Attendants یہاں قیام کر سکتے تھے۔ حجاب کی بڑھتی ہوئی تکلیف کی بات ہو رہی تھی۔ اسی دوران میں ڈاکٹر عطا کے فون پر کال آئی۔ انہوں نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف ان کا کوئی اسسٹنٹ تھا۔ اس نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! سہ پہر کا اخبار دیکھا ہے آپ نے؟"

"نہیں تو۔"

"یہاں روم میں جلال الدین صاحب سخت مصیبت میں ہیں۔ وہ میلانو میں ایک پلازا بنوا رہے تھے۔ اس کا ایک بہت بڑا شیڈ گرا ہے، جس کے نیچے آ کر کئی راہ گیر ہلاک

اور زخمی ہوئے ہیں۔ ان پر مجرمانہ غفلت کا الزام لگا ہے کیونکہ ایسا ہی چھوٹا واقعہ وہاں ایک ماہ پہلے بھی ہوا تھا اور محکمے نے انہیں حفاظتی انتظام کے لیے سخت وارننگ دی تھی۔"

"اوہ گاڈ۔" عطا صاحب نے بے ساختہ کہا۔

"جلال الدین صاحب کے خلاف میلانو میں باقاعدہ ایک جلوس نکلا ہے اور انہیں سخت سزا دینے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ نتیجے میں اقدام قتل کا مقدمہ درج ہوا ہے۔ سنا ہے کہ وہ پہلے ہی کسی کیس میں گرفتار ہیں۔"

"ہاں گرفتار تو ہے۔"

"بہرحال، راؤ خاندان کے تین چار اور بڑوں کو بھی گرفتار کیا گیا ہے۔ گرفتار ہونے والوں میں جلال الدین کے کوئی پیر صاحب بھی شامل ہیں۔ وہ بھی شراکت دار تھے۔"

اسسٹنٹ کی کال سننے کے بعد عطا صاحب نے تھکی تھکی سی سانس لی۔ "کیا ہوا؟" فیاض صاحب نے پوچھا۔

"سچ کہتے ہیں فیاض! مصیبت آتی ہے تو تنہا نہیں آتی۔ جلال اپنے اعمال کے شکنجے میں آ گیا ہے۔ بہت کچھ ختم ہو رہا ہے اس کا۔" اس کے بعد انہوں نے فیاض کو اس واقعے کی تفصیل سے آگاہ کیا۔

"میری بچی کو بڑا دکھ دیا ہے اس نے۔" فیاض صاحب نے نم آنکھوں کے ساتھ کہا۔ "ایک موقع پر تو مجھے لگا تھا شاید میں اب کبھی اس کی صورت ہی نہ دیکھ سکوں گا۔"

"میرے خیال میں ہم اس میں ہادی کے کردار کو بھی نہیں بھول سکتے۔ اگر وہ رسک لے کر وہاں درس والی کوٹھی میں نہ جاتا تو شاید وہیں پر سب کچھ ختم ہو گیا ہوتا۔ اس نے قدم قدم پر ساتھ دیا ہے فیاض۔"

فیاض صاحب خاموش رہے۔

عطا صاحب نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "شروع میں ہمیں یہ غلط فہمی رہی کہ شاید اس کی وجہ سے جلال اور حجاب کے تعلقات مزید بگڑے ہیں لیکن اب گہرائی سے دیکھا جائے تو ایسا کچھ نظر نہیں آتا۔ تعلقات پہلے ہی بہت زیادہ بگڑ چکے تھے۔ اسی شدید گھٹن سے نکلنے کے لیے تو حجاب وینس گئی تھی سہیلی کی شادی پر۔ اب یہ بات مکمل یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ ہادی اور حجاب کی پہلی ملاقات وہیں وینس میں ہوئی اور اس کے بعد ڈیڑھ دو ماہ تک وہ صرف اور صرف دوستوں کی طرح ملے۔ ان کے تعلق میں کسی بھی کا دور دور تک شائبہ نہ تھا۔"

"تمہارا مطلب ہے عطا! وہ ابھی تک حجاب کو ایک دوست کی حیثیت سے دیکھتا ہے؟"

"نہیں...... یہاں اس معاملے میں پیچیدگی موجود ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ حجاب کو پسند کرنے لگا تھا...... اور بے حد شدت سے۔ مگر یہ اس کا ظرف ہے کہ اس نے اس بارے میں کبھی ایک لفظ حجاب سے نہیں کہا۔ اس کو شبہ تک نہیں ہونے دیا۔ میرا خیال ہے کہ وہ اب بھی ہرگز یہاں نہ آتا، اگر حجاب اس سے خود آنے کی درخواست نہ کرتی۔ اپنی محبت کے حوالے سے وہ بہت گہرا، بہت زیادہ محتاط ہے۔ اس سارے معاملے میں اس سے بس ایک چھوٹی سی غلطی ہوئی جسے بدخواہوں نے بڑھا کر کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ وہی تصویر والی۔"

"ہاں لیکن جلال کے تیور تو اس سے پہلے ہی بہت بگڑ چکے تھے۔ وہ ارم سے شادی کا پکا فیصلہ کر چکا تھا۔" فیاض صاحب نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

اسی دوران میں فیصل اور ہادی نظر آئے۔ وہ باتیں کرتے ہوئے انہی کی طرف آ رہے تھے۔ فیاض اور عطا صاحب کو خاموش ہونا پڑا......

☆☆☆

وہ ایک اور انہونیوں والی رات تھی۔ اسپتال کی دیواروں سے باہر سرد ہوائیں سرپٹخ رہی تھیں۔ اندر ماحول نیم گرم تھا۔ رات کے دو بجے تھے۔ کمرے میں ہادی، حجاب کے سامنے بیٹھا تھا۔ سہ پہر کے بعد اس کی طبیعت پھر سنبھل گئی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے ہلکا پھلکا کھانا کھایا تھا اور اسٹابری جوس پیا تھا۔ حجاب کا ہاتھ ہادی کے ہاتھ میں تھا۔ وہ حیران ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ ہادی کو دیکھ کر بولی۔ "میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا، آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے ہادی۔ لوگ...... لوگ کیا کہیں گے؟"

"ہم لوگوں کو نہیں بتائیں گے حجاب۔ ابھی کسی کو خبر نہیں ہو گی۔ صرف عطا انکل، فیصل اور انکل فیاض کو علم ہو گا...... یہاں وینس میں اور ہے بھی کون جسے پتا چل سکے۔"

"نہیں ہادی...... ابو کیسے مانیں گے......"

"میں نے کہا ہے نا حجاب! یہ مجھ پر چھوڑ دیں۔ ان کو منانا میرا کام ہے...... میں ان کے قدموں پر سر رکھ دوں گا۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکا، کروں گا۔"

وہ کراہتے ہوئے بولی۔ "ہادی! میری سمجھ میں کچھ

نہیں آرہا۔مم…… مجھ پر رحم کریں…… مجھے بہت کچھ اندازہ ہے کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔کیا آپ……ایک قبر سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔میں تو بس یہ……"

اس نے حجاب کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔"آپ کچھ نہ کہیں حجاب! مجھے پتا ہے میں دیوانوں جیسی باتیں کررہا ہوں، لیکن مجھے میری دیوانگی کے ساتھ رہنے دیں۔ مجھے آپ کے سر کی قسم ہے حجاب! میں آپ سے زندگی میں پہلی اور آخری بار کچھ مانگ رہا ہوں۔پھر کبھی نہیں۔"

اس نے پھر کچھ کہنا چاہا۔ہادی نے ایک بار پھر بڑی نرمی سے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔"نہیں حجاب…… اب کچھ نہ کہنا……اگر کچھ کہنا ہے تو پھر یہیں اس جگہ اپنے ہاتھوں سے میری جان لے لیں……"

حجاب نے آنکھیں بند کرلیں۔آنکھوں کے بیرونی گوشوں سے دو موتی نکلے اور اس کے زرد شفاف رخساروں پر رینگتے چلے گئے۔گھڑی کی سوئیاں اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ان سوئیوں کو رکنا نہیں تھا۔بہت جلد ان کے وہ چند چکر مکمل ہونے والے تھے جن کا تعین ڈاکٹروں نے کردیا تھا اور درست کیا تھا۔

وہ شاعر تھا……ایک پیدائشی تخلیق کار تھا اور اکثر تخلیق کاروں کی دنیا اور ہوتی ہے۔ان کے شب و روز جدا ہوتے ہیں۔وہ خیالوں اور تصورات میں زندہ رہتے ہیں اور جب ایسے لوگ سچے عشق کے تجربے سے گزرتے ہیں تو اکثر کیا سے کیا ہوجاتے ہیں۔ ہادی کے اندر بھی ایک بے پناہ توانائی پیدا ہوچکی تھی۔ وہی توانائی جس نے جلال جیسے دبنگ شخص کو پستول کی صرف ایک جھلک سے گھٹنوں پر گرا دیا تھا۔آج بھی توانائی کسی اور صورت میں پھر ہادی کے اندر موجزن تھی۔آج یہ توانائی انکل فیاض کو ایک ایسے کام کے لیے تیار کررہی تھی جو وہ ہرگز کرنا نہیں چاہتے تھے۔لیکن یہ توانائی اپنے اندر منہ زور پانیوں کا بہاؤ رکھتی تھی……ایک ایسے طوفانی ریلے کی طرح تھی جو بہ ظاہر خاموش ہونے کے باوجود چٹانوں کو اکھاڑتا ہے اور اپنے اندر بہا کر لے جاتا ہے۔ یہ ہادی کی توانائی نہیں تھی۔ یہ تو عشق کی خداداد قوت تھی۔

جس منزل تے عشق پہنچایا
عقل نوں خبر نہ کائی

بند کمرے میں انکل فیاض کرسی پر تھے۔ ہادی ان کے قدموں میں بیٹھا تھا۔اس کے دونوں ہاتھ انکل فیاض کے پاؤں پر تھے۔ان کے درمیان کافی لمبی بات ہوئی تھی لیکن اب پچھلے تین چار منٹ سے ہادی کی زبان پر بس یہی الفاظ تھے۔"انکل پلیز……میرے حال پر رحم کیجیے…… حجاب کے یہ دو دن ہیں……یا تین چار دن ہیں۔خدا کے لیے مجھے یہ دے دیجیے۔میں انہیں اپنی پوری زندگی سمجھوں گا۔اگر یہ دن بڑھ گئے تو یہ قدرت کی طرف سے مجھے انعام ہوگا اور اگر نہ بڑھے تو بھی میری پوری زندگی کی طرح ہوں گے۔"

پریشانی، کشمکش اور تناؤ کے بعد انکل فیاض کے چہرے پر اب نرمی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔وہ آنکھیں پھیلا پھیلا کر اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کرنے لگے۔پھر انہوں نے ہادی کے کندھے پر اپنا لرزاں ہاتھ رکھا اور بولے۔"اس طرح نہ کرو۔صوفے پر بیٹھو…… میں حجاب سے بات کرکے ہی کچھ بتا سکتا ہوں۔"

ہادی نے خلوص دل سے ان کا ہاتھ چوما اور اٹھنے سے پہلے بولا۔"انکل! میں نے آپ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ میرے دل میں جو کچھ بھی تھا لیکن حجاب نے ہمیشہ مجھے ایک اچھے دوست کی طرح سمجھا۔اب میں ہی ہوں جو اس دوستی کو ایک اور رشتہ دینا چاہ رہا ہوں۔اگر وہ مان جائیں گی تو اس دنیا میں مجھ سے زیادہ خوش قسمت انسان اور کوئی نہیں ہوگا……"

☆☆☆

یہ انہونیوں کے شب و روز تھے۔سب کچھ انوکھا ہو رہا تھا۔لمحوں نے اپنی طنابیں کھینچ لی تھیں۔وقت سمٹ گیا تھا اور وقت کے ساتھ واقعات بھی سمٹ گئے تھے، جلدی جلدی وقوع پذیر ہورہے تھے۔آج وینس میں ہادی کی تیسری شب تھی اور آج وہ ہفت اقلیم کی دولت کا مالک بن رہا تھا۔ منہ زور ریلے نے سب کو ایک طلسماتی بہاؤ میں بہا دیا تھا۔ کوئی منطق، کوئی دلیل یا وجہ راہ میں حائل نہ ہوپائی تھی۔عطا انکل نے انڈین سائیکاٹرسٹ ڈاکٹر سرفراز سے بھی آف دی ریکارڈ بات کی تھی۔انہوں نے اس "ہنگامی شادی" کے بارے میں کوئی واضح رائے نہیں دی تھی۔نہ فائدہ مند قرار دیا تھا نہ نقصان دہ۔ہاں اتنا ضرور کہا تھا کہ اگر اس قسم کی کوئی تبدیلی بہت پہلے ہوتی تو شاید نفسیاتی طور پر حجاب کو بحال کرنے میں بہت مدد دیتی۔عطا صاحب نے ڈاکٹر سرفراز سے درخواست کی تھی کہ وہ یہ بات صرف اپنے تک ہی رکھیں گے۔پی ایچ ڈی ڈاکٹر سرفراز کی باتوں سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ اخذ ہوتا تھا کہ اس قسم کی کوئی جذباتی سپورٹ (جو حجاب کو طلاق یافتہ کے زمرے سے نکال دے) اس

کے لیے بہتری پیدا کرسکتی ہے۔کم از کم اس کے آخری دن بہتر ہوسکتے ہیں۔

اس رات حجاب کی طبیعت بہتر تھی۔یوں لگتا تھا کہ وہ شدید بیمار ہے ہی نہیں۔ہادی نے یہاں وینس میں اگر انکل فیاض کو راضی کرلیا تھا تو وہاں اپنی والدہ کو راضی کرنا اس کے لیے کون سا مشکل کام تھا۔ وہ اس بارے میں کافی کچھ تو انہیں پہلے ہی بتا چکا تھا۔انہیں بھی معلوم تھا کہ بیٹے نے جو ٹھانی ہے، وہ کرکے رہے گا۔ہادی نے کوئی ایک گھنٹا پہلے فون پر ان کی بات بھی حجاب سے کروائی تھی۔

اسپتال کے اس پرائیویٹ کمرے میں بڑی خاموشی کے ساتھ حجاب سے ہادی کا نکاح ہوگیا۔عطا انکل، فیصل اور انکل فیاض اس موقعے پر موجود تھے۔ایک طرح وہ سب ایک محبت بھرے "ٹرانس" میں تھے۔آنکھیں بھیگی تھیں اور دل رقت سے بھرے ہوئے۔شرعی طور پر بھی اس نکاح میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔طلاق کے بعد حجاب کے تین ماہ چار دن کی عدت پوری ہوچکی تھی۔ایک بیمار خاتون سے نکاح کرنا بھی کہیں منع نہیں تھا۔

حجاب کے جسم پر وہی اسپتال والے سفیدی مائل کپڑے تھے۔بس اس نے ایک لمبی کامدار شال اوڑھ لی تھی اور ہادی کی محبت بھری، ناقابل مزاحمت ضد کے سامنے سر جھکا دیا تھا۔وہ جس طرح خود مختلف تھا، اس کی ضد بھی مختلف تھی۔حجاب کا رنگ زردی مائل تھا، جیسے وہ شادی کے لیے مایوں کے بستر پر بیٹھی ہو۔اس کے ایک ہاتھ میں ابھی تک ڈرپس کے لیے "برانولا" لگی ہوئی تھی اور اسی ہاتھ میں ہادی نے تھوڑی سی مہندی بھی لگا دی تھی۔

گہری خاموشی تھی۔اسپتال کے کوریڈور اور گیلریوں میں سناٹا تھا اور اس سناٹے میں جیسے ایک غیر مرئی آواز گونج رہی تھی۔چھوڑ بابل کا گھر، آج پی کے نگر مجھے جانا پڑا……یہ پی کا نگر کون سا تھا۔شاید وہی نگر جو اس کمرے میں موجود ان گنت میڈیکل رپورٹس پر لکھا ہوا تھا۔"SCD، اچانک قلبی موت" گھڑی کی سوئیاں حرکت میں تھیں۔ اس پرائیویٹ وارڈ میں صرف ایک ڈیوٹی ڈاکٹر "ڈورتھی" تھی جسے ڈاکٹر عطا نے اعتماد میں لے کر اس ساری صورت حال سے آگاہ کررکھا تھا۔وہ اس انوکھی "شادی" پر حیران تھی، خوش بھی اور غمزدہ بھی۔

رات کا باقی حصہ ہادی نے حجاب کے بستر کے پاس کرسی پر بیٹھے بیٹھے گزار دیا۔حجاب کا ہاتھ تو اس کے ہاتھ میں تھا۔انہوں نے بہت سی باتیں کیں۔حجاب نے کہا۔"ہادی میری بات کا برا نہ مانیے گا۔ہمیں حقیقت سے نظر نہیں چرانی چاہیے……میں یہاں اس کمرے میں مرنا نہیں چاہتی۔کیا کچھ ایسا نہیں ہوسکتا کہ میں کہیں کھلی فضا میں سانس لے سکوں؟"

"پھر وہی مرنے والی باتیں۔"

"پلیز ہادی! مجھے بتائیں۔" وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی۔

"میں نے اس بارے میں عطا انکل سے بات کی تھی۔وہ بھی کہتے ہیں کہ آپ کا اس وقت اسپتال سے نکلنا کسی طرح بھی مناسب نہیں اور نہ اس کی اجازت دی جائے گی۔ہاں ایک کام ہوسکتا ہے۔آٹھویں فلور پر کچھ رہائشی کمرے بنے ہوئے ہیں۔آپ ماحول کی تبدیلی کے لیے عارضی طور پر وہاں جاسکتی ہیں۔اس کے لیے بھی عطا انکل کو خصوصی "پرمیشن" حاصل کرنا پڑے گی۔"

"پلیز ہادی کچھ کریں۔نہیں تو میں ڈاکٹروں کے دیے ہوئے وقت سے پہلے ہی آپ کو خدا حافظ کہہ جاؤں گی۔"

"اور اگر آپ نے ایسی باتیں بند نہ کیں تو میں ابھی پاکستان روانہ ہونے کے لیے ائرپورٹ پہنچ جاؤں گا۔" ہادی نے اس کا کان ہولے سے کھینچتے ہوئے کہا۔

اگلا دن گزر گیا۔ہادی ہر پل اس کے پاس رہا۔پھر انہونی شبوں کے اس دورانیے میں وہ ایک اور انہونی شب تھی۔ہادی اور حجاب بلڈنگ کی آٹھویں منزل پر ایک فرنشڈ، کشادہ کمرے میں موجود تھے۔کیپسول لفٹ کے ذریعے وہ پانچ سیکنڈ میں گراؤنڈ فلور سے اوپر پہنچے تھے اور اگر خدانخواستہ کوئی ضرورت پیش آتی تو پانچ سیکنڈ میں ہی نیچے بھی اتر سکتے تھے۔شادی کے بعد یہ ایک طرح سے ان کی پہلی رات تھی۔ڈاکٹر ڈورتھی نے سرخ اور سفید گلابوں کے دو بڑے گلدستے کمرے میں رکھ دیے تھے اور ان کی خوشبو سے فضا مہک رہی تھی۔کمرے کی کھڑکیاں جگمگاتے ہوئے وینس شہر کی طرف تھیں۔روشنیوں کا ایک جمگھٹا تھا اور ان روشنیوں کی چمک آبی گزرگاہوں اور نہروں میں منعکس ہو رہی تھی۔ہاں ایسی ہی ایک شب میں وہ پہلی بار ملے تھے۔

کمرے میں پہنچتے ہی حجاب بے چین نظر آنے لگی۔ اس کی سانس بوجھل ہوگئی۔اس کے کہنے سے پہلے ہی ہادی نے کھڑکیاں کھول دیں۔کمرے میں ٹمپریچر تھوڑا سا گر گیا اسے زیادہ کرنے کے لیے ہادی نے حرارت مہیا کرنے والے ڈیوائس کو ایڈجسٹ کیا۔وہ دونوں کمبل اوڑھ کر اور

ٹیک لگا کر بستر پر بیٹھ گئے۔ بلندی سے وینس کا نظارہ دلفریب تھا۔ روشنیاں علاقوں کی نشاندہی کر رہی تھیں۔ یہ وینزیا کیپ پلیس تھی۔ یہ "مارکو" کے درودیوار تھے اور یہ ریالٹو کے مشہور پل کی روشنیاں، اسی پل کے نزدیک ایک دن حجاب نے ہادی کے کان کے پاس غبارہ پھوڑا تھا اور پھر ہنس ہنس کر دوہری ہو گئی تھی۔

ہادی نے حجاب کو اپنے ساتھ لگا لیا اور ہولے ہولے اس کے بالوں کو سہلانے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کھڑکیوں سے باہر بھی جھانک رہا تھا۔ اسے یہی لگ رہا تھا کہ وہ جاگتی آنکھوں سے ایک خواب دیکھ رہا ہے۔ حجاب نے کھوئی کھوئی آواز میں کہا۔ "ہادی ایسا تو نہیں ہوا کرتا...... آپ نے یہ سب کیسے کر لیا...... کس طرح کر لیا یہ سب کچھ۔ سب مان گئے۔ مم...... میں بھی مان گئی۔"

"بس ایک جادو ہے میرے پاس۔"

"کیسا جادو؟"

"آپ کی محبت کا جادو۔"

"کیا یہ سب کچھ راز رہ سکے گا؟"

"کیوں نہیں رہے گا۔ ہم چار لوگوں کے سوا کسی اور کو اس کا علم نہیں۔ اور جب تک ہم نہیں چاہیں گے، ہوگا بھی نہیں۔"

"جب تک کا کیا مطلب؟ دو تین دن کی تو بات ہے ساری۔"

"خبردار۔" ہادی نے پھر اس کے ہونٹوں کو ہاتھ سے ڈھانپ دیا۔ "بہ طور شوہر میرا آپ کو حکم ہے کہ اس بارے میں بات نہیں کریں گی۔ آپ کو یاد ہے کہ آپ نے روم میں کولیسیئم کی طرف جاتے ہوئے کیا کہا تھا؟"

"کیا کہا تھا؟" وہ اس کے ہاتھ کے نیچے سے ہی بولی۔

"آپ نے کہا تھا، آج ہم آخری دن مل رہے ہیں۔ میں نے کہا تھا، آپ آخری دن کہہ کر میرا مزہ خراب کر رہی ہیں۔ آپ نے جواب دیا تھا۔ آپ اس کو آخری دن کیوں کہتے ہیں۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ آج کا پورا دن ہمارے پاس ہے۔ گلاس کو آدھا خالی کیوں دیکھتے ہیں۔ آدھا بھرا ہوا کیوں نہیں دیکھتے۔"

وہ چپ ہو گئی۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک لیے وینس کی ہزار ہا روشنیوں کو دیکھنے لگی۔ جیسے خود کو ان جگمگاتی سڑکوں پر رواں دیکھ رہی ہو۔ ہادی نے اسے نرمی سے بانہوں میں سمیٹ لیا۔ اس نے اپنا سر ہادی کے سینے پر رکھ دیا۔ وہ اس کے بالوں کو چوم کر بولا۔ "کیا سوچنے لگی ہیں؟"

اس نے کھوئی کھوئی آواز میں کہا۔ "ہادی! آپ کو پتا ہے، جب جلال تہ خانے میں میرے ساتھ سختی کرتا تھا، مجھے مارتا تھا تو کیا کہتا تھا؟"

"کیا؟"

"وہ کہتا تھا...... تم اپنے اندر کی چنگاری کی بات کیا کرتی تھیں۔ اب بتاؤ کہاں ہے وہ چنگاری؟ میں خود حیران ہوتی تھی کہ جلال کا ظلم سہنے سے انکار کرنے والی وہ چنگاری کہاں گئی۔ لیکن اب مجھے پتا چلا ہے کہ وہ چنگاری کہاں تھی۔"

"کہاں تھی؟"

"یہاں۔" حجاب نے ہادی کے ساتھ لگے لگے اس کے دل کے مقام پر انگلی رکھی۔

"ہاں ہادی! وہ چنگاری اڑ کر یہاں آ گئی تھی آپ کے دل میں۔ وہ ختم نہیں ہوئی تھی، بس اس نے جگہ بدلی تھی اور یہی چنگاری تھی جو شعلہ بنی اور...... اور جلال کے دفتر میں گھسی اور اس پر لرزہ طاری کر دیا۔"

ہادی اس کی بات کی گہرائی میں کھو کر رہ گیا۔ نرمی سے اس کے بالوں کو چوم کر بولا۔ "شاید ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ...... ایسی چنگاریاں جو ظلم کے نتیجے میں چمکتی ہیں، ختم نہیں ہوتیں۔ بس جگہ بدل لیتی ہیں اور کبھی شکل بدل لیتی ہیں......"

حجاب کی دوا کا وقت قریب آ رہا تھا۔ ہادی کی نظر بار بار وال کلاک کی طرف بھی اٹھ رہی تھی۔ وقت ہونے سے صرف ایک منٹ پہلے روم سروس سسٹم پر ڈاکٹر ڈورتھی کی کال آ گئی۔ ہادی نے کال ریسیو کی۔ فرانسیسی ڈاکٹر ڈورتھی بولی۔ "آپ کی مسز ٹھیک ہیں مسٹر ہادی؟"

"یس ڈاکٹر۔"

"ان کی دوا کا وقت ہو گیا ہے۔"

"یاد دہانی کا شکریہ ڈاکٹر۔"

"اوکے۔ گڈ وشز۔" ڈاکٹر نے کہا۔

دوا اور پانی کا گلاس پاس ہی پڑے تھے۔ ہادی نے اسی طرح حجاب کو بانہوں میں لیے لیے اسے دوا کھلائی۔ اصرار کر کے تھوڑا سا جوس پلایا۔ اس نے اپنا سر پھر ہادی کے سینے سے ٹکا دیا۔ نیم وا آنکھوں سے وینس کی جادوئی روشنیوں کو دیکھنے لگی، دیکھتے دیکھتے بولی۔ "ہادی! مجھے سچ بتائیے گا۔ آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے نا؟"

"اگر سچ پوچھ رہی ہیں تو نہیں۔ میں اپنا دوسرا "آپشن" استعمال کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" وہ سینے سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"میں آپ کو سزا دینا چاہتا ہوں۔"

"جی؟" وہ کچھ بھی نہیں۔

ہادی نے اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی اور بڑی محبت سے اس کے رخسار کو چوما...... پھر اس کی ٹھوڑی کو...... پھر ناک کو...... پھر اس تابندہ پیشانی کو (جو ہمیشہ ایک چاند کی طرح اس سے ہزار ہا میل کے فاصلے پر رہی تھی)...... پھر اس کے نازک ہونٹوں کو۔ شاید یہ واقعی جاگتی آنکھوں کا خواب تھا۔ حجاب کو چھوئے بغیر بھی اس کا عشق مکمل تھا، لیکن اب یہ عشق کاملیت کی معراج کو چھو رہا تھا۔

وہ ایک جادوئی شب تھی۔ ہادی خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین شخص سمجھ رہا تھا۔ وہ حجاب کو بس اسی طرح اپنی بانہوں میں سمیٹے بیٹھا رہا۔ اس کے کانوں میں محبت بھری سرگوشیاں کرتا رہا۔ تب وہ اس کے سینے پر سر رکھے رکھے سو گئی۔ ہادی نے مدھم روشنی میں اس کا چہرہ دیکھا۔ وہاں ایک سکون بھری مسکان کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ہادی نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہیں کی کہ کہیں وہ جاگ نہ جائے۔ پھر وہ بھی سو گیا۔

صبح دن چڑھے اس کی آنکھ کھلی۔ وہ اسی طرح اس کے سینے پر سر رکھے لیٹی تھی۔ آنکھیں بند تھیں...... ایک دم وہ بری طرح چونک گیا۔ اس نے اسے ہلایا۔ "حب...... حب۔"

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ہولے سے بولی۔ "نہیں...... ابھی کچھ نہیں ہوا۔"

ہادی کے سارے بدن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگی تھیں۔

وہ کچھ دیر بعد سرگوشی میں بولی۔ "آپ کو پتا ہے، آج کیا ہے؟"

"کیا ہے؟"

"ابو کی برتھ ڈے ہے۔ ان کو بتائیے گا نہیں۔ شام کو ایک چھوٹا سا کیک لے آئیے گا اور کوئی تحفہ بھی۔ میں ابھی سوچ کر بتاؤں گی۔"

"ایز یو لائیک۔" ہادی نے اپنی انگلیوں سے اس کے بالوں میں کنگھی کی۔

سارا دن انہوں نے نیچے اسپتال کے گراؤنڈ فلور پر ہی گزارا۔ حجاب کے دو تین ٹیسٹ بھی ہوئے جن میں ایکو گرافی بھی شامل تھی۔

شام کے بعد وہ ایک بار پھر آٹھویں فلور کے رہائشی اپارٹمنٹ میں موجود تھے...... بعد میں فیصل، ڈاکٹر عطا اور فیاض صاحب بھی وہیں آ گئے۔ فیاض صاحب نے حجاب کے ساتھ مل کر کیک کاٹا۔ حجاب اور فیصل نے انہیں تحفے دیے۔ حجاب کا تحفہ ایک خوب صورت سی رسٹ واچ تھی، چمڑے کے بہت نرم اسٹریپ والی۔ فیاض صاحب نے رسٹ واچ کو چوما اور پھر حجاب کو اپنے ساتھ لگا کر اس کے سر پر اپنی ٹھوڑی رکھ دی۔ وہ آنسو چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔

وہ بڑی خوشگوار رات تھی۔ حجاب کی طبیعت بھی بہت اچھی تھی۔ وہ سب کمرے میں ہی موجود رہے اور رات کے آخری پہر تک باتیں کرتے رہے۔ حجاب چھوٹی چھوٹی باتوں اور چھوٹی چھوٹی یادوں میں جیسے کھو سی گئی۔ اس نے سیل فون پر روم میں اپنی امی سے بھی طویل بات کی۔ انہیں اپنی خیریت اور تندرستی کے بارے میں بتایا۔ وہ خود چراغ کی طرح ٹمٹما رہی تھی مگر اس حالت میں بھی اسے اپنی امی کی صحت کی غیر معمولی فکر تھی۔ وہ وہیں سے کھانے پینے کے تحفے دے

وہ لوگ...!

☆ کتنے کم ظرف ہوتے ہیں، جو دوسروں کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔

☆ کتنے اچھے ہوتے ہیں، جو بے غرض دوسروں کے کام آتے اور سچی محبت کرتے ہیں۔

☆ کتنے سنگدل ہوتے ہیں، جو دوسروں کا سکون لوٹ کر خوش ہوتے ہیں۔

☆ کتنے بدقسمت ہوتے ہیں، جو سچائی اور خلوص کی قدر نہیں کرتے۔

☆ کتنے عظیم ہوتے ہیں، جو دوسروں کی غلطیوں کو معاف کرتے ہیں۔

☆ کتنے کھوکھلے ہوتے ہیں، جن کے قول و فعل میں تضاد ہوتا ہے۔

☆ کتنے ایثار پسند ہوتے ہیں، جو دوسروں کی خوشیوں پر اپنی خوشیاں قربان کر دیتے ہیں۔

☆ کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں، جو اللہ کی خوشنودی کے لیے اس کے بندوں سے پیار کرتے ہیں۔

رہی تھی اور پتا نہیں کیا کہہ رہی تھی۔ اس نے اپنی بھابی یعنی فیصل کی بیوی سے بھی بات کی اور اسے اپنے حوالے سے تسلی دی۔ ای سے بات ختم کرتے ہوئے اس نے فون پر انہیں الوداعی بوسہ دیا اور اس کی آنکھوں میں ایک مسرت آمیز طمانیت کروٹیں لینے لگی۔

اور یہ اگلی شب تھی۔ شام کو تھوڑی دیر حجاب مضمحل رہی تھی۔ بہرحال دو انجکشن لگنے کے بعد پھر بہتر ہوگئی تھی۔ وہ دونوں آٹھویں فلور کے اسی کمرے میں موجود تھے جہاں جگمگاتا وینس شہر اپنی ساری رعنائیوں اور یادوں کے ساتھ ان کے قریب تر آجاتا تھا اور وہ اس میں کھو جاتے تھے۔ وہی پرسوں والا منظر تھا۔ حجاب کے کہنے سے پہلے ہی ہادی نے باہر کی طرف کی کھڑکیاں کھول دی تھیں۔ وہ دونوں کمبل لیے بستر پر نیم دراز تھے۔ ہادی نے ابھی کچھ دیر پہلے ہی اپنے ہاتھ سے اسے کھانا کھلایا تھا۔ اس کے بالوں میں کنگھی کی تھی، اس کے ناخن تراشے تھے اور اس کی مہندی والی ہتھیلی کو چوما تھا۔

جب وہ اس کی ہتھیلی کو اپنی انگلیوں سے سہلا رہا تھا، حجاب نے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔ ”میں آپ سے پیار کرنے لگی ہوں۔“

”شکریہ۔“

”لیکن بہت دیر کردی میں نے۔“

”کیا مطلب؟“

وہ جلدی سے بات بدل کر بولی۔ ”یہ بات مجھے کل رات ہی کہہ دینی چاہیے تھی، کتنی پیاری چاندنی تھی، آج تو ہلکے بادل ہیں۔“

ہادی نے اسے ذرا غور کر دیکھا۔ وہ تازہ گلدستے کے سفید گلابوں پر انگلی پھیرنے لگی۔ کمرے میں گلابوں کی خوشبو جیسے رس بس گئی تھی۔ ہر شے مہکتی ہوئی محسوس ہوتی تھی...... وہ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ چھوٹی چھوٹی خوب صورت باتیں، جنہیں سن کر آنکھوں میں کنول کھلتے تھے اور جنہیں کہہ کر اپنے ہونٹوں پر ہی پیار آنے لگتا تھا۔

رات آگے کو سرکتی رہی۔ ہادی نے اسے بانہوں میں لے کر اس کی روشن پیشانی پر طویل بوسہ دیا۔ اس نے اپنا نچلا ہونٹ آہستہ سے دانتوں میں دبایا اور ہادی کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کیا کریں گے میرے بعد؟“

ہادی کے دل پر گھونسا سا لگا، پھر سنبھل کر بولا۔ ”شاید کبھی شادی نہیں کروں گا۔ بس وینس اور روم کی ان گلیوں میں گھوما کروں گا۔ ایسے شعر لکھوں گا جو دل والوں کو تڑپا دیں گے، لیکن اگر یہ ہوا بھی تو پتا ہے کب ہوگا؟“

”کب ہوگا؟“

”جب آپ پینسٹھ سال سے اوپر کی ہوجائیں گی اور میں ستر بہتر کا ہوں گا۔ ہمارے بہت سے بچے ہوں گے اور ان کے بچے بھی۔“

”واقعی؟“ اس نے ہادی کے سینے میں جذب ہوتے ہوئے کہا۔

”واقعی۔“ ہادی نے جواب دیا۔

لیکن...... وہ اسی رات مرگئی...... دنیا سے رخصت ہوگئی، ڈاکٹروں کے کہنے کے عین مطابق۔ بس دس بیس گھنٹوں کا فرق ہی پڑا ہوگا۔ رات کے دو بجے تھے جب ہادی کی بانہوں میں چھپے چھپے اور اس کے سینے سے لگے لگے اس کی سانس بوجھل ہونے لگی۔

”کھڑکیاں کھول دیں ہادی۔“ وہ کسمسائی۔

”کھڑکیاں کھلی ہیں حب۔“

”نہیں، ساری کھول دیں، میرا دم گھٹ رہا ہے۔“

”ساری کھلی ہیں حب۔“

اس نے تصدیق کے لیے ہادی کے سینے سے سر اٹھا کر دیکھا۔ مگر جیسے اسے کھڑکیاں نظر نہیں آرہی تھیں، نہ وینس نظر آرہا تھا۔ نہ اس کی نہریں اور سڑکیں جن پر ماضی کی ایک سہانی شب کی یادیں بکھری ہوئی تھیں۔ وہ تو جیسے ایک تاریک ”بیسمنٹ“ کو ہی دیکھ رہی تھی۔ ڈاکٹر ڈورتھی کی ہدایت کے عین مطابق ہادی نے کال بیل کا سرخ بٹن دبا دیا۔ ایک منٹ کے اندر اندر اسپتال کا چاق وچوبند عملہ ”پورٹ ایبل بیڈ“ کے پاس پہنچ گیا۔ وہ ہادی کے سینے سے لگے لگے بولی۔ ”ہادی! مجھے کہیں نہ بھیجیں۔ مجھے یہیں رکھیں۔ بس ابو کو یہاں بلالیں۔“

”وہ بھی آجاتے ہیں حب۔ ابھی ہمیں نیچے جانا ہے۔“

اس نے خود کو بہ مشکل حجاب سے علیحدہ کیا۔ عملہ اس کے بیڈ کو تیز رفتار لفٹ کی طرف دوڑاتا چلا گیا۔

چند منٹ بعد جب اسے آکسیجن لگی ہوئی تھی اور اسے انتہائی نگہداشت یونٹ میں لے جایا جارہا تھا، اس نے بائیں ہاتھ میں ہادی کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ دائیں ہاتھ میں اس کے ابو کا ہاتھ تھا۔ وہ جیسے ان دونوں ہاتھوں کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ انہیں آخر تک چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ شاید دنیا کی...... ہر ”حجاب“ کے لیے یہ دونوں ہاتھ اہم ترین ہوتے ہیں۔ زندگی اور موت کے سارے کٹھن

مرحلوں میں وہ ان ہاتھوں کو تھامے رکھنا چاہتی ہے۔

جب وینس کی سہانی شب ختم ہورہی تھی...... وینس کی لڑکی بھی ختم ہوگئی۔ اس نے اپنا نازک چہرہ اسپتال کی ہلکی سبز چادر میں ڈھانپ لیا۔ ہادی نے دھاڑیں مار کر روتے ہوئے انکل فیاض کو اپنی بانہوں میں لے لیا اور انہیں سہارا دیتا ہوا اسپتال کے سی سی یو سے دور لے آیا۔ ”نہیں انکل...... نہیں انکل۔“ وہ بار بار کہہ رہا تھا۔

☆☆☆

حجاب کی موت پر ہادی نے بس چند آنسو ہی بہائے تھے...... لیکن باقی آنسو کہاں تھے؟ وہ بیکراں پانی، وہ سمندر؟

وہ دل میں تھا، ٹھہرا ہوا تھا لیکن اس میں طوفانی ہلچل تھی۔ ہادی نے روم میں حجاب کی آخری رسومات میں بڑی خاموشی سے شرکت کی۔ اس کی میت کو کندھا بھی دیا، اس کی قبر پر مٹی بھی ڈالی، اس کے لیے دعا کے واسطے ہاتھ بھی اٹھائے۔ لیکن کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہے اور اس مرنے والی سے اس کا کتنا قریبی رشتہ ہے، یہ بات ایک راز تھی اور ہمیشہ راز ہی رہنا تھی۔

وہ واپسی سے پہلے خالہ صوفیہ سے بھی ملنا چاہتا تھا لیکن وہ کسی دوسرے عزیز کے گھر میں تھیں۔ انہیں ان سارے دلخراش معاملات سے فی الحال بالکل بے خبر رکھا گیا تھا۔

روم چھوڑنے سے دو دن پہلے ہادی رات کے وقت اکیلا ہوٹل سے نکلا اور اس مسلم قبرستان میں پہنچا جہاں وہ ابدی نیند سو رہی تھی۔ اسے لگا کہ یہ اس کی اسی شریک حیات کی قبر ہے جو برسوں اس کے ساتھ رہی ہے۔ وہ اس کی قبر کے پاس دو زانو بیٹھ گیا۔

یہ عشق نہیں آساں......

اس کے دل کے اندر سے کسی نے پکار کر کہا۔ نیم تاریکی تھی اور خاموشی تھی۔ دل میں ٹھہرا ہوا پانی حرکت کرنے لگا...... اچھال میں آگیا۔ وہ اس کی قبر پر رویا...... اور ایسا رویا کہ دل میں کوئی حسرت نہ رہی۔ نجانے یہ کتنا دورانیہ تھا۔ ایک گھنٹا...... دو گھنٹے یا اس سے زیادہ۔

”میرے بعد کیا کریں گے؟“ حجاب کی آواز کانوں میں گونجی۔

”شاید کبھی شادی نہیں کروں گا۔ بس وینس اور روم کی ان گلیوں میں ہی گھوما کروں گا اور ایسے شعر لکھوں گا جو دل والوں کو تڑپا دیں۔“

"ٹائم ختم ہوا جناب!" قبرستان کے "مسلمان اطالوی" چوکیدار کی پاٹ دار آواز آئی۔ وہ اس کی قبر پر الوداعی نظر ڈال کر اٹھ کھڑا ہوا۔ چلتا گیا...... چلتا چلا گیا۔ وہ روم کی ان ان جگہوں پر گیا جہاں وہ حجاب سے ملا تھا۔ دیکھتا رہا، سوچتا رہا۔ یہاں وہ بیٹھتی تھی، یہاں وہ ہنستی تھی، یہاں اس نے درخت سے ٹیک لگائی تھی۔ یہاں انہوں نے پھول خریدے تھے۔ یہ سب کچھ ویسا ہی تھا مگر وہ چلی گئی تھی، کبھی ان جگہوں پر واپس نہ آنے کے لیے۔ اور جاتے جاتے کہہ گئی تھی، میں آپ سے پیار کرنے لگی ہوں۔ ہاں مرنے سے صرف تین گھنٹے چالیس منٹ پہلے، اس نے کہا تھا، میں آپ سے پیار کرنے لگی ہوں۔ آہ...... یہ کیسا اقرار تھا۔ وہ سب کچھ جیسے ایک خیال کی طرح تھا۔ اردگرد ورد کے زرد غبار کے سوا اور کچھ نہیں تھا...... وہ ہوٹل پہنچا...... اس نے ہوٹل چھوڑا، اسٹیشن پر آیا۔ یہ سب کچھ ایک دھندلاہٹ میں چھپا ہوا تھا۔

اگلے روز اس نے خود کو ٹرین میں پایا۔ وہ وینس جا رہا تھا۔ آرام دہ نشست پر دراز، کھڑکی سے لگے لگے، وہ اونگھنے لگا۔ نیند اور بیداری کی درمیانی کیفیت میں اس کا تصور ایک بار پھر حجاب کو اس کے سامنے لے آیا۔ اس نے چٹکیلا گلابی جوڑا پہن رکھا تھا۔ ہاتھ پر وہی مہندی تھی جو ہادی نے لگائی تھی۔ پیشانی کا بے مثال چاند روشن تھا۔ وہ بولی۔ "آپ دکھی نہ ہوں، آپ نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے اور آخر میں میری موت کو بھی ایک سنہری موڑ دیا ہے۔ آپ سوچیں اگر میں اسی بیسمینٹ میں مرجاتی، بغیر روشنی دیکھے، بغیر کھلی ہوا میں سانس لیے، اپنے پیاروں سے ملے...... تو نجانے میری روح کب تک بھٹکتی رہتی۔ اب یہ سب نہیں ہوا اور وہ ہوا ہے جس کی میں نے کبھی توقع نہیں کی تھی۔ میں نے ان تین دنوں میں تین زندگیاں جی لی ہیں ہادی۔ میں خوش ہوں۔ آپ بھی آنسو پونچھ لیں۔" پھر اس نے گلابی آنچل آگے بڑھایا اور اپنے ہاتھ سے ہادی کے آنسو پونچھ دیے۔ اس کے آنچل میں سرخ و سفید گلابوں کی مہک تھی، پھر وہ اوجھل ہوگئی۔

وہ جیسے چونک کر سیدھا ہو بیٹھا۔ گاڑی اپنی رفتار سے جا رہی تھی۔ اسے اپنے اردگرد واقعی سرخ و سفید گلابوں کی مہک محسوس ہوئی۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنے سینے میں غم کے شعلوں کو قدرے دھیما محسوس کیا...... ہاں، اگر واقعی وہ اس بیسمینٹ میں گھٹ گھٹ کر مرجاتی تو یہ سانحہ مزید کتنا اندوہناک ہوجاتا۔

اس رات وہ وینس میں اترا اور جانے پہچانے راستوں پر چلنے لگا۔ وینس کی نہروں میں آبی بسیں رواں تھیں، آبی ٹیکسیوں میں خوش و خرم جوڑے قہقہے بکھیر رہے تھے، وہ چلتا چلتا اسی سڑک پر پہنچ گیا جہاں حجاب سے پہلی بار ملا تھا۔ یہ وہی سڑک تھی، وہی موڑ تھا، سامنے ہی وہ ریستوران نظر آرہا تھا اور وہ چھتری بھی جو حجاب نے اٹھائی گیرے کے راستے میں گرائی تھی اور اس موڑ کے پاس ہی آبی گزرگاہ کا پانی چمک رہا تھا۔ یہ سمندر کا حصہ تھا اور اس لحاظ سے سمندر ہی تھا۔ کناروں پر روشنیوں کے ہزار ہا جگنو اطالوی موسیقی کی لہروں پر رقصاں تھے۔ چند اچھی چیزیں لکھنے کے لیے اس سے بہتر جگہ اور کون سی ہوسکتی تھی۔ اس سے زیادہ گداز دل میں کہاں پیدا ہوسکتا تھا۔ اس نے پارکر کا قلم اور نوٹ بک نکال لی۔ درد روشنائی کی طرح تھا لیکن جب روشنائی ضرورت سے زیادہ ہو تو لفظ پھیلنے لگتے ہیں۔ اس نے ذرا انتظار کرنا مناسب سمجھا اور نئی چیز لکھنے سے پہلے ایک پرانی چیز پڑھنے لگا۔ حجاب اور اس کے سارے حالات اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے۔

"اور تم جانتے ہو کاسابیانکا کون تھا...... کاسابیانکا اطاعت اور فرمانبرداری کی لازوال مثال تھا۔ وہ بحری جہاز کے آفیسر کا لخت جگر تھا اور جب کھلے ویران پانیوں میں انگریزوں نے حملہ کیا، جب جہاز کو آگ لگی...... اور ہر طرف تہلکہ مچا، لشکریوں کی آہ و بکا سے عرشے لرزنے لگے تو باپ نے کاسابیانکا کو ایک جگہ کھڑا کیا اور کہا...... کاسا! یہاں کھڑے رہنا، جب تک میں نہ کہوں۔

اور وہ کہہ کر چلا گیا اور وہ بارود کی بارش میں موت کا شکار ہوا اور بیٹا، باپ کے حکم پر اسی جگہ کھڑا رہا۔ اس کے گرد موت نے اپنے گھیرے تنگ کیے لیکن وہ ہلا نہیں۔ وہ کیسے ہلتا؟ ابھی اس کے باپ کا حکم نہیں تھا اور وہ اسی جگہ کھڑا کھڑا مرگیا...... اور وہ اطاعت کی لازوال مثال تھا۔

میں نے کاسابیانکا کو نہیں دیکھا لیکن میں نے روم کی روشنیوں میں چمکتی دمکتی ایک لڑکی کو دیکھا ہے۔ وہ بھی اپنے باپ کے حکم پر ایک جلتی ہوئی چاردیواری میں کھڑی رہی۔ اس کے نازک پاؤں جل گئے، اس کا کومل بدن جھلس گیا۔ وہ درد سے کراہتی رہی...... اور کراہتی رہی...... ہاں میں نے کاسابیانکا کو نہیں دیکھا لیکن روم کی اس لڑکی کو دیکھا ہے۔"

زندگی کے نشیب و فراز گھٹن زدہ
ماحول اور حدود قیود سے نبرد آزما
باہمت حسینہ کی داستان کا اختتام

نیکی برباد

تنویر ریاض

کبھی کبھی نیکی کرکے بھی انسان کو پچھتانا پڑتا ہے اور دل چاہتا ہے کہ اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی نیکی برباد کردی جائے اور ایسا جب ہی ہوتا ہے جب کوئی حوصلہ آزمانے پر تل جائے تو برداشت ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ ہمسائے جب "ہردم کے سائے" بن جائیں تو جان چھڑانا مشکل ہوجاتا ہے۔

دل میں کدورت، ہونٹوں پہ ہنسی...... دو پڑوسنوں کی رسا کشی

ایرس فارم مارکیٹ میں خریداری کرنے میں مصروف تھی کہ اس نے دو عورتوں کو آپس میں باتیں کرتے ہوئے دیکھا، وہ انہیں جانتی تھی۔ وہ دونوں ویلس خاندان کے ہاں ہفتہ کے روز ہونے والی پارٹی کے بارے میں گفتگو کررہی تھیں جو وہ اپنے بیٹے جیسن کی کامیابی کی خوشی میں دے رہے تھے۔ اس نے حال ہی میں قانون کا امتحان پاس کیا تھا۔ ان میں سے ایک عورت کہہ رہی تھی کہ ویلس خاندان نے اپنے بیٹے کے گریجویشن کرتے ہی آبائی شہر

لانگ آئس لینڈ میں بہت بڑی پارٹی دی تھی اور اب وہ اپنی موسم گرما کی رہائش گاہ پر دوستوں کے لیے یہ تقریب منعقد کر رہے تھے۔

ایرس کو اس بات کا بہت صدمہ ہوا کہ اسے اس پارٹی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ اس موضوع پر ان عورتوں سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے کچھ خریدے بغیر ہی مارکیٹ سے روانہ ہوگئی۔ گھر آنے کے بعد بھی وہ سارا دن اسی الجھن میں مبتلا رہی لیکن جب شام کو بین سے اس کی ٹیلی فون پر گفتگو ہوئی تو اس نے اسے اس پارٹی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا کیونکہ جانتی تھی کہ وہ اپنے کام میں بہت مصروف ہے اور اس کی بات توجہ سے نہیں سنے گا۔

بدھ والے دن بھی اس کی بے چینی عروج پر رہی۔ وہ جب بھی کسی کام سے باہر جاتی مثلاً باغ میں کام کرنے یا کتوں کو ٹہلانے کے لیے تو گھر واپس آنے کے بعد اپنی آنسرنگ مشین ضرور چیک کرتی لیکن اسے کوئی پیغام نہیں ملا۔ اس روز اسے واحد فون کال رات نو بجے بین کی جانب سے موصول ہوئی۔ یہ بتانے کے لیے کہ اس کا کام ختم ہوگیا ہے اور وہ بہت جلد واپس آنے والا ہے۔ اس کی آمد ایک روز بعد متوقع تھی۔

''گویا تمہیں ایک اور مشکل دن گزارنا ہوگا۔'' ایرس نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

''میرے لیے تو یہ ایک ہفتہ کے برابر ہے۔ دل چاہ رہا ہے کہ اڑ کر تمہارے پاس پہنچ جاؤں اور اس ویک اینڈ پر خوب آرام کروں۔''

''پریشان مت ہو میری جان۔'' ایرس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''میں اس کا پورا انتظام کر دوں گی۔''

''جانتا ہوں کہ تم ایسا کر سکتی ہو۔ اس وقت کیا کر رہی ہو؟''

''تمہیں یاد کر رہی ہوں۔ اس کے علاوہ سب خیریت ہے۔''

''اور کتے کیسے ہیں؟''

''وہ بھی ٹھیک ہیں۔''

جمعرات کی صبح اس نے اپنے باغ سے فالتو گھاس صاف کرنے کا پروگرام بنایا جو ڈرائیو وے کے قریب داخلی دروازے پر اگ آئی تھی۔ یہاں سے وہ سڑک پر آنے جانے والوں کو دیکھ سکتی تھی جو ان کے گھر کے پاس سے گزر رہی تھی۔ اسے وہاں کام کرتے ہوئے ایک گھنٹا ہوا ہوگا کہ نینسی ویلس وہاں سے گزری۔ اس نے ایرس کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور کوئی بات کیے بغیر آگے بڑھ گئی۔ ایرس کی آنکھیں اس کی بی ایم ڈبلیو پر جم کر رہ گئیں۔ اسے نینسی کی بے اعتنائی پر بے حد افسوس ہو رہا تھا۔ جلد ہی یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی کہ نینسی نے اسے پارٹی میں مدعو نہیں کیا تھا۔ اس لیے شرمندگی کی وجہ سے بات کرنے سے کترا رہی تھی۔

جمعرات کی شام بین نے اسے کافی تاخیر سے فون کیا۔ وہ ابھی تک دفتر میں ہی تھا اور اسی وقت ایک میٹنگ بھگتا کر فارغ ہوا تھا۔ اس کی آواز سے ہی تھکاوٹ کا احساس ہو رہا تھا۔ ایرس کے دل میں اس کے لیے ہمدردی کے جذبات جاگ اٹھے اور وہ بڑی لگاوٹ سے بولی۔

''کل جلدی آنے کی کوشش کرنا۔''

''میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا۔''

جمعہ کی صبح اس نے سیاہ توت کی چٹنی بنائی۔ یہ بین کی پسندیدہ ڈش تھی۔ جنگل کے عقبی حصے میں سیاہ توت خوب اگتے تھے۔ ایرس انہیں اکٹھا کر کے محفوظ کر لیتی اور پھر سیزن کے ختم ہو جانے کے بعد بھی ان کی چٹنی اور جام بناتی رہتی۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے ڈونگے کو ٹھنڈا ہونے کے لیے سب سے اوپر والے خانہ میں رکھ دیا تاکہ کتوں کی پہنچ سے دور رہے پھر انہیں مایوسی کے عالم میں گھر میں چھوڑ کر ٹماٹر اور سلاد لینے کے لیے مارکیٹ کی طرف روانہ ہوگئی۔ بین کو سلاد بہت پسند تھی اور وہ اس کے لیے خاص اہتمام کرتی تھی۔ یہ اشیا خریدنے کے بعد وہ سویٹ کارن لینے کے لیے دوسری دکان پر گئی۔ وہ جانتی تھی کہ بین تازہ مکئی کے دانے دیکھ کر خوش ہو جائے گا۔ وہ مزید کچھ چیزیں خریدنا چاہ رہی تھی لیکن اسے ڈر تھا کہ کہیں اس دوران جان پہچان کی کوئی عورت نہ مل جائے اور ویلس کی پارٹی کے بارے میں باتیں کرنا شروع کر دے۔ وہ اس تکلیف دہ موضوع پر گفتگو کرنے سے کترا رہی تھی۔ فارم مارکیٹ سے وہ اٹالین مارکیٹ گئی۔ وہاں سے اس نے رات کے کھانے کے لیے گوشت کے پارچے اور ہفتہ کے لیے مرغی خریدی۔ اسے یاد آیا کہ بین کو آلو کی سلاد بھی بہت پسند ہے اور وہ چکن کے ساتھ اسے بڑے شوق سے کھاتا ہے۔ ایرس کی دادی جرمن تھی اور اس نے اسی سے یہ سلاد بنانے کا طریقہ سیکھا تھا۔

جمعہ اور ہفتہ کے لیے ڈھیر ساری خریداری کرنے کے بعد جب وہ گھر پہنچی تو کتے بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ انہیں اپنے ساتھ لے جاتی لیکن کار میں گرمی سے وہ بے حال ہو جاتے۔ بین کا کتا گرز دوڑ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ یہ اس کی عادت تھی۔ ایرس جب بھی گھر میں داخل ہوتی تو وہ اسی طرح کیا کرتا۔ چھوٹا کتا منگو اس کے اردگرد چکر لگا کر بھونکتا رہا گویا اپنی ناراضی کا اظہار کر رہا ہو۔ ایرس کے لیے ان دونوں کتوں کی موجودگی بہت بڑا سہارا تھی کیونکہ بچے اپنی زندگی میں مگن ہو کر اس سے دور ہو چکے تھے۔ بیٹی میری ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد سلیکون ویلی کی ایک فرم میں ملازمت اختیار کر چکی تھی جبکہ بیٹا بین جونیئر اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ سیویلی میں گرمیوں کی چھٹیاں گزار رہا تھا۔

ایلس نے دونوں کتوں کو پچکارا اور کھانے کا سامان لے کر کچن میں چلی گئی۔ رات کے کھانے کے لیے اس نے جھینگے نکالے۔ انہیں ابال کر صاف کیا اور ٹکڑوں میں کر کے فریج میں رکھ دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے دوپہر کا کھانا کھایا اور لونگ روم میں بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگی لیکن اس کا دھیان اخبار سے زیادہ ویلس کی پارٹی میں تھا اور وہ اسی کے بارے میں سوچے جا رہی تھی۔

''اس کتیا کے لیے میں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ وہ جب یہاں آئی تو کسی کو نہیں جانتی تھی۔ میں نے اسے اچھے اچھے لوگوں سے متعارف کروایا اور بتایا کہ کس دکان سے اچھی چیزیں مل سکتی ہیں۔ گزشتہ گرمیوں میں جب وہ لوگ بحری سفر پر گئے تو ان کی غیر موجودگی میں بلیوں کو نہلانے اور کھلانے پلانے کی ذمے داری بھی اپنے سر لے لی۔ اس کے باغ اور لان کی دیکھ بھال کی۔ اس نے مجھ سے پودے مانگے تو میں نے خوشی خوشی اس کی فرمائش پوری کی۔ میں جب بھی نئے پودے لے کر آتی تو وہ انہیں دیکھنے کے بہانے آتی اور مجھ سے مانگ کر ان میں سے کچھ پودے لے جاتی۔ اس کی یہ عادت جاننے کے باوجود میں اسے نئے پودوں کے بارے میں بتاتی اور بے وقوف بن جاتی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے میرے گھر صفائی کرنے والی عورت کو زیادہ تنخواہ کا لالچ دے کر اپنے پاس بلا لیا اور مجھے ابھی تک اس کی جگہ مناسب عورت نہیں مل سکی۔''

ایرس نے غصہ میں آ کر اخبار ایک طرف پھینکا اور بے چینی سے گھر میں ٹہلنے لگی۔ کتے بھی سمجھ گئے کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ چنانچہ وہ بھی اس کے ساتھ ہو لیے۔ وہ ڈائننگ روم، کچن، ہال وے میں چکر لگاتی رہی پھر واپس کچن میں آ گئی۔ اس نے سوچا کہ فرش کی صفائی کر دے۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی لیکن وہ اپنے آپ کو کسی کام میں مصروف رکھنا چاہ رہی تھی تاکہ اس کے ذہن میں ویلس کی پارٹی کا خیال نہ آئے۔

اس نے خوب رگڑ رگڑ کر فرش صاف کیا۔ یہاں تک کہ وہ شیشے کی طرح چمکنے لگا۔ گھڑی پر نظر ڈالی تو تین بج رہے تھے۔ کتوں کو باہر لے جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ وہ انہیں اتنا تھکا دینا چاہتی تھی کہ وہ بین کے آنے پر اسے تنگ نہ کریں اور شاید اس چہل قدمی سے اسے بھی کچھ سکون مل جائے۔ وہ اوپر گئی اور لباس تبدیل کر کے نیچے آ گئی۔ اب اس نے ٹی شرٹ اور شارٹس کے بجائے جینز اور لمبی آستینوں والا بلاؤز پہن رکھا تھا پھر اسٹور میں جا کر اس نے جاگرز پہنے اور کتوں کو اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

''چلو بچو! ہمارے باہر جانے کا وقت ہو گیا۔''

دونوں کتے چھلانگیں مارتے ہوئے اس کے پاس آئے اور اچھل کود کرنے لگے۔ اس نے ان دونوں کے گلے میں بندھا ہوا پٹا سنبھالا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ گھر کے پیچھے سے گزرنے والی اس سڑک پر جائے گی جو جنگل کی طرف جاتی ہے۔ وہاں راستے میں ایک دلدل تھی جہاں اکثر بطخیں جمع ہو جاتی تھیں۔ ایسی صورت میں اسے دونوں کتوں کی زنجیروں کو مضبوطی سے تھامنا پڑتا کیونکہ ذرا سی ڈھیل ملنے پر بڑا کتا گرز دلدل میں چھلانگ لگا دیتا۔ اسے اس کے تیرنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن وہ ڈرتی تھی کہ کہیں کوئی حادثہ نہ ہو جائے اور اگر کتے کو کچھ ہو جاتا تو وہ بین کا سامنا نہیں کر سکتی تھی کیونکہ وہ اس سے بہت محبت کرتا تھا۔

دلدل سے آگے ایک پہاڑی تھی جس پر بنی ہوئی پگڈنڈی پر چل کر وہ دوسری جانب اتر جاتی اور مکان کے دوسری جانب بنے ہوئے تالاب پر پہنچ جاتی۔ وہ ایسی جگہ تھی جہاں کتے کو تیرنے کی اجازت دی جا سکتی تھی اور اس تالاب میں اس کے لیے کوئی خطرہ بھی نہیں تھا۔ چھوٹے کتے منگو کو تیرنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ پانی سے نفرت کرتا تھا۔ جتنی دیر گرز تالاب میں رہتا۔ وہ تالاب کے کنارے پر دوڑتا اور اس پر بھونکتا رہتا۔

ایرس جنگل کی طرف جانے والی سڑک پر چلی جا رہی تھی اور دونوں کتے بھی اچھلتے کودتے اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ یہ سڑک ایک صدی یا اس سے بھی زیادہ پرانی تھی اور اگر بین اس کی صفائی ستھرائی کا خیال نہ رکھتا تو وہاں بھی گھاس پھوس اور خودرو جھاڑیاں اگی ہوتیں۔ اس سڑک کو صاف رکھنے کی ایک وجہ تو یہ تھی

کہ جب بھی بین اور گرز چہل قدمی کے لیے وہاں آتے تو ان کا سامنا سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے جنگلی مرغوں سے ہوتا تھا۔ دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ ان کی زمین کے ساتھ ساتھ گزرنے والی خلیج کے قریب ہی سیاہ توت افراط سے پیدا ہوتے تھے۔ وہ اس پگڈنڈی کی جانب بڑھ رہی تھی جو سیاہ توت کے درختوں کے جھنڈ کی طرف جاتی تھی کہ اچانک ہی دونوں کتے اکڑ کر رک گئے۔ بعد میں ایرس نے بین کو بتایا۔ ”وہ اپنی جگہ پر رک کر پنجوں کے بل دیکھ رہے تھے۔ گرز اپنی ناک اوپر کر کے فضا میں کچھ سونگھنے کی کوشش کر رہا تھا۔“

اسی وقت اسے وہ آواز سنائی دی جیسے کوئی شخص کھانس رہا ہو۔ یہ آواز اسی جانب سے آئی تھی جہاں سیاہ توت کی جھاڑیاں تھیں۔ دونوں کتے ایک ہی جگہ پر رک کر ساکت ہو چکے تھے اور اس جانب ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ خوف کی ایک سرد لہر نے ایرس کو بھی جکڑ لیا۔ اس نے جو کچھ نیچے دیکھا۔ اس کے بعد شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ وہ تیزی سے پلٹی اور دونوں کتوں کو ساتھ لے کر گھر کی جانب واپس چل دی۔ وہ دل ہی دل میں شکر ادا کر رہی تھی کہ اس نے کتوں کی زنجیر مضبوطی سے تھام رکھی تھی ورنہ کوئی بھی حادثہ ہو سکتا تھا۔

گھر واپس آنے کے بعد اس نے کپڑے سے اپنے پورے بدن اور ٹانگوں کو اچھی طرح صاف کیا پھر یہی عمل کتوں کے ساتھ بھی دہرایا گیا۔ جنگل میں کیڑے مکوڑوں کی بہتات تھی۔ اس لیے وہ کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی۔ جب اسے اطمینان ہو گیا کہ وہ تینوں ان کیڑوں سے محفوظ ہیں تو نہانے چلی گئی۔ پھر اس نے زرد رنگ کی شارٹ اور سفید رنگ کی پولو شرٹ پہنی جو بین اس کے لیے ہیلسینکی سے لایا تھا۔

اس نے ریفریجریٹر کھول کر ایک بار پھر تمام سامان کو چیک کیا لیکن وہ مسلسل جنگل میں ہونے والے واقعہ کے بارے میں سوچے جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے دماغ میں نینسی ویلس اور اس کی پارٹی کے بارے میں بھی منفی خیالات آ رہے تھے۔ اس نے دھیان بٹانے کے لیے ٹی وی آن کر دیا لیکن وہاں سے بھی صحت کی دیکھ بھال کے بارے میں کوئی پروگرام نشر ہو رہا تھا، جسے وہ بارہا دیکھ چکی تھی۔ اس نے ٹی وی بند کر دیا اور باہر باغ میں جا کر اگلے ہفتے کے کاموں کے بارے میں سوچنے لگی۔ اس کی نظر اس پیالے پر گئی جو پورچ کی چھت کے ساتھ ایک سلاخ کے ذریعے لٹکا ہوا تھا۔ اس میں شکر خوروں کے لیے خوراک رکھی جاتی تھی۔ اس نے پیالہ اتارا۔ کچن میں جا کر چینی ملا پانی بنایا اور پیالے میں بھر کر دوبارہ اپنی جگہ پر رکھ دیا پھر وہ وہیں کرسی پر بیٹھ کر بین کا انتظار کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد ہی ایک شکر خورا آیا اور ایرس اسے دیکھ کر مسکرا دی۔ یہ منظر دیکھ کر اسے ہمیشہ سکون اور راحت محسوس ہوتی تھی۔

ساڑھے چھ بجے کتوں نے زور زور سے بھونکنا شروع کر دیا۔ ایک کار سڑک سے ڈرائیو وے کی طرف آ رہی تھی۔ بین نے انجن بند کرنے سے پہلے ریس بڑھا کر اپنی آمد کی اطلاع دی تو منگو نے زور زور سے اچھلنا شروع کر دیا۔ ایرس اپنی جگہ سے اٹھی اور دروازہ کھول کر کتوں کو باہر آنے دیا۔ وہ دوڑتے ہوئے کار تک گئے اور بین کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔

ایرس بھی بین تک پہنچ چکی تھی۔ اس نے اپنے بازو پھیلا دیے اور وہ ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔ ایرس جذبات سے مغلوب ہوتے ہوئے بولی۔

”مجھے تو یوں لگ رہا تھا جیسے یہ ہفتہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔“

”میرا بھی کچھ یہی حال تھا بے بی۔“ وہ اس کا شانہ تھپکتے ہوئے بولا۔ ”تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔“

ایرس اس تعریف کا مطلب سمجھتی تھی۔ جب تک وہ کپڑے تبدیل کر کے آیا۔ وہ اس کے لیے کھانا میز پر سجا چکی تھی۔ کھانے کے دوران ہی ایرس نے اسے جنگل میں ہونے والے واقعے کے بارے میں بتایا۔

”مجھے یقین ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ بین نے کہا۔ ”گو کہ میں نے کبھی ایسی کوئی آواز نہیں سنی لیکن دادا اس بارے میں بتایا کرتے تھے۔ بہتر ہوگا کہ تم کچھ دنوں تک اس طرف نہ جاؤ اور اگر جانا بھی ہو تو کتوں کو ضرور ساتھ لے لینا۔“

کھانے کے بعد وہ دوبارہ صحن میں بیٹھ گئے اور اس وقت تک باتیں کرتے رہے جب تک مچھروں نے ستانا شروع نہیں کیا۔ وہاں سے وہ دونوں اٹھ کر بیڈ روم میں آ گئے اور تھوڑی دیر بعد بین، ایرس کے زانو پر سر رکھ کر سو گیا۔ ایرس مطمئن انداز میں اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی اور اس کے دماغ سے ویلس کی پارٹی کا خیال نکل چکا تھا۔

دوسرے روز وہ دونوں صحن میں بیٹھے تھے کہ ان کے کانوں میں موسیقی اور لوگوں کے زور زور سے بولنے کی

آوازیں آئیں۔ بین نے پوچھا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”ویلس نے اپنے بیٹے کی کامیابی کی خوشی میں پارٹی دی ہے۔ اس نے قانون کا امتحان پاس کیا ہے۔“

”کہیں یہ وہی تو نہیں جسے ہم سب ناقابلِ برداشت سمجھتے تھے۔“ بین نے پوچھا۔

”وہی ہے۔“ ایرس منہ بناتے ہوئے بولی۔ ”مجھے یقین ہے کہ وہ اب بھی ویسا ہی ہوگا۔“

”شکر ہے کہ ہم وہاں نہیں گئے۔“ بین نے کہا۔ ”ٹیڈ برا آدمی نہیں ہے لیکن اس کی بیوی کو دیکھ کر ہی کراہیت محسوس ہوتی ہے۔“

”چھوڑو ان باتوں کو۔“ وہ ایک ادا سے بولی۔ ”یہ بتاؤ کہ تمہارا ہفتہ کیسا گزرا۔ تم نے تو کچھ زیادہ بتایا ہی نہیں جبکہ میں سب کچھ تفصیل سے سننا چاہتی ہوں۔“

اتوار کو سہ پہر کے وقت بین کی روانگی ہوئی۔ وہ دونوں کار کے پاس کھڑے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ دونوں کتے بھی ان کے اردگرد منڈلا رہے تھے۔

”کیا تم اس ہفتے کچھ پہلے آ سکتے ہو؟“ ایرس نے پوچھا۔

”کوشش کروں گا۔“

”واقعی تم بہت محنت کرتے ہو۔“ ایرس اسے ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

بین نے زوردار قہقہہ لگایا اور باغ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم بھی تو بہت کام کرتی ہو۔“

”یہ کام نہیں بلکہ تفریح ہے۔“

بین کے جانے کے بعد ایرس کچھ دیر وہیں کھڑی رہی پھر دونوں کتوں کو لے کر مکان کے پیچھے واقع تالاب پر لے گئی اور گرز کی زنجیر چھوڑ کر اسے تالاب میں تیرنے دیا جبکہ چھوٹا کتا حسبِ معمول کنارے پر دوڑتا اور بھونکتا رہا۔

پیر کی صبح وہ گھٹنوں کے بل جھکی باغ میں فالتو گھاس صاف کر رہی تھی کہ نینسی ویلس ہاتھ میں بالٹی پکڑے آتی دکھائی دی۔ اس نے ایرس کو کام کرتے ہوئے دیکھا تو بولی۔

”تم دستانے کیوں نہیں استعمال کرتیں۔ اس طرح تو تمہارے ہاتھ خراب ہو جائیں گے۔“

”مجھے ہاتھوں پر مٹی کا لگنا اچھا لگتا ہے۔“ وہ اسے چڑانے کے لیے بولی۔

نینسی کی بھویں تن گئیں۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور بولی۔ ”کوئی نئی بات؟“

”نہیں۔“ ایرس نے کہا اور اپنے کام میں لگی رہی۔

”یہ زرد پھول تمہارے پاس کب آئے؟“ نینسی ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

”میں نے تمہیں اس کے کچھ پودے دیے تھے۔“

”واقعی، مجھے یاد نہیں۔“ وہ انجان بنتے ہوئے بولی۔

”کیا اب بھی اس جگہ سیاہ توت ہیں جہاں تم مجھے ایک مرتبہ لے گئی تھیں۔“

ایرس کام کرتے کرتے رک گئی اور نینسی ویلس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ہاں، وہاں کافی مقدار میں سیاہ توت موجود ہیں۔“

”میرا خیال ہے کہ وہاں سے تھوڑے سے سیاہ توت چن لوں۔ جیسن ایک ہفتہ کے لیے یہاں ہے اور اسے ناشتے میں تازہ سیاہ توت بہت پسند ہیں۔ اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو۔“

”نہیں، مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“

”بہتر ہوگا کہ تم دستانے پہن کر کام کرو۔“ وہ ہمدردی جتاتے ہوئے بولی۔

ایرس اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ وہ جنگل کی طرف جانے والے راستے پر گامزن تھی۔ ایرس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ جب نینسی اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو اس نے دوبارہ کام شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی اسے ایک چیخ سنائی دی۔ جیسے کوئی ڈر کے مارے چلانا شروع کر دے۔ اس کے بعد لگاتار کئی چیخیں سنائی دیں۔ ایرس نے اپنا کام روک دیا اور جنگل کی طرف دیکھنے لگی۔ جب چیخوں کا سلسلہ رک گیا تو اس نے دوبارہ گھاس کاٹنا شروع کر دی۔ اس کام کو ختم کرنے میں اسے دس منٹ لگ گئے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اپنی ٹانگوں کو کھڑے حرکت دینے لگی تاکہ گھٹنوں کی اکڑاہٹ ختم ہو جائے پھر اس نے گھاس کی ٹوکری اٹھائی اور گھر کی جانب چل دی۔ ٹوکری اس نے دروازے کے پاس رکھی اور جوتے اتار کر اندر چلی گئی۔ پھر اس نے اپنا کارڈلیس فون اٹھایا اور صحن میں آ کر جنگل کی طرف دیکھنے لگی۔ اب وہاں مکمل خاموشی تھی۔

”بے چارہ ریچھ۔ وہ اسے گولی مار دیں گے۔“ ایک لمحے کے لیے اس کے ذہن میں یہ خیال آیا پھر وہ پولیس کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

زنگ آلود

ملک صفدر حیات

نہ بچپن دیر تک کھیلتا ہے نہ جوانی لمبی عمر ساتھ چلتی ہے حتیٰ کہ بڑھاپا بھی بُرا آپا بن جاتا ہے لیکن پھر بھی... انسان کا زعم اسے سہانے سپنے دکھاتا ہے... وہ بے ساکھیوں کے باوجود اپنی سلطنت قائم رکھنا چاہتا ہے... یہی حال اللہ کے اس بندے کا بھی تھا جسے کبھی یہ خیال تک نہیں آیا کہ اسے واپس ایک روز اپنے رب کی جانب ہی پلٹ کے جانا ہے... بس یہی بھول اسے حسبِ منشا قدم اٹھانے پر اکساتی رہی۔ بالآخر اکساہٹ، اکتاہٹ میں بدل گئی اور پھر اسی مقام سے الٹی گنتی کا آغاز ہوگیا اور اس کی تمام ہوشیاری گویا زنگ آلود ہوگئی۔ بہرحال اس کے باوجود اگر الٹی گنتی ختم ہونے سے پہلے آگہی اسے بے ثباتی کا ادراک دیدیتی تو بچاؤ کے کچھ امکانات ضرور روشن ہو جاتے۔

قانون کی گرفت میں پھنسے ایک بے وقوف مجرم

کی الٹی تدبیروں کا دلچسپ احوال

جاڑا اپنے جوبن پر تھا۔ جنوری کا مہینا اپنی تمام تر ٹھنڈک اور یخ بستگی کے ساتھ دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا۔ پچھلے ایک ہفتے سے یا تو دن بھر سورج کا چہرہ دیکھنے کو ہی نہیں ملتا تھا یا پھر وہ تھوڑی دیر کے لیے جھلک دکھا کر غائب ہو جاتا تھا۔ صبح کے وقت دھند، ماحول اور فضا سے دامن گیر نظر آتی تھی۔ کاروبارِ زندگی بہ نسبت تاخیر سے آغاز ہوتا اور دن کے اختتام کے ساتھ ہی سمٹ جاتا تھا۔ گاؤں دیہات میں تو ویسے بھی زندگی کی رفتار قدرے سست ہوتی ہے۔ موسم سرما نے اس سستی کو دوآتشہ کر دیا تھا۔

ایسی ہی ایک دھند آلود صبح میں تیار ہو کر تھانے پہنچا تو عجیب سی صورتِ حال سے واسطہ پڑا۔ مجھ سے پہلے چند افراد وہاں موجود تھے جو یقیناً کسی کام کی ہی غرض سے وہاں آئے تھے۔ میں ان کے پاس سے گزر کر اپنے کمرے میں آگیا پھر جیسے ہی میں اپنی کرسی پر بیٹھا، کانسٹیبل اسلم میرے پاس آگیا۔

''اسلم! یہ کیا صبح ہی صبح تم لوگوں نے برآمدے میں رش لگایا ہوا ہے۔'' میں نے کانسٹیبل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''سب خیریت تو ہے نا؟''

''خیریت نہیں ہے ملک صاحب!'' کانسٹیبل نے جواب دیا۔ ''حسین آباد سے چند بندے ایک چور کو پکڑ لائے ہیں۔''

ان دنوں میں ضلع شیخوپورہ کے ایک تھانے میں تعینات تھا اور حسین آباد میرے تھانے کی حدود میں آتا تھا۔ موضع حسین آباد کم و بیش دو سو گھروں پر مشتمل ایک درمیانے درجے کا گاؤں تھا جہاں چودھری بشارت علی کی حکمرانی تھی۔ یہ گاؤں میرے تھانے سے دو میل کے فاصلے پر واقع تھا۔

میں نے کانسٹیبل سے کہا۔ ''چور کو اندر لے کر آؤ۔''

''او کے ملک صاحب.....'' یہ کہتے ہوئے وہ میرے کمرے سے نکل گیا۔

ایک منٹ سے بھی کم وقت میں کانسٹیبل اسلم کمبوہ واپس آگیا۔ اس کے ساتھ نصف درجن افراد بھی تھے۔ انہی میں ایک موٹا تازہ بندہ خاصا گھبرایا ہوا اور مصیبت زدہ نظر آتا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ مذکورہ بندہ ہی مبینہ چور ہے......

''کیا مسئلہ ہے بھئی؟'' میں نے خالص تھانے دارانہ انداز میں کہا۔

ایک بندہ مبینہ چور کی جانب قہر آلود انداز میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تھانے دار صاحب! اس بدذات نے چودھری صاحب کی حویلی میں چوری کی ہے۔ آپ اسے فوراً گرفتار

کر کے کڑی سے کڑی سزا دیں۔"

"تم کون ہو؟" میں نے اس غصیلے آدمی سے پوچھا۔

"جناب! میرا نام قدیر ہے۔" وہ سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔ "میں چودھری صاحب کا خاص بندہ ہوں۔ انہوں نے ہی مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ آپ اس کو تھانے میں بند کردیں۔" آخری جملہ اس نے "چور" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ادا کیا تھا۔

قدیر نامی اس بندے کا انداز مجھے قطعاً پسند نہیں آیا تھا۔ میں نے ڈانٹ سے مشابہ لہجے میں پوچھا۔ "میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم اللہ کے بندے ہوگے پر تم کہہ رہے ہو، چودھری کے بندے ہو...... میں غلط سمجھ رہا ہوں یا تم صحیح کہہ رہے ہو؟"

وہ میری بات سے بری طرح الجھ کر رہ گیا۔ سٹ پٹائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "وہ جی میرا مطلب تھا، میں چودھری بشارت صاحب کی حویلی میں ہوتا ہوں، ان کا خاص خدمت گار ہوں......"

"اچھا اچھا...... ایسا کہو نا!" میں نے اس کے زخموں پر نمک پاشی کرتے ہوئے کہا۔ "قدیر! یہ بتاؤ، اس تھانے کا انچارج میں ہوں یا تم؟"

"ظاہر ہے جناب......!" وہ گڑبڑا کر بولا۔ "تھانا انچارج تو آپ ہی ہیں۔"

"تو پھر تھانے داری بھی مجھے ہی کرنے دو۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "میں ہر نوعیت کے جرائم اور ان کی مقررہ سزاؤں کے بارے میں تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ مجھے پڑھانے کی کوشش مت کرو کہ کس بندے کو تم لوگ ایک چور کی حیثیت سے پکڑ کر لائے ہو، اس کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے......"

وہ اندر سے سلگ کر رہ گیا تاہم بہ ظاہر بڑی فرماں برداری سے بولا۔ "ٹھیک ہے جناب! آپ ہی کریں، جو بھی کرنا ہے۔"

میں نے باقی لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔ "تم......! باہر جا کر برآمدے میں بیٹھو۔"

سب الٹے قدموں مڑ گئے لیکن ایک پست قامت موٹا بندہ قدیر کے برابر میں کھڑا رہا۔ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"تم......؟"

"تھانے دار جی! یہ جبار ہے۔" قدیر نے جلدی سے کہا۔ "یہ بھی میرے ساتھ ہی چودھری صاحب کی حویلی میں ہوتا ہے۔"

میں نے متذکرہ بالا چور کا سرتاپا تنقیدی جائزہ لیا۔ اس کی عمر پچیس اور تیس کے درمیان رہی ہوگی۔ درمیانہ قد اور بدن مائل بہ فربہی۔ صورت عام سی۔ گال پھولے ہوئے، رنگت گندمی اور سر کے بال گھونگریالے۔ اس نے ہلکی سی مونچھیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کڑک دار آواز میں پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"شاکر......" اس نے ڈرے سہمے انداز میں جواب دیا۔

"کہاں سے آئے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"سرکار! یہ ادھر حسین آباد ہی کا رہنے والا ہے۔" جبار نامی شخص نے چور کے بولنے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ "ایک نمبر کا حرام ہے جناب......!"

"میں نے تم سے پوچھا ہے؟" میں نے گھور کر جبار کی طرف دیکھا۔

"نن...... نہیں۔" وہ گڑبڑا گیا۔ "آپ نے شاکر سے پوچھا ہے۔"

"تو پھر تم بھی باہر برآمدے میں جا کر بیٹھو۔" میں نے کمرے کے دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تمہاری یہاں کوئی گنجائش نہیں نکلتی......!"

وہ برا سا منہ بنا کر کمرے سے نکل گیا۔

لگتا تھا، چودھری بشارت علی نے اپنے بندوں کو کچھ زیادہ ہی سر چڑھا رکھا تھا۔ میں کافی عرصے سے اس تھانے میں محکمہ جاتی فرائض انجام دے رہا تھا۔ میں چودھری کو اور چودھری مجھے اچھی طرح جانتا تھا لیکن کسی کام کے حوالے سے یہ ہمارا پہلا واسطہ تھا۔ میرے سننے میں یہی آیا تھا کہ بشارت علی ایک مغرور اور خودسر چودھری تھا۔

میں نے شاکر کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے سوال کیا۔ "تو تم حسین آباد ہی کے رہنے والے ہو؟"

"جج...... جی......" وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

"چودھری کے بندے نے تمہیں حرام کیوں کہا؟" میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم کوئی کام وام بھی کرتے ہو یا چوری چکاری پر ہی گزارہ ہورہا ہے؟"

"جناب!" وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ "میں چور نہیں ہوں۔ میں تو کھیت مزدور ہوں۔ کبھی کام کرتا ہوں، کبھی فارغ ہوتا ہوں......"

"اور جب فارغ ہوتے ہو تو چوریاں کیوں کرتے ہو۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "تمہیں اور کوئی ڈھنگ کا شریفانہ کام سمجھ میں نہیں آتا؟"

"مائی باپ! میں کوئی عادی چور نہیں ہوں بلکہ...... میں تو چور ہی نہیں ہوں۔" وہ چہرے پر مسکینیت طاری کرتے ہوئے بولا۔ "یہ لوگ مجھ پر جھوٹا الزام لگا رہے ہیں۔ میں نے کچھ نہیں چرایا...... میں تو چودھری صاحب کی حویلی میں داخل بھی نہیں ہوا۔"

میں نے چور کی فریاد پر روئے سخن قدیر کی جانب موڑا اور استفسار کیا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے مجھے بتایا ہے کہ...... اس بدذات نے چودھری صاحب کی حویلی میں چوری کی ہے مگر یہ تو صاف انکاری ہے...... تم کیا کہتے ہو اس بارے میں؟"

"جناب! یہ کمینہ سراسر جھوٹ بول رہا ہے۔" وہ ناگواری سے شاکر کو گھورتے ہوئے بولا۔ "ہم نے اسے حویلی کے اندر سے پکڑا ہے۔"

"جھوٹ یہ لوگ بول رہے ہیں جی۔" شاکر نے مدد طلب نظر سے مجھے دیکھا اور بتایا۔ "ان لوگوں نے مجھے حویلی کے پچھواڑے سے پکڑا ہے اور بہت زیادہ مارا بھی ہے۔ آپ مجھ سے بڑی سے بڑی قسم لے لیں۔ میں نہ تو چودھری صاحب کی حویلی میں داخل ہوا ہوں اور نہ ہی میں نے کوئی چیز چوری کی ہے......"

"یہ کیا ماجرا ہے قدیر؟" میں نے استفساریہ انداز میں چودھری بشارت علی کے بندے کی طرف دیکھا۔

"جناب! جھوٹ ہم نہیں یہ لفنگا بول رہا ہے۔" قدیر نے جارحانہ لہجے میں کہا۔ "آپ اسے ٹرائل روم میں لے جا کر ذرا سختی کریں تو یہ سب کچھ اگل دے گا۔"

"اس کی زبان کس طرح کھلوانا ہے، یہ میں خود طے کرلوں گا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم صرف مجھے اتنا بتا دو کہ اس نے چودھری صاحب کی حویلی سے کیا چوری کیا ہے؟"

"وہ تو جناب...... ہم نے اسے واردات کرنے سے پہلے ہی پکڑ لیا۔" وہ اپنے بیان کو تبدیل کرتے ہوئے بولا۔ "اگر اس پر ہماری نظر نہ پڑتی تو اس کا داؤ لگ جاتا اور......"

"مگر پہلے تو تم نے بڑے وثوق سے بتایا تھا کہ شاکر نے چودھری صاحب کی حویلی میں چوری کی ہے۔" میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی ٹوک دیا۔ "اب تم کہہ رہے ہو کہ اگر تم لوگ اسے پکڑ نہ لیتے تو یہ واردات کرنے میں کامیاب ہوجاتا۔ اس غلط بیانی کا مطلب کیا ہے؟"

"وہ جناب! میرے کہنے کا مطلب یہی تھا کہ......" وہ سنبھلتے ہوئے بولا۔ "اس کو موقع نہیں مل سکا ورنہ......"

"ورنہ شر نہ کے قصے بعد میں چھیڑنا......" میں نے ایک مرتبہ پھر اس کی بات کاٹ دی۔ "صرف یہ بتاؤ کہ اس نے چودھری کی حویلی میں سے کچھ چرایا ہے یا نہیں؟"

"اسے کچھ بھی چرانے کا موقع نہیں مل سکا......!" وہ متاملانہ انداز میں بولا۔

قدیر کی پسپائی کو دیکھ کر مجھے یقین ہوگیا کہ اس معاملے کے پیچھے کوئی اور ہی کہانی ہے۔ جو کچھ نظر آرہا ہے یا یہ کہ جو کچھ دکھانے کی کوشش کی جارہی ہے، حقیقت اس سے قطعی مختلف تھی۔ قدیر کا جارحانہ انداز اور پھر اچانک نرم پڑ جانا اس امر پر دلالت کرتا تھا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ میں نے اپنا ایک خاص ذہن بنانے کے بعد قدیر سے پوچھا۔

"حسین آباد میرے تھانے سے کوسوں دور تو نہیں۔ اتنا بڑا واقعہ ہوگیا اور چودھری صاحب کہیں نظر نہیں آرہے۔ کہاں ہیں وہ؟"

"جناب! چودھری صاحب ادھر حویلی ہی میں ہیں۔" قدیر نے جواب دیا۔ "ان کی طبیعت رات ہی سے ٹھیک نہیں اسی لیے انہوں نے مجھے تھانے بھیجا ہے......"

قدیر کی وضاحت سے میرا دل مطمئن نہ ہوسکا۔ یہ تو مجھے بڑے واضح انداز میں محسوس ہوگیا تھا کہ اس معاملے کی تہ میں ضرور کوئی ہیر پھیر ہے۔ کیا ہیر پھیر ہے، اس بات کا پتا لگانے کے لیے ضروری تھا کہ میں قدیر کو فی الفور چلتا کردوں اور مبینہ چور یعنی شاکر سے تنہائی میں پوچھ گچھ کروں۔ اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد میں نے قدیر سے کہا۔

"ٹھیک ہے! سمجھ لو کہ میں نے اس بندے کو گرفتار کرلیا ہے۔ اب یہ میرے قبضے میں ہے۔ تم واپس جاسکتے ہو......"

"جناب! میں چودھری صاحب کو جا کر کیا کہوں؟" اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

"ان سے کہنا، میں چور سے کڑی پوچھ گچھ کر رہا ہوں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ "جو بھی نتیجہ برآمد ہوا، سامنے آجائے گا۔ اگر شام تک چودھری صاحب کی طبیعت ٹھیک ہوجائے تو وہ تھانے آکر مجھ سے ملاقات کرلیں۔"

"جی بہت اچھا......!" وہ متاملانہ لہجے میں بولا۔

میں نے قدیر کے اطمینان اور تسلی کی خاطر اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے کانسٹیبل اسلم کمبوہ کو آواز لگائی۔ اگلے ہی لمحے وہ چراغی جن کے مانند میرے سامنے حاضر ہوگیا۔ میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"اسلم! اس چور کی اولاد کو حوالدار جہانگیر کے حوالے کردو۔" میں نے شاکر کی جانب اشارہ بھی کردیا۔ "میں تھوڑی دیر میں اس سے تفتیش کرتا ہوں۔"

''اوئے چلو......!'' اسلم نے شاکر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ادھر حوالات میں تمہاری خدمت شدمت کرتے ہیں......''

بات ختم کرتے ہی اسلم نے استفساریہ انداز میں میری طرف دیکھا تو میں نے نگاہوں ہی نگاہوں میں اسے سمجھا دیا کہ ملزم شاکر کے ساتھ کسی قسم کی سختی نہیں کرنا۔ اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور شاکر کو لے کر چلا گیا۔

میرے ان جارحانہ احکام نے قدیر کو بڑی حد تک مطمئن کر دیا تھا۔ وہ بھی مجھے سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ اس کے رخصت ہونے کا مطلب یہی تھا کہ اس کے ساتھ آنے والے نصف درجن افراد بھی تھانے کی حدود سے جا چکے تھے۔ ان کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے اے ایس آئی یونس مرزا کو اپنے پاس بلا لیا۔

یونس مرزا بہت ہی محنتی اور پرعزم پولیس آفیسر تھا۔ اس کا شمار ان پولیس اہلکاروں میں ہوتا تھا جن میں ترقی کرنے کی بے پناہ صلاحیت پائی جاتی ہے اور دنیا کی کوئی بھی منفی طاقت ان کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ ان دنوں ایک خوفناک اور لرزہ خیز قتل کی تفتیش چل رہی تھی۔ اسی سلسلے میں، میں نے ایک اہم مشن یونس مرزا کے حوالے کر رکھا تھا۔ ابھی میں نے اسی سلسلے میں اسے اپنے پاس بلایا تھا۔

اس نے میرے پاس آ کر سیلوٹ کیا اور بڑی شائستگی سے بولا۔ ''جی حکم ملک صاحب......!''

''یونس......! تم آج ہی لاہور روانہ ہو جاؤ۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میری ایس پی صاحب سے بات ہو گئی ہے۔ انہوں نے ہمارے مسئلے کے بارے میں لاہور پولیس ہیڈ کوارٹر کو بتا دیا ہے۔ وہ لوگ تم سے بھرپور تعاون کریں گے۔''

''ٹھیک ہے ملک صاحب۔'' وہ فرماں برداری سے بولا۔ ''میں پندرہ بیس منٹ میں نکلتا ہوں۔''

''تمام تحقیقی اور تفتیشی کام مکمل کر کے واپس آنا ہے۔'' میں نے اس پر واضح کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر رات کو لاہور میں رکنا بھی پڑ جائے تو خیر ہے۔''

''جی...... میں سمجھ گیا۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ فکر نہ کریں ملک صاحب۔ میں آپ کی امیدوں پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔''

اے ایس آئی یونس مرزا کو لاہور روانہ کرنے کے بعد میں نے چور شاکر کو اپنے پاس بلا لیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ میری میز کی دوسری جانب کھڑا تھا۔ میں نے گھور کر اس کی آنکھوں میں دیکھا اور سنسناتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''یہیں کھڑے ہو کر میرے سوالوں کے جواب دو گے یا میں تمہیں بیٹھنے کا موقع دوں؟''

''آپ تھانے کے مالک ہیں سرکار۔'' وہ سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ کی مرضی ہے جو بھی کریں۔''

''اگر تم سچ بولنے کا وعدہ کرو تو میں تمہیں کرسی پر بیٹھنے کی اجازت دے سکتا ہوں......'' میں نے ٹٹولنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''تھانے دار صاحب!'' وہ لجاجت بھرے لہجے میں بولا۔ ''رب کی قسم، میں نے ابھی تک آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا اور...... آگے بھی سچ بولنے کا وعدہ کرتا ہوں جی......!''

''تو یہ بات درست ہے کہ تم نے چودھری بشارت کی حویلی میں کوئی چوری ووری نہیں کی؟'' میں نے تصدیق طلب انداز میں پوچھا۔

''میں نے چودھری صاحب کی حویلی سے ایک تنکا بھی نہیں چرایا جناب۔'' اس نے جواب دیا۔ ''آپ چاہیں تو میں بڑی سے بڑی قسم اٹھانے کو تیار ہوں۔''

''میرا کام قسمیں کھانے یا قرآن پاک اٹھانے سے نہیں چلتا اور نہ ہی میں اپنے محکمہ جاتی فرائض میں ان معاملات کو لانے کے بارے میں سوچ بھی سکتا ہوں۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''میں صرف تمہاری زبان سے سچ سننا چاہتا ہوں اور یہ بھی واضح کر دوں کہ اگر کسی بھی مرحلے پر تمہاری دروغ گوئی پکڑی گئی تو پھر ذہن میں یہ بھی رکھو کہ مجھ سے زیادہ ظالم اور جابر اور کوئی نہیں ہوگا۔''

میری اس ڈھکی چھپی سنگین دھمکی پر وہ ایک جھرجھری لے کر رہ گیا پھر معتدل انداز میں بولا۔ ''یقین کریں تھانے دار صاحب...... میں آپ سے بالکل جھوٹ نہیں بولوں گا۔''

''اچھی بات ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا۔ ''بیٹھ جاؤ!''

تھوڑی سی جھجک کے بعد وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، مجھے اس کیس میں کسی بڑی گڑبڑ کا احساس ہو چکا تھا۔ قدیر کا رویہ یہی ظاہر کرتا تھا کہ وہ ہر قیمت پر شاکر کو چوری والے معاملے میں پھنسا کر کڑی سزا دلوانے کی خواہش رکھتا تھا اور یہ بھی ظاہر تھا کہ یہ قدیر کی ذاتی خواہش نہیں ہو سکتی تھی۔ اس تمام تر کارروائی کے پیچھے یقیناً چودھری بشارت علی کا ذہن کام کر رہا تھا۔ حقائق کی تہ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ میں بہلا پھسلا کر اور اسے اعتماد کا یقین دلا کر کچھ اگلوانے کی کوشش کروں۔ میں

اس پالیسی کا حامی تھا کہ اگر سیدھی انگلی سے گھی نکل سکتا ہو تو پھر انگلی کو ٹیڑھا کر کے تکلیف اٹھانے کے چکر میں نہیں پڑنا چاہیے اور...... میں اس وقت یہی کر رہا تھا۔

''تو یہ بھی غلط ہے کہ تم حویلی کے اندر داخل...... ہوئے تھے؟'' میں نے شاکر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نرمی سے سوال کیا۔ ''ان لوگوں نے تمہیں حویلی کے پچھواڑے سے پکڑا تھا؟''

''جی، چودھری صاحب کے بندے سراسر جھوٹ بول رہے ہیں جناب۔'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''میں نے حویلی کے اندر بالکل قدم نہیں رکھا۔ ان لوگوں نے مجھے حویلی کے پیچھے کھیتوں کے اندر سے پکڑا ہے۔''

''تم حویلی کے پچھواڑے کیا کر رہے تھے؟''

''جناب......!'' وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں بولا۔ ''میں رفع حاجت کے لیے اس طرف گیا تھا۔''

شاکر کی وضاحت سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ میں نے وہ علاقہ اچھی طرح دیکھ رکھا تھا۔ چودھری کی حویلی کے اندر جانے کا تو کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا تاہم محکمہ جاتی ضرورت کے تحت کئی مرتبہ ادھر سے گزر ضرور ہوا تھا۔ چودھری بشارت علی کی حویلی کے عقب میں تاحد نگاہ سبز و شاداب کھیتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔

''چودھری کے بندوں نے تمہیں کب پکڑا تھا؟'' میں نے شاکر کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''آدھی رات کو جی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''یہی کوئی گیارہ بجے کا وقت ہوگا۔''

''اور اس وقت سے تم انہی لوگوں کے پاس تھے؟'' میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے سوال کیا۔

''ہاں جی!'' وہ فریادی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''انہوں نے مجھے بہت مارا ہے جی اور ٹھنڈی ٹھار رات میں مجھے ڈنگروں والے باڑے میں بند کر کے بھی رکھا ہے۔ یہ بہت ظالم لوگ ہیں جناب!''

''کیا اس دوران میں تمہاری چودھری سے بھی ملاقات ہوئی ہے؟''

''جی آج صبح مجھے چودھری صاحب کے سامنے پیش کیا تھا۔'' اس نے دکھی لہجے میں جواب دیا۔ ''قدیر اور جبار نے میرے سامنے چودھری صاحب کو بتایا کہ انہوں نے چور کو پکڑ لیا ہے۔ چودھری صاحب مجھے ایسی نظر سے دیکھنے لگے جیسے صدیوں سے انہیں میری ہی تلاش تھی۔ انہوں نے غصے بھرے انداز میں مجھ سے وہی سوال کیے جو آپ نے کیے ہیں۔ میں نے چودھری صاحب کے سامنے بھی سچ بولا۔ اس پر چودھری صاحب نے بھی مجھے دو چار تھپڑ مارے اور میری پسلیوں پر ٹھڈے بھی رسید کیے، پھر اپنے ڈشکروں سے کہا...... یہ کم ذات ایسے نہیں مانے گا۔ اسے تھانے میں بند کرا دو۔ میں بعد میں تھانے دار سے خود بات کر لوں گا......''

لمحے بھر کو رک کر اس نے سانس درست کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اب کسی بھی وقت چودھری صاحب تھانے آ کر آپ پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کریں گے کہ آپ میرے ساتھ بدترین سلوک کریں......!'' بات ختم کر کے وہ رحم طلب انداز میں مجھے تکنے لگا۔ ''میں بالکل بے گناہ ہوں سرکار......!''

''دیکھو شاکر!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں نے آج تک اپنے افسران بالا کا ناجائز دباؤ تسلیم نہیں کیا تو یہ چودھری بشارت علی میرے سامنے کیا بیچتا ہے۔ اس سلسلے میں تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر تم نے کوئی جرم نہیں کیا اور میرے سامنے کسی غلط بیانی سے کام نہیں لو گے تو تمہیں کچھ نہیں ہوگا......''

''جی، بہت بہت شکریہ تھانے دار صاحب!'' وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔ ''آپ دوسرے پولیس والوں سے بہت مختلف ہیں۔''

میں نے اس کے آخری جملے پر توجہ نہیں دی اور بدستور گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''شاکر! تمہاری باتوں اور چودھری بشارت کے رویے سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگ کافی دنوں سے تمہاری تلاش میں تھے۔ ایسا کیوں...... اس بات کی وضاحت تم کرو گے؟''

''جناب! میری تو خود کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تو چودھری صاحب کا کچھ نہیں بگاڑا......''

''تو پھر کیا......'' میرے انداز سے جھنجلاہٹ جھلکنے لگی۔ ''چودھری کا دماغ خراب ہو گیا ہے؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب!'' وہ رازدارانہ لہجے میں بولا۔ ''مجھے بھی یہی لگ رہا ہے۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''تمہیں کیا لگ رہا ہے؟''

''کہ چودھری صاحب کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔'' اس کی سنجیدگی میں ذرا سی بھی کمی واقع نہ ہوئی۔

میں نے قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔ ''مطلب کیا ہے تمہارا......؟''

''جناب والا......!'' وہ بہ دستور آواز کو دھیما رکھتے ہوئے بولا۔ ''جب سے چودھری صاحب نے دوسری شادی کی ہے، ان کا رویہ بڑا عجیب سا ہو گیا ہے۔''

یہ بات میرے علم میں تھی کہ کوئی چھ، سات ماہ پہلے حسین آباد کے چودھری بشارت علی نے دوسری شادی کر لی تھی۔ اس سے زیادہ تفصیلات میرے علم میں نہیں تھیں۔ مبینہ چور شاکر کی زبانی چودھری کی دوسری شادی کا ذکر سنا تو میرے اندر خود بہ خود اس کے بارے میں جاننے کا اشتیاق پیدا ہو گیا۔

''چودھری کی دوسری شادی کا اس کے بدلے ہوئے رویے سے کیا تعلق ہے۔'' میں نے ٹٹولنے والے انداز میں دریافت کیا۔ ''ذرا وضاحت تو کرو کہ دوسری شادی کے بعد چودھری تمہارے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑ گیا ہے؟''

''جناب! بات صرف میرے پیچھے پڑنے کی نہیں ہے۔'' اس نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں، اسے نور حسین کی بددعا لگی ہے جس سے چودھری صاحب کا دماغ قابو میں نہیں اسی لیے وہ الٹی سیدھی حرکتیں کرتے پھر رہے ہیں......''

شاکر کی بے ربط باتیں میرے پلے تو نہیں پڑ رہی تھیں تاہم میرے اندر ایک آواز ابھر رہی تھی کہ ان باتوں کے پیچھے کوئی راز چھپا ہوا ہے۔ میں نے کرید کا عمل جاری رکھتے ہوئے شاکر سے پوچھا۔

''چودھری کی دماغی حالت اور اس کی عجیب و غریب حرکتوں پر ہم بعد میں بات کریں گے۔ پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ نور حسین کون ہے اور اس نے چودھری کو بددعا کیوں دی ہے؟''

''نور حسین بھی حسین آباد ہی میں رہتا ہے تھانے دار صاحب۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہے۔ اس کا باپ سبزی منڈی میں ایک آڑھتی کے پاس منشی گیری کرتا ہے۔ نور حسین بھی ادھر سبزی منڈی ہی میں پلے داری کا کام کرتا ہے اور جہاں تک نور حسین کی بددعا کا تعلق ہے نا جناب......'' وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا، ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''نور حسین کی جگہ اگر میں بھی ہوتا تو چودھری صاحب کے لیے میرے دل سے بددعا ہی نکلتی......''

''پر چودھری نے نور حسین کے ساتھ ایسا کیا برا کر دیا ہے؟'' میں نے الجھن زدہ لہجے میں سوال کیا۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے چودھری صاحب کی دوسری شادی کا ذکر کیا ہے نا جی......'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''چودھری صاحب نے ایک خوب صورت لڑکی نورین سے شادی کی ہے اور یہ نورین...... پہلے نور حسین کی منگیتر تھی۔''

''کیا......؟'' میں نے بے ساختہ کہا۔

''جی...... میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' وہ اپنی بات میں رنگ بھرتے ہوئے بولا۔ ''نور حسین اور نورین کی منگنی کوئی ایک سال تک رہی۔ پھر چودھری صاحب، نورین پر ریجھ گئے۔ انہوں نے نورین کی ماں خالدہ کو جا نجانے، کیا پٹی پڑھائی کہ اس نے نورین اور نور حسین کی منگنی توڑ دی اور بعد میں نورین کی شادی چودھری صاحب سے کر دی۔''

''اوہ...... تو یہ ہوا تھا!'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''کیا اس موقع پر نورین کے باپ یا نور حسین کے والدین میں سے کسی نے شور نہیں مچایا؟''

''جناب! نورین کا باپ اسحاق تو کئی سال پہلے انتقال کر چکا ہے۔'' شاکر نے جواب دیا۔ ''اور نور حسین کے والدین بے چارے غریب لوگ ہیں۔ وہ چودھری صاحب کے آگے کیا شور مچائیں گے البتہ میں نے انہیں، نورین کی ماں خالدہ کو گالیاں دیتے ہوئے سنا ہے۔ دکھے ہوئے دل سے کسی کے لیے دعا تو نہیں نکل سکتی نا......'' اس نے لمحاتی توقف کے بعد ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''اب آپ نور حسین کی بے بسی کا خود ہی اندازہ لگا لیں۔ چودھری صاحب نے اس کے ساتھ جو کچھ کیا ہے اس کے بعد وہ دل ہی دل میں انہیں بددعائیں نہیں دے گا تو کیا پھولوں کے ہار پہنائے گا......؟''

چودھری بشارت علی کی دوسری شادی ظلم و جبر کی ایک چھوٹی سی داستان تھی۔ گاؤں دیہات ہو یا شہر...... اس نوعیت کی داستانیں دیکھنے اور سننے کو عام مل جاتی ہیں۔ زمانے کا دستور یہی ہے کہ طاقتور کا سکہ چلتا ہے اور کمزور کو ہر حال میں متاثر ہونا پڑتا ہے۔ متاثرین کے دل سے ظالموں اور جابروں کے لیے یقیناً بددعائیں ہی نکل سکتی ہیں سو...... نور حسین کسی بھی صورت میں چودھری کی خیر خواہی کے بارے میں نہیں سوچ سکتا تھا۔

نورین اور نور حسین کے ناموں میں لفظ ''نور'' قدر مشترک کی حیثیت رکھتا تھا۔ اگر ان دونوں کی شادی ہو جاتی تو یقیناً یہ ایک بڑی کامیاب جوڑی ثابت ہوتی۔ میں کوئی پہنچا ہوا روحانی بابا نہیں ہوں اور نہ ہی میں یہ بات کسی نوعیت کے علم نجوم یا علم الاعداد کی روشنی میں کہہ رہا ہوں۔ بس میں نے دونوں ناموں کی بناوٹ، نشست اور صوتی اثرات کی بنا پر ان الفاظ کا اظہار کیا ہے۔

میں نے مزید پندرہ منٹ تک گھما پھرا کر شاکر سے مختلف سوالات کیے اور مجھے یقین ہو گیا کہ وہ کسی بھی پہلو سے

قصوروار نہیں تھا۔ میں نے اس سے نور حسین، نورین اور چودھری بشارت علی کے حوالے سے اچھی خاصی معلومات حاصل کر لیں اور آخر میں کہا۔

''شاکر! تمہیں آج کا دن میرے تھانے کی حوالات میں گزارنا ہو گا۔''

''وہ کیوں جی؟'' اس نے الجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھا۔ ''جب میں نے کوئی گناہ نہیں کیا تو پھر آپ مجھے قید کیوں کر رہے ہیں۔ گھر میں میرے ماں باپ پریشان ہوں گے...... مجھے جانے دیں جناب!''

''جانے دوں گا...... مگر کل صبح!'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

اس کی حیرت دوچند ہو گئی۔ ''میں سمجھا نہیں جناب؟''

میں نے اسے سمجھایا۔ ''پہلی بات تو یہ کہ میں ایک دن تک تمہیں اپنے پاس رکھ کر تمہارے بیان کی تصدیق کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تمہاری بتائی ہوئی باتوں میں کوئی کھوٹ نہ نکلی تو کل صبح تمہیں باعزت رہا کر دیا جائے گا اور تم جتنی دیر اس تھانے کی حوالات میں رہو گے، تمہارے ساتھ کسی قسم کی سختی نہیں برتی جائے گی۔ تمہیں صاف ستھرا کھانا ملے گا اور رات کو سونے کے لیے تمہیں گرم کمبل بھی فراہم کیا جائے گا۔ حوالات کی رات، چودھری بشارت کے باڑے میں گزرنے والی رات سے زیادہ آرام دہ اور فرحت بخش محسوس ہو گی۔'' میں نے لمحاتی توقف کر کے گہری نظر سے اس کی طرف دیکھا اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''دوسری بات یہ کہ تم حسین آباد کی بہ نسبت یہاں تھانے میں زیادہ محفوظ ہو۔ اگر باہر گھومتے پھرتے دکھائی دیے تو چودھری کے بندے پھر تمہاری ٹھکائی کریں گے اور ہو سکتا ہے...... جان ہی سے مار ڈالیں۔''

اس نے میری سنگین باتوں کے جواب میں ایک خوف زدہ جھرجھری لی تاہم منہ سے کچھ نہیں بولا۔ میں نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''اور جہاں تک تمہارے ماں باپ کا تعلق ہے...... تو وہ اگر تمہیں ڈھونڈتے ہوئے یہاں آ گئے تو ان کی تسلی میں خود کرا دوں گا۔ تمہیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

میری بات اس کی سمجھ میں صحیح طور پر بیٹھ گئی تو اس نے گردن کو اثباتی جنبش دی اور بڑی فرماں برداری سے بولا۔

''جی اچھا......!''

میں نے حوالدار جہانگیر کو اپنے پاس بلا کر شاکر کے حوالے سے چند ضروری ہدایات دیں۔ وہ شاکر کو اپنے ساتھ لے کر حوالات کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

چودھری بشارت علی کی دوسری شادی میں میری دلچسپی اچانک بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ شاکر نے اپنی سیدھی باتوں میں جو انکشافات کیے تھے وہ گہری توجہ کے متقاضی تھے۔ آگے بڑھنے سے پہلے میں اس حوالے سے کچھ تفصیل آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

جیسا کہ آپ جان چکے ہیں نور حسین ایک کمزور اور غریب شخص تھا۔ وہ سبزی منڈی میں پلے داری کرتا تھا۔ اس کا باپ کریم بخش، شجاعت مہر نامی ایک آڑھتی کے پاس منشی لگا ہوا تھا۔ کریم بخش کے بارے میں مجھے یہ بھی پتا چلا کہ تحریک آزادی سے قبل وہ برٹش آرمی میں ایک سپاہی کی حیثیت سے خدمات انجام دے چکا تھا۔ وہ اس زمانے کا پرائمری پاس تھا اس لیے شجاعت مہر نے اسے لکھنے پڑھنے کا کام دے دیا تھا جب کہ اس کے مقابلے میں نور حسین نے اسکول کا منہ ہی نہیں دیکھا تھا جبھی وہ صحت مند اور توانا ہونے کے باوجود بھی سبزی اور پھل کے ٹوکرے اٹھانے پر مامور تھا۔

پرائمری تعلیم کو آپ حقارت کی نظر سے نہ دیکھیں۔ اگر آج کل کے نوجوانوں کو برا نہ لگے تو میں انتہائی معذرت کے ساتھ یہ ضرور کہوں گا کہ اس زمانے کا پرائمری آج کے ایم اے پاس سے زیادہ قابل اور ہونہار ہوا کرتا تھا۔

خیر...... نور حسین کی نورین سے کوئی ایک سال تک منگنی رہی اور پھر چودھری بشارت کے بیچ میں کودنے سے یہ منگنی نہ صرف ٹوٹ گئی بلکہ چودھری اور نورین کی شادی بھی ہو گئی اور اب اس واقعے کو بھی کم و بیش چھ ماہ گزر گئے تھے۔ اس ناخوشگوار واقعہ بلکہ عظیم سانحے پر کریم بخش اور اس کی بیوی چاند بی بی چودھری بشارت علی اور نورین کی ماں خالدہ کو پیٹھ پیچھے ہی برا بھلا کہہ سکتے تھے سو وہ کہہ رہے تھے اور جہاں تک نور حسین کا تعلق ہے تو...... وہ یقیناً دل مسوس کر رہ گیا ہو گا۔ وہ بھی چودھری کا بگاڑ تو کچھ نہیں سکتا تھا بہرحال...... اسے چودھری کو بددعائیں دینے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ مبینہ چور شاکر نے بھی اسی جانب اشارہ کیا تھا۔

شاکر ہی کے مطابق، کافی عرصہ پہلے نورین کے باپ اسحاق کا انتقال ہو گیا تھا۔ نورین سے ایک چھوٹا بھائی عارف تھا جس کی عمر چودہ سال کے آس پاس رہی ہو گی۔ نورین، چودھری سے شادی کے وقت بیس سال کی تھی۔

اس شادی سے پہلے خالدہ کی گزر بسر کریانہ کی ایک چھوٹی سی دکان پر تھی جو اس نے گھر کے ایک بیرونی کمرے

ہی میں کھول رکھی تھی۔ خالدہ خود ہی پورا دن وہ دکان چلاتی تھی تاہم گاہے بہ گاہے عارف اور نورین بھی اس کی مدد کردیا کرتے تھے۔

شادی کے بعد ان لوگوں کا رنگ ڈھنگ اور رہن سہن بالکل بدل کررہ گیا تھا۔ نورین چھوٹی چودھرائن بن کر چودھری بشارت کی حویلی میں پہنچ گئی تھی۔ نورین ہی کے صدقے خالدہ کو چودھری نے ایک صاف ستھرا مکان دلوادیا تھا۔ اس کے علاوہ پانچ ایکڑ زرعی زمین بھی اس کے نام کردی تھی اور گاہے بہ گاہے مالی مدد بھی کررہا تھا گویا اب اسے کریانہ کی دکان چلانے کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ قانونی اور شرعی لحاظ سے چودھری بشارت علی کی ساس کا مقام حاصل کرچکی تھی۔ چودھری کو کسی بھی صورت یہ گوارا نہ ہوتا کہ اس کی ساس دکانداری کرتی پھرے۔ چودھری نے اسے جتنی زمین دے دی تھی اس کی پیداوار خالدہ اور عارف کی گزربسر کے لیے کافی تھی۔ اس کے علاوہ چودھری اکثر و بیشتر اسے مالی تعاون بھی فراہم کررہا تھا۔

آگے بڑھنے سے پہلے کچھ ذکر چودھری کی پہلی بیوی کا بھی ہوجائے۔ چودھری کی زوجۂ اول کا نام کلثوم تھا۔ کلثوم چالیس کا ہندسہ عبور کرچکی تھی اور چودھری بشارت سے اس کی شادی کو لگ بھگ پندرہ سال گزر گئے تھے۔ کلثوم کے ساتھ ایک بہت بڑی خاندانی کمزوری بھی نتھی تھی۔ اس کے باپ چودھری حشمت آف موضع کرماں والی نے دو شادیاں کی تھیں پہلی بیوی سے کلثوم اور دوسری بیوی سے وقاص نامی ایک لڑکا پیدا ہوا تھا۔ جب کلثوم جوان ہوئی تو اس کی ماں کا انتقال ہوگیا۔ کچھ عرصے کے بعد اس کا باپ چودھری حشمت بھی بیمار رہنے لگا۔ چودھری حشمت نے اس حقیقت کو بڑی گہرائی سے محسوس کرلیا تھا کہ اس کی دوسری بیوی فردوس اور اس کا نوجوان بیٹا چودھری وقاص، کلثوم سے شدید ترین نفرت کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی چودھری کو غیرمحسوس طور پر یہ بھی یقین ہوگیا تھا کہ اب وہ زیادہ عرصے تک جی نہ سکے گا لہٰذا اس نے اپنی آنکھ بند ہونے سے پہلے کلثوم کی شادی چودھری بشارت سے کردی۔ اس شادی کے بعد ایک سال کے اندر ہی چودھری حشمت کا انتقال ہوگیا تھا۔

چودھری حشمت ایک دانا و بینا شخص تھا۔ کلثوم کی شادی کے وقت۔ اس نے اپنی زندگی ہی میں زمین اور جائداد کا بٹوارا بھی کردیا تھا۔ بھاری مالیت کے سونے چاندی کے زیورات کے علاوہ لگ بھگ پچاس ایکڑ زرعی زمین بھی کلثوم کے حصے میں آئی تھی۔

کلثوم نے چودھری بشارت کے ساتھ ایک بیوی کی حیثیت سے کم و بیش پندرہ سال گزار دیے تھے لیکن وہ چودھری کے لیے کوئی اولاد پیدا نہ کرسکی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی قدر و قیمت اور اہمیت کم ہوتی گئی چنانچہ چودھری بشارت نے چھ آٹھ ماہ پہلے نورین سے دوسری شادی کرلی تھی۔

چودھری بشارت کی حویلی میں ایک اہم کردار عرفان کا بھی تھا۔ عرفان کی عمر چھ سال تھی اور وہ چودھری کے چھوٹے بھائی چودھری شرافت علی کا بیٹا تھا۔ چودھری شرافت علی موضع رانی پور کا رہنے والا تھا۔ عرفان کو نہایت ہی کم عمری میں چودھری بشارت نے "اڈاپٹ" کرلیا تھا۔

کلثوم کی ایک بڑی خاندانی کمزوری کا میں نے پیچھے ذکر کیا ہے اور وہ کمزوری یہ تھی کہ اس کے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ شادی کے فوراً بعد اس کا میکا ختم ہوگیا تھا۔ اس کی سوتیلی ماں فردوس اور سوتیلا بھائی اس کی شکل دیکھنے کے روادار نہیں تھے۔ کوئی اخلاقی مدد یا تعاون کرنا تو بہت دور کی بات ہے تھا۔ شادی کے بعد چودھری بشارت اپنے بھتیجے عرفان کو اڈاپٹ کررہا تھا تو وہ ایک لفظ مخالفت اپنی زبان پر نہ لاسکی۔ اسی طرح جب چودھری نے دوسرا بیاہ رچایا تو بھی وہ کوئی صدائے احتجاج بلند نہ کرسکی کیونکہ وہ چودھری بشارت کے مزاج اور خودپسندی سے اچھی طرح آگاہ تھی۔ اس کے پاس، خاموش رہ کر اپنے حالات کے ساتھ سمجھوتا کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔

یہ تمام حالات اتنی تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آگے چل کر، اس کہانی کے مطالعے کے دوران میں آپ کا ذہن کیس کے پس منظر کے حوالے سے کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔

دوپہر سے کچھ دیر پہلے مبینہ چور شاکر علی کے گھر سے اس کا باپ جمیل اور ماں رشیدہ تھانے پہنچ گئے۔ جیسا کہ اوپر بتا چکا ہوں، یہ لوگ کھیت مزدور تھے اور محنت مزدوری کرکے اپنی گزربسر کررہے تھے۔

وہ بڑھیا اور بوڑھا اس بات سے واقف نہیں تھے کہ ان کا بیٹا گزشتہ رات سے غائب تھا۔ انہیں اس کی گمشدگی کے بارے میں آج صبح ہی پتا چلا تھا اور وہ اسے دیکھنے سیدھے تھانے آگئے تھے۔

"کمال ہے.....!" میں نے جمیل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "شاکر آدھی رات سے غائب تھا اور آپ لوگوں کو اس کی کچھ خبر ہی نہیں.....؟"

"سرکار! ہم دونوں پورا دن کھیتوں میں کام کرتے کرتے اتنا زیادہ تھک جاتے ہیں کہ گھر آنے کے بعد کسی چیز کا ہوش ہی نہیں رہتا۔" شاکر کا بوڑھا باپ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "رات کا کھانا کھا کر ہم لوگ سوجاتے ہیں۔ شاکر رات کو دیر سے گھر آتا ہے۔ ہمیں کچھ پتا نہیں چلتا کہ وہ کب آیا اور کب سویا.....؟"

"اس کو بھی اپنے ساتھ کھیتوں میں لے کر جایا کرو نا....." میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "تاکہ یہ بھی تھکن سے اتنا چور ہوجائے کہ آپ لوگوں سے بھی پہلے خراٹے لینے لگے۔"

"کبھی کبھی یہ بھی جاتا ہے ادھر مزدوری کرنے۔" رشیدہ بیٹے کی حمایت کرتے ہوئے بولی۔

"کبھی کبھی کیوں؟" میں نے تیز لہجے میں بڑی بی سے استفسار کیا۔ "اس سرکاری سانڈ کو کوئی شرم حیا بھی ہے کہ نہیں..... بوڑھے ماں باپ سارا دن محنت مشقت کرتے ہیں اور اسے آوارہ پھرنے ہی سے فرصت نہیں؟"

"یہ مجبور ہے بے چارہ.....!" رشیدہ بیٹے کی حمایت جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "یہ جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتا۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا مجبوری ہے اس کی؟"

"جناب! اس کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔" اس مرتبہ جمیل نے میرے سوال کا جواب دیا۔ "پچھلے ایک ماہ سے شاہ جی کا علاج ہورہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ..... شاکر کو مکمل ٹھیک ہونے میں ایک سال لگ جائے گا۔"

"ویسے جب سے شاہ جی نے اس کا علاج شروع کیا ہے وہ کافی بہتر ہے۔" رشیدہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

"یہ شاہ جی کون ہیں؟" میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"پیر محسن شاہ جناب!" جمیل نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ "ادھر نہر کے کنارے ان کا آستانہ ہے۔"

چودھری بشارت علی کی حویلی کے مشرقی پہلو میں شمالاً جنوباً ایک نہر گزرتی تھی۔ یہ ایک چھوٹی نہر تھی جو اپنے دونوں کناروں پر پھیلے ہوئے کھیتوں کو سیراب کرنے کا فریضہ انجام دیتی تھی۔

"شاہ جی نے بیماری کیا بتائی ہے؟" میں نے بوڑھے جمیل کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

"وہ کہتے ہیں، شاکر کے دل و دماغ پر ہوائی چیزوں کے اثرات ہیں۔" جمیل نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ "شاہ جی کاٹ کررہے ہیں۔ انشاءاللہ! وہ ٹھیک ہوجائے گا۔"

جب ہم کسی بات کے ساتھ "انشاءاللہ!" کے الفاظ نتھی کردیتے ہیں تو اس کا واضح مطلب یہی ہوتا ہے کہ..... اگر اللہ نے چاہا تو یا اگر اللہ کی مرضی ہوئی تو..... اپنے کسی کام میں اللہ کی رضا اور منشا کو شامل کرنا بڑی اچھی بات ہے لیکن اس موقع پر اپنے عمل کا جائزہ لینا بھی نہایت ضروری ہوجاتا ہے۔ اللہ پاک تو ہر انسان کی بہتری اور بھلائی ہی چاہتے ہیں۔ اگر ہم کسی کام میں بہتری کی امید رکھتے ہیں تو اپنے عمل کو اس کام کے مطابق بنانا بھی ضروری ہوتا ہے لیکن عام طور پر دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ ہمارا عمل تو کسی اور سمت میں جارہا ہوتا ہے اور ہم اس کے برعکس اللہ کی رضا اور حمایت چاہ رہے ہوتے ہیں۔ بہرحال، ہم سب پر..... اللہ رحم فرمائے۔

"ہوائی چیزیں.....؟" میں نے جمیل کی بات کے جواب میں کہا۔ "مطلب یہ کہ..... کوئی پرندے وغیرہ.....!"

میں نے دانستہ مصنوعی لاعلمی کا اظہار کیا تو رشیدہ نے بے چینی سے مجھے دیکھا اور اپنے الفاظ میں زور بھرتے ہوئے بولی۔ "نہیں تھانے دار جی..... شاہ جی کا مطلب ہے، آسیب اور سایہ وغیرہ..... وہ مخلوق جو کسی کو نظر نہیں آتی۔"

"وہ مخلوق جو صرف محسن شاہ کو نظر آتی ہے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں استفسار کیا۔ "ہے نا.....؟"

"آپ کو یقین نہیں آرہا تھانے دار صاحب۔" جمیل نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "لیکن یہ سچ ہے کہ جب سے شاہ جی نے شاکر کا علاج شروع کیا ہے، دھیرے دھیرے اس کی طبیعت ٹھیک ہوتی جارہی ہے۔"

"اسی لیے اب اس نے چوری چکاری شروع کردی ہے۔" میں نے کہا۔

"جی..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" وہ بہ یک وقت چونک کر مجھے دیکھنے لگے۔

میں نے انہیں چودھری بشارت علی اور اس کے بندوں کے، شاکر پر عائد کردہ الزامات کے بارے میں تفصیلاً بتایا۔ انہوں نے حیرت سے آنکھیں پھیلا کر میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر ایک مرتبہ پھر بیک زبان بولے۔

"ہمارا بیٹا چوری نہیں کرسکتا جی.....!"

"تمام والدین اپنی کمی اولاد کے بارے میں کچھ اسی قسم کے خیالات رکھتے ہیں۔" میں نے بیزاری سے کہا۔ "جاؤ، تم لوگ حوالات میں اپنے بیٹے سے ملاقات کرلو۔"

پھر میں نے ایک کانسٹیبل کو بلا کر جمیل اور رشیدہ کو اس کے ہمراہ حوالات کی طرف روانہ کردیا۔

میں نے شاکر سے پوچھ گچھ کرنے کے دوران میں بہ غور اس کا جائزہ بھی لیا تھا۔ ٹھیک ہے، وہ بے ربط اور سادھی گفتگو کرتا تھا اور اس کا فوکس بھی تھوڑی دیر کے بعد

بگڑنے لگتا تھا لیکن مجھے اس میں ''ہوائی چیزوں'' والی کوئی علامت دکھائی نہیں دی تھی۔ میرا تجزیہ یہ بتاتا ہے کہ ''ہوائی چیزوں'' سے نسبت رکھنے والے ایک سو کیسز میں سے ننانوے مختلف قسم کے دماغی اور نفسیاتی عارضوں کے نتیجے میں سامنے آتے تھے۔ ان کا کسی ماورائی مخلوق سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور اگر ان کا ڈھنگ سے کسی نفسیاتی معالج یا ذہنی امراض کے ماہر سے علاج کرایا جائے تو حامل علامات تندرست بھی ہو جاتا ہے۔ باقی رہ گئے ایک فیصد افراد تو وہ واقعتاً کسی ماورائی علاج جسے آپ روحانی علاج کا نام بھی دے سکتے ہیں، ہی سے ٹھیک ہو پاتے ہیں۔ جنات اور دیگر شریر مخلوقات کے وجود سے تو انکار ممکن نہیں لیکن بدی کی قوتیں اتنی بھی عام کارفرما نہیں ہیں جتنی کہ محسن شاہ ٹائپ روحانی معالجوں نے مشہور کر رکھی ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ اس ٹائپ کے معالجوں کا دھندا ہی اسی بنیاد پر چلتا ہے۔

جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا، سو مریضوں میں سے کوئی ایک آدھ واقعتاً کسی ماورائی عارضے میں مبتلا ہوتا ہے بالکل ویسے ہی سو روحانی معالجوں میں سے کوئی ایک آدھ ہی ماہر علم و ہنر ہوتا ہے، باقی سب اپنا کاروبار چمکانے والے ڈبا پیر ہوتے ہیں۔

جمیل اور رشیدہ پندرہ بیس منٹ کے بعد واپس میرے پاس آئے اور جمیل نے منت ریز لہجے میں مجھ سے کہا۔

''تھانے دار صاحب! میرا بیٹا بے قصور ہے۔ آپ اسے چھوڑ دیں۔''

''میں اسے ضرور چھوڑ دوں گا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن اس وقت جب مجھے اس کی بے گناہی کا یقین آجائے گا۔ کم از کم کل صبح تک اس کا تھانے میں بند رہنا ضروری ہے۔''

''لیکن تھانے دار جی......'' رشیدہ نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

مگر میں نے اس کے بولتے ہی بات کاٹ دی۔ ''لیکن ویکن کچھ نہیں رشیدہ! میں نے جو کہہ دیا وہی آخری بات ہے۔ تم لوگ بے فکر ہو کر جاؤ۔ جب تک تفتیش مکمل نہیں ہو جاتی، شاکر تھانے میں بند رہے گا۔ اس بات کا میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر وہ کسی جرم میں ملوث نہیں تو اسے ایک تھپڑ بھی نہیں مارا جائے گا۔''

وہ دونوں بے بسی سے مجھے دیکھنے لگے۔ ایک بات میرے حتمی لہجے نے انہیں اچھی طرح سمجھا دی تھی کہ میں تسلی کیے بغیر شاکر کو تھانے سے جانے نہیں دوں گا۔

''تھانے دار صاحب!'' جمیل نے لجاجت بھرے لہجے میں کہا۔ ''شاکر نے بتایا ہے کہ رات کو چودھری کے بندوں نے اس کے ساتھ وحشیانہ برتاؤ کیا ہے اور صبح چودھری صاحب نے بھی اس پر لاتیں گھونسے برسائے ہیں......''

''میں نے ابھی تم لوگوں سے شاکر کی سلامتی اور حفاظت کے حوالے سے جو وعدہ کیا ہے اس کا تعلق میرے تھانے سے ہے۔'' میں نے ان پر واضح کرتے ہوئے کہا۔ ''رات چودھری کی حویلی میں اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا گیا ہے وہ فی الحال میری ذمے داری میں نہیں آتا۔ اگر آپ کا بیٹا بے گناہ ثابت ہو جاتا ہے تو پھر میں چودھری سے یہ سوال ضرور کروں گا کہ اس نے شاکر کے ساتھ بدسلوکی کیوں کی......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''ابھی آپ لوگ جا کر چودھری بشارت سے پوچھ سکتے ہیں کہ اس نے اور اس کے بندوں نے آپ کے بیٹے کو رات زدوکوب کیوں کیا تھا......؟''

میرے آخری جملے نے ان کے چہروں پر کوفت ابھار دی۔ انہوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر جمیل نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''جناب! چودھری صاحب کو تو اللہ ہی پوچھے گا......!''

☆☆☆

آج صبح جب چودھری بشارت کا خاص بندہ قدیر شاکر کو ایک چور کی حیثیت سے میرے پاس چھوڑ گیا تھا تو میں نے واپسی میں اس کے ہاتھ چودھری کے لیے ایک پیغام بھجوایا تھا کہ وہ کسی وقت تھانے آ کر مجھ سے ملاقات کرے لیکن جب سہ پہر تک بھی اس کی شکل نظر نہ آئی تو میں نے اس سے ملنے حویلی جانے کا فیصلہ کر لیا۔

میں نے کانسٹیبل شوکت سے کہہ کر ایک تانگا منگوایا اور اسے ساتھ لے کر چودھری بشارت علی کی حویلی پہنچ گیا۔ اگرچہ شام ہونے میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے لیکن موسم سرما کی مہربانی سے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اب تب میں مغرب ہونے والی ہے۔

حویلی کے داخلی گیٹ پر میں نے تانگا رکوایا اور چودھری کے لیے پیغام بھجوایا کہ میں، ملک صفدر حیات تھانا انچارج اس سے ملنے آیا ہوں۔ چودھری کے ملازم نے ہم دونوں کو بڑے احترام کے ساتھ وسیع و عریض بیٹھک میں بٹھایا اور خود چودھری کو ہماری آمد کی اطلاع دینے حویلی کے اندرونی حصے کی طرف چلا گیا۔ حویلی کے اندر آنے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔ میں نے اس روز چودھری کی حویلی کو جتنا دیکھا

اور جیسا پایا اس کا نقشہ کھینچنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ یہ زیر نظر کیس کا ایک اہم حصہ ہے۔

وہ ایک وسیع و عریض حویلی تھی۔ جس کے مشرقی پہلو میں تھوڑے فاصلے پر ایک نہر رواں دواں تھی اور حویلی کے عقب میں یعنی جنوب کی سمت سبز و شاداب کھیتوں کا سلسلہ بہت دور تک پھیلا ہوا تھا۔ موضع حسین آباد کے اندر سے گزرنے کے بعد گاؤں کے آخری حصے میں یہ حویلی واقع تھی۔

حویلی کے بڑے گیٹ سے اندر داخل ہوں تو بائیں جانب ایک وسیع و عریض بیٹھک بنی ہوئی تھی جس میں بیک وقت کم از کم سو افراد کے بیٹھنے کی گنجائش نظر آ رہی تھی۔ لوگوں کے بیٹھنے کے لیے وہاں مختلف قسم کی نشستیں رکھی نظر آ رہی تھیں جن میں موڑھے، کرسیاں، صوفے اور فرشی نشست یعنی دریاں بھی بچھی ہوئی تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق وہاں ہر انسان کو اس کے مرتبے کے مطابق بٹھایا جاتا تھا۔ بیٹھک کی دیواروں پر مختلف نوعیت کے روغنی اور منقش فریم بھی آویزاں کیے گئے تھے جن میں زیادہ تر چودھری خاندان کے بزرگوں کی تصاویر لگی دکھائی دیتی تھیں۔

اس بیٹھک کے متوازی گیٹ کی دائیں طرف ملازموں کے لیے کمرے بنے ہوئے تھے جن کی تعداد چار یا پانچ تھی۔ اس کے بعد حویلی کا کشادہ صحن تھا جس میں دیواروں کے ساتھ ساتھ پھل دار اور پھول دار دونوں طرح کے پودے اور درخت اپنی بہار دکھلا رہے تھے۔ صحن کے عین وسط میں موٹے تنے والا ایک سایہ دار اور گھنا، بوڑھے برگد کا پیڑ قبضہ جمائے کھڑا تھا۔ اس برگد کا تنا اتنا موٹا تھا کہ بلا مبالغہ کسی بھی جوان کے کلاوے میں نہیں آ سکتا تھا۔

صحن کے اختتام پر حویلی کا رہائشی حصہ شروع ہوتا تھا جو حویلی کے اختتام تک چلا گیا تھا۔ اس رہائشی حصے کے بھی دو پورشن تھے جو تعمیر کے اعتبار سے جڑواں بھائی نظر آتے تھے۔ ایک حصے میں کلثوم اور دوسرے حصے میں نورین کی رہائش تھی۔ چودھری کا بھتیجا عرفان کلثوم والے حصے میں رہتا تھا جبکہ دوسری شادی کے بعد چودھری بشارت کا زیادہ تر وقت حویلی کے اس حصے میں گزرتا تھا جہاں نورین رہتی تھی۔

وہ باڑا جہاں پچھلی رات شاکر کو زدوکوب کیا گیا تھا وہ حویلی سے تھوڑے ہی فاصلے پر کھیتوں کے بیچ واقع تھا۔ اس باڑے میں چودھری کے مال مویشی اور دیگر زرعی آلات رکھے جاتے تھے۔ باڑے کے اندر بھی ملازمین کے لیے دو تین نیچی چھتوں والے کمرے بنے ہوئے تھے۔ شاکر کو پچھلی رات جانوروں کی معیت میں گزارنا پڑی تھی۔

جو بندہ ہماری آمد کی اطلاع لے کر حویلی کے اندر گیا تھا، تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ واپس آیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تھانے دار صاحب! آپ کو چودھری صاحب نے حویلی کے اندر بلایا ہے۔''

میں نے سوال کیا۔ ''چودھری صاحب بیٹھک میں نہیں آ سکتے؟''

''ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے جناب۔'' ملازم نے جواب دیا۔ ''اسی لیے انہوں نے آپ کو اندر آنے کے لیے کہا ہے......''

''شوکت علی!'' میں نے اپنے ساتھ آنے والے کانسٹیبل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم ادھر بیٹھک ہی میں بیٹھو، میں چودھری صاحب سے مل کر آتا ہوں۔''

کانسٹیبل نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔ میں ملازم کی راہنمائی میں بیٹھک سے نکل آیا اور کشادہ صحن کو عبور کر کے چودھری بشارت کی خواب گاہ میں پہنچ گیا۔ ملازم مجھے چودھری کے پاس چھوڑ کر واپس چلا گیا۔

چودھری تکیوں سے ٹیک لگائے پلنگ پر نیم دراز تھا۔ اس نے حتی الامکان گرمجوشی کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کیا اور مجھے بیٹھنے کے لیے کہا۔ میں اس کے سامنے ہی ایک منقش اور آرام دہ چوبی کرسی پر بیٹھ گیا جو یقیناً چودھری نے میرے لیے ہی وہاں رکھوائی تھی۔

''چودھری صاحب! آپ نے اپنی طبیعت کو کیا کر لیا ہے؟'' رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے پوچھا۔

''بس ملک صاحب! موسم کا اثر ہے۔'' وہ قدرے دھیمی آواز میں بولا۔ ''بخار اور زکام نے اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے دو دن سے...... اسی لیے میں آپ سے ملاقات کرنے تھانے بھی نہیں آ سکا۔''

''آپ نہیں آئے تو میں آ گیا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اپنا خیال رکھا کریں چودھری صاحب...... اس عمر میں موسم کی ذرا سی اونچ نیچ کیا سے کیا کر کے رکھ دیتی ہے۔''

چودھری بشارت کی عمر پچاس سے متجاوز تھی۔ اس عمر میں عموماً مرد کے جھٹکنے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں تاہم چودھری کی صحت اور سر کے بالوں وغیرہ سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے اپنی صحت اور جوانی کو مفت کا مال سمجھ کر بڑی بے دردی سے استعمال کیا تھا۔ میں نے اپنی بات میں اس کی عمر کے حوالے سے چٹکی لی تو وہ پھریری لے کر بولا۔

''ملک صاحب! میرے آدھے سے زیادہ سفید بالوں کو دیکھ کر آپ میرے بارے میں کوئی ایسا ویسا اندازہ قائم

کرنے کی کوشش نہ کریں۔ یہ تو دائمی نزلے کی وجہ سے سفید ہو گئے ہیں۔ میں تو اب بھی بہت سے جوانوں سے زیادہ جوان اور صحت مند ہوں۔"

لگتا تھا، میں نے اس کی دکھتی رگ کو چھیڑ دیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی اختلافی موضوع میں الجھ کر وقت برباد کروں لہٰذا میں نے صورتِ حال کو سنبھالتے ہوئے جلدی سے کہا۔

"جناب! یہ بات تو میں نے آپ کی ناساز طبیعت کو دیکھتے ہوئے ایک مشورے کے طور پر کہی ہے ورنہ آپ کی صحت اور جوانی پر تو کسی کو بھی شک نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو آپ چھ ماہ پہلے بیس سال کی ایک لڑکی سے شادی نہ کرتے......"

میری وضاحت سن کر اس کی آنکھوں میں جگنو سے چمک اٹھے۔ اسی لمحے چودھری کا ملازم ایک ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔ مذکورہ ٹرے انواع واقسام کی خورونوش کی چیزوں سے بھری ہوئی تھی۔ ملازم نے چودھری کے حکم پر ٹرے کو میرے قریب ایک میز پر رکھ دیا اور جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ چودھری نے اس سے پوچھا۔

"تم نے بتایا تھا کہ تھانے دار صاحب کے ساتھ ایک سپاہی بھی آیا ہے۔ اس کے کھانے پینے کا بھی کوئی بندوبست کیا؟"

"جی چودھری صاحب!" وہ گردن کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "آپ کے حکم کی تعمیل کر دی ہے جناب۔"

ملازم کے جانے کے بعد چودھری میری جانب متوجہ ہوا اور ٹرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "ملک صاحب! باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ آپ ساتھ ساتھ یہ بھی لیتے جائیں۔"

"اس کی کیا ضرورت تھی چودھری صاحب۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ نے خواہ مخواہ یہ تکلف کیا؟"

"کوئی مجھ سے ملنے آئے اور کچھ کھائے پیے بغیر واپس چلا جائے اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" وہ اصراری لہجے میں بولا۔ "آپ کے انکار یا ہچکچاہٹ کو قبول نہیں کیا جائے گا......"

میں نے کھانے پینے کی اشیا سے لدی پھندی اس ٹرے کا جائزہ لیا۔ اس میں کھوئے والا گاجر کا حلوا، دو پیس میں کٹے ہوئے بوائل ایگ، بسکٹ، چائے اور مختلف قسم کے خشک میوا جات رکھے نظر آ رہے تھے۔ میں نے چودھری کی خواہش اور مہمان نوازی کے احترام میں اپنے لیے چائے کے ساتھ چند چیزیں نکالیں پھر ہمارے درمیان باقاعدہ گفتگو کا آغاز ہوا۔ چودھری نے مجھ سے پوچھا۔

"ملک صاحب! اس بندے نے کچھ بتایا ہے؟"

"آپ کا اشارہ اس موٹے شاکر کی طرف ہے نا؟"

"جی ہاں وہی۔" وہ جلدی سے بولا۔ "اس نے اپنا جرم قبول کیا یا نہیں؟"

"میں نے اب تک جتنی تفتیش کی ہے اس میں تو وہ مجھے بے قصور نظر آتا ہے۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس کے مطابق، نہ تو وہ آپ کی حویلی کے اندر داخل ہوا ہے اور نہ ہی اس نے آپ کی کوئی چیز چرائی ہے بلکہ اس کا تو دعویٰ ہے کہ آپ کے بندوں نے اسے حویلی کے پچھواڑے کھیتوں میں سے پکڑا تھا۔" میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس کو رات بھر جانوروں والے باڑے میں رکھ کر جو مار پیٹ کی گئی وہ بھی سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔"

چودھری نے تحمل سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر سوال کیا۔ "ملک صاحب! آپ نے اس نامراد سے یہ سوال کیا کہ وہ آدھی رات کو میری حویلی کے پچھواڑے کیا کر رہا تھا؟"

میں نے شاکر کی بیان کردہ توجیہ چودھری کے سامنے رکھ دی۔

وہ طنزیہ انداز میں مسکرایا اور بولا۔ "کسے رفع حاجت کے لیے پورے گاؤں میں میری حویلی کا پچھواڑا ہی ملا تھا۔ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ اس بدذات کا گھر اس حویلی سے کافی فاصلے پر گاؤں کے دوسرے حصے میں ہے اور اس کے گھر کے نزدیک بھی کھیتوں کی کمی نہیں......"

چودھری کی بات میں وزن تھا۔ مجھے یہ بھی اندازہ لگانے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ وہ شاکر کے حویلی کے پیچھے پائے جانے کے حوالے سے اپنے ذہن میں ایک مخصوص سوچ رکھتا تھا۔ میں نے یہ عقدہ اسی کے ہاتھوں کھلوانے کا فیصلہ کیا اور کہا۔

"چودھری صاحب! لگتا ہے آپ بھی اس بات سے متفق ہیں کہ شاکر آپ کی حویلی کے اندر داخل ہوا ہے اور نہ ہی اس نے حویلی کے اندر سے کوئی چیز چرائی ہے لیکن آپ کو اس کی حویلی کے پچھواڑے موجودگی پر اعتراض ہے اور اس اعتراض کے پیچھے کوئی سنسنی خیز کہانی ہے......" میں نے لمحاتی توقف کر کے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور پوچھا۔

"میں غلط تو نہیں کہہ رہا چودھری صاحب......؟"

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ بہت کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن کسی سبب اس نے زبان کو روک لیا تھا۔ میں مذکورہ سبب تک رسائی کے لیے بے قرار ہو گیا۔

"چودھری صاحب!" میں نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔ "میں آپ کا سچا ہمدرد ہوں۔ اگر آپ کو کسی بھی حوالے سے شاکر پر کوئی خاص قسم کا شک ہے تو وہ معاملہ مجھ سے چھپانے کی کوشش نہ کریں۔ اگر آپ کو قانون کی مدد اور تعاون چاہیے تو سب کچھ کھول کر بیان کر دیں۔"

چند لمحات کے لیے وہ مجھے کسی گہری سوچ میں غرق دکھائی دیا پھر ایک فیصلے پر پہنچتے ہوئے وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"میرا خیال ہے، مجھے آپ پر پورا بھروسا کرنا چاہیے......"

"یہ آپ کا ایک دانش مندانہ فیصلہ ہوگا۔" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔

"آپ آئیں میرے ساتھ......" وہ اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "میں پہلے آپ کو کچھ دکھاتا ہوں، پھر آرام سے بیٹھ کر بات کریں گے۔"

میں اشیائے خورونوش سے بڑا کامل انصاف کر چکا تھا۔ چودھری کو دیکھ کر میں نے بھی نشست چھوڑ دی۔ چودھری بشارت کا پُراسرار انداز بتا رہا تھا کہ وہ کوئی سنسنی خیز انکشاف کرنے جا رہا ہے۔ میں اس کی معیت میں چلتے ہوئے، حویلی کے رہائشی حصے میں سے گزرتے ہوئے عقبی حصے میں پہنچ گیا۔ رہائشی حصہ حویلی کی چار دیواری کے اندر تعمیر کیا گیا تھا، وہ اس طرح کہ حویلی کی بیرونی دیوار اور رہائشی عمارت کے بیچ آٹھ دس فٹ جگہ خالی چھوڑ دی گئی تھی تاکہ تازہ ہوا آسانی سے گزر کر حویلی کے اندرونی حصوں میں تازگی اور فرحت کو بحال رکھ سکے۔

میں چودھری کی راہنمائی میں اسی خالی حصے میں پہنچ گیا۔ یہاں ایک جانب حویلی کی اونچی دیوار اور دوسری طرف رہائشی عمارت کا عقب تھا۔ حویلی کی چار دیواری کی اونچائی لگ بھگ دس فٹ رہی ہوگی۔ وہ ایک مضبوط فصیل نما دیوار تھی۔

"ملک صاحب! میں آپ کو اپنی ایک ایسی پریشانی کے بارے میں بتا رہا ہوں جو میرے اور میری بیوی کے سوا اور کسی کے علم میں نہیں ہے۔" وہ گمبھیر انداز میں بولا۔ "مجھے اُمید ہے، آپ اپنی تحقیق کے دوران میں حتی الامکان اس راز کی حفاظت کریں گے۔"

بات ختم کر کے اس نے امید بھری نظر سے مجھے دیکھا تو میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ "آپ بالکل بے فکر ہو جائیں چودھری صاحب۔ سمجھیں، آپ کا راز میرا راز ہے۔"

اس کے چہرے پر اطمینان جھلکا پھر تشکرانہ انداز میں گردن ہلانے کے بعد رہائشی عمارت کی ایک عقبی کھڑکی کی سمت اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے مستفسر ہوا۔

"آپ جانتے ہیں، اس کھڑکی کے پیچھے کیا ہے؟"

ظاہر ہے، میں نہیں جانتا تھا۔ میں نے تو اس حویلی میں آج پہلی مرتبہ قدم رکھا تھا لہٰذا میں نے بڑی سادگی سے کہہ دیا۔ "میں نہیں جانتا......!"

"یہاں اچھی خاصی سردی ہو رہی ہے۔" چودھری نے سرسری انداز میں کہا۔ "چلیں، اندر بیٹھ کر اطمینان سے بات کرتے ہیں۔"

چودھری کی چونکہ طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی اس لیے وہ موسم کی شدت کو کچھ زیادہ ہی محسوس کر رہا تھا۔ ویسے اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش بھی نہیں تھی کہ وہ شام سے پہلے کا وقت تھا اور فضا میں خنکی بہ درجہ اتم موجود تھی۔

ہم دوبارہ اسی خواب گاہ میں پہنچ گئے جہاں سے تھوڑی دیر پہلے اٹھ کر گئے تھے۔ اب کی بار چودھری نے میرے اور اپنے دونوں کے لیے مرغی کی گرما گرم یخنی منگوائی اور دوبارہ ٹیک لگا کر بیٹھنے کے بعد سرسراتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ملک صاحب! وہ جو کھڑکی میں نے آپ کو دکھائی ہے نا اس کے پیچھے ہمارا غسل خانہ ہے جو میرے اور نورین کے استعمال میں رہتا ہے۔"

اتنا بتا کر وہ خاموش ہوا تو میں کوئی سوال کیے بغیر ہمہ تن گوش رہا۔ یہاں مذکورہ کھڑکی کے حوالے سے ایک وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اسے عام پٹ والی چوبی کھڑکی نہ سمجھا جائے۔ یہ روشن دان کے سائز کی ایک مستطیل جگہ تھی جس کے اندر ڈیزائن دار سیمنٹ کی جالی لگی ہوئی تھی جس کے خالی حصوں میں سے تازہ ہوا کا بہ آسانی گزر ہو سکتا تھا۔ سطح زمین سے یہ "کھڑکی" کوئی آٹھ فٹ اونچائی پر بنائی گئی تھی۔

چودھری اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"پچھلے کچھ عرصے سے ہر جمعرات کو اس غسل خانے کے اندر سے ایک تعویذ پڑا مل رہا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس تعویذ پر نورین ہی کی نظر سب سے پہلے پڑتی ہے۔ وہ تعویذ مجھے کبھی غسل خانے میں پہلے پڑا دکھائی نہیں دیا۔ مجھے شک ہے کہ تعویذ کو اسی روشن دان نما کھڑکی سے اندر پھینکا جاتا ہے......" اس نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"سب سے پہلے میرا شک میری پہلی بیوی کلثوم کی طرف گیا تھا جو حویلی کے دوسرے حصے میں رہتی ہے۔ ظاہر ہے، اس کی موجودگی میں، میں نے نورین سے دوسری شادی کی ہے۔ کوئی بھی عورت اپنی سوکن کو برداشت نہیں کر سکتی۔ کلثوم بہ ظاہر تو میری نورین سے شادی کی مخالفت نہیں کر سکتی

تھی۔ ہوسکتا ہے، اس کے دل میں بہت زیادہ غم وغصہ بھرا ہوا ہو اسی لیے میرا دھیان سب سے پہلے کلثوم کی طرف گیا تھا۔ ظاہر ہے، اس نازک معاملے پر اگر میں براہِ راست اس سے بات کرتا اور واقعتاً اس گندے کھیل میں ملوث ہوتی تو میرے پوچھنے پر وہ صاف مکر جاتی لہٰذا میں نے نہایت ہی رازداری کے ساتھ اس پُراسرار کھیل کی چھان بین کا کام شروع کردیا۔ ایک بات تو طے ہے کہ کلثوم حویلی کے اس حصے میں قدم بھی نہیں رکھتی لہٰذا یہ سوچنا کہ وہ خود آکر غسل خانے میں تعویذ رکھ جاتی ہوگی بالکل غلط ہے۔ اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ وہ حویلی کے پچھواڑے جاکر کھڑکی کے راستے غسل خانے کے اندر تعویذ پھینکتی ہو۔ اب ایک ہی امکان باقی رہ جاتا تھا کہ اگر کلثوم اس کھیل میں شامل ہے تو وہ اپنے کسی وفادار سے یہ کام کرائی ہوگی......"

"آپ کو یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ اس حویلی کے اندر بڑی چودھرائن کے وفادار کون کون ہیں؟" وہ لمحے بھر کو رکا تو میں نے سوال کردیا۔ "آخر وہ بھی پچھلے پندرہ سال سے اس حویلی میں رہ رہی ہیں......!"

"مرد ملازم تو سب میری مٹھی میں ہیں۔" وہ چٹانی اعتماد سے بولا۔ "ان بندوں کے علاوہ دو ملازم عورتیں اس حویلی میں کام کرتی ہیں۔ بشیراں، نورین کی خدمت پر مامور ہے اور صغریٰ کلثوم کی خدمت کے لیے......" ایک گہری سانس چھوڑنے کے بعد وہ آگے بڑھا۔

"بشیراں کو تو میں نے کچھ عرصہ پہلے ہی ملازم رکھا ہے، دوسری شادی کے بعد لیکن صغریٰ پچھلے دس سال سے کلثوم کے ساتھ ہے۔ میرا شک اسی پر جارہا تھا۔ میں نے پچھلے کئی روز سے اس کی کڑی نگرانی کروا کے بھی دیکھ لی ہے۔ وہ اس شیطانی چکر میں ملوث نہیں پائی گئی۔ ہر طرف سے ناکام ہونے کے بعد میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ کسی باہر کے آدمی کی کارستانی ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی میں نے قدیر اور جبار کو تاکید کردی کہ وہ حویلی کے عقبی حصے پر گہری نظر رکھیں چنانچہ پچھلی رات انہوں نے شاکر کو حویلی کے پچھواڑے مشکوک انداز میں ٹہلتے ہوئے دیکھا تو پکڑ لیا۔ میں مانتا ہوں کہ وہ حویلی کے اندر داخل نہیں ہوا اور نہ ہی اس نے یہاں سے کچھ چرایا ہے لیکن جو صورتِ حال میں نے آپ کو بتائی ہے اس کی روشنی میں میرا دھیان کسی اور طرف جا ہی نہیں سکتا۔ اب وہ آپ کے قبضے میں ہے۔ اس کی زبان کھلوانا آپ کا کام ہے۔"

"پچھلی رات آپ کے ملازموں نے اسے باڑے میں رکھ کر خوب مارا پیٹا ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "آج صبح جب اسے آپ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ نے بھی اس کی ٹھکائی کی ہے۔ کیا اس نے آپ کے سوالوں کے جواب میں کچھ بتایا؟"

"اگر اس نے زبان کھول دی ہوتی تو پھر میں اسے تھانے نہ بھیجتا ملک صاحب۔" وہ سنسناتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "پھر تو سارا مسئلہ ہی حل ہوجانا تھا ناجناب۔"

"ٹھیک ہے، وہ میرے پاس ہے تو اس کو سچ بولنے پر بھی میں ہی مجبور کروں گا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "آپ نے بتایا ہے کہ پُراسرار تعویذوں والے معاملے سے آپ اور آپ کی دوسری بیوی ہی واقف ہیں یا پھر ابھی آپ نے مجھے اس راز میں شریک کیا ہے؟"

"جی ہاں، یہی حقیقت ہے۔" وہ بڑے وثوق سے بولا۔

"جب آپ نے قدیر اور جبار کو حویلی کے عقبی حصے کی نگرانی کا حکم دیا تو کیا کہا تھا۔" میں نے پوچھا۔ "کیا انہیں بھی آپ نے اس راز میں شریک کیا تھا؟"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب۔" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں نے انہیں چوری چکاری کے حوالے سے تنبیہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ حویلی کے بیرونی معاملات پر گہری نظر رکھیں۔ وہ تعویذوں والی کہانی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔"

"ہوں......" میں گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر پوچھا۔ "غسل خانے سے تعویذ ملنے کا سلسلہ اندازاً کب سے چل رہا ہے؟"

"جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے۔" وہ بتانے لگا۔ "تعویذ جمعرات یعنی جمعہ کی صبح ہی کو غسل خانے میں پڑا ملتا ہے۔ ابھی تک تین تعویذ ملے ہیں۔ کل چوتھی جمعرات تھی اور شاکر کو میرے بندوں نے پکڑ لیا اور اس جمعرات کو تعویذ بھی نہیں ملا......اب آپ خود ہی سوچیں، یہ سارے اشارے کس طرف جاتے ہیں؟"

"آپ کے بندوں نے پچھلی رات جب شاکر کو پکڑا تو اس کی تلاشی بھی لی ہوگی۔" میں نے ایک اہم سوال کیا۔ "کیا اس کی جامہ تلاشی سے کوئی تعویذ وغیرہ بھی برآمد ہوا تھا؟"

"نہیں جناب!" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "اس کے پاس سے کچھ بھی برآمد نہیں ہوا، ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔"

"چودھری صاحب!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس سے تو ظاہر ہوتا ہے، تعویذ والے معاملے سے اس کا دور دور کا واسطہ نہیں؟"

"اب جو بھی ہے، میں نے سارے حالات آپ کے سامنے رکھ دیے ہیں۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "تفتیش سے حقائق کو سامنے لے کر آنا آپ کا کام ہے۔"

"میں اپنا کام اچھی طرح کرنا جانتا ہوں چودھری صاحب!" میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "آپ کو مکمل طور پر مجھ پر بھروسا کرنا چاہیے۔ تعویذ والی کہانی میرے، آپ کے اور آپ کی چھوٹی بیگم کے درمیان ہی رہے گی۔ میں اصل معاملے تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کچھ اس انداز سے تفتیش کروں گا کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی سلامت رہے۔"

"اللہ آپ کا بھلا کرے۔" وہ امید بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "مجھے یقین ہے، آپ اس مہم میں ضرور کامیاب ہوں گے۔"

"بہ شرطیکہ اس سلسلے میں آپ مجھ سے بھرپور تعاون کریں۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "آپ کی مدد کے بغیر یہ ممکن نہیں ہے۔"

"میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں ملک صاحب۔" وہ فراخ دلی سے بولا۔ "آپ حکم تو کریں جناب......"

"سب سے پہلے تو آپ مجھے وہ تعویذ دکھائیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "جو پچھلی تین جمعراتوں سے آپ کے غسل خانے میں پھینکے جارہے ہیں؟"

"ملک صاحب! میں وہ تعویذ آپ کو نہیں دکھا سکتا......" چودھری بشارت کے چہرے پر الجھن کے آثار نظر آئے۔ "یہ ممکن نہیں ہے۔"

"کیوں؟" میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"وہ دراصل بات یہ ہے کہ......" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "ہمارے نہانے کے پانی والا ٹب غسل خانے میں اسی دیوار کے ساتھ رکھا ہوتا ہے جس دیوار میں وہ کھڑکی ہے جو تھوڑی دیر پہلے میں نے آپ کو دکھائی ہے۔ تعویذ اسی کھڑکی کی جالی میں سے اندر پھینکا جاتا رہا ہے اور وہ ٹب کے اندر آکر گرتا رہا ہے۔ یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ تینوں بار وہ ٹب پانی سے بھرا ہوا تھا۔ تعویذ پانی میں گرتے ہی گھلنے لگا، مطلب یہ کہ اس کی سیاہی (روشنائی) نکل کر پانی میں حل ہونے لگی۔ جب ہمیں اس تعویذ کے بارے میں پتا چلا تو اس کی تحریر تقریباً مٹ چکی تھی اور کاغذ بھی گیلا ہوکر اتنا نرم ہوگیا تھا کہ اسے محفوظ کرنا تقریباً ناممکن تھا لہٰذا......" وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا، ایک دو گہری سانسیں لیں پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"لہٰذا ہم نے ٹب والے پانی کو فوراً بہادیا اور اس قریب الختم تعویذ کو بھی پھاڑ کر بلکہ کچل کر پھینک دیا۔"

"ہر جمعرات کو ایسا ہی کیا آپ نے؟" میں نے سوالیہ نظر سے چودھری کو دیکھا۔

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "جی ہاں!"

میں نے چند لمحے ٹٹولنے والی نگاہ سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا پھر پوچھا۔ "اور یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ تینوں مرتبہ اس تعویذ کی دریافت آپ کی چھوٹی بیوی نورین کے ہاتھوں سے ہوئی ہے؟"

"جی ہاں!" وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "دراصل نورین صبح مجھ سے کافی پہلے بیدار ہوجاتی ہے اور ظاہر ہے غسل خانے میں بھی وہ مجھ سے پہلے ہی جاتی ہے اس لیے تعویذ پر اسی کی سب سے پہلے نظر پڑتی رہی ہے۔"

"جب آپ لوگ رات کو سونے کے لیے لیٹتے ہیں تو ظاہر ہے، اس سے پہلے غسل خانے کی طرف سے ہوکر آتے ہوں گے۔" میں نے کرید کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "کیا اس موقع پر آپ غسل خانے والے ٹب کا بھی جائزہ لیتے رہے ہیں؟"

"جناب! سیدھی سی بات ہے۔" وہ معتدل انداز میں بولا۔ "پہلے تو کبھی اس طرف بھی میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا لیکن جب دوسری بار ٹب کے اندر تعویذ کو تیرتے ہوئے دیکھا تو میں کچھ زیادہ ہی محتاط ہوگیا اور تیسری جمعرات کو میں نے بستر پر جانے سے پہلے پورے غسل خانے کو اچھی طرح چیک کیا تھا۔ پانی والا ٹب تو کیا، غسل خانے کے کسی بھی کونے کھدرے میں کوئی تعویذ نہیں تھا۔"

"لیکن جمعہ کی صبح جب چھوٹی چودھرائن صاحبہ غسل خانے میں گئیں تو تعویذ ٹب میں موجود تھا؟" میں نے استفساریہ نظر سے چودھری بشارت علی کو دیکھا۔

"جی ہاں...... بالکل...... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

"اس کا مطلب ہے......" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تعویذ کو رات ہی کے کسی حصے میں، آپ کے غسل خانے میں پھینکا جاتا رہا ہے؟"

"جی...... یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ گمبھیر انداز میں بولا۔ "تین جمعراتوں سے یہ پُراسرار سلسلہ جاری تھا اور کل بھی چوتھی جمعرات جب میرے بندوں نے آدھی رات کے وقت شاکر کو حویلی کے پچھواڑے مشکوک انداز میں ٹہلتے ہوئے دیکھا اور پکڑ لیا۔ آج صبح ٹب کے اندر تعویذ نہیں پایا گیا۔" وہ تھما۔ دو تین گہری سانسیں لے کر اپنے تنفس کو بحال کیا اور بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''آپ خود غور کرلیں ملک صاحب! سارے اشارے جمیل کے اس آوارہ لڑکے شاکر کی طرف جاتے ہیں۔ اگر آپ اس پر سختی کریں کے تو مجھے یقین ہے، وہ زبان کھول کر سچ اگل دے گا۔''

''ضرور چودھری صاحب!'' میں نے اس کی تشفی کی غرض سے تھپکی انداز میں کہا۔ ''میں تو اس سے ایسی کڑی تفتیش کروں گا کہ نانی وادی خواب میں آجائے گی۔ اس سلسلے میں تو آپ بالکل بے فکر ہوجائیں۔''

''میں چونکہ تعویذ والے معاملے کو پھیلانا نہیں چاہتا تھا اس لیے ڈھکے چھپے الفاظ میں اس بدبخت سے پوچھ گچھ کی تھی۔'' وہ تشویش بھرے انداز میں بولا۔ ''سب کے سامنے میرا زور اسی بات پر تھا کہ وہ چوری کی غرض سے یہاں آیا تھا لیکن آپ تو حقیقتِ حال سے آگاہ ہوچکے ہیں۔ آپ اس کی زبان سے سب کچھ بہ آسانی اگلوا سکتے ہیں......''

''ضرور اگلواؤں گا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا پھر پوچھا۔ ''چودھری صاحب! ایک انتہائی ذاتی نوعیت کا سوال پوچھوں۔ آپ جواب دیں گے نا......؟''

اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''جی پوچھیں......!''

''کیا آپ تعویذ گنڈے پر یقین رکھتے ہیں؟''

''جی ہاں۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''تعویذوں کے اچھے برے اثرات سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا ملک صاحب......''

''میں اس موضوع پر آپ سے کوئی بحث نہیں کروں گا چودھری صاحب۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کے غسل خانے کے ٹب میں سے ملنے تعویذات کس قسم کے اثرات کے حامل ہوسکتے ہیں؟''

''آپ یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ اچھے یا برے اثرات......!'' اس نے تصدیق طلب انداز میں مجھے دیکھا۔

''جی ہاں، بالکل۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلادی۔

''ظاہر ہے جی، یہ برے اثرات والے تعویذ ہی تھے۔'' وہ بڑے وثوق سے بولا۔

''اور اس قسم کا کام کوئی دشمن ہی کرسکتا ہے؟''

''جی، یہ تو سمجھ میں آنے والی بات ہے۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

''چودھری صاحب!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ اس گاؤں کے مطلق العنان بادشاہ ہیں۔ حسین آباد میں رہنے والا کوئی بھی شخص آپ سے دشمنی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ پھر ایسی نازیبا حرکت کی جرأت کون کرسکتا ہے؟''

''ملک صاحب! انسان کے جہاں سو دوست ہوتے ہیں وہاں ایک آدھ دشمن بھی ضرور ہوتا ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ حسین آباد کے لوگ میری بہت عزت کرتے ہیں۔ کسی کی مجال نہیں کہ وہ ایسی گری ہوئی حرکت کرسکے لیکن یہ شیطان حسین آباد کے باہر سے بھی تو کوئی کرسکتا ہے اور یہاں کے کسی بندے کو اپنا آلۂ کار بنا کر وہ ایسے اوچھے مگر خطرناک ہتھکنڈے آزما سکتا ہے۔''

''آپ کی بات میں وزن ہے چودھری صاحب!'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''پھر ایسے کسی بیرونی دشمن کی نشاندہی بھی تو آپ ہی کو کرنا ہوگی نا......؟''

''فوری طور پر تو میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ملک صاحب!'' وہ چہرے پر تھکن کے آثار سجاتے ہوئے بولا۔ ''میں اس سلسلے میں اپنی سوچ کے گھوڑے دوڑانے کی کوشش کرتا ہوں۔ آپ شاکر کا ٹرائل کریں۔ مجھے امید ہے، کوئی اچھا نتیجہ سامنے آئے گا۔''

''انشاء اللہ!'' میں نے پُراعتماد انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''چودھری صاحب! پچھلی تین جمعراتوں سے آپ کے غسل خانے کے ٹب میں تعویذ ملنے کا جو سلسلہ جاری رہا اس کے اثراتِ بد آپ پر ظاہر بھی ہوئے یا نہیں؟''

''مجھ پر نہیں، نورین پر ظاہر ہوئے ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''مطلب......؟'' میں نے حیرت بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''جس جمعہ کی صبح وہ تعویذ ملتا تھا، نورین کے سر میں پورا دن شدید درد ہوتا رہتا تھا۔'' چودھری نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ درد کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہوجاتا تھا۔ تینوں مرتبہ ایسا ہی ہوا لیکن......'' توقف کرکے اس نے ٹھہری ہوئی نظر سے مجھے دیکھا اور اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''آج ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ وہ صبح سے بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ ایک بار بھی اس نے سر میں درد کی شکایت نہیں کی اور اس کا سبب بھی آپ کے سامنے ہے ملک صاحب...... پچھلی رات شاکر کو غسل خانے میں تعویذ پھینکنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔''

اس کی تان گھوم پھر کر جمیل کے نکھٹو لڑکے شاکر پر ہی آکر ٹوٹتی تھی۔ میں نے اس حوالے سے چودھری کو زیادہ چھیڑنا مناسب نہ جانا اور سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تو اس کا مطلب ہے، یہ ساری مجرمانہ کارروائی آپ کی چھوٹی بیوی نورین کے خلاف کی جا رہی ہے......"

"جی، مجھے بھی یہی لگتا ہے۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "اسی لیے میرا دھیان سب سے پہلے کلثوم کی طرف گیا تھا لیکن وہ مجھے اس معاملے میں کہیں نظر نہیں آئی۔ اب اس مسئلے کو آپ ہی نے حل کرنا ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں ضرور حل کروں گا۔" میں نے کہا۔ "آپ اس بارے میں اور بھی جو کچھ جانتے ہیں وہ مجھے بتا دیں۔"

ہمارے درمیان مزید پندرہ بیس منٹ تک اسی موضوع پر گفتگو ہوتی رہی پھر میں چودھری سے اجازت لے کر اس کی حویلی سے نکل آیا۔

جب ہم تانگے میں بیٹھ کر حسین آباد سے تھانے کی جانب روانہ ہوئے تو رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں نے حویلی چھوڑنے سے پہلے وہ غسل خانہ بھی اچھی طرح دیکھ لیا تھا جہاں پچھلی تین جمعراتوں سے پانی والے ٹب میں تعویذ پڑا ہوا مل رہا تھا۔ ٹب اور جالی دار سیمنٹ کی روشن دان نما کھڑکی کی پوزیشن بھی بتاتی تھی کہ وہیں سے کوئی تعویذ کو غسل خانے کے اندر پھینکا کرتا تھا۔ یہ "کوئی" جو کوئی بھی تھا مجھے اسی کو تلاش کرنا تھا جبھی اس معاملے کا اسرار کھل سکتا تھا۔ ویسے بہ ظاہر یہ معاملہ جتنا سیدھا سادا دکھائی دے رہا تھا، ویسا تھا نہیں۔ میں اس تمام تر کارروائی کے پیچھے کسی سنسنی خیز کہانی کی توقع کر رہا تھا۔

تھانے پہنچ کر میں نے حوالدار کو اپنے پاس بلا کر ملزم سینہ چور شاکر کی "خیریت" پوچھی۔ اس کے تسلی بخش جواب کے بعد میں نے کہا۔

"جہانگیر! میں اپنے کوارٹر میں جا رہا ہوں۔ کچھ دیر کے بعد واپس آؤں گا۔ تم شاکر کو سونے نہیں دینا اور ہاں...... رات کا کھانا بہت زیادہ کھلانا۔"

"جی، میں سمجھ گیا۔" وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "آپ بے فکر ہو کر جائیں۔ جب بھی آپ واپس آئیں گے، بندہ آپ کو تیار ملے گا۔"

حوالدار بہت آسانی سے میرے مقصد کی تہ میں اتر گیا تھا۔ پولیس کی تفتیشی کارروائی میں اس حربے کو بھی عموماً آزمایا جاتا ہے۔ زیر تفتیش ملزم کو رات کے کھانے میں کوئی مسکن دوا ملا کر دی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ کوشش بھی کی جاتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ کھانا کھائے۔ جب وہ حلق تک کھانا ٹھونس لیتا ہے تو اس پر کسلمندی طاری ہونے لگتی ہے۔ ایک تو خمار رزق اور اس پر مسکن دوا کا اثر...... یہ تمام تر مل کر اسے جلد از جلد انتا غفیل ہونے پر اکساتے ہیں لیکن اس پر نگراں مقرر پولیس اہلکار اسے سونے نہیں دیتا۔ اسی جدوجہد میں وہ مرحلہ بھی آتا ہے جب ملزم ہر قیمت پر نیند کا طلب گار نظر آتا ہے۔ اس موقع پر اس سے جو بھی سوال کیا جائے وہ اس کا سیدھا اور کھرا جواب دیتا ہے۔

شاکر تو ویسے بھی کاہل الوجود شخص تھا۔ مجھے امید تھی کہ اس کی زبان کھلوانے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ میں نے اب تک اس سے جو پوچھ گچھ کی تھی اس سے مطمئن تھا لیکن چودھری نے میرے ذہن میں جو اہم سوال ڈال دیا تھا اس کی تصدیق بھی ضروری تھی کہ...... وہ رفع حاجت کے لیے اپنے گھر سے دور چودھری کی حویلی کے پچھواڑے کیوں پہنچا تھا؟

☆☆☆

میں چودھری کی حویلی سے اتنا کچھ کھا آیا تھا کہ رات کے باقاعدہ کھانے کی حاجت بالکل نہیں تھی لہٰذا میں نے کھانے کو فراموش کر دینا ہی مناسب سمجھا اور لباس تبدیل کر کے عشا کی نماز ادا کی پھر موجودہ حالات پر غور و فکر کرنے لگا۔

یقیناً چودھری بشارت نے تعویذ کے حوالے سے مجھ سے غلط بیانی نہیں کی ہوگی، میرا مطلب تعویذ کے پانی والے ٹب میں پائے جانے سے ہے اور جہاں تک تعویذات کے اثرات کا تعلق ہے تو اس بارے میں میرے خیالات و نظریات عام لوگوں سے بہت مختلف ہیں جس کی وضاحت پھر کسی مناسب موقع پر کروں گا۔ فی الحال یہ معاملہ حل کرنا زیادہ ضروری ہے۔

چودھری کے بیان کے مطابق جمعرات کی رات میں کسی وقت وہ تعویذ ان کے غسل خانے میں پھینک دیا جاتا تھا اور اگلی صبح سے نورین کے سر میں شدید درد شروع ہو جاتا تھا۔ چودھری اس تعویذاتی سلسلے کو اپنی نئی بیوی کے خلاف ایک خطرناک اور گھناؤنی سازش قرار دے رہا تھا۔ وہ اس بات پر بھی پکا یقین رکھتا تھا کہ تعویذات کے اچھے برے اثرات ہوتے ہیں۔ اس کے یقین کو اس واقعے سے تقویت ملتی تھی کہ جب گزشتہ رات غسل خانے میں تعویذ نہیں پھینکا گیا تو آج دن بھر نورین کے سر میں درد نہیں ہوا تھا۔ گویا نورین کا کوئی دشمن وہ خفیہ کارروائی کر رہا تھا یا کسی سے کروا رہا تھا۔

چودھری کا دھیان دشمنی کے حوالے سے سب سے پہلے اپنی پہلی بیوی کلثوم کی طرف گیا تھا کیونکہ چودھری دوسری شادی کر کے اس پر سوکن لایا تھا۔ وہ نورین کی آمد سے خوش نہیں تھی لہٰذا اس سے دشمنی کر سکتی تھی لیکن چودھری کی غیر مجبوبی

خفیہ تحقیق نے کلثوم کو کلیئر کر دیا تھا۔ چودھری کی کلیئرنس کو میں حتمی نہیں سمجھتا تھا۔ میں کلثوم کے معاملے کو اپنے طور پر بھی چیک کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

میرے ذہن میں بار بار نور حسین کا نام گھوم جاتا تھا۔ میں نے چودھری سے ملاقات کے دوران میں نور حسین کا ذکر نہیں کیا تھا اور نہ ہی اس نے ایسا کوئی تذکرہ کیا لیکن میرا ذہن اسے یکسر نظر انداز کرنے کو تیار نہیں تھا۔ نور حسین ایک ایسا نوجوان تھا جس کے دل میں چودھری کے لیے سب سے زیادہ نفرت بھری ہوئی تھی۔ چودھری نے اس کی منگیتر نورین سے شادی کر لی تھی۔ اس وقت پورے حسین آباد میں چودھری کو سب سے زیادہ ناپسند نور حسین ہی کر سکتا تھا لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کیا نور حسین تعویذات کے ذریعے کوئی ایسا قدم اٹھا سکتا تھا جس سے نورین کو نقصان پہنچے۔ وہ چودھری سے دشمنی کر سکتا تھا مگر نورین سے نہیں اور...... اگر وہ نورین کو نقصان پہنچانے کی کوشش میں تھا تو اس کا یہ مطلب نکلتا تھا کہ وہ اس شادی کے حوالے سے نورین کو بھی برابر کا قصوروار سمجھتا تھا۔ بہرحال حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے لیے نور حسین کی مکمل چیکنگ بھی ضروری تھی۔

میں نے شاکر اور چودھری کی دشمنی کے بارے میں جتنا بھی سوچا مجھے کوئی ایسا نکتہ مل نہ سکا جس کو بنیاد بنا کر میں شاکر پر شک کر سکتا۔ بہرحال رات گیارہ بجے میں دوبارہ تھانے پہنچ گیا اور جہانگیر کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔

وہ میرے پاس آیا تو میں نے پوچھا۔ "بندے کی کیا پوزیشن ہے؟"

"ایک دم تیار ہے ملک صاحب!" جہانگیر نے بتایا۔ "کہہ رہا ہے، چاہے میری جان لے لو مگر سونے کی اجازت دے دو۔"

"ویری گڈ......!" میں نے مطمئن انداز میں گردن ہلائی۔

"ملک صاحب!" حوالدار نے پوچھا۔ "اگر آپ کا حکم ہو تو اسے آپ کی خدمت میں پیش کروں؟"

"دس منٹ کے بعد!" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا، پھر پوچھا۔ "شیبنہ ڈیوٹی پر کون کون موجود ہے؟"

حوالدار نے موجود اہلکاروں کے نام گنوا دیے۔

میں نے کہا۔ "کانسٹیبل ناصر کو فوراً میرے پاس بھیجو۔"

"اوکے سر......!"

"اور اس کے ٹھیک دس منٹ کے بعد تم شاکر کو میرے پاس پہنچا دینا۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

حوالدار نے میرے حکم کی تعمیل کے لیے اثبات میں گردن ہلائی اور الٹے قدموں کمرے سے نکل گیا۔ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں کانسٹیبل ناصر میرے سامنے موجود تھا۔ ناصر ایک ہونہار اور چاق و چوبند پولیس اہلکار تھا۔ میں نے جب بھی اسے کوئی خاص مشن سونپا، اس نے مجھے مایوس نہیں کیا تھا۔

"ناصر!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "آج کی رات سے تمہاری آؤٹ ڈور ڈیوٹی ہے، میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

"جی ملک صاحب!" وہ فرماں برداری سے بولا۔ "آپ مجھے تھانے سے باہر کوئی مشن سونپنے والے ہیں۔"

"بالکل درست اندازہ لگایا ہے تم نے۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "یہ جو بندہ اس وقت حوالات میں ہے نا، تمہیں اس کی کڑی نگرانی کرنا ہے۔ میں تھوڑی دیر میں اسے چھوڑ دوں گا۔"

"سمجھ گیا ملک صاحب!" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "میں شاکر کے تھانے سے نکلتے ہی سائے کی طرح اس کے ساتھ چپک جاؤں گا۔"

"اور نگرانی کا یہ کام سادہ لباس میں انجام دیا جائے گا۔" میں نے یاددہانی کرانے والے انداز میں کہا۔ "یہ بات تو تم اچھی طرح جانتے ہو نا؟"

"جی ملک صاحب!" وہ جلدی سے بولا۔ "میں آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "میں شاکر کو اپنے پاس بلا رہا ہوں۔ تم لباس تبدیل کر کے ریڈی ہو جاؤ......"

"اوکے ملک صاحب!" یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔

کچھ دیر کے بعد جہانگیر نے شاکر کو میرے پاس پہنچا دیا۔ اس کی حالت خاصی مضحکہ خیز ہو رہی تھی۔ چہرے پر بے بسی اور بے کسی کے تاثرات نظر آ رہے تھے۔ حوالدار اسے میرے پاس چھوڑ کر واپس چلا گیا تو میں نے بہ آواز بلند اسے مخاطب کیا۔

"ہاں بھئی شاکر...... کیا حال چال ہیں؟"

"جناب......!" وہ شاکی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ نے تو کہا تھا، حوالات میں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی مگر آپ کے حوالدار صاحب تین چار گھنٹے سے میرے ساتھ بہت برا سلوک کر رہے ہیں۔"

"اچھا......!" میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا حوالات میں تمہارے ساتھ مار پیٹ کی گئی ہے؟"

"اس سے بھی برا سلوک جناب!" وہ فریادی لہجے میں بولا۔

میں نے ہمدردانہ انداز میں کہا۔ ”مجھے بتاؤ، تمہارے ساتھ حوالدار نے کیا زیادتی کی ہے۔ میں ابھی تمہارے سامنے اسے ڈانٹ لگاتا ہوں۔“

”تھانے دار صاحب! مجھے سخت نیند آرہی ہے۔“ وہ منت زیر لہجے میں بولا۔ ”اور حوالدار صاحب سونے نہیں دے رہے۔ میں کوئی تین چار گھنٹے سے ان کی خوشامدیں کررہا ہوں مگر ان کا ایک ہی جواب ہے...... آج کی رات وہ مجھے جگا کر رکھیں گے۔ اگر میں نے ان کی بات نہ مانی اور سو گیا تو وہ مجھے الٹا لٹکا کر میری تشریف پر چھترول کریں گے پھر مجھے تاریک رات میں بھی ہر طرف چمکتا ہوا سورج نظر آئے گا......“ لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر مجھ سے پوچھا۔

”آپ ہی بتائیں تھانے دار جی! میرے ساتھ ظلم نہیں ہورہا؟“

”بہت...... ظلم بھی اور زیادتی بھی۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”لیکن تم فکر نہ کرو، میں تمہاری فریاد سننے آگیا ہوں۔“

اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا اور کہا۔ ”کیا آپ مجھے سونے کی اجازت دے دیں گے......؟“

”ضرور...... مگر یہاں تھانے کی حوالات میں نہیں۔“

”پھر......؟“ اس کی حیرت دو چند ہوگئی۔

میں نے اس کی حالت اور بے یقینی میں مزید اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تم اپنے گھر جاکر آرام سے سوگے...... نرم اور گرم بستر پر۔“

”مم مم...... مگر......!“ حیرت کے مارے اس کی زبان سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

”اگر مگر کچھ نہیں شاکر......!“ میں نے اس کے چہرے پر نظر گاڑتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں ابھی اور اسی وقت چھوڑ رہا ہوں لیکن......!“

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ تڑپ کر بولا۔ ”لیکن کیا جی؟“

رہائی کی خوش خبری نے اس کی نیند کافور کردی تھی اور یکایک وہ خاصا ہشاش بشاش دکھائی دینے لگا تھا۔ اس کے لیے میں نے ایک غیر متوقع بات کردی تھی جبھی اس کے ذہن میں بے یقینی نے ایک عجیب سی کشمکش پیدا کردی تھی۔

”لیکن یہ کہ......“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اس رہائی کے لیے تمہیں میرے ایک سوال کا جواب دینا ہوگا...... کھرا اور سچا جواب۔“

وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ ”آپ دس سوال پوچھیں سرکار!“

”دس نہیں، صرف ایک!“ میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

وہ منتظر نگاہ سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ”شاکر! میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کل رات تم رفع حاجت کے لیے اپنے گھر سے کافی فاصلے پر، چودھری بشارت کی حویلی کے پچھواڑے ہی کیوں گئے تھے...... یہ کام تو کسی اور جگہ پر بھی ہوسکتا تھا۔ حسین آباد میں کھیتوں کی کمی تو نہیں؟“

میرا سوال سن کر اس کے چہرے پر کچھ ایسے تاثرات ابھرے جیسے میں نے اس کی کوئی چوری پکڑلی ہو۔ مجھے یقین ہوگیا کہ شاکر کے ذہن میں کوئی ایسی خاص بات چھپی ہوئی ہے جو اس نے ابھی تک مجھے بتائی نہیں۔

”شاکر!“ اسے تذبذب کا شکار دیکھ کر میں نے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔ ”اگر مجھے میرے سوال کا درست جواب نہ ملا تو پھر میں تمہیں حوالدار جہانگیر کے حوالے کرنے پر مجبور ہوجاؤں گا اس کے بعد وہ تمہارا جو بھی حشر کرے؟“

”نن...... نہیں سرکار......!“ وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ”تو پھر بتاؤ......؟“

”کوئی خاص وجہ نہیں ہے جناب......!“ وہ بولتے بولتے رک گیا۔

”خاص نہیں ہے تو عام وجہ ہی بتادو......“ میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔

”وہ...... وہ جی...... شاہ جی کا حکم تھا۔“ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

”کون شاہ جی؟“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

”پیر محسن شاہ جناب......!“ اس نے بتایا۔ ”وہ میرا علاج کررہے ہیں نا......!“

”تو یہ بھی اسی علاج کا حصہ ہے کہ تم چودھری بشارت کی حویلی کے پچھواڑے رفع حاجت کے لیے جاؤ......“ میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔ ”اور وہ بھی آدھی رات کو...... یہ وہ کس قسم کا علاج کررہے ہیں؟“

”یہ تو انہی کو پتا ہوگا سرکار۔“ وہ بے چارگی سے بولا۔ ”میں نے تو وہی کیا جو شاہ جی کا حکم تھا......“

”کیا حکم دیا تھا محسن شاہ نے؟“

”شاہ جی نے فرمایا تھا کہ مجھے اکتالیس جمعرات تک چودھری صاحب کی حویلی کے پچھواڑے آدھی رات کو رفع

حاجت کے لیے جانا ہوگا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”آپ کو میرے ابا اور اماں نے بتایا ہے نا کہ آج کل شاہ جی سے میرا علاج چل رہا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ میں ایک سال کے اندر بھلا چنگا ہوجاؤں گا۔“

”جمیل اور رشیدہ نے تمہارے علاج وغیرہ کا ذکر تو کیا ہے۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”لیکن یہ اکتالیس راتوں والے ”عمل“ کے بارے میں انہوں نے مجھے کچھ نہیں بتایا؟“

”ان کو اس معاملے کا پتا ہی نہیں ہے جناب!“ وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ”شاہ جی نے یہ ہدایت صرف مجھے کی تھی اور اس بات کا بھی عہد لیا تھا کہ میں اس بارے میں کسی کو نہیں بتاؤں گا اور نہ ہی کوئی ناغہ کروں گا۔ مجھے نہایت پابندی کے ساتھ پوری اکتالیس جمعراتوں کو یہ ”عمل“ کرنا تھا اور ابھی صرف چار جمعرات ہی گزری تھیں......“

”اوہ......!“ میں نے ایک گہری سانس لی اور کہا۔ ”شاکر! تم نے شاہ جی کی دونوں ہدایات کی ایسی تیسی کردی ہے۔ اس نے تم سے جو عہد لیا تھا وہ مکمل طور پر ٹوٹ چکا ہے۔ اب تم کیا کرو گے؟“

”کل شاہ جی کے آستانے پر حاضری دوں گا جناب!“ وہ پچھتاوے کے احساس کے ساتھ بولا۔ ”وہی بتائیں گے، اس مسئلے کا حل کیا ہوگا۔ انہوں نے مجھے سختی سے تاکید کی تھی کہ ایک تو اکتالیس جمعرات تک مجھے کوئی ناغہ نہیں کرنا اور دوسرے اس جمعرات والے عمل کے بارے میں کسی کو کچھ بتانا نہیں۔ میں نے یہ معاملہ آپ کے سامنے کھول دیا ہے اور یہ بھی طے ہے کہ میں پانچویں جمعرات کو چودھری کی حویلی کے پچھواڑے نہیں جاسکوں گا۔ اگر میں نے ادھر کا رخ کیا تو چودھری کے بندے پھر مجھے پکڑ لیں گے۔ پہلے وہ خود میری دھلائی کریں گے اور اس کے بعد آپ کے پاس تھانے میں جمع کرادیں گے۔ شاہ جی کے علاج سے مجھے اچھا خاصا فائدہ ہورہا تھا کہ یہ مصیبت نازل ہوگئی......“

”تمہیں تکلیف کیا ہے شاکر؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

”جی...... میں سمجھا نہیں......!“ وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

”مطلب یہ کہ......“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں بیماری کیا ہے آخر...... پیر محسن شاہ کس چیز کا علاج کررہا تھا......؟“

شاکر نے میرے سوال کے جواب میں جو کچھ بتایا وہ جمیل اور رشیدہ کی زبانی میں پہلے ہی سن چکا تھا۔ وہ نہایت ہی سادگی سے بولا۔

”وہ جناب! ہوائی چیزوں کا اثر ہے مجھ پر......!“

”اور شاہ جی اس اثر کی کاٹ کررہے ہیں؟“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”جی...... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب!“ وہ تیزی سے اپنی گردن کو تائیدی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ”میں جب بھی ان کے پاس جاتا ہوں، وہ ایک نمبو (لیموں) کو میرے سر کے اوپر رکھ کر کاٹتے ہیں......“

میں نے افسوس ناک اور رحم بھری نظر سے شاکر کو دیکھا اور پوچھا۔ ”یہ بتاؤ، ہوائی چیزوں کے زیر اثر تم محسوس کیا کرتے ہو؟“

”بس جناب......“ وہ لایعنی انداز میں بولا۔ ”کسی کام کو دل نہیں چاہتا۔ بس عجیب سی حالت ہوتی ہے دماغ کی......“

”یہ تو ہوائی چیزوں کے اثرات نہیں ہیں۔“ میں نے کٹیلے انداز میں کہا۔

”پھر...... پھر یہ کیا ہے جناب؟“ وہ دہشت بھری آواز میں بولا۔

میں نے بہ دستور طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”یہ تو ایک خاص قسم کی بیماری کی علامات ہیں۔“

”بیماری......؟“ وہ تشویش بھری نظر سے مجھے تکنے لگا۔

”ہاں بیماری“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اور اس خطرناک بیماری کا نام ہے...... ہڈحرامی!“

وہ حیرت سے منہ کھول کر میرا منہ دیکھنے لگا۔

☆☆☆

اگلی صبح میں تیار ہوکر تھانے پہنچا تو اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے میرا ذہن ایک مخصوص لائحہ عمل تیار کرچکا تھا۔ رات میں نے اس کیس کے مختلف پہلوؤں پر ہر زاویے سے سوچا تھا اور متعلقہ مشکوک افراد کی فہرست میں ایک اور بندے کا اضافہ ہوگیا تھا اور وہ بندہ تھا پیر محسن شاہ عرف ”شاہ جی“۔ رات شاکر سے ہونے والی گفتگو میں، میں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ شاہ جی سے تفصیلی پوچھ گچھ مفید نتائج پر منتج ہوگی لہٰذا آج صبح میں نے شاہ جی کے آستانے ہی سے تفتیش کا آغاز کیا تھا۔

پیر محسن شاہ کے نام میں لفظ ”محسن“ کی وجہ تسمیہ کچھ اس طرح تھی کہ شاہ جی ہر ماہ ایک مخصوص تاریخ کو نیاز کا اہتمام کرتا تھا۔ عصر اور مغرب کے درمیان پلاؤ کی ایک دیگ پکائی جاتی۔ تصور یہ قائم کیا گیا تھا کہ اس پلاؤ سے بھری ہوئی بند دیگ کو مختلف لوگ تھام کر کھڑے ہوں گے۔ اگر دیگ حرکت میں آکر گھومنے لگے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ ان لوگوں

کی دلی مرادیں پوری ہوں گی۔ مقررہ تاریخ کو حسین آباد اور اردگرد کے دور دراز گاؤں سے بھی درجنوں حاجت مند مذکورہ دیگ کے کناروں کو "چھونے" آیا کرتے تھے۔

بعد کی تحقیق سے یہ راز میرے علم میں آگیا تھا کہ جب لوگ دیگ کے کناروں کو تھام کر کھڑے ہوتے تھے تو دیگ حرکت میں کیسے آجاتی تھی۔ آپ سے یہ راز پہلے شیئر کر رہا ہوں تاکہ آپ گھسن شاہ جیسے چکر بازوں کے فریب سے محفوظ رہ سکیں۔

گھسن شاہ نے اصول یہی بنایا ہوا تھا یا یوں سمجھ لیں کہ اس کا حکم یہی تھا کہ ایک وقت میں کم از کم چار افراد دیگ کے کناروں کو تھام کر کھڑے ہوں گے۔ آستانے پر موجود افراد میں لگ بھگ ایک درجن شاہ جی کے اپنے خاص بندے تھے۔ جب دیگ کو گھمانا مقصود ہوتا تھا تو ان بندوں میں سے کم از کم دو شامل ہوجاتے تھے۔ وہ سکھائے ہوئے بندے غیر محسوس انداز میں اس طرح دیگ پر طاقت استعمال کرتے تھے کہ اس میں لرزہ سا پیدا ہوجاتا تھا۔ سادہ لوح دیہاتی یہ سمجھتے کہ شاید ان کی خواہش پوری ہونے کی نوید مل رہی ہے۔ وہ مارے خوشی کے شاہ جی کے بندوں کی مکاری سے غافل ہوجاتے اور جوش جذبات میں وہ بھی غیر ارادی طور پر قوت صرف کرنے لگتے۔ اس سے شاہ جی کے بندوں کا کام آسان ہوجاتا لہٰذا دیکھتے ہی دیکھتے دیگ حرکت میں آکر گھومنے لگتی۔ جن افراد کے چھونے سے دیگ گھومنے لگتی، ان "خوش نصیبوں" کو شاہ جی کے حکم کے مطابق اگلے ماہ نیاز کے تمام تر اخراجات برداشت کرنا ہوتے تھے۔ کسی سیانے نے کیا خوب فرمایا ہے کہ..... دنیا میں جب تک بے وقوف لوگ موجود ہیں، عقل مند بھوکے نہیں مر سکتے۔

میں یہاں پر اس سیانے کے فرمان میں ایک چھوٹی سی ترمیم کرنا چاہوں گا کہ..... جب تک دنیا میں سادہ دل اور معصوم لوگ موجود ہیں، شاطر اور مردہ ضمیر دھوکے باز بھوکے نہیں مر سکتے۔

اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں کہ دنیا میں سادہ لوح، معصوم بہ الفاظ دیگر بے وقوف لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جنہیں عیار اور چالاک لوگ مختلف نوعیت کے فریبوں سے الو بنا کر اپنا الو سیدھا کرتے رہتے ہیں اور میرے تجربے اور مشاہدے میں یہ بھی آیا ہے کہ ایسے بے ضمیر لوگوں کا انجام بڑا عبرت ناک ہوتا ہے۔

میں گھسن شاہ کے آستانے کی طرف جانے کے لیے تھانے سے نکلنے ہی والا تھا کہ کانسٹیبل ناصر وہاں پہنچ گیا۔ ناصر کو میں نے گزشتہ رات شاکر کی نگرانی پر مقرر کیا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی میں نے پوچھا۔

"کیا خبریں ہیں ناصر؟"

"ملک صاحب! تھانے سے وہ سیدھا گھر گیا تھا۔" اس نے جواب دیا۔ "گھر کے اندر اس نے کیا کیا، یہ تو مجھے پتا نہیں جناب لیکن تھوڑی دیر پہلے وہ گھر سے نکل کر حسین آباد سے باہر کی طرف گیا ہے۔"

"اور تم اس کی نگرانی چھوڑ کر میرے پاس آگئے ہو؟" میں نے تیز نظر سے اسے گھورا "گھر کے اندر تو وہ یقیناً رات بھر سوتا رہا ہوگا۔ یہ جاننا زیادہ اہم تھا کہ وہ حسین آباد سے باہر کس طرف جارہا ہے اور کیوں جارہا ہے؟"

"میں نے سب معلوم کرلیا ہے ملک صاحب!" وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ "اسی لیے تو آپ کو رپورٹ دینے آیا ہوں۔"

"کیا معلوم کرلیا ہے تم نے؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ گھسن شاہ کے آستانے کی طرف گیا ہے جناب۔" وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ "اور آج کا پورا دن ادھر آستانے پر ہی گزارے گا۔"

"یہ بات تمہیں کیسے پتا چلی؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"شاکر کی ماں سے۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا رشیدہ سے اس سلسلے میں تمہاری کوئی بات ہوئی ہے؟"

"براہ راست تو بات نہیں ہوئی جناب۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن میں نے ماں بیٹے کے درمیان ہونے والی باتیں سنی ہیں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے کانسٹیبل کی طرف دیکھا۔

"وہ دراصل....." وہ میرے سوال کے جواب میں بتانے لگا۔ "جب رات کو شاکر اپنے گھر کے اندر چلا گیا تو میں اس کے گھر کے سامنے لگے ایک درخت پر چڑھ کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ اتنا گھنا درخت ہے کہ مجھے خود کو اس کے پتوں کے اندر چھپانے میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ درخت کی اس خفیہ پناہ گاہ سے شاکر کے گھر کا صحن صاف نظر آرہا تھا۔ میں نے ٹھنڈی ٹھار رات میں جاگ کر پہرا دیا اور صبح جب شاکر گھر سے نکلنے لگا تو میں نے شاکر اور اس کی ماں کے بیچ ہونے والی باتیں سن لیں۔ جب شاکر وہاں سے روانہ ہوگیا تو میں درخت سے اتر کر آپ کے پاس آگیا ہوں۔"

اس کے خاموش ہونے پر میں نے پوچھا۔ "شاکر اور

رشیدہ کے درمیان کیا باتیں ہوئی تھیں؟"

میرے استفسار کے جواب میں اس نے جو کچھ بتایا وہ اس طرح سے تھا کہ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد شاکر نے شاہ جی سے ملاقات کا ارادہ ظاہر کیا تھا اور رشیدہ نے اسے تاکید کی تھی کہ وہ آج کا پورا دن ادھر آستانے پر ہی رک کر شاہ جی کی خدمت وغیرہ کرے تاکہ اس کی صحت جلد از جلد ٹھیک ہوجائے۔ شاکر نے ماں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مغرب سے پہلے گھر واپس آجائے گا۔

"اچھا تو معاملہ اس طرح ہے....." میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اگر آپ کا حکم ہو تو میں شاکر کی مزید نگرانی کے لیے شاہ جی کے آستانے کی طرف چلا جاتا ہوں۔" اس نے اجازت طلب نظر سے مجھے دیکھا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے شاکر۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم اب گھر جا کر آرام کرو۔ ٹھنڈی ٹھار رات میں تم نے خاصی سخت ڈیوٹی دی ہے۔"

"مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ملک صاحب!" وہ سوالیہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ "یا اب مزید نگرانی کی ضرورت نہیں رہی؟"

"تمہارا دوسرا خیال درست ہے۔" میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں ادھر گھسن شاہ کے آستانے کی طرف ہی جارہا ہوں۔ باقی کا معاملہ میں خود دیکھ لوں گا....." لمحاتی توقف کرکے میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں تم سے بالکل ناراض نہیں ہوں....."

اس نے تشکرانہ انداز میں گردن ہلائی اور مجھے سلام کرکے واپس چلا گیا۔ میں چند منٹ کے بعد ایک تانگے میں بیٹھ کر حسین آباد کی جانب روانہ ہوگیا۔ میں نے اپنے ساتھ کسی اور اہلکار کو لے جانا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

پیر گھسن شاہ کا آستانہ حسین آباد کے باہر نہر کے کنارے بنا ہوا تھا۔ یہ ویسا ہی آستانہ تھا جیسا کہ عام طور پر ہوا کرتے ہیں۔ میں نے تانگے کو آستانے کے باہر رکوایا اور خود سنبھلے قدم اٹھاتے ہوئے اندر داخل ہوگیا۔ ایک وسیع وعریض صحن کے آخری کنارے پر ایک نیچی چھت والا کمرا بنا ہوا تھا جو یقیناً گھسن شاہ کا حجرہ تھا۔ آستانے کے صحن میں نصف درجن مرد وزن بھی مجھے دکھائی دیے جو اپنی حاجات کے سلسلے میں وہاں آئے تھے۔ شاکر ان لوگوں میں مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ مجھے صحن کے اندر دیکھ کر ایک تنومند شخص میری جانب بڑھا۔ اس کے انداز سے خاصی عجلت جھلکتی تھی۔

میں اس وقت مکمل یونیفارم میں تھا۔ شاید اسی لیے وہ میری جانب متوجہ ہوا تھا کہ ایک پولیس والے کا آستانے پر کیا کام۔ میرے قریب پہنچنے پر اس نے نہایت ہی ادب سے جھک کر مجھے سلام کیا اور بولا۔

"تھانے دار صاحب! آپ شاہ جی کے آستانے پر اور اتنی صبح.....؟"

ایک بات تو واضح تھی کہ وہ بندہ مجھے اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اس کی بات سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایک کائیاں اور عیار شخص تھا۔ میں نے سرسری لہجے میں کہا۔

"بس ایسے ہی۔ جی چاہا، آج شاہ جی کی خدمت میں حاضری دی جائے۔"

"سب خیریت تو ہے نا سرکار؟" وہ کھوجتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "پہلے کبھی آپ نے شاہ جی کے آستانے کو رونق نہیں بخشی نا.....!"

آمد کے حوالے سے اسے میری وضاحت نے مطمئن نہیں کیا تھا جبھی وہ مزید سوال کر رہا تھا۔ میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کردیا اور سرتاپا اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے، تم بھی ادھر آستانے پر ہی ہوتے ہو.....؟"

"جی سرکار! میں شاہ جی کا خاص آدمی ہوں۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر فخریہ لہجے میں بولا۔ "آستانے کا سارا انتظام میرے ہی ہاتھ میں ہے۔"

"نام کیا ہے تمہارا؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"کھنڈی.....!" اس نے جواب دیا۔

"کھنڈی..... یہ کیسا نام ہے؟" میں نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔

"جناب! میں بچپن میں بہت پیارا اور خوب صورت ہوتا تھا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "میری ماں مجھے "کھنڈ پتر" کہتی تھی یعنی چینی کی طرح میٹھا بیٹا..... بعد میں، میں کھنڈ (چینی) سے کھنڈی ہوگیا....."

"تم تو بہت دلچسپ آدمی ہو یار۔" میں نے تعریفی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "اب جلدی سے شاہ جی سے میری ملاقات بھی کرادو۔"

کھنڈی نے شاہ جی کے حجرے کی طرف دیکھا اور کہا۔ "سرکار! اس وقت ایک بی بی اندر شاہ جی سے ملاقات کر رہی ہے۔ وہ باہر آئے تو میں آپ کی آمد کی اطلاع دیتا ہوں۔"

اس وقت ہم دونوں مذکورہ حجرے سے دس قدم کی دوری پر کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے حجرے کے دروازے کی

طرف دیکھا جو تقریباً بند ہی تھا۔ کھنڈی کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق شاہ جی کسی عورت سے ملاقات کررہا تھا۔ میں بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا تو کھنڈی جلدی سے بولا۔

”میں آپ کے بیٹھنے کا بندوبست کرتا ہوں جناب!“

ادھر کھنڈی کی بات ختم ہوئی ادھر حجرے کا دروازہ کھلا اور ایک درمیانی عمر کی عورت حجرے سے باہر نکلی۔ کھنڈی نے یقیناً اسی عورت کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ میرے لیے ایک اجنبی عورت تھی لیکن اس کی جیسے ہی مجھ پر نظر پڑی، وہ بری طرح چونک گئی۔

ایک لمحے کے لیے وہ تذبذب کا شکار نظر آئی جیسے فیصلہ نہ کرپارہی ہو کہ وہاں سے رخصت ہو یا واپس حجرے کے اندر داخل ہوجائے۔ اس کے ردِعمل نے مجھے اندر سے ریڈ الرٹ کردیا کیونکہ اس کی یہ ڈانواں ڈول کیفیت مجھے دیکھنے کے بعد ہوئی تھی۔ جیسے وہ آستانے پر پولیس کی موجودگی سے خوف زدہ ہوگئی ہو۔ میں یکایک بے حد محتاط ہوگیا۔

لمحاتی تذبذب میں رہنے کے بعد اس نے خود کو سنبھال لیا اور اپنی چادر کا بڑا سا گھونگٹ نکال کر وہ تیز رفتاری سے چلتے ہوئے آستانے کے احاطے سے نکل گئی۔ میں نے کھنڈی سے پوچھا۔

”یہ عورت کون تھی؟“

”آپ نہیں جانتے سرکار......!“ اس نے الٹا مجھ سے پوچھ لیا۔

”اگر مجھے پتا ہوتا تو تم سے کیوں سوال کرتا۔“ میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔

”یہ اپنے چودھری صاحب کی نئی ساس ہے جناب۔“ وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ”کوئی آٹھ ماہ پہلے چودھری صاحب نے اس کی بیٹی نورین سے شادی کی ہے۔“

”اچھا...... تو یہ خالدہ تھی۔“ میں ایک گہری سانس خارج کرکے رہ گیا۔

”جی ہاں، بالکل وہی۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”شاہ جی کی دعاؤں نے اس کی اور اس کی بیٹی کی قسمت بدل کر رکھ دی ہے۔ یہ شاہ جی کی بڑی پکی عقیدت مند ہے سرکار....“ وہ تھوڑی دیر کے لیے تھما پھر جلدی سے اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”باتیں تو پھر بھی ہوتی رہیں گی تھانے دار صاحب۔ میں پہلے شاہ جی سے آپ کی ملاقات کرادوں......“

بات ختم کرتے ہی وہ حجرے کی سمت بڑھ گیا۔ خالدہ کا شاہ جی کا عقیدت مند ہونا میرے لیے کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ میری تشویش اس کے فوری ردِعمل سے جڑی ہوئی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر سناٹے میں آگئی تھی پھر اس نے فوراً وہاں سے کھسک لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ خالدہ کی یہ حرکت مجھے اس امر کا یقین دلا رہی تھی کہ اس کے ساتھ کوئی بڑی گڑبڑ ہے اور...... اس گڑبڑ کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ پولیس سے بھی بنتا ہے......

میں انہی سنسنی خیز سوچوں سے الجھا ہوا تھا کہ کھنڈی نے میرے پاس آکر بتایا کہ شاہ جی اپنے حجرے کے اندر مجھے یاد فرمارہے ہیں۔ میں نے ذہن کو جھٹکا اور حجرے کے اندر پہنچ گیا۔

وہ فرشی نشست والا ایک عام سا حجرہ تھا جس کے ایک کونے میں دیوار کے ساتھ گھمن شاہ اپنی گدی پر فروکش تھا۔ میری آمد پر وہ اپنی روایت کے خلاف اٹھ کر مجھ سے ملا پھر دوبارہ گدی پر براجمان ہوگیا۔ وہ سرخ آنکھوں اور موٹی توند والا ایک پستہ قامت شخص تھا۔ اس نے سر اور ڈاڑھی کے بال بے تحاشا اور بے سمت بڑھا رکھے تھے۔ گھمن شاہ کی رنگت توے کو بھی شرماتی تھی۔

رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”تھانے دار صاحب! آج اس طرف کا چکر کیسے لگ گیا۔ سب خیریت تو ہے نا......؟“

”شاہ جی! آپ کی میں نے اکثر لوگوں سے بہت تعریف سنی ہے۔“ میں نے اسے چونا لگانے کی کوشش کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ”ماشاءاللہ! آپ کی دعاؤں میں بڑا اثر ہے۔“

”کون کون ہے جو ہماری تعریف میں لگا ہوا ہے؟“ وہ خاصی رعونت سے مستفسر ہوا۔

میں نہایت ہی نرمی اور حکمت کے ساتھ اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا تاکہ گھمن شاہ کو میرے حوالے سے کسی قسم کا کھٹکا نہ ہو۔ میں نے بھی ایک عام عقیدت مند کی طرح کہا۔

”شاہ جی! کوئی ایک ہو تو بتاؤں۔ سب سے بڑی مثال تو خالدہ کی ہے سرکار۔ آپ کی دعاؤں نے اس کی تقدیر بدل کر رکھ دی ہے۔ کہاں وہ کریانے کی ایک دکان چلایا کرتی تھی اور کہاں اب وہ چودھری صاحب کی ساس کا درجہ حاصل کرچکی ہے۔“

وہ خوشی سے پھول گیا اور بڑی موج سے بولا۔ ”آپ نے بھی کس کا ذکر کردیا تھانے دار صاحب...... وہ ابھی تو یہاں سے اٹھ کر گئی ہے۔ آپ سے پہلے وہ میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی، بس جناب....“ وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”سارا معاملہ فرماں برداری کا ہے جی۔ جس نے مان لی، اس نے منزل پالی اور جس کا دل شک میں پڑا وہ

منجدھار کے پھنس گیا۔“

”واہ وا...... سبحان اللہ!“ میں نے اس کی بات سے متاثر ہونے کا ناٹک کیا۔ ”حضرت! آپ نے بڑی رمز کی بات کی ہے۔“

”خالدہ کافی عرصے سے میرے پاس آرہی ہے۔“ وہ اپنی ہی ترنگ میں بولتا چلا گیا۔ ”ہر دفعہ یہی کہتی تھی کہ شاہ جی! روشن مستقبل کے لیے دعا کریں۔ میں اس کی خواہش پوری کردیتا تھا پھر اس کے دن پھر گئے، چودھری بشارت نے اس کی بیٹی کو پسند کرلیا۔ وہ میرے پاس مشورہ کرنے آئی کہ نورین کے بارے میں کیا فیصلہ کرے۔ میں نے سارا معاملہ بہ غور سنا اور اسے حکم دیا کہ نورین اور نور حسین کی منگنی کو فوراً ختم کرکے چودھری صاحب کو ”ہاں“ کہہ دے۔ اس نے میرے حکم کی تعمیل کی اور دیکھ لیں، اب راج کررہی ہے......“ وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

”اگر نور حسین سے وہ اپنی بیٹی کو بیاہ دیتی تو آج بھی کریانے کی دکان چلا رہی ہوتی......“

”آپ کے مشورے نے تو خالدہ اور اس کے بچوں کی زندگی بدل کر رکھ دی ہے شاہ جی۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”نورین کا چھوٹی چودھرائن بن جانا کوئی معمولی بات نہیں...... کیا خالدہ آج کل کسی نئی حاجت کے لیے آپ کی خدمت میں حاضری دے رہی ہے؟“

میرے آخری سوالیہ جملے پر وہ بے ساختہ بدک کر مجھے شک زدہ نظر سے دیکھنے لگا۔ مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ میری بات اسے بہت زور کی لگی تھی۔ میں نے بھی جب سے خالدہ کا چونکا ہوا ردِعمل دیکھا تھا، میرے دماغ میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی جبھی میں نے شاہ جی سے خالدہ کے بارے میں یہ سوال کیا تھا۔

وہ بہت ہی شاطر اور کائیاں شخص تھا۔ لمحاتی الجھن کے بعد اس نے خود کو بڑے سلیقے سے سنبھال لیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بڑی مضبوطی سے بولا۔

”تھانے دار صاحب! آپ تو سیانے بیانے آدمی ہیں۔ خالدہ کی تشویش کو بڑی آسانی سے سمجھ جائیں گے......“

صاف نظر آرہا تھا کہ وہ اپنی باتوں کی جادوگری سے میری آنکھوں میں دھول جھونکنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے اس کی خواہش پوری کرتے ہوئے ارادت مندانہ انداز میں کہا۔

”حضرت! آپ سمجھائیں گے تو میں کیوں نہیں سمجھوں گا......“

”آپ کو تو پتا ہی ہوگا کہ چودھری کی پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہیں۔“ وہ مجھے سمجھانے کی کوشش کرنے لگا لیکن صاف محسوس ہورہا تھا کہ اس کی یہ وضاحت کھوکھلی ہے۔ ”پندرہ سال کے انتظار کے بعد اس نے نورین سے دوسری شادی کی ہے۔ خالدہ کو یہ فکر کھائے جارہی ہے کہ اگر نورین سے بھی کوئی اولاد نہ ہوئی تو کہیں چودھری...... “ وہ رکا اور معنی خیز انداز میں بولا۔ ”آپ میرا مطلب تو سمجھ گئے ہیں جناب۔“

میری سمجھ میں تو یہی آیا تھا کہ وہ اصل بات کو گول کرکے مجھے کوئی اور کہانی سنا رہا تھا تاہم میں نے اس کی تسلی کے لیے کہہ دیا۔ ”شاہ جی! میں بہت اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ خالدہ کو تشویش ہے کہ چودھری کہیں نورین سے مایوس ہوکر تیسری شادی نہ کرلے...... اسے ایسا کرنے سے بھلا کون روک سکتا ہے۔“

”اللہ آپ کا بھلا کرے تھانے دار صاحب!“ وہ سکھ کی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”بس، یہ بے چاری اپنی بیٹی کی گود ہری کرنے کے لیے مجھ سے تعویذ دھاگا لینے آجاتی ہے......“ لمحاتی توقف کے بعد وہ یکدم موضوع بدلتے ہوئے مجھ سے مستفسر ہوا۔

”آپ سنائیں، اس طرف کیسے چکر لگا؟“

”ایک مسئلے کے لیے آپ کے ماہرانہ اور روحانی مشورے کی ضرورت ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مجھے امید ہے، آپ درست راہنمائی فرمائیں گے۔“

اس کی آنکھوں اور چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے اسے میری بات کا بالکل یقین نہ آیا ہو تاہم وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”جی فرمائیں...... آپ کی خدمت کرکے مجھے خوشی ہوگی۔“

”مسئلہ شاکر نامی ایک بندے کا ہے۔“ میں نے کہنا شروع کیا۔ ”جس کا آپ روحانی علاج کررہے ہیں......“

”اچھا اچھا...... آپ اس موٹے کی بات کررہے ہیں جس کو آپ نے پچھلی رات تھانے میں بند رکھا تھا۔“ وہ سرسری انداز میں بولا۔ ”وہ صبح آیا تھا میرے پاس اور اس نے اپنی بپتا بھی سنائی ہے مجھے۔ آج وہ دن بھر میرے آستانے پر ہی رہے گا۔ ابھی میں نے اسے ایک کام سے کہیں بھیجا ہوا ہے۔ جناب! میں تو سمجھتا ہوں، شاکر بے قصور ہے...... اس سے کوئی کام کاج تو ہوتا نہیں۔ ایک نمبر کا بزدل ہے۔ وہ چودھری کی حویلی میں گھس کر چوری کی ہمت کیسے کرسکتا ہے۔“

”میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ وہ بے گناہ ہے اسی لیے میں نے اسے چھوڑ بھی دیا ہے۔“ میں نے بڑی رسان سے کہا۔ ”آپ کو پتا ہے، جب کسی کی شکایت موصول ہوتی ہے تو اس سے تفتیش تو کرنا پڑتی ہے نا......؟“

www.paksociety.com

''ہاں ہاں......'' اس نے سرسری انداز میں گردن ہلائی اور پوچھا۔ ''جب اس کو آپ نے بے گناہ سمجھ کر چھوڑ دیا ہے تو پھر کون سا مسئلہ ہے؟''

''میں چاہتا ہوں کہ وہ دوبارہ کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو۔'' میں نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ''اس لیے آپ سے چند سوالات کرنے آیا ہوں۔''

''جی جی...... ضرور۔'' وہ پہلو بدلتے ہوئے بولا۔

''کیا شاکر پر واقعی ہوائی چیزوں کے اثرات ہیں؟''

''سو فیصد جناب۔'' وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ''میں ان کی کاٹ کر رہا ہوں۔ ایک سال سے پہلے وہ بھلا چنگا ہوجائے گا۔''

میں نے رفع حاجت والے معاملے کا ذکر کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''آپ نے اس کام کے لیے چودھری کی حویلی کا پچھواڑا ہی کیوں منتخب کیا تھا؟''

''میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ گھر سے کچھ فاصلے پر۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ الجھ کر بولا تھا...... گھر سے دور...... چودھری کی حویلی سے بھی آگے...... میں نے اس کے سمجھنے کی آسانی کے لیے کہہ دیا، ہاں ٹھیک ہے۔'' وہ رکا، ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اس کام کے لیے جگہ کا انتخاب شاکر کا ذاتی فیصلہ تھا۔''

''اور آپ نے اسے یہ تاکید کی تھی کہ اس کے بارے میں کسی کو بتاؤ گے نہیں کہ اکتالیس جمعرات تک اسے آدھی رات کو رفع حاجت کے لیے گھر سے دور جانا ہے؟''

''جی ہاں!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''بعض معاملات میں اس قسم کی پابندیاں عائد کرنا پڑتی ہیں۔''

''اور فرض کریں......'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ''اگر کسی جمعرات کو نصف شب اسے حاجت ہی محسوس نہ ہو تو......؟''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھانے دار صاحب!'' وہ بڑے یقین سے بولا۔ ''جن لوگوں پر سحری اثرات ہوتے ہیں یا جو آسیب وغیرہ کی لپیٹ میں آجاتے ہیں، جب ان کا باقاعدہ روحانی علاج شروع ہوجاتا ہے تو ہر جمعرات کو آدھی رات کے وقت انہیں شدید قسم کی حاجت محسوس ہوتی ہے۔''

میں اس کی توجیہ سے قطعی مطمئن نہ ہوا تاہم فضول بحث میں الجھ کر وقت برباد کرنے کے بجائے میں نے یہی ظاہر کیا کہ اس کی وضاحت نے میری تسلی کردی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ کہتے ہوئے میں وہاں سے واپس آگیا۔

''شاہ جی! آپ شاکر کو اچھی طرح سمجھا دیں کہ وہ آیندہ کوئی ایسی حرکت نہ کرے کہ چودھری کے بندے اسے دوبارہ پکڑ کر میرے پاس لے آئیں!''

''جی، آپ بے فکر ہوکر جائیں۔'' وہ مجھے رخصت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں اسے سمجھا دوں گا۔ مجھے خود اس کا بہت خیال ہے۔''

☆☆☆

چھٹی حس نے مجھے کبھی دھوکا نہیں دیا۔

کوئی میرے اندر سے چیخ چیخ کر یہ کہہ رہا تھا کہ اگر میں خالدہ پر مناسب ''توجہ'' دوں تو یہ کیس چٹکی بجاتے میں حل ہوجائے گا۔ اس نے شاہ جی کے آستانے پر مجھے دیکھ کر جس ردعمل کا مظاہرہ کیا تھا وہ منظر میری یادداشت سے چپک کر رہ گیا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کا بری طرح چونک جانا، خوف زدہ ہونا، اپنے چہرے کو چادر کے گھونگٹ میں چھپانا اور تیز رفتاری سے وہاں سے چلے جانا اس امر کی دلیل تھا کہ اسے مجھ سے کوئی خطرہ ہے۔

پولیس کو دیکھ کر کوئی شخص اتنا زیادہ خوف زدہ اسی وقت ہوتا ہے جب اس نے کوئی سنگین جرم کیا ہو...... تو اس کا مطلب تھا خالدہ کسی جرم میں ملوث تھی۔ اگر ایسا تھا تو پھر یہ بات بھی یقینی تھی کہ اس جرم میں کمسن شاہ بھی برابر کا شریک رہا ہوگا۔ شاہ جی نے خالدہ کی آستانے پر آمدورفت کے حوالے سے جو وضاحت کی تھی، میں اس سے قطعی مطمئن نہیں تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے خالدہ پر ہاتھ ڈالنے کا فیصلہ کرلیا۔

میں نے تھانے پہنچتے ہی سب سے پہلے خالدہ کی کڑی نگرانی کا بندوبست کیا۔ شام تک کی رپورٹ کے مطابق اس نے دو مرتبہ کمسن شاہ کے آستانے پر حاضری دی تھی یعنی صبح والی حاضری ملا کر تین بار...... یہ ایک غیر معمولی نکتہ تھا۔ میں نے اپنا ذہن بنایا اور تمام تر مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر چھٹی حس کی پکار پر اسی رات کارروائی ڈال دی۔ لگ بھگ رات دس بجے میں اے ایس آئی یونس مرزا کے ساتھ خالدہ کے گھر پہنچ گیا۔ موسم سرما میں اس وقت تقریباً سارا حسین آباد گہری نیند کے مزے لے رہا تھا۔

میری دستک کے جواب میں خالدہ نے آنکھیں ملتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ اپنے سامنے دو پولیس والوں کو دیکھ کر وہ ٹھٹکی۔ یقیناً اس نے مجھے بھی پہچان لیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا وہ دروازہ بند کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے ارادے کو عملی شکل دیتی، میں بھرامار کے گھر کے اندر داخل ہوگیا۔ اگلے ہی لمحے یونس بھی اندر آگیا۔ اس صورت حال نے خالدہ کو بوکھلا کر رکھ دیا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''خالدہ! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تم سے ضروری پوچھ گچھ کرکے واپس چلا جاؤں گا......''

میری بات اس کی سمجھ میں آگئی اور کوئی شدید ردعمل ظاہر کرنے کے بجائے وہ ہمیں گھر کی بیٹھک میں لے آئی۔ اس کا بیٹا عارف گھر کے اندرونی حصے میں کہیں گہری نیند سو رہا تھا۔ ہم روبرو بیٹھ چکے تو میں نے کہا۔

''خالدہ! میں جانتا ہوں کہ تم چودھری بشارت کی ساس ہو اور تمہیں یہ غرور بھی ہوگا کہ چودھری کے ڈر سے تمہارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا لیکن میں تھانے دار ہوں ذرا دوسری ٹائپ کا...... کسی کے رعب یا دباؤ میں نہیں آتا ہوں۔ میں اگر چاہتا تو تمہیں تھانے بلا کر تفتیش کرتا لیکن میں نے تمہاری عزت کا خیال کرتے ہوئے ایسا نہیں کیا اور رات کی تاریکی میں خود چل کر تمہارے پاس آیا ہوں تاکہ گاؤں والوں کو پتا نہ چلے کہ تمہارے گھر پولیس آئی ہے......'' لحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے امید ہے، تم مجھ سے کسی قسم کی غلط بیانی نہیں کروگی......''

''لیکن مسئلہ کیا ہے......'' وہ ان جان بنتے ہوئے بولی۔ ''آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟''

''تعویذات کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ تعویذات جو چودھری کے غسل خانے کے ٹب میں پڑے ملتے ہیں......؟''

میرا اندھیرے میں چھوڑا ہوا تیر نشانے پر جا کر لگا۔ وہ بے حد خوف زدہ انداز میں بولی۔ ''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔''

''اس کا مطلب ہے، شرافت کی زبان تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔'' میں نے کڑے تیوروں سے اسے گھورتے ہوئے کہا پھر اے ایس آئی کی طرف دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''یونس مرزا...... یہ تھانے کا کیس ہے۔ جس طرح کمسن شاہ نے اپنے کالے کرتوتوں کا اقرار کرلیا ہے، یہ بھی سب بولے گی...... فرفر بولے گی۔''

میرے اس نفسیاتی حربے کا اس پر خاطر خواہ اثر ہوا، بکھرے ہوئے لہجے میں مجھ سے پوچھنے لگی۔ ''کیا شاہ جی سے بھی آپ نے پوچھ گچھ کی ہے......؟''

''پوچھ گچھ......!'' میں نے جارحانہ انداز میں کہا۔ ''وہ اس وقت میرے تھانے میں الٹا لٹکا ہوا ہے۔ اس نے مجھے بتا دیا ہے کہ تم اس سے جو تعویذات لے کر آتی تھیں وہ کس مقصد کے لیے تھے......'' میں نے اسے بری طرح بدکتے اور خوف زدہ ہوتے دیکھ کر اندازہ لگالیا تھا کہ اس کی برداشت جواب دینے والی ہے۔ ''اب یہ فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ میری باتوں کے سیدھے سیدھے اور سچے جواب دوگی یا تمہیں بھی تھانے لے جاکر کمسن شاہ کے پہلو میں چھت سے الٹا لٹکا دوں......؟''

اس کے اعصاب میرے زبردست نفسیاتی حربے کا مقابلہ نہ کرسکے اور وہ منمناتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''نہیں نہیں...... میں تھانے نہیں جاؤں گی...... آپ کو جو کچھ بھی پوچھنا ہے، ادھر ہی پوچھ لیں...... جب شاہ جی نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے تو میں چھپا کر کیا کروں گی......''

آیندہ پندرہ بیس منٹ کے اندر خالدہ نے میرے مختلف سوالات کے جواب میں مجھے جو کچھ بتایا وہ حیرت انگیز اور سنسنی خیز تھا۔ میں اس کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

نورین کی بہ نسبت کلثوم بڑی دور اندیش اور صبر والی تھی کہ اس نے زبان پر تالا ڈال کر چودھری بشارت کے ساتھ زندگی کے پندرہ سال ہنسی خوشی گزار دیے تھے۔ شاید اس کا سب سے بڑا سبب یہ بھی ہو کہ اس کا دکھ سننے والا دنیا میں کوئی موجود نہیں تھا لیکن نورین نے ماں کی پوچھ تاچھ کے نتیجے میں چودھری بشارت کی زندگی کا سب سے خوفناک راز اگل دیا تھا۔ خالدہ نے اس پر مسلسل یہ دباؤ ڈال رکھا تھا کہ اسے جلد از جلد صاحب اولاد ہوجانا چاہیے ورنہ چودھری اس سے مایوس ہوکر کہیں اور منہ دیکھنا شروع کردے۔

خالدہ کی یہ تشویش اس لحاظ سے جائز تھی کہ وہ کسی آسودہ حال خاندان سے تعلق نہیں رکھتی تھی۔ ان کے دن تو اچانک ہی پھر گئے تھے اور وہ ان دنوں اور آنے والے دنوں کو پھرا ہوا ہی دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ نورین چھوٹی چودھرائن کی حیثیت سے حویلی میں بیٹھی راج کرتی رہے اور...... نورین کا راج کرنا اسی وقت یقینی ہوسکتا تھا جب وہ چودھری کے لیے اولاد پیدا کرکے دکھا دے لیکن خالدہ کے، صبح شام کے اصرار پر جب نورین نے اسے تلخ حقائق سے آگاہ کیا تو گویا خالدہ کے سر پر ایٹم بم گر گیا۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو نورین......؟'' وہ بے یقینی سے بیٹی کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں اماں۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ''دکیا، چودھری اگر دس شادیاں بھی کرلے تو وہ باپ نہیں بن سکتا کیونکہ وہ زنگ آلود ہے۔''

''اوہ......!'' خالدہ ایک سانس خارج کرکے رہ گئی۔

چودھری کی ''زنگ آلودگی'' کا تو خالدہ کے پاس کوئی علاج نہیں تھا تاہم وہ ہر قیمت پر اپنے اور نورین کے عیش

وآرام کو دائمی بنانا چاہتی تھی لہٰذا وہ مشورے کے لیے اپنے گرو گھنٹال گھمسن شاہ کے پاس پہنچ گئی۔

شاہ جی نے پوری بات توجہ سے سنی اور تعویذاتی چکر کی ابتدا کردی۔ اس منصوبے کے مطابق نورین کو ہر جمعرات کو خود ہی پانی والے ٹب میں تعویذ کو ڈالنا تھا اور اگلی صبح شدید سردرد کا ناٹک کرنا تھا اور اس ناٹک کے ساتھ ہی دبے الفاظ میں کچھ ایسے تبصرے بھی کرنا تھے کہ تعویذات کے سلسلے میں چودھری بشارت کا شک اپنی پہلی بیوی کلثوم کی طرف جائے کہ وہ اپنی سوکن پر کسی قسم کا سفلی عمل کروا رہی ہے۔ اس کے نتیجے میں چودھری بشارت غصے میں آکر کلثوم کو اپنی زندگی سے باہر نکال دیتا اور نورین کا حویلی میں قیام آنے والے دنوں کے لیے محفوظ ہو جاتا۔

گھمسن شاہ اصلی پیر تھا یا نقلی، اس بحث سے قطع نظر وہ بھی چودھری کی زنگ آلودگی کو ٹھیک نہیں کرسکتا تھا، سو اس نے وہی کیا تھا جو اس کے بس میں تھا۔

چودھری بشارت علی کے غسل خانے میں ہونے والا ٹوپی ڈراما روز روشن کی طرح میرے سامنے عیاں ہو چکا تھا۔ میں نے خالدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اگر میں تمہاری، تمہاری بیٹی اور گھمسن شاہ کی حرکتوں کے بارے میں چودھری بشارت کو بتادوں تو جانتی ہو کیا ہوگا......؟“

وہ باقاعدہ میرے قدموں میں گر گئی پھر خوشامدانہ لہجے میں بولی ”تھانے دار صاحب! میری اور نورین کی عزت آپ کے ہاتھ میں ہے۔“

”ٹھیک ہے......“ میں نے اسے واپس اپنی جگہ بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اس سلسلے میں چودھری کو کچھ نہیں بتاؤں گا لیکن اس کے بدلے تمہیں بھی مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا؟“

”ایک نہیں، میں دس وعدے کروں گی۔“ وہ اضطراری انداز میں بولی۔ ”آپ حکم کریں۔“

”دس نہیں صرف ایک وعدہ!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”میں تم ماں بیٹی کا دشمن نہیں ہوں اور نہ ہی تمہارے عیش وآرام میں کوئی خلل ڈالنا چاہتا ہوں۔ بس مجھ سے یہ وعدہ کرو کہ آیندہ تم لوگ چودھری بشارت کی پہلی بیوی کلثوم کے خلاف کوئی سازش نہیں بنو گے۔“

”جی...... میں پکا وعدہ کرتی ہوں۔“ وہ میرے آگے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔ ”میں آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔“

میں نے مزید دس منٹ تک اسے مختلف پہلوؤں سے سمجھایا اور اس کے گھر سے نکل کر تھانے کی جانب روانہ ہوگیا۔

خالدہ کے اقبال جرم کے بعد میں نے اسے بتادیا تھا کہ محض اس کی زبان کھلوانے کے لیے میں نے گھمسن شاہ کی گرفتاری کی بات کی تھی۔ وہ میرے اس انکشاف پر چونکی تو ضرور لیکن مجھ سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ کرسکی۔ میں نے دھمکی دیتے ہوئے اس پر واضح کردیا تھا کہ اگر ان لوگوں نے میری ہدایات پر من وعن عمل نہ کیا تو میں وہ سب کچھ عملاً بھی کرکے دکھادوں گا جس کا ذکر کیا ہے۔ پھر پورا تھانا دیکھے گا کہ گھمسن شاہ اور خالدہ چھت سے جھولتے ہوئے تفتیش کے دوران میں، ذبح ہونے والے جانور کی آوازیں کس طرح نکالتے ہیں۔

اس نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے خوفزدہ انداز میں کہا تھا۔ ”تھانے دار جی! میری توبہ، میری آنے والی سات نسلوں کی توبہ جو آپ کے کسی حکم کی عدولی کروں۔“

”آنے والی نسلوں“ کا ذکر شاید اس نے اپنے بیٹے عارف کے حوالے سے کیا تھا کیونکہ نورین کی طرف سے تو فی الحال ایسی کوئی امید رکھی نہیں جاسکتی تھی۔ جب تک نورین کی ازدواجی زندگی ایک زنگ آلود پرزے کے ساتھ گزر رہی تھی، ایسی خوشی کے امکانات دکھائی نہیں دیتے تھے۔

اس واقعے کے دو روز بعد گھمسن شاہ کی طرف سے مجھے ایک رقعہ ملا۔ یہ رقعہ اس کے آستانے کے مجاور کھنڈی نے مجھ تک پہنچایا تھا۔ مذکورہ رقعے کے اندر صرف ایک جملہ تحریر تھا۔

”شکریہ ملک صاحب! آپ بہت سمجھدار پولیس آفیسر ہیں۔“

میں نے اس رقعے کا جواب لکھ کر کھنڈی کے ہاتھ پیر گھمسن شاہ کو بھجوادیا۔ میرا جواب بھی ایک جملے پر ہی محیط تھا۔ میں نے لکھا تھا۔

”شاہ جی! امید ہے، آپ بھی ایسی ہی سمجھداری کا مظاہرہ کریں گے......!“

مجھے یقین تھا کہ میری کڑی تنبیہ کے بعد کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آئے گا کہ چودھری بشارت کو مجھ سے کسی نوعیت کے تعاون کی ضرورت پیش آئی اور ایسا ہی ہوا تھا۔ میری دلی خواہش یہ تھی کہ یہ معاملہ خوش اسلوبی سے دب دبا جائے اور مجھے چودھری کے سامنے اس کی نااہلیت کا ذکر کرتے ہوئے زنگ آلودی کو زیر بحث نہ لانا پڑے۔

میں چونکہ چودھری کا پردہ رکھنا چاہتا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے میری اس خواہش کو پورا کردیا تھا۔ بے شک! وہی نیت کا حال جانتا ہے......!

(تحریر: حُسام بٹ)

دھچکا

سلیم انور

دنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک شاطر موجود ہے۔ کوئی کسی کو نقصان پہنچانے میں اور کوئی کسی کے نقصان سے بچنے کے لیے تدبیروں کی جنگ لڑ رہا ہے... کبھی بازی مات ہوتی ہے اور کبھی بساط ہی پلٹ جاتی ہے جیسے کہ یہاں... وہ جو اسے ویران کرنے آیا تھا خود حیران ہو کر میدان چھوڑ گیا۔

دل کی دنیا میں تغیر پیدا کرتی ایک دلکش تحریر

پیٹر دروازے کے سامنے جھک کر بیٹھ گیا اور اپنے قفل شکن اوزاروں کی مدد سے تیزی سے تالے کو رگڑنا شروع کردیا۔ ہال وے میں اس وقت سناٹا چھایا ہوا تھا لیکن کسی بھی لمحے کوئی بھی اپنے فلیٹ کے دروازے سے باہر آسکتا تھا یا کوئی بھی لفٹ سے باہر قدم رکھ سکتا تھا۔

گو کہ اس کی انگلیاں جچے تلے انداز سے مہارت کے ساتھ حرکت کر رہی تھیں، ساتھ ہی اس کی نظریں بھی چوکنے انداز میں راہداری کے دونوں اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اتنے میں لفٹ کے دروازے کے اوپر لگے ہوئے انڈیکیٹر بلب باری باری روشن ہونے لگے جو اس بات کا اشارہ تھا کہ لفٹ اوپر آرہی ہے۔ پھر جوں ہی اس فلور پر لفٹ کے پہنچنے اور رکنے کی گھنٹی بجی، قفل کا بولٹ پیٹر کے اوزاروں سے ہار مان گیا۔

پیٹر تیزی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ ابھی وہ بہ مشکل دروازہ بند کرپایا ہی تھا کہ اس کے کانوں میں لفٹ کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔

اس اپارٹمنٹ بلڈنگ کے مکین داخلی دروازے کی سیکیورٹی پر بہت زیادہ یقین رکھتے تھے اور اپنے فلیٹوں میں داخلی دروازوں کے تالوں پر زیادہ توجہ نہیں دیتے تھے۔ بہت ہی کم فلیٹ ہوں گے جن کے تالے قفل شکن پروف ہوں گے۔

پیٹر نے جس فلیٹ میں نقب زنی کا ارادہ کیا تھا اس کا تالا بھی ایک عام قسم کا تھا، اسی لیے پیٹر کو اسے توڑنے میں زیادہ

وقت نہیں لگا تھا۔ پیٹر اپنے اوزاروں کا پاؤچ ایک گلدستے میں چھپا کر اندر لایا تھا۔ اسی لیے دربان نے اس پر ایک نگاہ ڈالنے کے بعد دوبارہ اس کی طرف دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

اگر وہ اپنے پیکٹ سے پاؤچ میں رکھے ہوئے جمع کردہ دھاتی ہتھیاروں کے ساتھ داخل ہوتے ہوئے پکڑا جاتا تو یہ ثبوت اسے دوبارہ جیل بھیجنے کے لیے کافی تھا اور پیٹر کا پکڑے جانے اور دوبارہ جیل کی ہوا کھانے کا قطعی کوئی ارادہ نہیں تھا۔

فلیٹ میں داخل ہونے کے بعد وہ دروازے سے کان لگا کر کھڑا ہو گیا۔ لفٹ کی جانب سے بڑھتے ہوئے قدموں اور قہقہوں کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر قدموں کی چاپ دروازے کے سامنے سے ہوتی ہوئی دھیمی ہوتی چلی گئی۔

پیٹر نے اندھیرے اپارٹمنٹ میں اطمینان کا سانس لیا۔ اس غیر قانونی حرکت کے احساس سے اس کے پورے جسم میں سنسنی سی پھیل گئی۔ اس قسم کی مہمات میں جو نقدی اور جواہرات اس کے ہاتھ لگتے تھے، ان سے اس کی گزر اوقات خوب ہو جاتی تھی لیکن پیٹر نے جس بنا پر یہ پیشہ اختیار کیا تھا، اس کی حقیقی وجہ نقدی یا زیورات نہیں تھے۔ یہ اس ہیجانی کیفیت سے پیدا ہونے والا سرور تھا کہ جس جگہ اسے موجود نہیں ہونا چاہیے تھا، وہ وہاں موجود ہوتا تھا۔ اسی سرور کی کیفیت کے حصول کے لیے وہ اپارٹمنٹس میں نقب زنی کی وارداتیں کرتا تھا۔ پھر پیٹر خواب گاہ کی جانب بڑھنے لگا۔ یہی وہ کمرا تھا جہاں مکین ہمیشہ اپنی قیمتی اشیا محفوظ رکھا کرتے تھے۔

تب اچانک ایک چھت پر لگی لائٹ روشن ہو گئی اور اس کی تیز چمک سے پیٹر کی آنکھیں ایک لمحے کے لیے خیرہ ہو گئیں۔

جب اس کی آنکھیں روشنی سے ہم آہنگ ہوئیں تو اس نے درمیانی عمر کی ایک عورت کو خواب گاہ کے دروازے کے عین قریب کھڑے ہوئے پایا۔ اس کی عورت کی انگلیاں ابھی تک لائٹ سوئچ کو تھامے ہوئے تھیں۔ اس کے چہرے پر شاک کی سی کیفیت تھی جو یقیناً پیٹر کو اپنے اپارٹمنٹ میں غیر متوقع طور پر دیکھنے سے اس پر طاری ہوئی تھی۔

تب اچانک حیرانی کی یہ کیفیت تیزی سے معدوم ہو گئی اور اس کی جگہ درد کی شدت کے آثار نمودار ہو گئے۔ ساتھ ہی وہ عورت بیڈروم کے فرش پر اپنا ہاتھ سینے پر رکھ کر گرتی چلی گئی۔

نہیں، ایسا نہیں ہونا چاہیے...... پیٹر نے سوچا۔ پیٹر جانتا تھا کہ اگر یہ عورت مر گئی اور اس معاملے میں اگر وہ کبھی دھرا گیا تو نقب زنی کے الزام کے ساتھ ساتھ اس پر قتل کا الزام بھی آسکتا تھا اور اپنے سابقہ مجرمانہ ریکارڈ کی روشنی میں وہ پھر کبھی جیل سے باہر نہیں آسکے گا۔

وہ تیزی سے اس عورت کی جانب لپکا۔

نزدیک پہنچ کر اسے عورت کے چہرے پر خوف کے سائے منڈلاتے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ وہ خاموشی سی سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ”کم آن لیڈی! میرے سامنے مت مرنا۔“

وہ عورت کچھ دیر تک گہرے گہرے سانس لیتی رہی۔ پھر دھیمے لہجے میں بولی۔ ”میری مدد کرو۔“ پھر وہ ہانپنے لگی۔

پیٹر کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس عورت کی کس طرح مدد کرے۔ تب وہ عورت دوبارہ گویا ہوئی۔ ”میں دل کی مریضہ ہوں۔“

پیٹر اس عورت پر جھک گیا اور تیزی سے بولا۔ ”تمہاری دوائیں کہاں ہیں؟ میں لا کر دیتا ہوں۔ بتاؤ کہاں ہیں؟“

عورت نے بیڈ کی جانب نائٹ اسٹینڈ کی طرف اشارہ کیا۔ تب پیٹر نے دیکھا کہ نائٹ اسٹینڈ پر دوائیں اس طرح آراستہ تھیں جیسے کسی ڈرگ اسٹور کا کیبنٹ ہو۔ یقیناً یہ عورت اس سے کہیں زیادہ بیمار ہے جیسی کہ دکھائی دے رہی ہے۔

پیٹر تیزی سے نائٹ اسٹینڈ کے پاس پہنچا اور دواؤں کی بوتلوں کو ٹٹولتے ہوئے چیخ کر بولا۔ ”دوا کا کیا نام ہے، لیڈی۔ تمہیں کس دوا کی ضرورت ہے؟“

وہ عورت بہ دستور نائٹ اسٹینڈ کی جانب اشارہ کر رہی تھی لیکن منہ سے کچھ نہیں کہہ پا رہی تھی۔ پیٹر بلند آواز سے اپنا سوال دہرائے جا رہا تھا۔ ”دوا کا نام بتاؤ لیڈی۔ جلدی کرو۔“

جب عورت نے کوئی جواب نہیں دیا تو پیٹر نے جھنجلاہٹ کے عالم میں بہت ساری بوتلیں سمیٹ لیں اور انہیں اٹھا کر اس عورت کے پاس لے آیا۔

”یہ دیکھو! ان میں سے جو تمہیں درکار ہے وہ اٹھا لو۔“ پیٹر نے کہا۔

اس عورت نے انکار کے انداز میں سر کو دائیں بائیں حرکت دی اور پھر سرگوشی کے لہجے میں بولی۔ ”قریب آؤ، میرے اور قریب آؤ۔“

پیٹر اس عورت کے زیادہ قریب ہونے سے کترا رہا تھا۔ اس خوف سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے کہ وہ عورت اس کی آنکھوں کے سامنے موت کے منہ میں نہ چلی جائے اور وہ دیکھتا رہ جائے۔

”جلدی کرو!“ اس عورت نے پھر سرگوشی کی۔

پیٹر نے اپنی پتلون درست کی اور ایک گھٹنے کے بل جھک کر اس عورت کے مزید نزدیک ہو گیا۔

تب اس عورت نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر اس کی کمر کے گرد حمائل کرتے ہوئے اپنی گرفت سخت کر دی۔ پیٹر کو یوں لگا جیسے کسی آہنی شکنجے نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا ہو۔ وہ عورت اپنے ہونٹ اس کے کان کے نزدیک لے آئی اور پھر ہلکے سے ملتجی لہجے میں بولی۔ ”پیرامیڈیکل والوں کو فون کر دو۔ نائن ڈبل ون پر۔ میرے بچنے کی بس یہی ایک صورت ہے۔ تم مجھے اس طرح مرتا ہوا نہیں چھوڑ سکتے۔“

پیٹر نے خود کو بہ مشکل تمام اس عورت کی آہنی گرفت سے آزاد کرایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ایک لمحے کے لیے غور سے اس عورت کو دیکھتا رہا۔ اس عورت کے چہرے کی کیفیت اور جس بہ مشکل طریقے سے وہ ایک ایک سانس لے رہی تھی، یہ ظاہر کر رہے تھے کہ وہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکے گی۔ یہ بھانپتے ہی پیٹر چوکنا ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ اسے فوری طور پر کچھ کرنا ہوگا اور جو کچھ بھی کرنا ہے، اس میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔

پیٹر نے دستانوں میں بند ہاتھوں سے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور 911 ڈائل کیا۔

جب آپریٹر نے فون اٹھایا تو پیٹر نے آواز بدلتے ہوئے کہا۔ ”اس کال کو ٹریس کرو۔ اس پتے پر ایک عورت مر رہی ہے۔ پیرامیڈکس سے کہو کہ وہ فوراً یہاں پہنچیں۔“

اس سے قبل کہ آپریٹر کچھ کہتا، پیٹر نے فوراً ہی فون بند کر دیا اور اسے واپس نائٹ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس عورت کی جانب پلٹ گیا۔ ”ہمت سے کام لو، لیڈی۔“ اس نے عورت کو دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ”پیرامیڈکس بس پہنچنے ہی والے ہیں۔“

پھر وہ برق رفتاری سے اپارٹمنٹ سے باہر نکل گیا۔ اس نے نکلتے وقت دروازہ بند کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔ وہ جلد از جلد اس عمارت سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔

نقب زنی کے لحاظ سے یہ ایک بری شب ثابت ہوئی تھی اور اب وہ بس یہی چاہ رہا تھا کہ گھر پہنچ کر بستر پر لیٹ جائے اور یہ فراموش کر دے کہ ناکام نقب زنی کا کوئی واقعہ بھی پیش آیا تھا۔

☆☆☆

کیرولین نے اس وقت تک انتظار کیا جب تک اسے یقین نہیں آ گیا کہ نقب زن جا چکا ہے۔ پھر وہ فرش پر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ٹیلی فون کی جانب لپکی۔

اس نے ریسیور اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”ہیلو 911؟ آپریٹر کیا تم بہ دستور لائن پر ہو؟“

دوسری جانب سے آپریٹر نے جواب دیا۔ ”فون کان سے لگائے رکھیں، میڈم۔ ہم نے ایمبولینس روانہ کر دی ہے جو چار منٹ میں آپ کے پاس پہنچ جائے گی۔“

”انہیں پیغام دے دو کہ جلدی پہنچنے کی کوشش نہ کریں۔ میرے اپارٹمنٹ میں نقب زن گھس آیا تھا سو میں نے ہارٹ اٹیک کا ڈھونگ رچایا تھا۔ میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ نقب زن اتنا دردمند ہوگا کہ میری خاطر تمہیں فون کرنے پر رضامند ہو جائے گا۔“

”یہ تو آپ نے سوچنے میں بہت تیزی دکھائی۔“ آپریٹر نے ستائشی لہجے میں کہا۔ ”لیکن یہ بہت برا ہوا کہ وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔“

یہ سن کر کیرولین کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ ”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”وہ کچھ لوٹ کر لے جانے میں کامیاب تو نہیں ہوا؟“ آپریٹر نے پوچھا۔

”نہیں۔ لیکن اگر لے جاتا تو تب بھی زیادہ دیر آزاد نہیں گھوم سکتا تھا۔“

”وہ کیسے؟“

”جب میں نے اسے قریب بلا کر اس کے کان میں سرگوشی کی تھی تو ساتھ ہی اس کا بٹوہ بھی چرا لیا تھا۔ اس کی رہائش کا پتا اس کے بٹوے میں موجود ہے۔ میں اسے پولیس کے حوالے تو نہیں کرنا چاہتی کیونکہ اس نے مجھ سے ہمدردی کی تھی۔ لیکن ساتھ ہی کیا اس نے مجھے لوٹنے کی کوشش نہیں کی تھی؟“

پھر کیرولین نے آپریٹر کو اس نقب زن کا پتا لکھوا دیا۔

فون بند کرنے کے بعد کیرولین نے فرش پر بکھری ہوئی دوائیں اور گولیاں سمیٹ کر واپس نائٹ اسٹینڈ پر رکھی ہوئی دیگر دواؤں کے ساتھ سجا دیں۔ یہ دوائیں اس کے مرحوم شوہر کی تھیں جو دل کا مریض تھا اور اس کے مرنے کے بعد کیرولین نے اس کی نشانی کے طور پر انہیں پاس رکھا ہوا تھا۔ اس نے کئی بار چاہا کہ ان دواؤں کو پھینک دے لیکن اس کے دل نے کبھی یہ گوارہ نہیں کیا۔

اور چونکہ وہ ہارٹ اٹیک کی کیفیت سے بھی بہ خوبی واقف تھی اس لیے اسے ہارٹ اٹیک کا ڈھونگ رچانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ پھر وہ سوچنے لگی کہ جب اس نے اس نقب زن کی پتلون میں سے اس کا بٹوہ نکالا تھا تو اس وقت ساتھ ہی اسے چند گولیاں اس کی جیب میں بھی کھسکا دینی چاہیے تھیں۔ اس لیے کہ جب وہ نقب زن اپنے گھر پہنچے گا اور وہاں پولیس کو اپنا منتظر پائے گا تو کہیں اسے بھی ہارٹ اٹیک نہ ہو جائے اور اسے حقیقت میں دوا کی ضرورت پیش آ جائے۔

محفلِ شعر و سخن

❁ عبدالغفور خان ساغری خٹک ..... چھب، ضلع اٹک

وقتِ رخصت اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی
کیا خبر بچھڑنے کا ماتم تھا یا میرے دور جانے کا غم

❁ اعجاز احمد راحیل، ماہی ..... ساہیوال

ہم اپنے فن کا اثاثہ یہاں اٹھا لائے
دیارِ شعر و سخن میں غزل سجا لائے
چراغِ شہر کے سارے لے تھما دیں گے ہم
تمہارے جسم کی خوشبو اگر ہوا لائے

❁ محمد قدرت اللہ نیازی ..... حکیم ٹاؤن، کراچی

سنا ہے سب کچھ مل جاتا ہے دعا سے
ملتے ہو خود، یا مانگوں خدا سے!

❁ قیصر اعوان ..... ڈسٹرکٹ جیل، سرگودھا

محبتوں میں ہر اک لمحہ وصال ہوگا، یہ طے ہوا تھا
بچھڑ کے بھی ایک دوسرے کا خیال ہوگا، یہ طے ہوا تھا
وہی ہوا نہ بدلتی رُت میں، تم نے ہم کو بھلا ہی ڈالا
کوئی بھی رت ہو، نہ چاہتوں کا زوال ہوگا، یہ طے ہوا تھا

❁ محمد یونس جاوید ..... پیروال

مجھے یقین ہے کہ آمائشِ جمال کے بعد
تمہارے ہاتھ سے آئینہ گر گیا ہوگا

❁ حافظ گل محمد، عمار گل ..... حیدرآباد، تھل بھکر

نہ مروت نہ محبت نہ خلوص ہے محسن
میں تو شرمندہ ہوں اس دور کا انساں ہوکر

❁ محمد حنیف آصف ..... حیدرآباد، تھل بھکر

کبھی تو لوٹ آئیں گی روٹھی ہوئی یادیں بھی
کسی کو بھول جانے کی قسم کھایا نہیں کرتے

❁ محمد صفدر معاویہ، عمر زاہد خان ..... خانیوال

میری آنکھوں سے جو چھلکے ہیں
ان کو آنسو مت سمجھ دوست
تیری یاد کے وہ لمحے ہیں
جو لمحہ لمحہ مجھ پہ اترے

❁ ابن سید، سید اکبر شاہ ..... اوگی، مانسہرہ

زمانے کے سوالوں کو میں ہنس کر ٹال دوں لیکن
نمی آنکھوں کی کہہ دے گی مجھے تم یاد آتے ہو

❁ ادریس احمد خان ..... ناظم آباد، کراچی

رفاقتوں میں پشیمانیاں تو ہوتی ہیں
کہ دوستوں سے بھی نادانیاں تو ہوتی ہیں

❁ محمد اشرف تبسم، حسنین اشرف ..... بحریہ ٹاؤن، پنڈی

کاش ایسا ہو کہ اب کے بے وفائی میں کروں
تو پھرے قریہ بہ قریہ کو بہ کو میرے لیے
اور میں لامحدود ہوجاؤں سمندر کی طرح
تو بنے دریا بہ دریا جُو بہ جُو میرے لیے

❁ اللہ نواز افق ..... ڈیرہ اسماعیل خان

کیوں نہ پاگل کہے یہ زمانہ ہمیں
ہم نے مٹی کو بھی نقشِ پا کہہ دیا

❁ ماہین فاطمہ ..... کراچی

انا کہتی ہے کہ روٹھنے والے کو جانے دو
کوئی اندر سے کہتا ہے، منا لیتے تو اچھا تھا

❁ مہرین ناز ڈوگر ..... حیدرآباد

کوئی طلب بھی نہیں اور سوگوار بھی ہوں
پکارتا بھی نہیں اور محوِ انتظار بھی ہوں
نہ جانے کتنے ارادوں میں بٹ گیا ہے وجود میرا
اسے پا بھی لیا ہے اور بے قرار بھی ہوں

❁ منشی محمد عزیز مے ..... لڈن ضلع وہاڑی

وہ حسن مجسم کمال اس کی آنکھیں
سراپا محبت جمال اس کی آنکھیں
ملیں تو میں دونوں جہاں دے کے لے لوں
وہ چہرہ، وہ زلفیں، وہ گال، اس کی آنکھیں

❁ داؤد اشفاق ..... کراچی

میری انکساریوں پہ تیرا تند و تیز لہجہ
وہی میری جی حضوری، وہی تیری حکمرانی

❁ سلیم شہزاد و رائے ..... ڈسٹرکٹ جیل، سرگودھا

بچھڑے ہوئے یاروں کی صدا کیوں نہیں آتی
اب روزنِ زنداں سے ہوا کیوں نہیں آتی
اے موسمِ خوشبو کی طرح روٹھنے والے
پیغام تیرا لے کر صبا کیوں نہیں آتی

❁ حیدر سلطان رائے ..... سرگودھا

مرتا بھی نہیں ٹھیک سے جیتا بھی نہیں ہے
یہ دل کہ تیرے بعد سنبھلتا بھی نہیں ہے
اک عمر کے صحرا سے تیری یاد کا بادل
ٹلتا بھی نہیں اور برستا بھی نہیں ہے

❁ البیلی ..... کراچی

عمرِ رواں پھر کبھی نہ مسکرائی بچپن کی طرح
میں نے مٹی بھی جمع کی کھلونے بھی لے کر دیکھے

❁ توصیف احمد ..... پٹھان کالونی، کراچی

وہ تو کہتا تھا اسے ساری دعائیں یاد ہیں
کیا بچھڑ کے پھر سے ملنے کی دعا کوئی نہیں!

❁ رعنا رضوی ..... مانچسٹر، یوکے

اے صبحِ حشر ہم سے سوال و جواب کیا
ہم آرہے ہیں ہجر کی راتیں گزار کے

❁ محمد اکرام صدیقی ..... اٹک سٹی

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

❁ سوہانی ..... لاہور

دل رہے ہر گھڑی بے قرار، اس سے کہنا
ہوگئے زندگی سے بیزار، اس سے کہنا
بہت مغرور ہے وہ اپنی ذات کی خودسری پہ
چاہیے ہوتا ہے کسی کا پیار، اس سے کہنا

❁ راجکماری ..... لاہور

بہت ارمان تھا تیرے پیار کو پانے کا
شکوہ ہے صرف تیرے خاموش رہ جانے کا
دیوانگی اس سے بڑھ کر کیا ہوگی
آج بھی انتظار ہے تیرے لوٹ آنے کا

❁ محمد اسحاق فری ..... کورنگی، کراچی

یاد آتا ہے روز و شب کوئی
ہم سے روٹھا ہے بے سبب کوئی

❁ رضوان تنولی ..... اورنگی ٹاؤن، کراچی

تیرے رخسار پہ نہ گرے کبھی کوئی غم کا آنسو
خدا تیری ہر دعا، تیری تقدیر بنا دے

❁ متین سلطان تنولی ..... اورنگی ٹاؤن، کراچی

مطمئن ہوں تجھے لفظوں کی حرارت دے کر
میں نے کتنا تجھے سوچا، کبھی سوچا تو نے؟

❁ پیہو جی ..... لاہور

ٹوٹ جائے نہ کہیں ضبط کی خواہش میری
نہ کر میرے ہمسفر اس قدر آزمائش میری
کہتا گیا میرے روپ کا جادو غزل بنا مجھے
یا پھر دل سے کم ہونے لگیں ہیں چاہتیں میری

❁ روشنی رشید ..... دھمیال کیمپ، راولپنڈی

گردشِ ایام کی زنجیر سے کہہ دو
خوشبو کا سفر وقت کا پابند نہیں ہے

❁ ایم افضل کھرل ..... ننکانہ صاحب

وہ پلا کر جام لبوں سے محبت کا محسن
اب کہتے ہیں نشے کی عادت اچھی نہیں ہوتی

❁ جنید احمد ملک.....گلستان جوہر، کراچی
میں ایک بے وفا سے وفا کرتا رہا
وہ غیروں سے مل کر مجھے تباہ کرتا رہا

❁ عتیق الرحمان، عمران زیب.....فیصل آباد
بدل کر فقیروں کا بھیس ہم غالب
تماشا اہلِ کرم دیکھتے ہیں

❁ زوہیب احمد ملک.....گلستان جوہر، کراچی
کمال کی فنکاری ہے اس میں
وار بھی دل پر اور راج بھی دل پر

❁ علی ڈوگر.....ساہیوال
کتابوں کی طرح ہے وہ بھی
الفاظ سے بھرپور مگر! خاموش

❁ عمرو راز قمر انصاری.....پھلرواں شہر
تیری بات جھوٹ ہوتی ہے
عشق ہوتا ہے یا پھر نہیں ہوتا

❁ محمد طلحہ.....کراچی
میں کسی کام کا نہیں ورنہ
وہ کسی کام سے ہی آجاتا

❁ رمضان پاشا.....گلشن اقبال، کراچی
میکدے میں اذاں سن کر رویا بہت
اس شرابی کو دل سے خدا یاد ہے

❁ محمد عقیل چٹھہ.....حافظ آباد
دانش میں خوفِ مرگ سے مطلق ہوں بے نیاز
میں جانتا ہوں موت ہے سنت حضور کی

❁ محمد خواجہ.....کورنگی، کراچی
زخم سینے میں، خلش دل میں، لبوں پر آہیں
یہ خلاصہ ہے میری زیست کے افسانے کا

❁ راجہ ابرار خان.....نیو سینٹرل جیل ملتان
ناں تیرے بعد بتا کون لبوں سے اپنے
وقتِ رخصت میرے ماتھے پہ دعا لکھے گا

❁ ایم افضال انصاری.....ڈنگہ شہر
پلکوں کے کنارے جو ہم نے کبھی بھگوئے نہیں
انہیں لگتا ہے کہ ہم کبھی روئے نہیں

❁ راجہ افتخار علی افق.....چوآسیدن شاہ، سوہرہ
تھکی ٹوٹی ہوئی نیندوں کے درمیان اکثر
بہت چپکے سے جاگ اٹھتی ہیں تیری یادیں

❁ طالب حسین.....پشاور
عجیب سی شرط محبت ہے اس کی
میں پورا اتروں تو وہ معیار بڑھا دیتا ہے

❁ جبران احمد.....گلشن اقبال، کراچی
تیز بارش میں کھڑا رہا میں بس اک جملہ سننے کو
کہ وہ کہہ دیں ادھر آؤ پاگل بھیگ جاؤ گے

❁ طالب حسین طلحہ.....نیو سینٹرل جیل ملتان
اک قیامت ہے کہ ہر شام گزر جاتی ہے
تو نے دیکھا نہیں نقشہ میری تنہائی کا

❁ ماہا ایمان.....حافظ آباد
کوئی میری ہستی کا مفہوم پوچھے
میں جینے کی خاطر مرا جا رہا ہوں

❁ محمد اشفاق سیال.....شورکوٹ سٹی
جب بھی ملتا ہے اسے تیری جھلک کا مرہم
ایک دلہن کی طرح درد سمٹ جاتا ہے

❁ ایم اے فاضل فریدی.....نامعلوم مقام
مرنے سے پہلے ہی مر گیا ہوں میں
گر کچھ سانس باقی ہے تو جدائی مار ڈالے گی

❁ ریاض بٹ.....حسن ابدال
مجھ کو دشمن کے ارادوں پہ بھی پیار آتا ہے
تیری الفت نے محبت میری عادت کر دی

❁ حاجی محمد اقبال زرگر.....نئی منڈی سکھیکی
ہم کتنے خوش نصیب ہیں کہ بعد مرگ بھی
ماتم ہمارا شہر کے سارے گھروں میں ہے

کوپن برائے شمارہ جولائی 2014

محفلِ شعر و سخن

نام: ....

پتا: ....

زندگی کی ایک تلخ حقیقت اور جذبوں کی فریب کاریوں کا قصہ

خون کا رشتہ

ثمر عباس

رشتہ چاہے خون کا ہو یا دل کا، اسے نبھانے کے لیے جس اخلاص اور شعور کی ضرورت ہوتی ہے وہ ضروری نہیں کہ ہر ایک کے پاس ہو... وہ بھی رشتوں کے بھنور میں پھنسنے کے باوجود اپنی ذات اور مفاد کا پرستار نکلا... گویا "اپنی ذات سے عشق ہے سچا باقی سب افسانے ہیں" کے مترادف اسے بھی کسی کی پروا نہ تھی۔

میں معمول کے مطابق صبح کے وقت اپنی ای میل چیک کر رہا تھا کہ ایک ای میل کے مضمون نے مجھے چونکا دیا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ فوری طور پر یونیورسٹی اسپتال میں ڈاکٹر والٹر شمٹ سے رابطہ کروں کیونکہ میری میڈیکل ہسٹری کے حوالے سے کوئی مسئلہ سامنے آیا ہے۔ میں ڈاکٹر شمٹ کو نہیں جانتا تھا اور نہ ہی اس پیغام کا مفہوم میری سمجھ میں آیا لیکن میری ہتھیلیاں پسینے سے تر ہو گئیں۔ میں ہمیشہ سے ہی ڈاکٹروں سے خوفزدہ رہا ہوں اور اس کی ایک معقول وجہ بھی

ہے۔ میں اسکول کے زمانے میں فٹ بال کا بہت اچھا کھلاڑی ہوا کرتا تھا اور مبصرین کا خیال تھا کہ اس سال اپنی ٹیم کو نیشنل فٹ بال لیگ کا فاتح ضرور بنواؤں گا لیکن اوہیو اسٹیٹ کے خلاف میچ کھیلتے ہوئے میرے گھٹنے پر شدید چوٹ لگی جس نے میرے سارے خواب چکنا چور کردیے۔ چار آپریشن کرنے کے بعد ڈاکٹروں نے فیصلہ سنا دیا کہ اب میں زندگی بھر فٹ بال نہیں کھیل سکتا۔ ذرا سی بے احتیاطی مجھے ہمیشہ کے لیے معذور بنا سکتی ہے۔

میں نے کانپتے ہاتھوں سے اسپتال کا نمبر ملایا۔ ڈاکٹر شمٹ موجود نہیں تھا۔ استقبالیہ کلرک نے مشینی انداز میں کہا۔ ''اگلے ہفتہ میں جمعرات کا اپائنٹمنٹ مل سکتا ہے۔''

میں نے جھلاتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر شمٹ کو اطلاع کردو کہ میں بیس منٹ میں اس سے ملنے آرہا ہوں۔''

ٹیلی فون بند کرکے میں اپنے کمرے سے باہر آیا اور سیکریٹری سے پوچھا۔ ''مسز فلپس، آج کی کیا مصروفیت ہے؟''

''مسٹر اسٹیفورڈ، آپ کو دو لوگوں سے ملنا ہے جنہوں نے قرضے کے لیے درخواست دے رکھی ہے۔''

''تم انہیں کوئی اور وقت دے دو اور میرے باپ کو بتادینا کہ بورڈ میٹنگ میں شرکت کے لیے بارہ بجے تک پہنچ جاؤں گا لیکن کچھ دیر بھی ہوسکتی ہے۔''

''شاید مسٹر اسٹیفورڈ سینئر اسے پسند نہ کریں۔''

''جانتا ہوں لیکن تم وہی کرو جو میں نے کہا ہے۔''

میں اپنی جیگوار کو طوفانی رفتار سے اڑاتا ہوا یونیورسٹی اسپتال پہنچا اور استقبالیہ کلرک سے پوچھا۔ ''ڈاکٹر والٹر شمٹ کہاں ملیں گے؟''

''وہ چھٹے فلور پر ہوتے ہیں۔ جینیاتی تحقیق کے شعبہ میں......''

میں اس کی پوری بات سنے بغیر لفٹ کی طرف بڑھا۔ چھٹی منزل کا ماحول اسپتال سے بالکل مختلف تھا۔ وہاں نرسوں اور وہیل چیئرز کے بجائے مختلف کیبنوں میں لوگ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے دکھائی دیے۔

''میرا نام اسٹیفورڈ ہے اور میں ڈاکٹر شمٹ سے ملنے آیا ہوں۔'' میں نے استقبالیہ کلرک سے کہا۔

''میں نے ٹیلی فون پر بتادیا تھا کہ ڈاکٹر شمٹ بہت مصروف ہیں......''

''میں بھی فارغ نہیں ہوں۔'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر شمٹ کو بتادو کہ جیکسن اسٹیفورڈ فوراً اس سے ملنا چاہتا ہے، شاید تمہیں معلوم نہیں کہ میرے خاندان نے اس اسپتال کی تعمیر کے آدھے اخراجات برداشت کیے ہیں اور اب بھی ہر سال بھاری رقم بطور عطیہ دی جاتی ہے۔ اگر ڈاکٹر شمٹ بہت مصروف ہے تو مجھے اس اسپتال کے سربراہ سے ملنا ہوگا۔''

اس نے تیوری چڑھا کر مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پھر انٹرکام کا ریسیور اٹھاتے ہوئے بولی۔ ''مسٹر اسٹیفورڈ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ جی، جی۔ ٹھیک ہے۔ میں انہیں بھیج رہی ہوں۔''

ڈاکٹر شمٹ کا کیبن دوسروں کی نسبت بڑا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو اس نے مجھے اپنے سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جیکسن اسٹیفورڈ سوم۔''

''چہارم۔'' میں نے تصحیح کی۔ ''میرے والد اسٹیفورڈ سوم ہیں۔''

''اوہ اچھا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں نے یونہی پوچھا تھا، تمہاری شناخت کے لیے۔ ورنہ تمہیں کون نہیں جانتا۔ کیا میں تمہیں یاد نہیں رہا؟''

''مجھے افسوس ہے، میں بینک آفیسر ہوں اور میرا کئی لوگوں سے واسطہ رہتا ہے۔ کیا ہم پہلے مل چکے ہیں؟''

''میں شماریات اور ٹرگنومیٹری کی کلاس میں تمہارے ساتھ بیٹھا کرتا تھا۔''

''ہاں۔'' میں نے جھوٹ بولا۔ ''مجھے یاد آگیا۔''

''نہیں اور یہ ضروری بھی نہیں کہ تم مجھے یاد رکھو۔ تم ان دنوں کالج کے بہترین کھلاڑی ہوا کرتے تھے جبکہ میں ایک عام سا طالب علم تھا۔''

''اپنی یادداشت پر زور دوں گا تو بہت کچھ یاد آجائے گا لیکن فی الحال مجھے بینک میں ضروری میٹنگ میں جانا ہے۔ بہتر ہوگا کہ ہم کام کی بات کریں۔''

''گویا تم بھی فیملی بزنس میں ہو اور اسٹیفورڈ بینک میں کام کررہے ہو؟''

''ہاں۔'' اس لمحے مجھے کچھ بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ میں ایک سابق فٹ بال کا کھلاڑی، بینک آفیسر اور ایک بڑی ایمپائر کا وارث تھا اور لوگ میرے رتبے کے مطابق مجھ سے پیش آتے تھے لیکن شمٹ بالکل بھی متاثر نہیں ہوا۔ لگتا تھا جیسے اس نے مجھے تفریح لینے کے لیے بلایا ہے۔

''یہ سب کیا ہے؟'' میں نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔ ''آخر تمہیں مجھ سے رابطہ کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟''

''تمہارے میڈیکل ریکارڈ میں کچھ بے قاعدگی پائی گئی ہے جیکسن۔'' اس نے ایک فارم میری طرف بڑھاتے

ہوئے کہا۔ ''تم برا تو نہیں مانو گے اگر میں تمہیں جیکسن کہوں۔ بہرحال ہم کلاس فیلو رہ چکے ہیں۔''

''اس وقت تم ڈاکٹر شمٹ اور میں مسٹر اسٹیفورڈ ہوں۔'' میں نے فارم پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا لیکن اس کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''یہ ایک تحقیقاتی مطالعہ ہے جو یونیورسٹی گزشتہ چالیس سال سے کررہی ہے۔ تمام کھلاڑی زمانہ طالب علمی میں ہی خودکار طریقے سے رجسٹر کرلیے جاتے ہیں۔ تمہیں اپنا ڈی این اے ٹیسٹ یاد ہوگا جو کالج کے پہلے سال کے دوران ہی لیا گیا تھا۔''

''کیا میرے گھٹنے میں کوئی خرابی نظر آرہی ہے؟'' میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں، یہ کوئی اور معاملہ ہے۔''

''اوہ سمجھا۔'' میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''کیا کسی لڑکی نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ میں اس کے بچے کا باپ ہوں۔''

''نہیں۔ یہ ایک غیر پدری مسئلہ ہے۔ سات سے دس فیصد کیسوں میں اس طرح کی بے قاعدگی سامنے آتی ہے۔ جیسا کہ تمہارے کیس میں نظر آرہا ہے۔''

میں حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں کچھ سمجھا نہیں۔''

''میرے پاس صورتِ حال کی وضاحت کرنے کے لیے مناسب الفاظ نہیں ہیں۔ میں نے جیکسن اسٹیفورڈ سوم کا ڈی این اے ڈیٹا تین مرتبہ چیک کیا ہے اور اس کے مطابق وہ تمہارا باپ نہیں ہے۔''

''کیا تم یہ کہہ رہے ہو کہ میں ناجائز اولاد ہوں؟''

''بالکل نہیں۔ ڈی این اے ٹیسٹ سے صرف خونی رشتہ کا تعین ہوتا ہے۔ قانونی طور پر شادی کے بعد پیدا ہونے والا ہر بچہ جائز ہوتا ہے۔ جیکسن اسٹیفورڈ سوم ہر اعتبار سے تمہارا باپ ہے سوائے اس ایک وجہ کے۔''

''اوہ میرے خدا۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ یوں لگا جیسے کسی نے میرے پیٹ پر زوردار لات رسید کردی ہو، مجھے سانس لینے میں دشواری ہورہی تھی۔

''اتنے عرصہ بعد یہ انکشاف کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟'' میں نے جرح کے انداز میں پوچھا۔

''یہ ایک تعلیمی مطالعہ ہے اور اس میں فوری نتائج کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کا طریقہ کار ہی ایسا ہے، جس کی وجہ سے یہ عمل بہت سست لیکن انتہائی درست ہوتا ہے۔''

''کیا میرا باپ......'' میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ ''کیا اسٹیفورڈ سینئر کو یہ بات معلوم ہے؟''

''ہم نے اسے نہیں بتایا۔ کیونکہ ہمارے ریکارڈ تک اس کی رسائی نہیں ہوسکتی۔ ہم صرف اس شخص سے معلومات کا تبادلہ کرتے ہیں جس کا ڈی این اے ٹیسٹ لیا جاتا ہے۔ مسٹر اسٹیفورڈ سوم کے ریکارڈ میں کوئی مسئلہ نہیں۔ اس لیے ہم نے انہیں تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتایا اور نہ آئندہ ایسا ہوگا۔''

''کیا تم بتاسکتے ہو کہ میرا حقیقی باپ کون ہے؟''

''قانونی طور پر جیکسن اسٹیفورڈ سوم ہی تمہارا باپ ہے۔''

''لعنت بھیجو اس پر۔'' میں نے جھلاتے ہوئے کہا۔ ''تم جانتے ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔''

''بالکل۔'' ڈاکٹر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ ہم صرف حقیقی ڈونر سے ہی معلومات کا تبادلہ کرتے ہیں۔''

''گویا تم جانتے ہو لیکن مجھے بتانا نہیں چاہتے۔''

''قانون کے تحت مجھے اس کی اجازت نہیں مسٹر اسٹیفورڈ لیکن فارم پر تمہاری ماں کا پتا موجود ہے وہ ہوپکنز گلین نامی بحالی کے مرکز میں زیرِعلاج ہے۔''

''میں سمجھ گیا۔'' میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں خود ہی معلوم کرلوں گا۔''

''جانتا ہوں کہ تمہارے لیے یہ خبر پریشانی کا باعث ہوگی، مجھے افسوس ہے۔''

''تمہیں افسوس کرنے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''تم نے تو اس صورتِ حال سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کی کوشش کی ہے۔ اب میری بات غور سے سن لو۔ اگر کسی کو اس کی بھنک بھی پڑگئی یا اس کی وجہ سے میرے خاندان کو معمولی سی بھی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا تو تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ نہ صرف تمہارا لائسنس منسوخ ہوجائے گا بلکہ تم کبھی کسی یونیورسٹی میں کام نہیں کرسکو گے۔''

''مسٹر اسٹیفورڈ......'' اس نے کچھ کہنا چاہا۔

''پہلے مجھے اپنی بات ختم کرلینے دو۔ میں چاہوں تو ایک بٹن دبا کر تمہارا کریڈٹ ریکارڈ تباہ کرسکتا ہوں۔ پھر تم کسی بینک یا ادارہ سے کوئی قرض یا قسطوں پر خریداری نہیں کرسکو گے۔ تم اس قابل نہیں رہو گے کہ اپنی حیثیت ثابت کرسکو۔ میں تمہاری زندگی تباہ کردوں گا اگر تم نے مجھے یا میرے خاندان کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ میرا خیال ہے کہ اب ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے۔''

ڈاکٹر کا چہرہ زرد پڑ گیا اور اس کے چہرے کی

مسکراہٹ غائب ہوگئی گو کہ مجھے اس سے کچھ زیادہ تسلی نہیں ہوئی لیکن کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر تھا۔

☆☆☆

عام طور پر میں اپنی ماں سے ملنے ہفتہ کے روز جایا کرتا تھا۔ میری ماں کثرت شراب نوشی کی عادی ہوگئی۔ دو مرتبہ وہ صحت یاب ہو کر گھر آ چکی تھی لیکن جب تیسری بار یہ بیماری عود کر آئی تو اس نے بہتر یہی جانا کہ وہ میرے باپ کے ساتھ رہنے کے بجائے بحالی کے مرکز میں قیام کرے۔ یہ انتظام دونوں کے لیے مناسب تھا۔ اس طرح آئے دن کے جھگڑوں اور ناراضی کا امکان بھی نہ رہتا۔ وہ پارٹیوں اور تقریبات میں ایک ساتھ شرکت کرتے لیکن علیحدہ علیحدہ زندگی گزار رہے تھے۔

میری ماں کے لیے ایک پرائیویٹ کاٹیج مخصوص تھا جہاں زندگی کی تمام سہولتیں موجود تھیں یعنی ٹینس کورٹ، سوئمنگ پول، کلب، لائبریری وغیرہ وغیرہ۔ میری اس سے ملاقات عقبی لان میں ہوئی وہ ایزل پر بیٹھی کوئی تصویر بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے ابھی تک اپنے آپ کو سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں اپنی ماں سے ملتا ہوں۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔

جب میں نے پشت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی لیکن میرے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ وہ پریشان ہوتے ہوئے بولی۔

''جیکسن، کیا بات ہے، خیریت تو ہے، کہیں تمہارا باپ......؟''

''وہ بالکل ٹھیک ہیں۔'' میں اس کے برابر والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''لیکن مجھے جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ کافی سنجیدہ نوعیت کا ہے۔''

یہ کہہ کر میں نے اسے ساری بات بتا دی۔ اس امید پر کہ شاید یہ سب کچھ غلط ہو لیکن اس کے چہرے پر پھیلتی زردی نے میرا رہا سہا شبہ بھی دور کر دیا۔

''گویا یہ سچ ہے؟'' میں اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

''مجھے افسوس ہے جیکسن۔ مجھے یہ سب کچھ تمہیں پہلے بتا دینا چاہیے تھا۔''

''تم کیا سمجھتی ہو؟'' میں نے تلملاتے ہوئے کہا۔ ''میں چوبیس سال کا ہو چکا ہوں، تم کس مناسب وقت کا انتظار کر رہی تھیں۔ کیا اسٹیفورڈ کو اس کا علم ہے؟''

''میں اس بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتی۔ ہمارے درمیان بہت کم بات ہوتی ہے، اس لیے میرے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ کیا جانتا ہے اور کیا نہیں۔''

''تم جانتی ہو کہ میرا حقیقی باپ کون ہے؟''

''ہاں لیکن اس سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا بلکہ معاملات مزید پیچیدہ ہو جائیں گے۔''

''ماں، اس وقت جو کچھ مجھ پر گزر رہی ہے اس سے زیادہ برے حالات نہیں ہو سکتے۔''

لیکن میں غلطی پر تھا جب ماں نے مجھے حقیقی باپ کے بارے میں بتایا تو اس کے بعد معاملات واقعی پیچیدہ ہوتے چلے گئے۔

☆☆☆

بینک واپس آنے کے بعد میں نے اپنی سیکریٹری سے کہہ دیا کہ وہ مجھے کوئی فون کال ٹرانسفر نہ کرے مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت درکار تھا لیکن اس کی نوبت ہی نہ آسکی۔ ابھی میں نے کوٹ اتارا ہی تھا کہ اسٹیفورڈ سوم کمرے میں داخل ہوا۔

''بورڈ میٹنگ دوپہر میں تھی، تم کہاں چلے گئے تھے؟''

''ایک ضروری کام پڑ گیا تھا۔'' میں نے اپنے آپ کو کرسی پر گراتے ہوئے کہا۔ ''بیٹھ جاؤ ڈیڈ۔ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔''

''میرے پاس وقت نہیں ہے۔ مجھے میٹنگ میں جانا ہے۔''

''تھوڑا سا وقت نکالنا ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''یہ بہت اہم مسئلہ ہے۔'' پھر میں نے اسے وہ سب کچھ بتا دیا جو میں ڈاکٹر سے سن کر آیا تھا۔ وہ حیران ہونے کے بجائے ناراض نظر آ رہا تھا۔

''کیا تم پہلے سے یہ بات جانتے تھے؟'' میں نے پوچھا۔ ''تمہیں یہ کب معلوم ہوا؟''

''میں ایک بینکر ہوں جیکسن۔'' وہ تلخی سے بولا۔ ''یہ حساب کتاب بہت آسان ہے۔ میں حیران ہوں کہ تمہیں اب تک اس کا اندازہ کیوں نہیں ہوا۔ یہ بات تو مجھے اسی وقت معلوم ہوگئی تھی جب میں نے تمہیں پہلی بار اپنے باپ اور دادا کی تصویروں کے ساتھ کھڑے ہوئے دیکھا۔ مجھے اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا کہ تمہارا خون ہمارے خاندان سے نہیں ملتا۔''

میں حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس کے لہجے میں واضح تبدیلی نظر آ رہی تھی۔

''تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تم سے لاتعلقی اختیار نہیں کروں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ اس طرح میرے خاندان کی نیک نامی متاثر ہو۔ تم اپنی موجودہ حیثیت میں کام کرتے رہو گے، جب تک کہ تمہیں اپنا مقام یاد رہے لیکن یہ مت بھولنا کہ تم میرے ملازم ہو کیونکہ تمہارے جسم میں ہمارے خاندان کا خون نہیں ہے اس لیے وقت آنے پر میرا بھتیجا بورڈ میں تمہاری جگہ لے لے گا۔ تمہاری حقیقت ہمارے درمیان راز رہے گی۔ ہم دونوں کو اس سلسلے میں محتاط رہنا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ تم میری بات سمجھ گئے ہو گے۔''

میں اتنا بدحواس ہو گیا تھا کہ کوئی جواب نہ دے سکا۔

''میں تمہارے جواب کا منتظر ہوں۔''

''جی جناب۔'' میں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ ''ہاں ڈیڈی!'' لیکن جیکسن اسٹیفورڈ سینئر میرا باپ نہیں تھا اور یہ بات اسے بہت پہلے سے معلوم تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اب کیا ہوگا لیکن اس کے جذبات بالکل واضح تھے۔ اس کی نظر میں میری کوئی اہمیت نہیں تھی۔

☆☆☆

ڈیڈی کے جانے کے بعد میں نے اپنی سیکریٹری سے کہا کہ وہ میری دوپہر کی تمام مصروفیات منسوخ کر دے۔ اس کے بعد میں اپنی کرسی پر نیم دراز ہو کر اس نئے حادثے کے بارے میں سوچنے لگا۔ ایک طرح سے یہ انکشاف میرے لیے سکون کا باعث بنا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں اور اسٹیفورڈ سینئر کبھی قریب نہیں رہے، وہ انتہائی خود پسند اور مغرور شخص تھا اور ہمیشہ معاشرے میں اپنی خاندانی برتری کے بارے میں لیکچر دیتا رہتا۔ مثلاً یہ کہ عام لوگوں کو دوست نہ بناؤ۔ وہ ہمیشہ تمہیں استعمال کرنے کی کوشش کریں گے۔ صرف امیر لوگوں سے دوستی کرو جن سے فائدہ ملنے کی امید ہو، وغیرہ وغیرہ۔

اس کی نظر میں صرف خونی رشتوں یا کاروباری دوستوں کی اہمیت تھی۔ دوسرے لوگوں کو وہ بالکل بھی منہ نہ لگاتا تھا۔ میں نے بھی بچپن میں اس جیسا بننے کی کوشش کی لیکن میں فطری طور پر ایسا نہیں تھا۔ میں لوگوں میں جلدی گھل مل جاتا تھا اور اسٹیفورڈ سینئر کے معیار کے مطابق میرے بیشتر دوست نیچ ذات سے تعلق رکھتے تھے۔ میں نے کبھی ان کے بارے میں جانچنے کی کوشش نہیں کی۔ ہم صرف گھوم پھر کر لطف اندوز ہوتے تھے۔ شاید میں بہت بے وقوف تھا لیکن میرے لیے سب سے زیادہ افسوس ناک بات یہ تھی کہ وہ عموماً مجھ سے ناراض رہا کرتا تھا۔ میں نے کبھی اس کے دل میں اپنے لیے محبت محسوس نہیں کی بلکہ وہ مجھے حقیر جانتا تھا صرف اس لیے کہ میں اس کی نسل سے نہیں تھا۔ جیسے جیسے میں اپنی گزشتہ زندگی پر نظر ڈالتا گیا تو مجھے اس کے واضح اشارے ملتے گئے۔

مجھے آٹھ سال کی عمر میں بورڈنگ اسکول بھیج دیا گیا۔ شاید اس لیے کہ میں اپنے نچلی ذات کے دوستوں سے دور رہوں۔ مما مجھ سے ہر ہفتے ملنے آتیں جبکہ میرا باپ شاذ و نادر ہی وہاں آتا۔ تب بھی اس کا لیکچر جاری رہتا۔ مثلاً یہ کہ مجھے اپنی خاندانی روایات کے مطابق زندگی گزارنی ہے۔ اپنے آپ کو مستقبل کی ذمے داریوں کے لیے تیار کرنا ہے تاکہ میرے دادا اور خاندان کا نام روشن ہو سکے وغیرہ وغیرہ۔

میں درحقیقت اسٹیفورڈ خاندان کا فرد نہیں تھا اور وہ یہ بات جانتا تھا اور ظاہر ہے کہ اس خاندانی کاروبار میں میرا کوئی مستقبل نہیں تھا۔ میں کون ہوں اور میری حیثیت کیا ہے۔ اس وقت میرے سامنے سب سے اہم سوال یہی تھا۔

میری عمر چوبیس سال ہو چکی تھی اور میں بینک کے قرض دینے والے شعبے میں آفیسر کے طور پر کام کر رہا تھا میں بڑے ٹھاٹ سے رہتا تھا۔ عمدہ لباس، نئی کار اور ایک شاندار اپارٹمنٹ لیکن میری کار قسطوں پر لی گئی تھی، اپارٹمنٹ بینک کے نام لیز تھا جبکہ کپڑے اور دیگر ضروریات فیملی اکاؤنٹ سے پوری ہوتی تھیں یعنی میرا کچھ بھی نہیں تھا اور مجھے وہی مراعات مل رہی تھیں جو کسی بینک ملازم کو حاصل ہوتی ہیں۔ ذاتی اکاؤنٹ کے سوا میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ کار، اپارٹمنٹ بلکہ کپڑے تک بینک کی ملکیت تھے اور یہ سب چیزیں کسی بھی وقت واپس لی جا سکتی تھیں۔

اسٹیفورڈ نے مجھے دھمکی دی تھی اور بینک میں چار سال گزارنے کے بعد میں جانتا تھا کہ وہ کتنا کینہ پرور ہے اور کس حد تک جا سکتا ہے۔ اس کے پاس وکیلوں کی فوج تھی اور ایک مالیاتی ادارہ کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے وہ لامحدود اختیارات رکھتا تھا۔ ان چار سالوں میں، میں اچھی طرح جان گیا تھا کہ وہ اپنے منافع کی خاطر لوگوں کی زندگی تباہ کر دیتا ہے۔ مجھے اس میں کوئی مسئلہ نہیں تھا کہ وہ میری ماں سے بدلہ لینے کے لیے میری زندگی تباہ کر سکتا ہے۔

ماں نے بتایا تھا کہ میرا حقیقی باپ ایک کار ڈیلر سین مولی تھا۔ میں اس سے ملنا چاہ رہا تھا لیکن اس سے پہلے مجھے ایک اور فون کرنا تھا جو شاید میرے لیے کئی گنا مشکل کام تھا۔

☆☆☆

بنگھم اسکول کا ہال بچوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں ان

کے درمیان سے گزرتا ہوا استقبالیہ تک گیا اور وہاں سے معلومات حاصل کرنے کے بعد اسٹاف روم کی طرف بڑھا۔ جیسے ہی میں نے دروازہ کھولا۔ گھنٹی بجنے کی آواز آئی اور کئی استانیاں اٹھ کر اپنی اپنی کلاس کی طرف روانہ ہوگئیں۔ جینا مولی ایک بڑی میز کے آخری سرے پر تنہا بیٹھی کچھ لکھ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میرا سانس اٹکنے لگا۔ میں نے اس کے بارے میں دوسرے انداز سے سوچنے کی کوشش کی۔ اب وہ میری سوتیلی بہن تھی لیکن میں ان یادوں کو کیسے بھلا سکتا تھا جو میرے ماضی سے جڑی ہوئی تھیں۔ میرے ذہن میں کئی تصویریں ابھر رہی تھیں۔ قہقہے لگاتی جینا، میرے بازوؤں میں سمٹی ہوئی جینا...... اوہ میرے خدا۔

وہ مجھے پہلے کے مقابلے میں کچھ کمزور اور تھکی ہوئی نظر آئی۔ اس نے اپنی کاپی بند کرتے ہوئے مجھے دیکھا اور ایک لمحہ کے لیے اس کی آنکھیں میرے چہرے پر جم گئیں پھر اس نے کاپی دوبارہ کھولی اور اس میں کچھ لکھنے لگی۔

”تم بہت کاہل ہو اسٹیفورڈ۔“ وہ بولی۔ ”چار سال بعد تمہیں میرا خیال آیا۔“

”تم تو مجھے اس وقت چھوڑ کر چلی گئی تھیں جب میں اسپتال میں تھا۔“ میں نے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”یہ سچ نہیں ہے۔ میں نے تم سے اس وقت ملنے کی کوشش کی۔ جب تمہیں جان ہاپکنس میں منتقل کیا جارہا تھا لیکن انہوں نے مجھے اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں دی کیونکہ صرف خاندان کے افراد ہی تم سے مل سکتے تھے۔ دوسرے دن تمہارے باپ نے مجھ سے اسکول میں ملاقات کی اور کہا کہ اگر میں تم سے ملنا چھوڑ دوں تو وہ مجھے دس ہزار ڈالرز دیں گے۔“

”اور تم نے وہ پیسے لے لیے؟“

”نہیں۔ میں نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد میں مسلسل تمہیں فون کرنے کی کوشش کرتی رہی لیکن رابطہ نہ ہوسکا۔ تم نے تو کبھی مجھے فون نہیں کیا۔ ایک مرتبہ بھی نہیں۔“

”اس وقت میں اپنے مسائل سے دوچار تھا۔ تمہیں معلوم ہے کہ میرے گھٹنے کے چار آپریشن ہوئے۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ شاید زندگی بھر کے لیے لنگڑا ہوگیا ہوں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تمہیں کچھ معلوم نہیں۔ چند ہفتوں بعد ایک لحیم شحیم شخص میرے گھر آیا۔ اس نے اپنا نام بیٹس بیلے بتایا تھا۔“

”بیٹ مین۔“ میں نے تصحیح کی۔ ”وہ جیل کا محافظ رہ چکا ہے اور اب بینک اور میرے باپ کے لیے خاص کام انجام دیتا ہے۔“

”جیسے تمہاری گرل فرینڈز کو دھمکانا۔“ اس نے طنز آمیز انداز میں کہا۔

”زیادہ تر وہ ان لوگوں سے قرض کی وصولی کرتا ہے جو ادائیگی میں ٹال مٹول سے کام لیتے ہیں۔“

”یقیناً وہ اس کام میں ماہر ہوگا۔ اس نے مجھے دھمکی دی کہ شرافت سے وہ رقم وصول کرلوں ورنہ وہ میری ٹانگیں توڑ دے گا۔ تم نے مجھ سے کئی ہفتوں تک رابطہ نہیں کیا تھا۔ لہٰذا میں نے وہ پیسے لے لیے اور اپنی زندگی میں واپس آگئی۔“

”تم نے اپنا وقت ضائع نہیں کیا۔“ میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”چند ماہ بعد میں نے تمہیں کیمپس میں دیکھا تو تم حاملہ ہوچکی تھیں۔“

”یہ میری زندگی میں پیش آنے والا حسین ترین واقعہ تھا۔“ یہ کہہ کر اس نے کاپی میری طرف بڑھا دی۔ اس میں ایک تین سالہ خوب صورت بچے کی تصویر رکھی ہوئی تھی۔

”بہت خوب صورت بچہ ہے۔“ میں نے [illegible] انداز میں کہا۔

”اس کے باپ کا نام ٹائی شون ڈگ ہے۔ وہ باسکٹ بال کا کھلاڑی ہے۔“

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اس سے ملتی رہتی تھیں۔“

”یہ بعد کی بات ہے۔ جب تم نے مجھے چھوڑ دیا تو میں اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے پارٹیوں میں جانے لگی تاکہ تمہیں بھلا سکوں۔ پھر میری ملاقات ٹائی شون سے ہوئی۔ گوکہ میں نے اس کے ساتھ مختصر وقت گزارا لیکن اس کا پھل اس بچے کی صورت میں مل گیا۔“

”مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی۔“

”اب تم کیا چاہتے ہو۔ یہاں کس لیے آئے ہو؟“

”مجھے اپنے بارے میں کچھ نئی باتیں معلوم ہوئی ہیں جو تم سے شیئر کرنے آیا ہوں۔“ پھر میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ یہ سن کر اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں لیکن اس کے علاوہ اس نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔

”تمہارے والد یہ بات پہلے سے جانتے تھے؟“ اس نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں! انہیں یہ بات ہمیشہ سے معلوم تھی اور اسی لیے وہ مجھ سے نفرت کرتے تھے۔“

”مجھے یہ سن کر افسوس ہوا لیکن اب مجھے احساس ہو

رہا ہے کہ وہ کیوں ہم دونوں کو الگ کرنے پر تلے ہوئے تھے شاید وہ ایسا کرنے میں حق بجانب تھے لیکن......“

”لیکن کیا؟“

اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”اس بات کو چار سال ہوگئے ہیں۔ میں اپنے اور بچے کے لیے زندگی گزار رہی ہوں۔ اس کے باوجود میں تمہیں کبھی نہیں بھول پائی اور نہ ہی اس تعلق کو جو کبھی ہمارے درمیان تھا مجھے ہمیشہ یہی محسوس ہوا کہ اب بھی ہم دونوں کے بیچ کوئی رابطہ ہے۔“

”ہاں، ہمارے درمیان خون کا رشتہ ہے۔“

”میں وہ بات نہیں کر رہی۔ میرا اشارہ اس مضبوط تعلق کی جانب ہے جو کبھی ہمارے درمیان تھا۔ تم میری محبت تھے جسے میں نے گنوا دیا۔ مجھے ڈر تھا کہ کبھی خوش نہ رہ سکوں گی لیکن اب مجھے دوبارہ سوچنا پڑے گا۔ کیا میں تم سے ایک بات پوچھ سکتی ہوں؟“

”کیوں نہیں؟“

”تم نے مجھے اپنی زندگی سے کیوں نکال دیا۔ مجھ سے دوبارہ رابطہ کیوں نہیں کیا؟“

”میرا خیال تھا کہ تم مجھے اس لیے چھوڑ کر چلی گئیں کہ اب میں فٹ بال کا کھلاڑی نہیں رہا تھا پھر جب میں صحت یاب ہوکر اسکول آیا تو میں نے تمہیں حاملہ کے روپ میں دیکھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ تم نے کسی اور کو چن لیا ہے لہٰذا میں بھی مایوس ہوگیا۔“

”اب تم یہاں کیوں آئے ہو؟ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

”کچھ نہیں۔ میں نے سوچا کہ تمہیں بھی یہ بات معلوم ہونی چاہیے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس دنیا میں تمہارے سوا کوئی اور نہیں جس سے میں یہ بات کرسکوں۔ وہ صرف تم ہو جینا۔ صرف تم۔“

”اب تم کیا کرو گے؟“

”میں اپنے باپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ حقیقی باپ سے۔“

”معاف کرنا میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتی کیونکہ میں نے اسے دو سال سے نہیں دیکھا ہے۔ ہمارے تعلقات کبھی خوشگوار نہیں رہے۔ اس لیے میں ان دنوں بھی کیمپس میں رہ رہی تھی جب تم سے میری ملاقات ہوئی تھی اور بچے کی پیدائش کے بعد میں نے اس سے مکمل طور پر قطع تعلق کرلیا۔“

”مجھے افسوس ہے جینا۔“

”تمہیں افسوس کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے زندگی میں جو غلطیاں کی ہیں۔ ان پر مجھے کوئی پچھتاوا نہیں لیکن تم سے ملنا یا بچے کی پیدائش کو ان غلطیوں میں شمار نہیں کرتی۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہیں یہاں تک آنے کی زحمت گوارا کرنا پڑی۔ اگر کبھی مجھ سے بات کرنا چاہو تو میرا نمبر ڈائریکٹری سے مل جائے گا۔“

”موجودہ حالات میں شاید یہ مناسب نہ ہوگا۔“ میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

”شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ اس نے پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔ ”اپنا خیال رکھنا۔“

میں دروازے کے قریب پہنچ کر رک گیا اور بولا۔ ”کیا تم اپنے باپ کو کوئی پیغام دینا چاہو گی؟“

اس کی آنکھوں میں سرد مہری کی جھلک ابھری اور وہ بولی۔ ”نہیں، کچھ نہیں۔“

☆☆☆

سین مولی کا شوروم کافی بڑا تھا۔ اس کے پاس کیڈی

نقل برائے عقل

مولوی صاحب نے اپنی تقریر میں کہا۔ ”میری زندگی کے سب سے سہانے شب و روز جس عورت کے ساتھ گزرے وہ عورت میری بیوی نہیں تھی۔“

حاضرین کو سانپ سونگھ گیا ”مولوی صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟“

تھوڑے توقف کے بعد مولوی صاحب نے کہا۔ ”جی وہ عورت کوئی اور نہیں میری ماں تھی، ایک صاحب کو یہ بات بہت اچھی لگی، اس نے سوچا کیوں نہ گھر جا کے اس کا تجربہ کرے، سیدھا کچن میں گیا جہاں اس کی بیوی انڈے فرائی کر رہی تھی، اس نے کہا میری زندگی کے شب و روز جس عورت کے ساتھ گزرے وہ عورت کم از کم تم نہیں تھیں۔ 4 دن کے بعد جب ان صاحب کے منہ سے پٹیاں اتاری گئیں اور تیل کی جلن کچھ کم ہوئی تو بولے۔

کاپی پیسٹ ہمیشہ بھی سودمند نہیں ہوتا۔

مرسلہ: رضوان تنولی کریزوی،
اورنگی ٹاؤن، کراچی

لک، شیورلیٹ اور جنرل موٹرز کے ٹرکوں کے ڈیلر شپ تھی۔ میں نے اس تک پہنچنے کے لیے شوروم میں کھڑی کاریں دیکھنا شروع کر دیں اور ایک کیڈی کنورٹیبل میری توجہ کا مرکز بن گئی۔ موبی اس وقت کسی سیلز مین سے الجھ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میرے پاس آیا اور بولا۔

''تمہیں کیا چاہیے؟''

''میں یہ کار دیکھ رہا تھا۔''

''نہیں، یہ محض ایک بہانہ ہے کیونکہ تمہاری جیگوار اس کے مقابلے میں تین گنا قیمتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم کون ہو۔ لیکن میں تمہارے باپ کے ساتھ اور وہ میرے ساتھ کوئی کاروبار نہیں کرتا۔ ان دنوں تم کیا کر رہے ہو؟''

جب میں نے اسے اپنے کام کی نوعیت بتائی تو وہ نرم پڑ گیا اور بولا۔ ''بہتر ہوگا کہ ہم دفتر میں بیٹھ کر بات کریں۔''

موبی کا دفتر شیشے کے کیبن میں تھا جہاں سے پورے شوروم میں نظر رکھی جا سکتی تھی۔ اس کی میز پر بھی وہی فٹ بال کی ٹرافی رکھی ہوئی تھی جو شیٹی گن اسٹیٹ کے ہر کھلاڑی کو ٹیم میں شامل ہونے پر ملتی تھی۔

میں نے وہ ٹرافی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''تم فٹ بال کھیلتے تھے؟''

اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ برسوں پرانی بات ہے۔'' میرا حقیقی باپ کافی کیم شیم تھا۔ اس کا وزن مجھ سے کم از کم سو پاؤنڈ زیادہ ہوگا۔ اس نے قیمتی سلک کا سوٹ پہن رکھا تھا اور چہرے پر کاروباری مسکراہٹ تھی۔ میرا خیال تھا کہ مجھے دیکھ کر اس کے اندر پہچان کا جذبہ ابھرے گا لیکن فی الحال ہمارے درمیان صرف فٹ بال ہی قدر مشترک تھی۔

''میں نہیں کہہ سکتا کہ تمہارے اندر میری کتنی شباہت ہے لیکن تم اپنی ماں سے بہت ملتے ہو۔ کیا وہ اب بھی اتنی ہی خوب صورت ہے؟''

''میں ایسا ہی سمجھتا ہوں لیکن اس نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ کس طرح تم دونوں......''

''رہنے دو۔ ایسا ہو جاتا ہے۔ اس وقت وہ کم عمر تھی اور میں فٹ بال کا کھلاڑی تھا۔ تم تو جانتے ہو کہ یہ لوگ ہمیشہ عورتوں میں گھرے رہتے ہیں۔''

''کیا تمہیں معلوم تھا کہ وہ بچے کی ماں بننے والی ہے؟''

''شاید اس نے مجھے بتانے کی کوشش کی تھی۔ ایک روز اس نے کیفے ٹیریا میں مجھ سے پوچھا کہ کیا میں اس کے بارے میں سنجیدہ ہوں۔ میں نے اسے ٹال دیا۔ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور وہ بولا۔ ''تمہارا باپ میرا مطلب ہے کہ جیکسن اسٹیفورڈ سینئر اس بارے میں جانتا ہے؟''

''ظاہر تو یہی لگتا ہے کہ اسے پہلے سے یہ بات معلوم ہے لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''اس سے کئی باتوں کی وضاحت ہو جاتی ہے۔'' موبی کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''اس شخص نے جہاں جہاں موقع ملا۔ مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ اس نے چیمبر آف کامرس اور کنٹری کلب میں میری مخالفت کی۔ سب سے کم بولی دینے کے باوجود اس کے بینک نے میری پیشکش نامنظور کر دی۔ اس کی وجہ سے میری ڈیلر شپ بھی آدھی رہ گئی۔ اب مجھے اس کی وجہ معلوم ہوئی ہے۔ یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔ وہ اسی لیے مجھ سے نفرت کرتا ہے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔''

''اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔ کیا میں تمہیں واپس لینے کے لیے وکیل سے رابطہ کروں؟''

''نہیں جناب۔ مجھے توقع تھی کہ شاید ہم......''

''اس کا کوئی امکان نہیں۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''تمہارا باپ پہلے ہی مجھ سے نفرت کرتا ہے اور اس کا شہر میں کافی اثر رسوخ ہے۔ اس کے علاوہ تمہارے آنے سے میری ازدواجی زندگی بھی تباہ ہو جائے گی۔ جانتے ہو میری بیوی کا وزن مجھ سے دگنا ہے۔ میرے بیٹے صرف اس وقت نظر آتے ہیں جب انہیں پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ میری بیٹی کسی کالے کے عشق میں مبتلا ہو گئی ہے اور میں اس سے بات نہیں کرتا۔ میری گھریلو زندگی میں ویسے ہی بہت تلخیاں ہیں۔ اس لیے مجھے معاف ہی رکھو۔''

''میرا بھی کچھ یہی حال ہے مسٹر موبی۔'' میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''مجھ سے ملنے کا شکریہ۔''

میں اس سے ہاتھ ملا کر رخصت ہونے لگا تو وہ بولا۔ ''ایک منٹ رکو۔ تم نے بتایا تھا کہ بینک میں قرض دینے کے شعبہ میں کام کرتے ہو۔''

''ہاں لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''میں تم سے خلاف قاعدہ کوئی بات نہیں کرنا چاہتا لیکن اگر تم کچھ پیسے بنانا چاہتے ہو تو ہم اس سلسلے میں بات کر سکتے ہیں۔''

''نہیں۔'' میں نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا۔ ''تم دونوں کے درمیان میری وجہ سے پہلے ہی مسائل ہیں اور میں مزید کسی مشکل میں پڑنا نہیں چاہتا۔ ایک دفعہ معاملات ٹھیک ہو جائیں پھر ہم اس موضوع پر بات کر سکیں گے تاکہ ہمیں کام کرنے میں آسانی رہے۔''

بینک واپس آتے ہوئے میں نے نیلے رنگ کی کراؤن وکٹوریہ کو اپنا تعاقب کرتے دیکھا۔ میں اس کار کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ میں نے ہی یہ کار بینک کے لیے لیز پر حاصل کی تھی اور جو میرے باپ کے خاص آدمی ون بیٹ مین کے استعمال میں تھی۔ گویا وہ میرا تعاقب کر رہا تھا اور اسے اپنے دیکھے جانے کا بھی کوئی ڈر نہیں تھا۔

☆☆☆

آیندہ چند روز میں اسٹیفورڈ سینئر کے ساتھ میرے تعلقات سرد سے سرد تر ہوتے چلے گئے۔ وہ ناراضی جو اس کے دل میں برسوں سے موجود تھی، اب لاوے کی شکل اختیار کر چکی تھی اور اس نے کبھی بھی اسے چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ میری کوشش تھی کہ اس سے کم سے کم سامنا ہو تاکہ معاملات مزید خراب نہ ہوں لیکن ایک ہفتہ بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ صورتِ حال میرے کنٹرول سے باہر ہو گئی۔

ہفتے کے روز میں معمول کے مطابق ماں سے ملنے گیا تو وہ اپنے کاٹیج میں اکیلی بیٹھی تھی اور اس کی آنکھیں رو رو کر سرخ ہو گئی تھیں۔ میں نے ماں کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

وہ مجھے کسی اور جگہ منتقل کر رہے ہیں۔ یہ بات مجھے آج صبح ہی بتائی گئی ہے۔ تمہارے باپ نے تمام انتظامات کر دیے ہیں اور ساری تیاری مکمل ہے۔''

''لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتے......؟''

''انہوں نے مجھے یہاں رہنے کے لیے نااہل قرار دے دیا ہے۔ بینک کے وکیل نے کاغذات تیار کر لیے ہیں اور ڈاکٹروں نے ان پر دستخط بھی کر دیے ہیں۔ اب ہم کچھ نہیں کر سکتے۔''

''ہم اس معاملے کو دیکھتے ہیں۔'' میں نے کہا لیکن جب میں نے اپنی ماں کی دیکھ بھال کے اخراجات خود ادا کرنے کی پیشکش کی تو میرا چیک مسترد ہو گیا۔ میرے تمام اکاؤنٹس منجمد کر دیے گئے تھے۔

☆☆☆

اسٹیفورڈ سینئر اپنے کمرے میں موجود تھا جب میں آندھی اور طوفان کی مانند وہاں داخل ہوا لیکن وہ اکیلا نہیں تھا بلکہ اس کی حفاظت کے لیے ون بیٹ مین بھی ایک کونے میں کھڑا ہوا تھا۔

''ڈیڈ۔ مجھے کچھ ذاتی نوعیت کی باتیں کرنا ہیں۔'' میں نے بیٹ مین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بیٹ مین کو تمام خاندانی راز معلوم ہیں۔ وہ تمہارے خون اور حسب نسب کے بارے میں بھی جانتا ہے اگر تم اکاؤنٹس کے سلسلے میں......''

''میں اپنی ماں کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اس کا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں جو میرے اور تمہارے درمیان چل رہے ہیں۔''

''تم غلطی پر ہو۔'' وہ سرد لہجے میں بولا۔ ''اس کا فریب ہی اس سارے مسئلے کی جڑ ہے۔''

''میں وہی کروں گا جو تم کہو گے۔'' میں نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اسے ڈسٹرب مت کرو۔''

''بے شک تم وہی کرو گے جو میں کہوں گا لیکن تم دل سے اس کے لیے آمادہ نظر نہیں آتے۔ بیٹ مین نے مجھے بتایا ہے کہ تم موبی سے ملنے گئے تھے۔''

''تم میری جاسوسی کر رہے ہو۔''

''جانتا تھا کہ تم اس نیک نامی کا تحفظ نہیں کر سکو گے جو میں نے تمہیں بخشی ہے میرا اندازہ درست نکلا۔''

''میں صرف یہ چاہ رہا تھا کہ......''

''خاموش ہو جاؤ۔ میں نے تمہاری وجہ سے بہت بے عزتی برداشت کر لی۔ اب مزید نہیں کر سکتا۔ میں کئی سالوں سے موبی کو اس کی زبان بند رکھنے کے لیے پیسے دے رہا ہوں۔ لیکن اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ایک ہی دفعہ میں سارا حساب بے باق کر دوں۔''

''ہم خاموشی سے چلے جائیں گے۔ کوئی ہنگامہ نہیں کریں گے۔'' میں نے کہا۔

''اپنے آپ کو اتنا ذلیل مت کرو۔ تم اس وقت جاؤ گے جب میں کہوں گا تاکہ مجھے اور بینک کو کم سے کم شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے۔ اپنے کام پر واپس جاؤ اور اگر تم واقعی اپنی ماں کے بارے میں فکرمند ہو تو اپنا یہ آرش چہرہ لے کر میرے سامنے کبھی نہ آنا۔''

میں اپنے دفتر میں واپس آ کر کام کرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن میری توجہ اس پر مرکوز نہ ہو سکی۔

میں نے اپنی جیکٹ اٹھائی اور پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھ گیا۔ بیٹ مین میرا تعاقب کر رہا تھا۔ میں نے جیگوار چلاتے ہوئے کئی بار مڑ کر میں جھانکا۔ وہ میرا پیچھا کر رہا تھا لیکن میری جیگوار سے اس کی کراؤن وکٹوریہ کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ میں اس سے کئی بلاک کے فاصلے پر نکل آیا تو گاڑی ایک سپر مارکیٹ کی پارکنگ لاٹ میں کھڑی کر دی اور سیل فون نکال کر موبی کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

''مسٹر موبی! تم نے پیسے کمانے کا جو آئیڈیا دیا تھا،

میں اس پر مزید بات کرنا چاہتا ہوں۔ کیا ہم آج رات مل سکتے ہیں؟''

☆☆☆

''اس میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔'' مولی نے نیچی آواز میں کہا۔ ہم اس وقت ڈیئر بورن کے علاقے میں سڑک کے کنارے بنے ہوئے ایک بار کے کونے والے بوتھ میں بیٹھے ہوئے تھے۔

''میں نے چند بار چھوٹے چھوٹے قرضے لیے ہیں لیکن اگر اندر کوئی اپنا آدمی بیٹھا ہو تو سارا کھیل تبدیل ہوسکتا ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''میں اپنی ڈیلر شپ کی جانب سے نئی کیڈی لک کاروں کی خریداروں کے لیے قرضہ کی درخواست دوں گا۔ میرے پاس گولڈن کریڈٹ کارڈ ہے لہٰذا تم میرا ایس منظر چیک کیے بغیر اس درخواست کو منظور کرسکتے ہو۔ بینک مجھے ادائیگی کردے گا اور جب تک تمہارا نام وہاں موجود ہے۔ کوئی مجھ سے اس قرض کے بارے میں سوال نہیں کرے گا۔''

''اگر قرضہ لینے والا ادائیگی نہ کرسکے تو کیا ہوگا؟''

''انشورنس والے بینک کو ادائیگی کردیں گے۔ میں کاریں خرید کر سمندر پار انہیں دگنے داموں فروخت کردوں گا اس طرح ہم دونوں طرف سے منافع کمائیں گے۔ تم زیادہ سے زیادہ کتنی درخواستیں نمٹا سکتے ہو؟''

''میں ہفتے میں تقریباً ساٹھ درخواستیں کلیئر کرتا ہوں۔ یوں سمجھ لو کہ دن میں دو یا تین لیکن اگر پہلی ادائیگی وقت پر نہ ہوئی تو سرخ نشان لگ جائے گا۔''

''اس میں کم از کم ایک مہینا یا چھ ہفتے لگ سکتے ہیں۔ اس دوران ہم کم از کم دس لاکھ ڈالرز کمالیں گے۔ تم پر زیادہ سے زیادہ بے پروائی سے کاغذات تیار کرنے کا الزام آئے گا۔''

''اسٹیفورڈ سینئر اس پر ایک سیکنڈ کے لیے بھی یقین نہیں کرے گا۔''

''وہ کر بھی کیا سکتا ہے۔ تمہارے اوپر الزامات لگا کر وہ کبھی اپنے خاندان اور بینک کی ساکھ کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔ وہ کبھی ایسا راستہ اختیار نہیں کرسکتا۔''

''اس کے پاس دوسرے طریقے بھی ہیں۔ اس کا سیکیورٹی چیف ایسے معاملات کو خود دیکھتا ہے جو لوگ میرے باپ کو دھوکا دیتے ہیں وہ یا تو کھڑکی سے گر کر ہلاک ہوجاتے ہیں یا کسی کار کے نیچے آکر کچلے جاتے ہیں۔''

''مجھے بیٹ مین سے کوئی خطرہ نہیں۔'' مولی نتھنے پھلاتے ہوئے بولا۔

''لیکن مجھے تو ہے۔''

☆☆☆

''میرے باپ کے ساتھ شامل ہو کر تم ایک بڑی غلطی کروگے۔'' جینا نے آہستہ سے کہا۔ ہم اس وقت اس کے چھوٹے سے اپارٹمنٹ کے لیونگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔

''مجھے پیسوں کی ضرورت ہے جینا۔ مجھے اپنے بارے میں بھی کچھ سوچنا ہے۔ اسٹیفورڈ سینئر نے تو مجھے چینک میں قید کر رکھا ہے۔ میرے پاس اپنا کچھ بھی نہیں ہے۔ مولی کے منصوبے پر عمل کرکے میری خواہش پوری ہوسکتی ہے۔''

''اس کا خیال ہے کہ اسٹیفورڈ خاندان کو بدنامی سے بچانے کے لیے تمہیں چھوڑ دے گا۔ فرض کرو وہ اس کی بھی پروا نہ کرے اور تمہیں جیل بھجوا دے یا بیٹ مین کو تمہارے پیچھے لگادے۔''

''مجھے یقین نہیں کہ وہ ایسا کرے گا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ تم اس پر یقین کرنا نہیں چاہتے۔''

اس کا کہنا صحیح تھا۔ میں واقعی اس پر یقین کرنا نہیں چاہ رہا تھا۔ حالانکہ سچ تو یہ تھا کہ اگر اسٹیفورڈ طیش میں آتا تو میں ہی اس کے غضب کا نشانہ بنتا۔ مولی کا نام کہیں بھی نہ آتا۔

''لعنت بھیجو۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''ممکن ہے کہ وہ بچے خوش قسمت ہوتے ہوں جن کا کوئی باپ نہ ہو۔ میرے دو دو باپ ہیں اور میں ان میں سے کسی پر بھروسا نہیں کرسکتا۔''

''اب تم کیا کروگے؟'' جینا نے پوچھا۔

''میں یہی کرسکتا ہوں کہ کھیل شروع کردوں اور خطرہ محسوس کرتے ہی بھاگ جاؤں۔''

''یاد ہے گزشتہ بار وہ تمہیں اسٹریچر پر لے کر گئے تھے۔''

''اب ایسا نہیں ہوگا۔'' میں نے پورے اعتماد سے کہا۔

☆☆☆

چند دنوں بعد ہی میری میز پر فرضی قرضہ کی درخواستیں آگئیں۔ میں نے دفتر کا دروازہ بند کیا اور دیر تک ان کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر میں نے ان سب کی منظوری دے دی۔ البتہ ایک تبدیلی یہ کی کہ کئی ضامنوں کے بجائے میں نے ایک آف شور کمپنی کا انتخاب کیا جو اسٹیفورڈ کی پسندیدہ تھی۔ مولی کا منصوبہ ہموار طریقہ سے آگے بڑھ رہا تھا البتہ ہر بار درخواستوں پر دستخط کرتے ہوئے میرے ہاتھ کانپنے لگتے۔ میں جانتا تھا کہ محض یہ چند دنوں کی بات ہے۔ ایک دن چھت گرے گی اور میں اس کے تلے دب کر رہ جاؤں گا اور ایسا ہی ہوا۔

پہلا قرضہ منظور ہونے کے ٹھیک نوے دن بعد اسٹیفورڈ سینئر اور بیٹ مین میرے کمرے میں آئے۔ دروازے کو لاک کیا اور اسٹیفورڈ غراتے ہوئے بولا۔

''مجھے یقین نہیں آتا کہ تم نے یہ کوشش کی ہوگی۔'' اس نے کاغذوں کا پلندا میری طرف اچھال دیا۔

''میرے خدا۔ تم تو ایک قابل چور بھی نہیں ہو۔''

''میں نے تقریباً آٹھ سو پچاس ہزار کی ہیرا پھیری کی ہے۔ کیا اس سے میری اہلیت ثابت نہیں ہوتی؟'' میں نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

''میں قرضوں کے معاملات پر کم ہی توجہ دیتا ہوں لیکن مسلسل عدم ادائیگی کی وجہ سے میں اس جانب متوجہ ہوگیا۔ تمہیں اپنے نظام کے تحت قرضے دینا چاہیے تھے۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ جس کمپنی کو تم نے ضامن بنایا ہے وہ بہت پہلے یہ کام چھوڑ چکی ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم اور مولی ساری رقم واپس کردو ورنہ تم اس کمرے سے ہتھکڑیوں سمیت باہر جاؤگے۔''

''نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں ایسا نہیں سمجھتا۔''

''کسی کو مسٹر اسٹیفورڈ کے سامنے اس طرح بولنے کی جرأت نہیں ہوتی۔'' بیٹ مین غرایا۔ ''جو کچھ کہا گیا ہے وہی کرو ورنہ زندگی بھر کے لیے معذور بنا دیے جاؤگے۔''

''کیا تم واقعی اسے ایسا کرنے کی اجازت دوگے؟'' میں نے اسٹیفورڈ سینئر سے پوچھا۔

''تم نے خود ہی معاملہ یہاں تک پہنچایا ہے۔'' وہ سرد مہری سے بولا۔

''شکریہ ڈیڈ۔'' میں نے کہا۔

''کس بات کا؟''

''اس سب کے لیے جو تم نے مجھے دیا۔ اب یہ آخری تماشا بھی دیکھ لو۔'' یہ کہہ کر میں نے میز پر سے فٹ بال ٹرافی اٹھائی اور اس کا بٹن دبا دیا۔ تیر کی طرح ایک پلاسٹک کی گولی نکلی اور سیدھی بیٹ مین کے سینے میں جا کر لگی، وہ چکرا کر کرسی پر گر پڑا۔ میں نے اس پر جھپٹنے میں دیر نہیں لگائی۔ اس نے میری گرفت سے نکلنے کے لیے کندھے میں لٹکا پستول نکالنا چاہا اور یہی اس کی غلطی تھی۔ میں نے اس کی کہنی پر زوردار ضرب رسید کیا۔ ہڈی ٹوٹنے کی آواز آئی۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ وہ اپنے زخمی بازو کو پکڑتے ہوئے اٹھا تو میں اسے کھینچتا ہوا دروازے تک لے گیا اور اسے باہر نکال کر دروازہ اندر سے بند کرلیا پھر میں اسٹیفورڈ سینئر کی جانب متوجہ ہوا۔

''او کے ڈیڈی۔ مجھ سے معاملہ طے کرلو۔ اگر تمہیں اپنی رقم واپس چاہیے تو اس کے لیے بین مولی سے لڑو۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ تم دونوں میں کون جیتتا ہے، میں جا رہا ہوں اور جو کچھ میرا ہے وہ اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنے اکاؤنٹس منتقل کرنے کے لیے چیک لکھ دیا ہے۔ اگر وہ چیک باؤنس ہوگیا یا میں نے بیٹ مین کو دوبارہ اپنا تعاقب کرتے دیکھا تو میں تمہارے سارے کرتوت لوگوں کے سامنے لے آؤں گا۔ گو کہ ہمارے درمیان خون کا رشتہ نہیں لیکن تم نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا ہے۔ میں تمہیں اور تمہارے غلام کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا سکتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تمہاری سمجھ میں بات آگئی ہوگی۔''

یہ کہہ کر میں دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ اسٹیفورڈ سینئر نے کچھ کہنا چاہا لیکن آواز اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئی۔

☆☆☆

میں پارکنگ لاٹ میں جینا کا انتظار کر رہا تھا۔ اسکول سے چھٹی ہوتے ہی وہ سیدھی میری طرف آئی اور بولی۔

''کیا ہوا تم ٹھیک تو ہو؟''

''ہاں، میں ہمیشہ کے لیے یہاں سے جا رہا ہوں اور کسی دوسری جگہ نئے سرے سے زندگی شروع کروں گا۔''

''تمہارے لیے یہی بہتر رہے گا۔''

''میں چاہتا ہوں کہ تم بھی میرے ساتھ چلو۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ اب یہ ممکن نہیں۔ ہماری محبت ماضی کا قصہ ہے۔ اب میں تمہاری بہن ہوں۔''

''پھر تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔''

''وہ کیا؟''

''ممکن ہے کہ میں کچھ عرصہ کے لیے کہیں دور چلا جاؤں۔ اس دوران کیا تم میری ماں کی دیکھ بھال کرسکتی ہو؟''

''کیا تمہیں یقین ہے؟''

''تمہارے علاوہ اور کوئی نہیں جس سے میں یہ بات کہہ سکوں۔''

''نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''تمہیں یقین ہے کہ وہی تمہاری حقیقی ماں ہے؟''

میں نے اسے بالوں سے پکڑ کر جھنجوڑا لیکن وہ بدستور مسکرا رہی تھی۔ دوسرے لمحہ میں بھی اس کے ساتھ شامل ہوگیا اور بولا۔ ''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ جس طرح کے حالات پیش آرہے ہیں انہیں دیکھتے ہوئے یہی بہتر ہے کہ اسے بھی چیک کرلیا جائے۔''

محی الدین نواب

ساتویں قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پُرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوسِ قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا بادو باراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کُن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیّر اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیّر خیز سنگم۔

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ داستان ہے دورِ جدید کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی منگی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا جمرو اور چاچی مٹی کے ساتھ اندرونِ سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ گاؤں کا وڈیرا حشمت جلالی ایک بدنیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا، چونکہ ماروی مراد کی منگ تھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہٰذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گوٹھ چھوڑنا پڑا۔ مراد جوکہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا وڈیرا حشمت کی منشی گیری کرتا تھا۔ وڈیرا حشمت جلالی اور اس کے بیٹے روایتی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جائداد بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کردی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہوگیا۔ اس رات زلیخا نے اسے ایک قیمتی ہار بھی تحفتاً دیا تھا۔ گاؤں سے فرار ہوکر یہ دونوں کراچی کے ایک مضافاتی علاقے یٰسین گوٹھ آگئے جہاں ماروی اپنے چاچا چاچی کے ساتھ پہلے ہی آچکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہوگئی جوکہ ممبر اسمبلی اور بزنس ٹائیکون، لیکن ہوبہو مراد کا ہم شکل تھا۔ بس دونوں کے درمیان صرف قسمت کا فرق تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ حشمت جلالی جوکہ خود بھی ممبر اسمبلی تھا اس کا وکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کرچکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کرلی اور خاموشی سے فرار ہوگئی۔ وڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کرائی۔ ناکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جوکہ زلیخا کے ہی قد کاٹھ کی تھی، بربادکر کے قتل کردیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے مسخ کرکے اسے اپنی بیٹی ظاہر کرکے الزام مراد پر لگادیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا، ارادہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گوشہ نشین ہونا تھا۔ محبوب کے سرپرست اس کے والد کے زمانے کے معروف منشی تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل سمیرا کو سیکریٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل وجان سے مرمٹا لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا جس میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے بطور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد کو شادی کے لیے ایک لاکھ کی ضرورت تھی۔ محبوب نے زلیخا کے دیے ہوئے ہار کو ایک لاکھ میں خریدنے کی پیشکش کی لیکن مراد راضی نہ ہوا۔ اسی دوران مراد کے گھر چوری کی واردات ہوئی اور چور نقد رقم کے ساتھ زلیخا کا وہ ہار بھی لے گئے لیکن پکڑے گئے یوں مراد بھی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہوگیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو جنم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی لیکن وڈیرا باپ اور بیٹوں کو خبر نہیں تھی کہ زلیخا کہاں اور کس حال میں ہے۔ ماں رابعہ جانتی تھی لیکن مراد سے نالاں تھی۔ وہ شوہر اور بیٹوں سے بھی ناراض تھی لہٰذا انہیں خبر نہیں کی۔ مراد اس قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کررہا تھا۔ اسی باعث اس کی وڈیرا حشمت سے دشمنی ہوگئی۔ یہ بات پارٹی کے لیڈر تک پہنچ گئی نتیجتاً چانڈیو استعفیٰ دے کر چلا آیا۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہوگیا۔ اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی سہیلی کی شادی میں شرکت کے لیے گوٹھ گئی تاہم محبوب چانڈیو اسے بچالایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکریٹ ایجنٹ برنارڈ کو رہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرینہ جوکہ جیلر کی بیٹی ہے دیگر دو ساتھی بہرام اور دارا اکبر کے ساتھ آئے ہوئے ہیں جو مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی اور اس سے شادی اسے ورغلا کر ماروی سے دور کررہی تھی جبکہ ماروی پر بھی دباؤ تھا کہ وہ محبوب سے شادی کرلے لیکن دونوں اپنے عشق پر قائم تھے۔ مقدمے کو معلوم نہیں کب تک چلنا تھا لیکن محبوب نیک نیتی سے ان کا مددگار تھا اور حتیٰ کہ جب ماروی محبوب کے احسانات سے بچنے کے لیے جان بوجھ کر غائب ہوگئی جس میں سمیرا بھرپور مدد کررہی تھی تاکہ محبوب ماروی کی مدد سے باز آجائے مگر اس خبر کے بعد وہ دلبرداشتہ ہوکر خود مراد کی جگہ جیل میں قید ہوگیا جبکہ دوسری جانب ماروی کی تلاش کا لالچ دے کر مراد کو مرینہ جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہوگیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کرا سے جھانسا دیتے ہوئے اس کے شکنجے سے فرار ہوگیا۔ جبکہ دوسری جانب سمیرا اور منشی صاحب محبوب کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ ایک موقع پر مرینہ مراد کا پیچھا کرتے ہوئے راستے میں ماروی تک پہنچ گئی اور محبوب سے فون پر اپنے باپ کے ذریعے رابطہ کرایا تو اسی خبر سے محبوب میں نئی زندگی دوڑ گئی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

وہاں دور تک پہاڑیاں بھی تھیں۔ کھیت بھی تھے اور گھنے درختوں کے باعث رات اور کالی ہوگئی تھی۔ وہ بہت ہی پرسکون ویرانہ تھا۔ مگر وہ پرسکون نہ تھی۔ دماغ میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ ان لمحات میں محبوب پر بُری طرح جھنجلا رہی تھی۔

اس نے باپ کو فون کیا اور کہا۔ ''اس کتے کو الو بنانا ہوگا۔ اسے فون دیں۔ میں بات کروں گی۔''

جیلر نے سلاخوں کے درمیان فون کو محبوب کے پاس پہنچاتے ہوئے کہا۔ ''مرینہ سے بات کرو۔''

وہ فون لے کر اسے کان سے لگا کر بولا۔ ''ہیلو...!''

''ہیلو محبوب! تم اپنی جگہ درست ہو۔ تمہاری ماروی جن حالات سے گزر رہی ہے اُن کے پیشِ نظر تمہیں ہم پر یا کسی پر بھی بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔ ویسے میرا دل صاف

ہے۔ میں ماروی سے دشمنی نہیں کررہی ہوں اور کیوں کروں گی؟ جبکہ یہ بیچاری کسی بھی معاملے میں میرے لیے اہم نہیں ہے۔ ابھی صرف اس لیے اہمیت ہے کہ اس کے بغیر میں مراد تک پہنچ نہیں پاؤں گی۔

جیسا کہ تم جانتے ہو۔ میں نے پاپا سے بھی وعدہ کیا ہے۔ مجھے اپنے وعدہ کے مطابق مراد کو دو دنوں میں واپس جیل میں پہنچانا ہے۔ اِدھر وہ مجھ سے بدظن ہوکر مجھے دھوکا دے کر کہیں چلا گیا، اب معلوم ہوا ہے کہ وہ جام تھارو کی ایک جیل میں ہے۔ مشکل یہ ہے کہ وہ مجھ سے بدظن ہے۔ میں اسے لینے وہاں تنہا جاؤں گی تو بھی میرے ساتھ نہیں آئے گا۔ یہ تو تم جانتے ہو کہ ماروی کو دیکھتے ہی آنے کے لیے راضی ہوجائے گا۔''

محبوب نے قائل ہوکر کہا۔ ''درست کہہ رہی ہو، وہ ماروی کو دیکھتے ہی چلا آئے گا۔''

وہ بولی۔ ''میرے سامنے مشکل یہ بھی ہے کہ جام تھارو کا وڈیرا سر پھرا ہے۔ ہم سے فون پر بات نہیں کرتا ہے تو بھلا مراد کو ماروی سے کیسے فون پر بولنے دے گا؟

میں وہاں جاکر اس کے بڑے بیٹے سے مراد کی رہائی کا سودا کروں گی۔ ہوسکتا ہے کل شام تک ان سے ڈیلنگ ہوجائے گی۔ میں پرسوں تک ضرور مراد کو وہاں سے نکال لاؤں گی۔ ماروی بھی وہاں تمہارے سامنے ہوگی۔ مجھے صرف دو دن کا وقت دو۔''

محبوب نے کہا۔ ''بہت میٹھی بن کر بول رہی ہو۔ تم اپنی جو مجبوریاں بیان کررہی ہو۔ ان کے پیشِ نظر ایک ہی شرط پر تم باپ بیٹی پر بھروسا کروں گا۔''

''بولو شرط کیا ہے؟''

''وہاں ماروی کے پاس اور یہاں میرے پاس فون رہے گا۔ وہ جب تک یہاں نہیں آئے گی میں فون پر اس کی خیریت معلوم کرتا رہوں گا۔''

وہ بولی۔ ''تمہاری یہ شرط مناسب ہے۔ تم جب چاہو گے ماروی سے باتیں کرسکو گے۔ لو ابھی اس سے دو چار باتیں کرو۔ تمہیں اطمینان ہوگا کہ یہ میرے پاس محفوظ ہے۔''

اس نے لینڈ کروزر کے پاس آکر ماروی کو فون دیتے ہوئے کہا۔ ''محبوب سے باتیں کرو۔''

اس نے فوراً ہی فون لے کر اسے کان سے لگایا۔ پھر کہا۔ ''ہیلو محبوب صاحب! میں ماروی بول رہی ہوں۔''

اس نے کہا۔ ''صاحب نہیں صرف محبوب کہو۔ میں نے پہلے بھی تم سے کہا تھا۔ کیا تم میری اتنی سی خواہش پوری نہیں کرسکتیں؟''

وہ سر جھکا کر بولی۔ ''آپ جو کہیں گے وہ کہوں گی۔ میں عجیب حالات سے گزر رہی ہوں۔ نہ گھر کی رہی ہوں۔ نہ گھاٹ کی۔ نہ آپ کی پناہ میں رہ پائی۔ نہ مراد سے مل پارہی ہوں۔''

''حوصلہ رکھو۔ مشکلیں دور ہوتی رہیں گی۔ جام تھارو میں مراد سے مل سکو گی۔ پھر اس کے ساتھ کراچی آؤ گی۔

یہ بات ذہن میں رکھو کہ دھوکا کھاسکتی ہو۔ یہ مرینہ بہت چالباز ہے میں نے اس سے کہہ دیا ہے جیسے ہی کوئی پریشانی ہوگی فوراً مجھے فون پر اطلاع دوگی۔ یہاں میرے پاس بھی فون رہے گا۔ میں ہر آدھے گھنٹے میں تمہاری خیریت معلوم کرتا رہوں گا۔''

''یا خدا...! آپ میرا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ میری خاطر آپ مراد کی جگہ قیدی بن گئے ہیں۔ خدا آپ کو ہر مصیبت سے بچائے اور قید خانے سے رہائی دے۔''

''یہ خوش خبری سنو۔ حشمت جلالی نے سمجھوتا کرلیا ہے۔ مقدمہ ختم ہوجائے گا۔ مجھے جلد ہی رہائی مل جائے گی۔''

مرینہ نے گاڑی کی کھڑکی کے پاس آکر کہا۔ ''زیادہ باتیں نہ کرو۔ بیلنس بہت کم رہ گیا ہے۔ آگے کہیں جاکر بیلنس کارڈ خریدنا ہوگا۔ پھر اس سے باتیں کرلینا۔''

دوسری طرف محبوب نے یہ سن کر کہا۔ ''فون اسے دو۔ میں پھر کسی وقت تمہیں کال کروں گا۔''

مرینہ نے فون لے کر کہا۔ ''پلیز کم سے کم صرف ضروری باتیں کیا کرو۔''

اس نے کہا۔ ''دیکھو اگر کوئی رکاوٹ ہوگی، وہ مجھ سے بات نہیں کرسکے گی تو میں کسی طرح کے حیلے بہانے نہیں سنوں گا۔ ہر حال میں اس کی خیریت معلوم ہونی چاہیے۔''

''میں سمجھ گئی جو چاہتے ہو وہی ہوگا۔ پاپا کو فون دو۔''

وہ فون لے کر بیٹی سے بولا۔ ''میں اِدھر سے ہونے والی باتیں سن کر سمجھ رہا ہوں۔ ہمارے درمیان سمجھوتا ہوگیا ہے۔''

وہ وہاں سے جاتے ہوئے بولا۔ ''اب میں آفس کی طرف جارہا ہوں۔ یہ بتاؤ۔ تم اسے کب تک الو بنا سکو گی۔ اِدھر ماروی وڈیرے کی جیل میں جائے گی تو محبوب کو فون پر بتائے گی۔ اس سے فون لیا جائے گا تو محبوب اِدھر سے کالیں کرتا رہے گا پھر جواب نہ ملنے پر ہمارا دشمن بن جائے گا۔ میں تو بری طرح پھنس گیا ہوں۔''

''آپ نہیں پھنسیں گے وہ پھنسے گا۔ میں جام تھارو

پہنچ کر محبوب کو جان لیوا حادثے کی کہانی سناؤں گی۔

"میں چاچی کو گن پوائنٹ پر رکھوں گی۔ ماروی کو دھمکی دوں گی کہ وہ منہ سے ایک ذرا آواز نکالے گی تو چاچی کو گولی مار دوں گی۔ ماروی اس کی جان بچانے کے لیے خاموش رہے گی۔

"پھر چاچی فون پر رو رو کر محبوب سے بولے گی کہ ایک ہیوی ٹرک نے کار کو ٹکر ماری تھی۔ ماروی اور ڈرائیور مارے گئے ہیں۔ چاچا بری طرح زخمی ہے۔"

جیلر نے سر ہلا کر کہا۔ "ہاں جب چاچی رو رو کر بیان دے گی تو محبوب کو یقین ہوگا ـــ حقیقت کیا ہے؟ یہ معلوم کرنے جیل سے باہر نہیں جا سکے گا۔ وہ معروف بخلی جیسے اعتماد کے لوگوں سے حقیقت معلوم کر سکتا ہے لیکن وہ تو ان سے بھی چھپا ہوا ہے اور جب جیل سے نکل آئے گا اور اسے سچ معلوم ہوگا تو یہ الزام نہیں دے سکے گا کہ میں نے اسے مراد کی جگہ قیدی بنا کر رکھا تھا۔ کوئی یقین نہیں کرے گا۔"

"آل رائٹ پاپا! میں پھر کسی وقت فون کروں گی۔"

وہ فون بند کر کے گاڑی میں آ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "چلو یہاں خواہ مخواہ اتنی دیر ہو گئی۔"

دونوں گاڑیاں آگے بڑھ کر تیز رفتاری سے جانے لگیں۔

☆☆☆

مراد گڑھی داد و پہنچ کر رک گیا۔ یہ اچھی طرح سمجھ گیا کہ موٹر سائیکل کی رفتار سے ہیرو کو پکڑ نہیں سکے گی۔ وہ ایک پیٹرول پمپ کے پاس آ کر رکا تھا۔ وہاں تین ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ وہ لانگ روٹ کی سواریاں اٹھاتی تھیں۔ اس نے ایک ٹیکسی ڈرائیور کے پاس آ کر پوچھا۔ "جام تھارو جاؤ گے؟"

ڈرائیور نے کہا۔ "ہم جانے کے لیے ہی بیٹھے ہیں۔ لیکن وہاں سے واپسی کے لیے سواری نہیں ملتی ہے۔ ڈبل کرایہ دو گے تو چلوں گا۔"

"تو پھر چلو۔ جتنا مانگو گے دوں گا۔"

"پورے چار ہزار لوں گا۔"

"اس شرط پر دوں گا کہ طوفانی رفتار سے لے جاؤ گے۔"

"آندھی طوفان کی طرح لے جاؤں گا۔ لیکن تمہاری یہ موٹر سائیکل کیسے جائے گی؟"

"یہ تمہیں دے رہا ہوں۔ اسے رکھ لو۔"

وہ حیرانی سے بولا۔ "کیا بول رہے ہو؟"

"دیر نہ کرو۔ اسے رکھنا ہے تو رکھو۔ ورنہ میری گاڑی ہے۔ میں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ فوراً چلتے ہو یا نہیں؟"

وہ جلدی سے بولا۔ "چلتا ہوں مگر یہ گاڑی چوری کی ہوئی تو پھنس جاؤں گا۔"

"تم دیر کر رہے ہو۔ میں دوسری ٹیکسی میں چلا جاؤں گا۔"

"نہیں مہربان! چل رہا ہوں۔ اپنی موٹر سائیکل میں بیٹھ کر میرے گھر تک چلو۔ وہاں اسے چھوڑ کر میری ٹیکسی میں بیٹھ جاؤ۔"

مراد نے یہی کیا۔ موٹر سائیکل اس کے گھر میں چھوڑی پھر ٹیکسی میں بیٹھ کر وہاں سے آگے چلا۔ ڈرائیور واقعی طوفانی رفتار سے چلا رہا تھا۔

مرینہ کا قافلہ اس سے تقریباً پچاس کلومیٹر آگے جا رہا تھا اور اچھی خاصی رفتار سے جا رہا تھا۔ پیچھے آنے والی ٹیکسی میں مرینہ کے دو تابعدار پچھلی سیٹ پر تھے اگلی سیٹ پر چاچا ڈرائیور جلال احمد عرف جلاّ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

چاچا نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔ "جب سے کراچی چھوڑا ہے، تب سے کہیں آرام سے رہنے کی جگہ نہیں مل رہی ہے۔ منّی اور ماروی کو لے کر بھاگتا ہی چلا جا رہا ہوں۔"

ایک تابعدار نے کہا۔ "آگے بھی کہیں رہنے سہنے کا ٹھکانا نہیں ہوگا۔ میڈم ہمیں وہاں سے بھی دوڑاتی ہوئی کہیں لے جائیں گی۔"

دوسرے تابعدار نے کہا۔ "چوبیس گھنٹے گزر گئے ہیں، نہ ہم نے پیٹ بھر کر کھایا ہے نہ پوری نیند سو سکے ہیں۔ ہم کچھ بولتے ہیں تو وہ جھڑک دیتی ہے۔"

تیسرے تابعدار نے کہا۔ "لندن کی بہت بڑی پولیس افسر ہے، یہاں اس کا جیلر باپ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ ہم بڑی رقم کے لالچ میں کہاں آ کر پھنس گئے ہیں۔ اسے چھوڑ کر بھاگیں گے تو کہیں نہ کہیں پکڑے جائیں گے۔ یہ باپ بیٹی ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

چاچا نے پوچھا۔ "کیا یہ اچھی عورت نہیں ہے؟"

ایک تابعدار نے کہا۔ "بابے! اس کے ساتھ چل پڑے ہو تو کیا اچھی اور کیا بری؟ جو سامنے آئے گا ـــ بھگتنا ہی ہوگا۔"

لینڈ کروزر میں ماروی اور چاچی پچھلی سیٹ پر تھیں۔ مرینہ اگلی سیٹ پر اپنے تابعدار کے ساتھ تھی۔ وہ اس کے حکم کے مطابق تیز رفتاری سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ منزل دور تھی اور راستہ شیطان کی آنت کی طرح لمبا ہوتا جا رہا تھا۔

وہ اندر ہی اندر مراد پر جھنجلا رہی تھی۔ وہ نامراد ماروی کے پاس جانے کے لیے اسے چھوڑ کر بھاگا ہوا

تھا۔ اس نے ذرا ایک طرف جھک کر عقب نما آئینے میں ماروی کو دیکھا۔ پھر گالیاں دیں۔ "کتیا! اس میں ایسا کیا ہے جو مجھ میں نہیں ہے؟

وہ کتا کل سے مجھے دوڑا رہا ہے۔ آخر کہاں مر گیا ہے؟ کہاں مرے گا؟ اسے تو آنا ہی ہوگا۔ میں اس کمینی کو وڈیرے کی جیل میں چھوڑ کر پھر اسے تلاش کروں گی۔ کہیں تو سامنا ہوگا۔ تب اسے بولوں گی کہ ماروی میری مٹھی میں ہے۔ فون پر اس سے بات بھی کراؤں گی۔

ہاں تب ہی وہ اس سے ملنے اور اسے پانے کے لیے میرے قدموں میں جھکے گا۔ کتا کہیں کا..."

اس نے پھر عقب نما آئینے میں ماروی کو دیکھا۔ غصہ آ رہا تھا کہ اس کے دو یار ہیں۔ دونوں ہی اس کے دیوانے ہیں اور اس نے دونوں کو اپنے پیچھے لگا رکھا ہے۔ وہ نفرت سے سوچ رہی تھی۔

وہ پچھلی سیٹ پر اس کے ناپاک خیالات سے بے خبر تھی۔ اس کے چہرے کی معصومیت اور دلکشی ایسی تھی کہ دلوں کو کھینچ لیتی تھی۔ اس کے برعکس مرینہ جرائم کی اور گناہوں کی دنیا میں زندگی گزارتی آ رہی تھی۔ اس لیے اس کی معصومیت زہر لگ رہی تھی۔

رات کو کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ سب ہی کو بھوک لگ رہی تھی۔ تھکن سے برا حال تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی بستی میں پہنچ گئے۔ سڑک کے کنارے ایک اجاڑ سا ہوٹل تھا۔ انہوں نے رک کر پوچھا۔ "کھانے کو کچھ ہے؟"

تازہ روٹیاں تنور سے نکالی جا رہی تھیں۔ گوشت کا سالن باسی تھا۔ مہک آ رہی تھی۔ دکاندار نے کہا۔ "آپ لوگ آرام سے بیٹھیں۔ آدھے گھنٹے میں مرغی کا سالن تیار ہو جائے گا۔"

مرینہ نے کہا۔ "ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ فوراً انڈوں کا آملیٹ بنا کر دو۔"

ایک تابعدار نے کہا۔ "میڈم! ایسی بھی کیا جلدی ہے ہمیں گھنٹا بھر آرام کرنا چاہیے۔ کل سے دوڑتے چلے آ رہے ہیں۔"

وہ سخت لہجے میں بولی۔ "میں بھی دوڑتی آ رہی ہوں اور ایک عورت ہوں۔ شرم کرو۔ انڈے اور روٹیاں لے کر گاڑی میں بیٹھو اور راستے میں کھاتے چلو۔"

دوسرے تابعدار نے کہا۔ "آپ نے فوجیوں جیسی ٹریننگ حاصل کی ہے۔ ہمارے اندر آپ جیسی قوتِ برداشت نہیں ہے۔ ہمیں ذرا سستا لینے دیں۔"

وہ بولتا ہوا ایک بنچ پر بیٹھ رہا تھا۔ اسی لمحہ میں مرینہ نے گھوم کر ایک لک ماری۔ اس کے منہ پر جیسے ہتھوڑا پڑا تھا۔ وہ بیٹھتے بیٹھتے الٹ کر زمین پر گر پڑا۔ وہ حقارت سے بولی۔ "میں ایک بار بولتی ہوں۔ دوسری بار ٹھوکروں میں اڑا دیتی ہوں۔"

انڈوں کے آملیٹ تیار ہو رہے تھے۔ وہ ایک آملیٹ کو روٹی میں رکھ کر اس کا رول بنا کر دانتوں سے لقمہ توڑتے اور چباتے ہوئے بولی۔ "اپنی اپنی روٹیاں لو۔ اور گاڑی میں آ جاؤ۔"

وہ اپنی لینڈ کروزر کی طرف چلی گئی۔ وہ مار کھانے والا اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے دونوں ساتھی اس کے کپڑوں سے مٹی جھاڑ رہے تھے اور زیر لب بول رہے تھے۔ "سالی پولیس افسر ہے بڑے پاور والی ہے۔ ہم کیا کر سکتے ہیں؟ صبر کرو۔ اس ڈیلنگ کے بعد پھر بھی اس کا کام نہیں کریں گے۔"

ماروی سہمی ہوئی سی مرینہ کو دور سے دیکھ رہی تھی۔ ڈرائیور جلال احمد نے کہا۔ "بہن یہ خطرناک عورت ہے۔ پتا نہیں، ہم کس چڑیل کے ساتھ کہاں جا رہے ہیں؟"

چاچا نے بھی روٹیوں اور انڈوں کا رول بنا کر چاچی اور ماروی کو دیا۔ وہ سب کھانا ہاتھوں میں لے کر دونوں گاڑیوں میں آ کر بیٹھ گئے۔ وہ قافلہ وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

وہ سب خاموشی سے رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ ان کے تین طرف گہری تاریکی تھی صرف سامنے ہیڈ لائٹس کے باعث دور تک جانے والی سڑک دکھائی دے رہی تھی۔

وہ ایک گھنے جنگل سے گزر رہے تھے۔ ایسے وقت مرینہ کے فون سے کالنگ ٹون ابھرنے لگی۔ اس نے فون کو کان سے لگا کر کہا۔ "یس پاپا...!"

باپ نے کہا۔ "میں نے محبوب کو ایک فون لا کر دیا ہے۔ یہ کہہ رہا ہے، ماروی کے فون پر اس سے بات کرے گا۔ کیا اس کے پاس فون ہے؟"

"ہاں میں نے اس سے لے لیا تھا۔ ابھی دے رہی ہوں۔ وہ اس کے نمبر پر بات کر سکتا ہے۔"

مرینہ نے اپنے بیگ میں سے ماروی کا فون نکال کر اسے دیا۔ اسی وقت کالنگ ٹون سنائی دی۔ وہ بٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر بولی۔ "میں خیریت سے ہوں۔ یہ تھکا دینے والا سفر ابھی تک جاری ہے۔ پتا نہیں، ہم جام تھارو کب پہنچیں گے۔ یہاں چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔"

"کیا اندھیرے سے ڈر لگ رہی ہو؟"

"ڈر لگ تو نہیں ہوں لیکن تھکن اور پریشانی نے

نڈھال کردیا ہے۔"

مرینہ اگلی سیٹ پر تھی۔ کان پیچھے لگے ہوئے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی اگر یہ صرف محبوب سے ہی لگی رہے۔ مراد کا پیچھا چھوڑ دے اسے ٹھکرا دے تو وہ میری ٹھوکروں میں آجائے گا۔

وہ ایک بار مل تو جائے۔ میں اس کے گلے میں پٹا ڈال کر زنجیریں پہنا کر اسے اپنے بیڈ سے باندھ کر رکھوں گی۔ مرد کو کتا بنا کر رکھو تو وہ دُم ہلاتا رہتا ہے۔

گاڑی کی رفتار اچانک سست ہونے لگی۔ اس نے ناگواری سے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

تابعدار گاڑی کو روکتے ہوئے بولا۔ "ٹنکی خالی ہوگئی ہے۔"

اس نے گاڑی روک دی۔ پیٹرول سے بھرے ہوئے دو کین رکھے ہوئے تھے۔ پہلے کی طرح فکر و پریشانی کی بات نہیں تھی۔ پریشانی یہ ہوئی کہ ٹیکسی میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی۔ جلال عرف جلاّ بونٹ اٹھا کر چیک کرنا چاہتا تھا لیکن تاریکی میں دیکھنے کے لیے ٹارچ بھی نہیں تھی۔

مرینہ نے غصہ سے کہا۔ "کیا ایسے وقت تمہاری ٹیکسی کو بھی بیمار ہونا تھا۔ میں جلدی پہنچنا چاہتی ہوں لیکن تم لوگوں کی کاہلی مجھے پہنچنے نہیں دے گی۔"

اس نے حکم دیا کہ لینڈ کروزر کی ہیڈ لائٹس کا رُخ ٹیکسی کے بونٹ کی طرف کیا جائے اور فوراً اسے ٹھیک کیا جائے۔

اس کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ جلاّ خرابی درست کرنے لگا۔ وہ کوئی موٹر میکنک نہیں تھا۔ اسے دیر ہو رہی تھی۔ ایک تابعدار نے کہا۔ "لاؤ۔ میں دیکھتا ہوں۔"

وہ اپنے طور پر کوششیں کرنے لگا۔ اس کی بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ دوسرے تابعدار نے کہا۔ "تم دونوں ہٹو۔ میں دیکھتا ہوں۔ ایسی کیا خرابی ہے کہ دور نہیں ہو رہی ہے۔"

وہ اوزار لے کر بونٹ کے اندر گھس گیا۔ مرینہ جھنجلا رہی تھی۔ اس نے موبائل فون پر وقت دیکھتے ہوئے کہا۔ "ایک گھنٹا گزر گیا ہے۔ میں اس ٹیکسی کو آگ لگا دوں گی۔"

تابعدار نے کہا۔ "میں کچھ کام جانتا ہوں۔ یہ ٹھیک ہوجائے گی۔ پلیز ذرا صبر کریں۔"

اس نے پندرہ منٹ تک صبر کیا پھر اس نے ٹیکسی کو لات مارتے ہوئے کہا۔ "لعنت ہے اس پر۔ چلو میری گاڑی میں کسی طرح گھس کر بیٹھو۔ جلدی کرو۔"

ٹیکسی میں چاچا اور مرینہ کے دو تابعدار تھے۔ وہ پیچھے دم میں بیٹھ سکتے تھے۔ جلاّ نے کہا۔ "میڈم! مجھے چھوڑ کر نہ جائیں۔ میں اس جنگل میں اکیلا نہیں رہوں گا۔"

وہ بولی۔ "کیا میں نے تمہارا ٹھیکا لیا ہے۔ گاڑی ٹھیک کرو اور ہمارے پیچھے آسکتے ہو تو آؤ۔ ورنہ یہیں مرو۔"

وہ تیزی سے چلتی ہوئی اپنی گاڑی کے پاس آئی پھر اس نے رُک کر تینوں تابعداروں کو دیکھا۔ وہ جلاّ کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ ایک نے کہا۔ "سوری میڈم! ہم اسے تنہا جنگل میں چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔"

وہ غصے سے بھڑک گئی۔ "وہاٹ نان سنس؟ کیا یہ تمہارا باپ ہے کہ اسے چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔ میں تمہیں پے کر رہی ہوں۔ تم کیسے نمک حرام ہو کہ میرا کھا رہے ہو اور میرے حکم سے انکار کر رہے ہو۔ چلو یہاں سے۔۔۔"

"آپ صبر کریں تو ٹیکسی ٹھیک ہوجائے گی۔ آپ جام تمارو دیر سے پہنچیں گی تو قیامت نہیں آجائے گی۔"

وہ شیرنی کی طرح غراتی ہوئی اس کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔ "آرڈر از آرڈر۔ یو آر گومنٹس۔ جو حکم دیا ہے اس کی تعمیل کرو۔ کم آن اسے چھوڑو اور گاڑی میں بیٹھو۔"

وہ تینوں چپ کھڑے رہے۔ مرینہ نے ایک الٹا ہاتھ ایک تابعدار کو رسید کیا۔ وہ مار کھا کر پیچھے گیا۔ پھر اس نے جوابی حملہ کیا۔ اس نے بچاؤ کرتے ہوئے ایک کراٹے کا ہاتھ رسید کیا۔ دوسرا تابعدار حملہ کرنے آرہا تھا۔ اسے گھوم کر ایک کک ماری۔ وہ تینوں بہترین گن شوٹر تھے لیکن فائٹر نہیں تھے۔ مرینہ جیسی تربیت یافتہ کے مقابلے میں مار کھا کر پیچھے ہٹ رہے تھے۔

ان کی سلامتی اسی میں تھی کہ اس سے مقابلہ نہ کریں۔ پھر وہ تینوں اچانک ہی دوڑتے ہوئے ہیڈ لائٹس کی روشنی سے باہر تاریکی میں چلے گئے۔ اس کی نظروں سے گم ہوگئے۔ وہ بولی۔ "تم تینوں کی موت آگئی ہے بھاگ کر کہاں جاؤ گے؟"

ٹھائیں کی آواز کے ساتھ ایک گولی مرینہ کے قدموں کے پاس آئی اور وہاں سے مٹی اڑاتی ہوئی گزر گئی۔ وہ تینوں تابعدار پوری طرح بغاوت پر اتر آئے تھے۔

وہ اچھل کر دوڑتی ہوئی اپنی گاڑی کے پاس آئی پھر اس کا دروازہ کھولا۔ ماروی اور مُنی سہمی ہوئی بیٹھی تھیں۔ اس نے ماروی کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر کھینچا پھر اسے ایک ہاتھ سے دبوچ کر اپنے آگے ڈھال بنا کر لباس کے اندر سے ریوالور نکال لیا۔

اب وہ بھی ہیڈ لائٹس کی روشنی کے باہر تاریکی میں تھی۔ پھر بھی نیم تاریکی میں جھلک رہی تھی۔ چاچی مُنی گاڑی کے اندر ہائے ہائے کر رہی تھی۔ "ہائے اسے کیوں لے گئی ہو؟ اری او انگریزن۔۔۔! اس کی جگہ مجھے آگے کر دو۔"

وہ بولتی ہوئی باہر آگئی۔ ماروی اس کے ایک ہاتھ کے شکنجے میں تھی اور اس کی مضبوط گرفت کو سمجھ رہی تھی کہ نکل نہیں پائے گی۔ اس نے زندگی میں کبھی کسی سے زور آزمائی نہیں کی تھی۔ پہلی بار میدانِ جنگ میں پہنچ گئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کرے؟

اور وہ کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔ مرینہ اسے دبوچ کر نیم تاریکی سے گہری تاریکی کی طرف جارہی تھی۔ ایک تابعدار کی آواز سنائی دی۔ "اے میڈم! ہم نے تم پر لعنت بھیج دی ہے۔ اب اگر زندہ رہنا چاہتی ہو تو یہاں سے اکیلی جاؤ۔"

مرینہ نے گہری تاریکی میں پہنچتے ہی آواز کی سمت گولی چلائی پھر چیخ کر کہا۔ "میں مات کھانے کے لیے پیدا نہیں ہوئی ہوں۔ ابھی تم تینوں کو زخمی اور اپاہج بنا کر لے جاؤں گی۔"

جواب میں دوسری سمتوں سے یکے بعد دیگرے تین گولیاں چلیں وہ تینوں ایک دوسرے سے دور رہ کر اسے تاریکی میں دیکھنے کی کوششیں کر رہے تھے۔ اور وہ ایک درخت کے پیچھے ماروی کے ساتھ محفوظ تھی۔

ایک تابعدار نے کہا۔ "ماروی! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مراد جام تمارو کی جیل میں نہیں ہے۔ وہ آزاد ہے۔ مرینہ پر تھوک کر تمہاری تلاش میں بھٹک رہا ہے۔"

یہ سنتے ہی ماروی اس کی گرفت میں کسمسانے لگی۔ خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ مرینہ نے اس کی کنپٹی سے ریوالور کی نال لگاتے ہوئے کہا۔ "سالی کتیا۔۔۔! میرے ہاتھ سے نکل کر جانا چاہے گی تو وہ ڈھونڈنے۔۔۔ والا عاشق تیری لاش بھی نہیں دیکھ سکے گا۔ چپ چاپ کھڑی رہے گی تو زندہ رہے گی۔"

چاچا اُدھر جلال احمد جلاّ اور تینوں تابعداروں کی طرف تاریکی میں تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "یہ ہم کہاں آکر پھنسے ہیں؟ میری بچی کو اس ڈائن سے بچاؤ۔ وہ اسے مار ڈالے گی۔"

ایک نے کہا۔ "بابے! وہ اسے نہیں مارے گی۔ ہم جانتے ہیں۔ مراد کو پھانسنے کے لیے اسے زندہ رکھے گی۔"

ان لمحات میں جو بول رہا تھا اس کی سمت ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی۔ وہ چیخ مار کر گر پڑا۔ مرینہ نے تاریکی میں نشانہ بازی کا کامیاب مظاہرہ کیا تھا۔

ویسے وہ مرا نہیں تھا صرف زخمی ہوا تھا اور وہ کہہ چکی تھی کہ انہیں زخمی اور اپاہج بنا کر لے جائے گی۔

وہ زبردست فائٹر تھی۔ ان تینوں کو دوڑا دوڑا کر مارنے والی تھی۔ لیکن ایک بات سے شکست کھا رہی تھی۔ یہ بھید کھل گیا تھا کہ مراد جام تمارو میں نہیں ہے۔ اب کسی وقت بھی محبوب ماروی کو کال کرتا تو وہ اسے بتا دیتی پھر وہ جیل کی چار دیواری میں رہ کر ایسی دشمنی کرتا کہ اس کے جیلر باپ کی شامت آجاتی۔

مرینہ منہ سے آواز نہیں نکال رہی تھی۔ کیونکہ تاریکی میں آواز کی سمت ہی گولیاں آتی ہیں۔ اس نے ماروی کے کان میں کہا۔ "اپنا فون مجھے دو۔ تم اس سے بات نہیں کرو گی۔"

وہ بولی۔ "وہ میرے پاس نہیں ہے۔ دیکھ لو خالی ہاتھ ہوں۔ وہ گاڑی میں رہ گیا ہے۔"

مرینہ اس کے لباس کو اچھی طرح ٹٹول کر مطمئن ہوگئی۔ فی الحال محبوب کو حقیقت معلوم ہونے والی نہیں تھی۔ یہ بھید کھلنے تک وہ اپنے باپ کو بچانے کی کوئی اور تدبیر سوچنے والی تھی۔

لیکن اب ماروی کے اندر بارود بھر گئی تھی۔ اس اطلاع نے اسے اندر سے اُچھال دیا تھا کہ مراد نہ کسی جیل میں ہے نہ کسی کے شکنجے میں ہے۔ وہ اس کی تلاش میں بھٹک رہا ہے۔

وہ اس بھٹکنے والے کے لیے بھڑک گئی۔ جیسے ابھی اُڑتی ہوئی اس کے پاس پہنچنا چاہتی ہو۔ کہاں تو یہ کہ اس کی گرفت سے نکل نہیں پا رہی تھی۔ کہاں یہ کہ ایکدم سے مچل کر پوری قوت سے ایک ہاتھ کی کہنی اس کے پیٹ میں ماری۔ مرینہ کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔ "ہائے کتیا۔۔۔!"

وہ ایک ناقابلِ شکست فائٹر تھی۔ ایک نازک اندام لڑکی کا نازک سا حملہ ایسا ہی تھا جیسے چیونٹی نے کاٹا ہو۔ لیکن چیونٹی بھی اچانک کاٹے تو ایک ذرا سی لمحاتی تلملاہٹ ہوتی ہے۔

مرینہ اچانک حملے کے باعث اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی۔ پیچھے ہی ایک چھوٹا سا گڑھا تھا۔ وہاں لڑکھڑا کر گر پڑی۔ ہاتھ سے ریوالور چھوٹ کر اندھیرے میں کہیں چلا گیا۔

ماروی بھی اس کے ساتھ گری۔ اس کی گرفت سے آزاد ہو کر لڑھکتی ہوئی ذرا دور جا کر اٹھ گئی۔ یہ دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ آگے کیا ہے؟ اسے مرینہ سے دور ہونا تھا اور

مراد کی طرف بھاگنا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے راستہ ٹٹولتی ہوئی ایک قدم آگے بڑھی تو جھٹکا کھا گئی۔ پاؤں ڈھلان پر پڑا تھا۔ وہ ڈگمگا گئی۔ گرتے گرتے حلق سے چیخ نکلی۔ ''مراد...!''

وہ ایسے گری جیسے کسی نے پٹخ دیا ہو۔ ڈھلان دور تک گئی تھی۔ نیچے لڑھکنے کے دوران پھر اس نے پکارا۔ ''مراد...!''

رات کے سناٹے میں دور تک آواز گونج رہی تھی۔

''مراد۔ مو۔ را... آد۔ آد۔ آد۔ آد...''

ایک تو پتھریلی زمین تھی۔ نیچے جاتے جاتے کسی بڑے پتھر سے سر ٹکرایا تو جیسے موت نے دبوچ لیا۔ پانچوں حواس نے یکبارگی اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ بیہوش ہوگئی۔

دوسرے ہی لمحے میں جیسے معجزہ ہوگیا۔

دور کہیں تاریکی سے مراد کی گونجتی لہراتی ہوئی آواز آئی۔ ''ماروی۔ وی۔ ای۔ ای۔ ای...''

مرینہ کے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ پہلے ماروی نے اسے پکارا تھا پھر جواباً گمشدہ بھی پکار رہا تھا۔

جیسے کانوں نے دھوکا کھایا ہو۔ مرینہ کو یقین نہیں ہوا۔ جسے اٹھائیس گھنٹوں سے تلاش کر رہی تھی وہ ماروی کی ایک آواز پر آگیا تھا۔ ارے یہ کیسا عشق ہے...؟

اور... اور وہ خطرہ بن کر آگیا تھا۔ وہ ماروی کو دھوکا دے کر لے جا رہی تھی۔ اب وہ دھوکا دینے والی کو صحیح سلامت چھوڑنے والا نہیں تھا۔

وہ زمین پر گری ہوئی تھی۔ فوراً ہی اِدھر اُدھر رینگتے ہوئے اپنا ریوالور ڈھونڈنے لگی۔ اُدھر تین تابعدار دشمن بن گئے تھے۔ اِدھر سے جان کا دشمن چلا آرہا تھا۔

مراد آخر موٹر سائیکل سے پیچھا چھڑا کر ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنی ماروی تک پہنچ ہی گیا تھا۔ پہلے تو اس نے دور ہی سے لینڈ کروزر اور ٹیکسی کی ہیڈلائٹس دیکھی تھیں۔ فوراً ہی ڈرائیور کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا تھا۔ ''ہیڈلائٹس بجھاؤ۔''

اس نے بجھا دی تھیں پھر مراد نے کہا۔ ''اندھیرے میں اسی طرح آہستہ آہستہ آگے بڑھو۔ یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں اور وہاں سڑک پر کیوں رُکے ہوئے ہیں؟''

ایسے ہی وقت ادھر سے ایک گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنا بیگ اٹھا کر ٹیکسی سے باہر آتے ہوئے ڈرائیور سے بولا۔ ''یہیں رکو۔ میں ابھی آؤں گا۔''

وہ تاریکی میں سڑک کے کنارے بڑی احتیاط سے آگے بڑھنے لگا۔ تب ادھر گاڑیوں کی طرف سے کسی کی آواز سنائی دی۔ وہ بول رہا تھا۔ ''اے میڈم! ہم نے تم پر لعنت بھیج دی ہے۔ اب اگر زندہ رہنا چاہتی ہو تو یہاں سے اکیلی جاؤ گی۔''

مراد نے آواز پہچان لی۔ وہ مرینہ کے تینوں تابعداروں کو تاریکی میں بھی ان کی آوازوں سے پہچان سکتا تھا۔ یہ کسی شک وشبہ کے بغیر معلوم ہوگیا کہ وہاں مرینہ ہے اور مرینہ ہے تو وہاں یقیناً ماروی بھی ہے۔

تابعدار کی بات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ مرینہ سے باغی ہوگئے ہیں اور اسے چیلنج کر رہے ہیں۔ پھر ایک فائر کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی مرینہ کہہ رہی تھی۔ ''میں مات کھانے کے لیے پیدا نہیں ہوئی ہوں۔ ابھی تم تینوں کو زخمی اور اپاہج بنا کر لے جاؤں گی۔''

اس کی آواز سنتے ہی مراد کے دل نے تیزی سے دھڑک کر پوچھا۔ ''میری ماروی فائرنگ کرنے والوں کے درمیان کہاں ہوگی؟ یا خدا...! اسے سلامتی دے۔''

وہ تیزی سے اُدھر جانے لگا۔ ایسے وقت یکے بعد دیگرے تین گولیاں چلی تھیں۔ پھر ایک تابعدار کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''ماروی! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مراد جام تمارو کی جیل میں نہیں ہے۔ وہ آزاد ہے۔ مرینہ پر تھوک کر تمہاری تلاش میں کہیں بھٹک رہا ہے۔''

یوں مراد پر ایک ایک بات واضح ہو رہی تھی۔ وہ مرینہ پر لعنت بھیجتا ہوا ان دو گاڑیوں کے قریب پہنچ رہا تھا۔ زمین پر جھک گیا تھا۔ چاروں ہاتھ پاؤں سے رینگتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

وہاں ایک اور گولی چلنے کے بعد خاموشی چھا گئی تھی۔ یہ وہ لمحات تھے۔ جب ماروی نے یہ سنا تھا کہ اس کا مراد کسی کا قیدی نہیں ہے اور اس کی تلاش میں بھٹک رہا ہے۔ یہ سنتے ہی وہ بھڑک گئی تھی۔ کمزور ہونے کے باوجود مرینہ پر حملہ کیا تھا۔ جس کے نتیجے میں ایک ڈھلان کی طرف لڑھکتے ہوئے اس نے مراد کو پکارا تھا۔

یہی تو وہ لمحات ہوتے ہیں جو پیار کرنے والے دلوں میں بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک پیدا کر دیتے ہیں۔

مراد نے جیسے پل صراط سے گزرتے ہوئے صدیوں کی تلاش کے بعد ماروی کی آواز سنی تھی۔ وہ چاروں ہاتھ پاؤں سے رینگ رہا تھا۔ ایکدم سے اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے بے اختیار حلق پھاڑ کر ماروی کو پکارا۔ پھر اندھا دھند اُدھر دوڑتا چلا گیا۔

یہ پیار کی نادانی اور بے احتیاطی تھی۔ کہیں سے بھی

گولی آکر اسے لگ سکتی تھی لیکن قسمت اچھی تھی۔ مرینہ تاریکی میں ریوالور ڈھونڈ رہی تھی اور تینوں تابعداروں نے مراد کی آواز سنتے ہی فائرنگ روک دی تھی۔

پھر وہ رک گیا۔ آگے کدھر جائے؟

ماروی نے دوبارہ اسے پکارا تھا۔ پھر اپنی آواز کے ساتھ گم ہوگئی تھی۔ دور سڑک پر جہاں گاڑیوں کی ہیڈلائٹس کی روشنی تھی۔ ادھر نہ ماروی نہ چاچا چاچی اور نہ ہی دشمن دکھائی دے رہے تھے۔ سب ہی تاریکی میں گم ہوگئے تھے۔

اس کے موبائل فون میں ٹارچ تھی۔ وہ تاریکی میں ماروی تک پہنچ سکتا تھا۔ لیکن ٹارچ کی سمت گولیاں بھی ضرور آتیں۔

ایسے وقت دور تاریکی سے ایک تابعدار نے کہا۔ ''مراد! ہم نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ یہ سن لو کہ ہم نے اس ذلیل عورت پر تھوک دیا ہے۔ تم پر گولی نہیں چلائیں گے۔''

دوسرے تابعدار کی آواز سنائی دی۔ ''ہم اس کتیا کے تابعدار نہیں ہیں۔ اس حرام کی اولاد نے ہمارے ساتھی کو گولی ماری ہے۔ وہ زخمی ہوا تھا۔

یہ بیچارہ زخموں کی تاب نہ لا کر مرگیا ہے۔ ہم اس ذلیل کمینی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ تم اس سے ہوشیار رہو۔''

مرینہ سن رہی تھی۔ ہوا کا رخ بدل چکا تھا۔ وہاں سب ہی اس کے دشمن ہوگئے تھے اور پتا نہیں ماروی کہاں گم ہوگئی تھی۔ اس کی آواز نہیں آرہی تھی۔

وہ سوچ رہی تھی۔ ''اگر وہ مرگئی ہوگی تو مراد مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ میرا ایک ذرا لحاظ نہیں کرے گا۔''

ہاتھ سے ریوالور بھی نکل گیا تھا۔ ڈھونڈنے کے باوجود نہیں مل رہا تھا۔ وہ زمین پر رینگتی ہوئی لینڈ کروزر کی طرف جانے لگی۔ وہ شکست تسلیم کرنے والی اور میدان چھوڑنے والی عورت نہیں تھی۔ لیکن جنگ کے دوران عارضی طور پر پیچھے ہٹنا پڑتا ہے۔ وہ آئندہ دشمنوں سے نمٹنے کے لیے واپس آنے والی تھی۔ اس وقت رینگتی ہوئی آکر اپنی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

پھر سب نے گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ ایک نے چیخ کر کہا۔ ''وہ بھاگ رہی ہے۔''

دوسرے نے کہا۔ ''اسے جانے نہ دو۔''

تڑاتڑ دو گولیاں آئیں وہ لینڈ کروزر کی باڈی میں لگیں۔ مراد نے چیخ کر کہا۔ ''گولیاں نہ چلاؤ۔ اسے جانے دو۔ ماروی کو تلاش کرو۔ وہ چپ کیوں ہے؟ کیوں نہیں بول رہی ہے؟''

مرینہ گاڑی کی رفتار بڑھا کر بھاگتی جا رہی تھی۔ اس کے فرار ہوتے ہی وہ سب اپنے اپنے موبائل کی ٹارچ روشن کرتے ہوئے ماروی کو ڈھونڈنے لگے۔

جلال عرف جلاّ' چاچی چاچا کی مدد سے ٹیکسی کو دھکے دیتے ہوئے اِدھر سے اُدھر گھماتے ہوئے دور تک ہیڈ لائٹس کی روشنی پہنچانے لگا۔ مراد نے بھی ان کی مدد کی وہ ٹیکسی کو ڈھلان کی طرف لائے تو پھر سب ہی چیخ پڑے۔ وہ دور ڈھلان کے نچلے حصے میں بڑے سے پتھر کے پاس ساکت پڑی ہوئی تھی۔

مراد دوڑتا ہوا چلا تیں لگاتا ہوا اس کے پاس آیا۔ اسے آوازیں دیں پھر اس کے پاس دوزانو ہو کر اس کے سر کو اٹھایا۔ وہ بیہوش تھی۔ ایک طویل جدائی کے بعد یہ کیسی ملاقات تھی؟ اپنے دیوانے عاشق کا لمس بھی اسے ہوش میں نہیں لا سکتا تھا۔

مراد نے چیخ کر کہا۔ ''وہاں پیچھے اندھیرے میں ایک ٹیکسی ہے۔ اسے فوراً لاؤ۔ اسے اسپتال پہنچانا ہوگا۔''

جلاّ اور ایک تابعدار اودھر دوڑتے چلے گئے۔ ایسے وقت کالنگ ٹون سنائی دی۔ چاچی لینڈ کروزر سے اُترتے وقت اپنا سامان اور ماروی کا فون لے آئی تھی۔ وہ فون کو مراد کے پاس لا کر بولی۔ ''بیٹے! اس فون پر سائیں محبوب بولتے ہیں۔ ان سے بات کرو۔ انہیں بتاؤ' یہاں ہم پر کیسی قیامت آئی ہے؟''

مراد نے اسے لے کر بٹن کو دبا کر کان سے لگایا۔ رابطہ ہوتے ہی محبوب کی آواز سنائی دی۔ ''ماروی! کہاں ہو؟ کیا جام تمہارو پہنچ گئی ہو؟ میں بہت بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں۔ جب تک مراد سے نہیں ملو گی مجھے سکون نہیں ملے گا۔''

مراد نے کہا۔ ''سائیں! السلام علیکم۔''

وہ چونک کر خوش ہو کر بولا۔ ''مراد... ! یہ تم ہو؟ مرینہ نے ماروی کو تمہارے پاس پہنچا دیا ہے؟ او تھینکس گاڈ!''

''ایسا کچھ نہیں ہے سائیں! وہ شیطان کی اولاد ماروی کو دشمنی سے لے جا رہی تھی۔ میں کسی کی قید میں نہیں تھا۔ اپنی ماروی کو تلاش کر رہا تھا۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ میں بھٹکنے والا ماروی کے پاس پہنچ گیا ہوں اور مرینہ اپنی سلامتی کے لیے یہاں سے بھاگ گئی ہے۔''

''تم دونوں کہاں ہو؟''

''میں کیا بتاؤں کہ ہم کہاں ہیں؟ اور یہاں کیا ہو رہا ہے۔ ماروی بیہوش ہے۔ ہم اسے کسی قریبی شہر کے اسپتال لے جا رہے ہیں۔ وہاں پہنچ کر فون کروں گا۔ آپ وہاں آ جائیں۔''

محبوب نے اپنے فون کو اور آہنی سلاخوں کو دیکھا۔ مراد نہیں جانتا تھا کہ وہ اس کی جگہ قیدی نمبر سات سو سات بن چکا ہے۔

فی الحال مراد سے رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ ادھر ماروی کو کسی قریبی شہر کے اسپتال لے جا رہا ہوگا۔ محبوب نے جیلر کے نمبر پنچ کیے۔ اس کا فون مصروف تھا۔

اس لیے مصروف تھا کہ مرینہ باپ سے بول رہی تھی۔ ''پاپا... ! ماروی ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ میرے تابعدار باغی ہو گئے ہیں۔ مراد نہ جانے کہاں مرا ہوا تھا۔ اچانک ہی آ دھمکا۔ میں بالکل تنہا ہو گئی تھی۔ ایک ہتھیار بھی میرے پاس نہیں تھا۔ بہت مجبور ہو کر وہاں سے بھاگ کر آ رہی ہوں۔''

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ''یہ کیا ہو گیا مرینہ؟ ادھر محبوب کو ماروی سے ہماری دشمنی کا علم ہوگا تو میں مصیبت میں پڑ جاؤں گا۔ اس کا منہ بند نہیں کر سکوں گا۔''

''ابھی محبوب کو معلوم نہیں ہوگا۔ فون ماروی کے پاس نہیں ہے۔ یہاں میری گاڑی میں پڑا ہوگا۔''

''لیکن یہ بات کب تک چھپی رہے گی۔ محبوب سے ماروی کا رابطہ نہیں ہوگا تو میں اسے کیا جواب دوں گا؟''

''میں نہیں جانتی پاپا! میں بہت اپ سیٹ ہوں۔ آج تک کبھی ایسی مات نہیں کھائی۔ میں مراد کو نہیں چھوڑوں گی۔ آپ وڈیرے شاہ ولی میاں کو فون کریں۔ میں وہاں پہنچنے والی ہوں۔''

اس نے کہا۔ ''میں ابھی اسے فون کرتا ہوں۔ مگر میری...''

وہ بات کاٹ کر بولی۔ ''میں شاہ ولی میاں کے مسلح کارندوں کو لے کر واپس اسی جگہ جاؤں گی پھر ان سے ٹکراؤ ہوا تو ان سب کے ہوش اڑا دوں گی۔ مراد کو اپاہج بنا کر اپنے قدموں میں نہ رکھا تو میرا نام مرینہ نہیں۔''

''تم اپنا غصہ نکالنے اپنا انتقام لینے کے لیے سوچ رہی ہو۔ یہاں میری شامت آنے والی ہے۔ انتقام بعد میں لینا۔ پہلے میری فکر کرو۔''

''میں کیا فکر کروں۔ آپ کو کیسے مشکل سے نکالوں جبکہ میں مشکل میں ہوں۔ یہ تو ایسا وقت ہے کہ ہمیں اپنی اپنی مشکل خود ہی آسان کرنی ہوگی۔ سوری پاپا! پھر کسی وقت کال کروں گی۔ آپ شاہ ولی کو فون کریں۔ میں وہاں جا رہی ہوں۔''

فون بند ہو گیا۔ وہ غصہ سے تلملانے لگا۔ خود کو گالیاں دینے لگا کہ بیٹی کی باتوں میں آ کر کیوں قیدی تبدیل کیے۔ اب مصیبت کے وقت وہ بھی ساتھ چھوڑ رہی تھی۔ وہ کرتی بھی کیا؟ جو مسئلہ درپیش تھا اس کا کوئی حل ہی نہیں تھا۔

اس کے فون پر محبوب کی مس کال کی اطلاع تھی۔ تھوڑی دیر پہلے اس نے کال کی تھی۔ ابھی پھر کر سکتا تھا۔ اس نے فوراً ہی فون کا سوئچ آف کر دیا۔ فی الحال اس سے کترانے کا یہی ایک طریقہ تھا۔

محبوب نے اسے مزید دو بار کال کی۔ پھر سمجھ گیا کہ وہ بات کرنے سے کترا رہا ہے۔ دونوں باپ بیٹی پھنس گئے ہیں۔ نجات کا راستہ تلاش کر رہے ہوں گے۔

اس نے سوچا۔ ''کوئی بات نہیں' کب تک کترائیں گے۔ جیلر کو تو مجھ سے بات کرنی ہی ہوگی۔''

اسے جیلر کے رویے پر غصہ نہیں آیا۔ وہ اندر سے بہت خوش تھا۔ ماروی مرینہ کے چنگل سے نکل کر مراد کی پناہ میں پہنچ گئی تھی۔ اگرچہ بیہوش تھی۔ تاہم جلد ہی اس کی خیر خیریت سننے والا تھا۔

اس کے لیے سب سے بڑی خوشی یہ تھی کہ جس کی زندگی کے آثار نہیں مل رہے تھے' وہ زندہ سلامت تھی۔ پھر یہ اطمینان ہوا کہ مراد اس کی حفاظت کے لیے پہنچ گیا تھا۔ مگر ہاں۔ یہ تشویش تھی کہ مرینہ' مراد کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ وہ اسے جیل سے نکال کر لے گئی تھی۔ اسے گرفتار کرنے کے لیے اپنے وسیع ذرائع اور اختیارات سے کام لے گی اور جب مراد تک پہنچے گی تو ماروی پھر اس کے شکنجے میں آ جائے گی۔

محبوب نہیں جانتا تھا کہ سیدھے سادے مراد نے بندوق اٹھائی ہے اور بدترین حالات سے مردانہ وار لڑتا آ رہا ہے۔ ایک سوچ یہ تھی کہ وہ تنہا ہے۔ مسلح دشمن کثیر تعداد میں ہوں گے تو وہ اپنی اور ماروی کی سلامتی کے لئے کچھ نہیں کر سکے گا۔

ابھی وہ خوش ہو رہا تھا اور ابھی فکر میں مبتلا ہو گیا۔ مختلف پہلوؤں سے سوچتے سوچتے یہ حقیقت سمجھ میں آئی کہ ماروی اور مراد محفوظ نہیں ہیں۔ مرینہ کسی وقت بھی ایک بدترین بلا کی طرح ان پر نازل ہو سکتی ہے۔

اس نے بے اختیار زیرلب کہا۔ ''مجھے ان کی سلامتی کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔

میں کیا کر سکتا ہوں؟ جبکہ آہنی سلاخوں سے باہر نہیں جا سکتا۔

ایک ہی راستہ ہے۔ معروف صاحب کو ایک کال کروں گا تو درجنوں سیکیورٹی گارڈز ان کی حفاظت کے لیے پہنچ جائیں گے۔

لیکن ایسا کرنے کے لیے خود کو ظاہر کرنا ہوگا۔ ابھی تو میں ان کی نظروں سے گم ہوں۔ ان سے فون پر بولوں گا تو وہ مجھے بلائیں گے یا میرے پاس آنے کی ضد کریں گے۔

کیا مجھے مجبور ہو کر بھید کھول دینا چاہیے کہ میں یہاں مراد کی جگہ پہنچا ہوا ہوں؟''

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ ''نہیں۔ جلد ہی مقدمہ ختم ہونے والا ہے' مجھے رہائی ملنے والی ہے۔ اس سے پہلے میرا اور معروف صاحب کو شاک نہیں پہنچانا چاہیے۔ معروف صاحب کو حقیقت معلوم ہوگی تو وہ مراد کو فوراً ہی واپس لا کر مجھے یہاں سے نکالنا چاہیں گے۔ یہ نامناسب ہوگا۔ میں بھی ایسا نہیں چاہوں گا۔

ابھی ماروی مراد کے ساتھ ہے۔ وہ مدتوں کے بعد مل رہے ہیں۔ انہیں ایک دوسرے سے بچھڑنا نہیں چاہیے۔

محبوب نے دوسرے پہلو سے سوچا۔ ''اگر میں معروف صاحب سے فون پر بات کروں۔ اپنا موجودہ ٹھکانا نہ بتاؤں۔ صرف انہیں ماروی اور مراد کی سیکیورٹی کے انتظامات کے لیے کہوں تب بھی راز کھل جائے گا۔ وہ اور سیکیورٹی والے ماروی کے ساتھ مراد کو دیکھیں گے تو اسے محبوب سمجھیں گے حقیقت نہیں چھپے گی۔ معلوم ہو جائے گا کہ مراد جیل سے باہر ہے اور اس کی جگہ محبوب اندر بیٹھا ہوا ہے۔''

وہ بڑی دیر تک ہر پہلو پر غور کرتا رہا۔ ماروی اور مراد کو مرینہ کے شر سے ہر حال میں بچانا تھا۔ ورنہ وہ جیل کی چار دیواری میں سکون سے رہ نہ پاتا۔

آخر اس نے معروف تجلی سے رابطہ کیا۔ فون پر ان کے نمبر پنچ کیے۔ پھر اسے کان سے لگایا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ پھر معروف تجلی کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو۔ کون...؟''

وہ دھیمی آواز میں بولا۔ ''میں بول رہا ہوں۔''

وہ دھیمی آواز دھماکا ثابت ہوئی۔ معروف بیٹھا ہوا تھا اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ چیخ کر بولا۔ ''محبوب! تم ہو...؟ کیا میں تمہاری آواز سن رہا ہوں؟ تم ہی بول رہے ہو نا...؟''

''جی ہاں۔ آپ پلیز زور سے نہ بولیں۔ میری اس کال کو راز رہنے دیں۔''

وہ دھیمی آواز میں بولا۔ ''تم کہاں ہو؟ ابھی یہاں آؤ۔ یا مجھے بتاؤ کہاں ملو گے؟''

”آپ سے معافی چاہتا ہوں‘ نہیں مل سکوں گا۔ وعدہ کرتا ہوں کچھ دنوں کے بعد حاضر ہو جاؤں گا۔“

”سمجھ میں نہیں آتا‘ کیوں چھپ رہے ہو۔ جبکہ ماروی زندہ ہے اور ہم اسے پھر واپس لا سکتے ہیں۔“

”میں نے اسی لیے فون کیا ہے کہ آپ اسے واپس لے آئیں گے مجھے یقین ہے... ابھی۔ میں ابھی آپ سے کوئی اور کام لینا چاہتا ہوں۔“

”ہاں بولو۔ مجھے کیا کرنا ہے؟“

”لنگڑا جانی کسی وقت بھی آپ کے پاس آئے گا۔ جتنی بھی رقم وہ مانگے‘ آپ اسے دیتے رہیں گے۔“

معروف نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”لنگڑے جانی سے کام لے رہے ہو؟ تم کیا کرتے پھر رہے ہو محبوب...؟“

”آپ سوالات کریں گے تو میں فون بند کر دوں گا۔ پھر آپ میری آواز کبھی نہیں سنیں گے۔“

وہ بولا۔ ”نہیں میں کوئی سوال نہیں کروں گا۔ لنگڑا جو مانگتا رہے گا اسے دیتا رہوں گا۔“

”اور آپ اس کے پیچھے جاسوس نہیں لگائیں گے کہ وہ میرے لیے کیا کر رہا ہے؟“

”میں تمہاری مرضی کے خلاف کچھ نہیں کروں گا۔ تم وعدہ کرو کہ مجھ سے رابطے میں رہو گے۔“

”یہاں بجلی نہیں ہے۔ بیٹری ڈاؤن ہونے والی ہے۔ یہ ایک پسماندہ علاقہ ہے۔ کسی دوسرے علاقہ میں جاؤں گا تو اسے چارج کرنے کے بعد ضرور رابطہ کروں گا۔ ابھی اجازت دیں۔ لنگڑا کسی وقت بھی آپ کے پاس آئے گا۔“

اس نے رابطہ ختم کرتے ہی لنگڑے جانی کے نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہونے پر بولا۔ ”میں محبوب علی چانڈیو بول رہا ہوں۔“

اس نے سلام کیا پھر کہا۔ ”سر! حکم کریں۔“

وہ بولا۔ ”اس بار لاکھوں روپے کا کام ہے۔ تم آج ہی زیادہ سے زیادہ اسلحہ خریدو گے۔ زیادہ سے زیادہ کرائے کے قاتلوں کو خریدو گے۔ ابھی معروف مجی صاحب کے پاس جاؤ۔ جتنی رقم چاہو گے‘ وہ تمہیں دیں گے۔“

”میں ابھی جاتا ہوں سر! ابھی آپ کا کام شروع کرتا ہوں۔ مگر کرنا کیا ہے؟“

”تم صبح سے پہلے اپنے مسلح تابعداروں کے ساتھ جام تھارو کی طرف جاؤ گے‘ میں تمہیں بتاتا رہوں گا کہ کدھر جانا ہے۔ تمہیں میرے ایک ہم شکل تک پہنچنا ہے۔ اس کے ساتھ وہی ماروی ہو گی‘ جس کے لیے ہم نے میمن گوٹھ میں جنگ لڑی تھی۔ تم ان دونوں کو سیکیورٹی دو گے۔“

”آپ جو چاہتے ہیں وہی ہو گا سر!“

”تمہارے تابعدار ان دونوں سے دور رہ کر ان کی نگرانی کرتے رہیں گے۔ مرینہ نامی ایک عورت ان کے لیے مصیبت بن گئی ہے۔ وہ لندن کی ایک پولیس افسر ہے۔ وہ سرکاری طور پر یا غیر سرکاری طور پر پولیس اور غنڈوں سے کام لے سکتی ہے۔“

”آپ فکر نہ کریں سر! یہ جانی آپ کے لیے جان لڑا دے گا۔ اور حکم کریں؟“

”معروف صاحب کو اور کسی کو بھی یہ نہیں بتاؤ گے کہ تم کس مقصد سے کہاں جا رہے ہو۔“

”سر! آپ کا کام رازداری سے ہو گا۔“

”تو پھر جاؤ۔ جتنی جلدی جام تھارو کی طرف جا سکتے ہو‘ جاؤ۔“

اس نے رابطہ ختم کر کے اطمینان کی گہری سانس لی۔ چار دیواری میں قید رہ کر وہ جس حد تک ماروی اور مراد کو سیکیورٹی دے سکتا تھا‘ دے رہا تھا۔

☆☆☆

جام تھارو کا وڈیرا شاہ ولی میاں بڑی بے چینی سے ماروی کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا بیٹا شاہ داد میاں اس سے بھی زیادہ اضطراب میں مبتلا تھا۔ جب سے یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ ایک ارب پتی محبوب علی چانڈیو کی معشوقہ ہے اور اس کے لیے وہ لاکھوں روپے لٹاتا رہتا ہے تب سے باپ بیٹے کے دماغوں میں یہ بات اٹکی ہوئی تھی کہ وہ ماروی کو وہاں قیدی بنا کر لاکھوں روپے کماتے رہیں گے۔

باپ سے زیادہ بیٹے نے کمائی کی پلاننگ کی تھی۔ اس کے ذہن میں ایک منصوبہ پک رہا تھا۔ ابھی اسے اچھی طرح پکا کر محبوب علی چانڈیو سے لاکھوں نہیں کروڑوں روپے حاصل کر سکتا تھا۔ بس ماروی کے وہاں پہنچنے کی دیر تھی۔

یہ تو ہوتا آیا ہے کہ جو سوچو‘ وہ نہیں ہوتا۔ کچھ اور ہو جاتا ہے۔ وہ جو توقع کر رہے تھے‘ وہ پوری ہونے والی نہیں تھی۔

ایک تھکا دینے والے انتظار کے بعد مرینہ وہاں پہنچی تو اسے تنہا دیکھ کر وہ حیران ہوئے۔ اس نے شاہ ولی میاں اور شاہ داد میاں سے مصافحہ کیا۔ وہ ایک دوسرے سے متعارف ہوئے پھر مرینہ نے انہیں بتایا کہ اس کے ساتھ کیا ہو چکا ہے۔ وہ باپ بیٹے مایوس ہوئے۔ ماروی ایک بلینک چیک تھی۔ کیش ہونے سے پہلے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔

مرینہ نے کہا۔ ”وہ ابھی ہاتھ آ سکتی ہے۔ آپ مجھے اپنے گن شوٹرز دیں۔ ان کی ٹیکسی خراب ہو گئی تھی۔ وہ وہیں ہوں گے یا وہاں سے زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔“

باپ بیٹے کے لیے تو ماروی اہم تھی‘ مرینہ حقیقتاً مراد پر جھپٹنے‘ اسے زخمی اور اپاہج بنا کر اپنی کسٹڈی میں رکھنے کے لیے اسی جگہ دوبارہ جانا چاہتی تھی۔

شاہ ولی میاں نے کہا۔ ”اگر ماروی کو پکڑ کر لا سکتی ہو تو ہمارے چار مسلح کارندوں کو لے جاؤ۔“

شاہ داد‘ ماروی کے لیے تڑپ رہا تھا۔ اس نے مرینہ سے کہا۔ ”تم یہاں کے علاقوں سے واقف نہیں ہو۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا اور تمہاری راہنمائی کروں گا۔“

وہ بولی۔ ”تھینک یو۔ اس سے اچھی بات اور کیا ہو گی۔ تمہارے جیسا گائڈ ملے گا تو وہ ہم سے بچ کر نہیں جائے گی۔ جلدی چلو۔ ورنہ وہ دور نکل جائیں گے۔“ شاہ داد اس کے ساتھ لینڈ کروزر میں آ کر بیٹھ گیا۔ چار کارندے ایک جیپ میں سوار ہو کر ان کے پیچھے چل پڑے۔

شاہ داد ڈرائیو کر رہا تھا۔ مرینہ ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ونڈ اسکرین کے پار رات کا اندھیرا دیکھ رہی تھی۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں ذرا دور تک سڑک نظر آ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”دیر ہوئی تو وہ اُدھر سے چلے جائیں گے۔ پلیز اسپیڈ بڑھاؤ۔“

وہ رفتار بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”کیا تم خاموش رہنے کی عادی ہو۔ یا غصہ میں بھری بیٹھی ہو؟“

”مجھے غصہ آ رہا ہے۔ پہلے مراد دھوکا دے کر فرار ہوا پھر یہاں آتے آتے میرے تینوں تابعدار اچانک دشمن بن گئے۔ اگر وہ دشمنی نہ کرتے تو ماروی ابھی تمہاری جیل میں ہوتی۔“

”فکر نہ کرو۔ ہم ماروی کو واپس لے آئیں گے۔“

”اس کے ساتھ مراد ہے۔ وہ بہت خطرناک ہو گیا ہے۔“

وہ حقارت سے بولا۔ ”اونہہ۔ اس سے سامنا ہو گا تو دیکھو گی کہ میں اس سے زیادہ خطرناک ہوں۔“

”میں بھی اس سے نمٹنا جانتی ہوں۔ بس یہی سوچ رہی ہوں کہ وہ لوگ وہاں موجود ہوں۔ مجھے شکست کا بدلا لینے کے لیے ان کی تلاش میں بھٹکنا نہ پڑے۔“

”پہلے تو یہ بات دماغ سے نکال دو کہ تم نے شکست کھائی ہے۔ تم نے نمک حراموں سے دھوکا کھایا ہے۔ ابھی جنگ جاری ہے تم پلٹ کر حملہ کرنے جا رہی ہو۔ ان نمک حراموں کو جہنم میں پہنچاؤ گی۔ پھر مراد کو باندھ کر ماروی کو میری گود میں بٹھا کر لاؤ گی۔“

مرینہ نے بڑی سنجیدگی سے مسکرا کر اسے دیکھا۔ ”تم بہت اچھے ہو۔ درست کہہ رہے ہو‘ ابھی میں نے شکست نہیں کھائی ہے۔ ابھی تو میں انہیں دوڑا دوڑا کر مارنے والی ہوں۔ مراد پھر میرے شکنجے میں آئے گا اور...“

وہ سر گھما کر اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اور ماروی کے لیے کیا کہہ رہے ہو...؟ وہ تمہاری گود میں بیٹھ کر آئے گی...؟ کیا ارادے ہیں جناب کے...؟“

وہ ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ہائے کیا بتاؤں‘ کتنے نیک ارادے ہیں۔“

وہ بولی۔ ”پہلے ہی اس کے دو عاشق ہیں۔ عاشق نمبر تین کہلانا چاہتے ہو؟“

”ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں حسن پرست اور عاشق مزاج نہیں ہوں۔ اگر ہوتا تو تم پر بھی عاشق ہو جاتا۔ تم بہت ہی خوبصورت اور پرکشش ہو۔“

”تھینک یو لیکن وہ گود میں بٹھانے والی بات تمہارے منہ سے نکلی ہے۔ صاف صاف بولو۔ وہ تمہاری جیل میں آئے گی تو اس کے ساتھ کیا کرو گے؟“

”مجھے عورت سے نہیں دولت سے دلچسپی ہے اور اس کے پیچھے ایک ارب پتی دولتمند ہے۔“

پھر اس نے مرینہ پر ایک نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ بتاؤ اگر تمہیں مراد سے دلچسپی ہے تو ماروی کو کیوں پکڑ کر لانا چاہتی ہو؟“

”ماروی‘ مراد کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ میرے شکنجے میں رہے گی تو مراد میرے آگے جھکتا رہے گا۔“

وہ بولا۔ ”یہی کھیل میں کھیلنا چاہتا ہوں۔ مجھے ماروی سے نہیں‘ اس کے ارب پتی عاشق سے دلچسپی ہے۔ میں ماروی کو اپنے شکنجے میں رکھ کر اس کے عاشق کی دولت سے کھیلتا رہوں گا۔“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”پھر تو ہمارے ارادے ایک ہیں اور ہمارے کام آنے والی سونے کی چڑیا بھی ایک ہی ہے۔“

وہ جس سڑک پر تھے‘ وہاں سے ایک اور سڑک نکل کر دوسری طرف جا رہی تھی۔ شاہ داد نے کہا۔ ”یہ سڑک سکھر کو جاتی ہے۔ میں یقین سے کہتا ہوں اگر دشمن ابھی جائے واردات پر نہیں ہیں تو وہ ضرور سکھر کی طرف گئے ہوں گے۔“

گاڑی تیز رفتاری سے جا رہی تھی۔ مرینہ ونڈ اسکرین کے پار توجہ سے دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔ ”میں جگہ پہچان رہی ہوں۔ ہم قریب پہنچ رہے ہیں۔“

شاہ داد نے فون پر ایک کارندے سے کہا۔ ’’ہوشیار رہو۔ہم پہنچ گئے ہیں۔گاڑی روکتے ہی ہیڈ لائٹس بجھا دینا۔‘‘

دونوں گاڑیوں کی رفتار سست ہوتی رہی پھر وہ ایک جگہ رک گئیں۔اچانک لائٹس بجھنے کے باعث کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔مرینہ نے سرگوشی میں کہا۔ ’’یہی جگہ ہے۔مگر خاموشی ہے۔ہمارے آنے سے کوئی ہلچل پیدا نہیں ہوئی ہے۔‘‘

وہ بولا۔ ’’وہ خاموش رہ کر چھپ کر ہمیں گھیرنا چاہیں گے۔‘‘

وہ بولی۔ ’’باہر نکلو۔میری طرف آؤ۔ہمیں اپنی گاڑی سے دور رہنا ہوگا۔وہ اسی طرف گولیاں چلائیں گے۔‘‘

وہ بہت محتاط رہ کر دشمنوں کی آہٹیں سننا چاہتے تھے۔اب ستاروں کی روشنی میں کچھ کچھ نظر آرہا تھا۔وہ دونوں چاروں ہاتھ پاؤں سے رینگتے ہوئے ایک جگہ رک گئے۔مرینہ نے سرگوشی میں کہا۔ ’’جو ٹیکسی خراب ہوگئی تھی وہ اسی جگہ تھی۔اب نہیں ہے۔اسے ٹھیک کرکے لے گئے ہوں گے۔‘‘

’’وہ سب ایک ٹیکسی میں کیسے گئے ہوں گے؟‘‘

’’مراد کسی گاڑی میں یہاں تک پہنچا تھا۔وہ دو گاڑیوں میں گئے ہیں۔یہاں شاید نہیں ہیں۔زمین پر لیٹ جاؤ۔میں انہیں للکار رہی ہوں۔‘‘

وہ دونوں سڑک کے کنارے چاروں شانے چت ہوگئے۔پھر مرینہ نے چیخ کر کہا۔ ’’مراد...!میں آگئی ہوں...‘‘

وہ چپ ہوکر جواب کا انتظار کرنے لگی۔وہاں کوئی ہوتا تو جواب دیتا۔اس نے گن کو آسمان کی طرف کرکے کئی فائر کیے پھر انتظار کرنے لگی۔جواباً فائرنگ نہیں ہوئی۔

شاہ داد نے فون پر ایک کارندے کو حکم دیا۔ ’’جیپ میں بیٹھ کر ہیڈ لائٹس آن کرو۔گاڑی گھما گھما کر روشنی میں دیکھو۔کوئی یہاں ہے بھی یا نہیں؟‘‘

اس کے حکم کی تعمیل کی گئی۔جیپ کی ہیڈ لائٹس ہر سمت دور تک جانے لگیں۔وہ سب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔پھر کارندے نے کہا۔ ’’سائیں!ادھر کوئی نہیں ہے۔‘‘

وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔پھر کھڑے ہوگئے۔شاہ داد نے کہا۔ ’’ہم نے یہاں آکر وقت ضائع کیا ہے۔پھر بھی انہیں پکڑ سکتے ہیں۔آگے سکھر جیسے بڑے شہر میں وہ کچھ دیر کے لیے ضرور رکیں گے۔‘‘

مرینہ نے اپنی گاڑی میں آکر بیٹھتے ہوئے کہا۔

’’فوراً چلو۔وہ کہیں ادھر سے بھی نہ چلے جائیں۔‘‘

وہ سب گاڑیوں میں آکر بیٹھ گئے۔وہاں سے اسی سڑک پر واپس جانے لگے۔آگے دو راہا تھا۔ایک راستہ جام تھارو اور دوسرا راستہ سکھر کی طرف جاتا تھا۔وہ اسی شہر کی طرف مڑ گئے۔

انہوں نے وقت ضائع کیا تھا۔لیکن اب ان کا اندازہ درست تھا۔مراد بیہوش ماروی کو اسی شہر کے اسپتال میں لے گیا تھا۔

☆☆☆

پتا نہیں نصیب میں کیسی محبت، کیسا عشق لکھا تھا کہ وہ ملتے ملتے بچھڑ جاتے تھے۔یا پھر مل کر بھی مل نہیں پاتے تھے۔ماروی اور مراد کے ساتھ اس وقت یہی ہورہا تھا۔وہ مل گئی تھی لیکن نہ اسے دیکھ رہی تھی نہ بول رہی تھی۔وہ پتھریلی ڈھلان پر لڑھکتی ہوئی ایک بہت بڑے پتھر سے ٹکرا کر لہولہان ہوگئی تھی۔سر سے اور بدن سے اچھا خاصا لہو بہہ گیا تھا۔اسے خون کی بوتلیں دی جارہی تھیں۔

ڈاکٹر نے کہا تھا کہ بے ہوشی طویل ہوگی۔شاید صبح تک ہوش میں آسکے گی۔ماروی کی طرف سے کسی حد تک اطمینان ہوگیا۔اسے بڑی پھرتی سے اسپتال پہنچایا گیا تھا۔وہ خطرے سے باہر تھی۔صبح تک ان سے باتیں کرنے والی تھی۔

انہیں ایک پہلو سے اطمینان تھا۔اس کے باوجود وہ کئی پہلوؤں سے خطرات میں گھرے ہوئے تھے۔مراد یہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ مرینہ ضرور پلٹ کر حملہ کرنے گی اور اسے تلاش کرتی ہوئی اسی قریبی شہر میں آئے گی۔

تب کیا ہوگا؟ اور وہ کیا کرسکے گا؟ صرف مقابلہ کرنے کی بات ہوتی تو وہ ڈرنے والا نہیں تھا۔مرنے مارنے والا بن چکا تھا۔ لیکن یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ شہر میں شاید گولیاں نہیں چلائے گی۔وہاں لندن کی پولیس افسر ہونے کا فائدہ اٹھائے گی۔اسے مفرور مجرم کہہ کر شہر کی تمام پولیس اور انٹیلی جنس والوں کو اس کے پیچھے لگائے گی۔پھر وہ کہاں چھپتا پھرے گا؟

فی الحال ماروی اسپتال میں تھی۔چاچی چاچا وہاں اسے تنہا نہیں چھوڑ سکتے تھے اور مراد بھی اس سے دور نہیں رہ سکتا تھا۔

اور یہ بھی مناسب نہیں تھا۔ایک جگہ رہنے سے وہ آسانی سے دیکھ لیے جاتے۔مجبوری یہ بھی تھی کہ ماروی کو صرف اسپتال والوں کے رحم و کرم پر چھوڑ نہیں سکتے تھے۔

وہ اس شہر میں اجنبی تھے۔الگ الگ کہیں جاکر چھپتے تو ان علاقوں کے لوگ ان پر شبہ کرتے، پولیس میں مخبری کرتے۔حالات ایسے تھے کہ ماروی کے ہوش میں آنے تک اسپتال اور شہر چھوڑ کر نہیں جاسکتے تھے۔

وہ بہت ہی پاگل کردینے والے مسائل میں الجھے ہوئے تھے۔فی الحال دعاؤں کا سہارا تھا اور اس وقت ایک ہی دعا تھی کہ ماروی کے ہوش میں آنے تک مرینہ مصیبت بن کر اُدھر نہ آئے۔

مراد اسپتال کے ایک حصے میں چاچا اور چاچی کے ساتھ بیٹھا موجودہ مسائل پر بات کررہا تھا۔چاچی نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر کہا۔ ’’مصیبتیں ہیں کہ ایک کے بعد ایک چلی آرہی ہیں۔ایسے وقت سائیں محبوب بہت یاد آتے ہیں۔اگر وہ جیل میں نہ ہوتے تو ابھی ہماری مدد کے لیے یہاں آجاتے۔‘‘

مراد نے چونک کر چاچی کو دیکھا پھر پوچھا۔ ’’کون جیل میں ہے؟ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ خدا نہ کرے وہ کبھی جیل کا منہ دیکھیں۔‘‘

چاچی نے کہا۔ ’’ماروی نے میرے پاس بیٹھ کر سائیں محبوب سے فون پر باتیں کی تھیں پھر مجھے بتایا تھا کہ وہ تمہاری جگہ جیل میں سزا کاٹ رہے ہیں۔‘‘

اس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔وہ بے اختیار چیخ پڑا۔ ’’یہ کیا بول رہی ہو؟ کیا ماروی نے تم سے کہا ہے؟ وہ کیسے جانتی ہے کہ سائیں محبوب جیل میں ہیں؟‘‘

’’مرینہ نے فون پر سائیں سے اس کی باتیں کرائی تھیں۔اس وقت وہ جیل کے اندر تھے۔وہیں سے بول رہے تھے۔ماروی ہوش میں آئے گی تو پوچھ لینا۔‘‘

چند لمحوں کے لیے مراد پر جیسے سکتہ طاری ہوگیا۔پچھلی باتیں ایک ایک کرکے ذہن میں گھومنے لگیں۔مرینہ کی مکاری سمجھ میں آنے لگی کہ اس نے اسے جیل سے فرار نہیں کرایا ہے۔اس مکار نے اپنے طور پر چال چلی ہے۔

اس کی سمجھ میں آرہا تھا کہ وہ مفرور ہوکر بھی مفرور نہیں ہے۔وہاں جیل میں کوئی سات سو سات نمبر کا قیدی ہے۔تب ہی اس کے خلاف گرفتاری کا وارنٹ ابھی تک جاری نہیں ہوا ہے اور وہ سات سو سات نمبر کا قیدی اس کا ہم شکل ہے۔یعنی وہ محبوب علی چانڈیو صاحب ہیں۔

اس نے پریشان ہوکر چاچی سے پوچھا۔ ’’سائیں میری جگہ کیوں گئے ہیں؟ انہوں نے ایسا کیوں کیا ہے؟ مجھے کیوں نہیں بتایا کہ وہ ایسا کرنے والے ہیں اور اب تو انہیں جو کرنا تھا‘ وہ مجھے بے خبر رکھ کر کرچکے ہیں۔‘‘

چاچی نے ماروی کے فون پر محبوب کے نمبر پنچ کیے پھر اسے مراد کو دیا۔اس نے فون لے کر اسے کان سے لگایا۔رابطہ ہونے پر محبوب کی آواز سنائی دی۔ ’’ہیلو...؟‘‘

مراد نے کہا۔ ’’سائیں!میں بول رہا ہوں۔‘‘

وہ خوش ہوکر بولا۔ ’’او مراد!ماروی کیسی ہے؟ کیا اسے ہوش آگیا ہے؟ اسے زیادہ چوٹیں تو نہیں آئی ہیں؟‘‘

’’وہ ابھی بے ہوش پڑی ہے۔اسے خون دیا جارہا ہے۔ہم سکھر کے اسپتال میں ہیں۔ڈاکٹر نے کہا ہے وہ دیر سے ہوش میں آئے گی۔لیکن میں ہوش میں آگیا ہوں۔‘‘

محبوب نے پوچھا۔ ’’یہ کیا کہہ رہے ہو؟‘‘

’’آپ نے مجھے بے ہوش رکھا‘ بے خبر رکھا۔کیا آپ نے مجھے بیوقوف نہیں بنایا؟‘‘

محبوب کچھ بول نہ سکا۔مراد نے بڑے صدمے سے کہا۔ ’’اس وقت آپ میری جگہ ہیں۔‘‘

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ’’ایسا کرنا ضروری تھا۔میرا دل کہہ رہا تھا کہ ماروی زندہ ہے اور جہاں بھی ہے میری پناہ میں واپس نہیں آئے گی۔اگر تم جیل سے باہر جاؤ گے‘ اسے یقین ہوگا کہ مراد رہائی پاکر آیا ہے تو وہ چھپ کر نہیں رہے گی۔تمہارے پاس بھاگی چلی آئے گی۔‘‘

’’آپ ہمیں ملانے کے لیے ایک مجرم‘ ایک قیدی بن گئے ہیں۔آپ نے اپنی عزت‘ اپنی شہرت اور اپنی شخصیت کو کیوں اس طرح خاک میں ملایا ہے؟

’’یہ نہیں سوچا کہ مقدمہ میرے خلاف ہوگا تو آپ کو پھانسی پر چڑھایا جائے گا؟‘‘

’’جو ہوگیا‘ اسے بھول جاؤ۔ماروی کے ساتھ موجودہ دلدل سے نکل کر یہاں آؤ اور خوش خبری سنو۔یہ مقدمہ ختم ہورہا ہے۔میں ایک آدھ ہفتے میں باہر آنے والا ہوں۔‘‘

وہ محبوب کی قربانیوں پر اندر سے قربان ہورہا تھا۔اوپر سے شکایتیں کررہا تھا۔پھر خوش ہوکر بولا۔ ’’کیا سچ کہہ رہے ہیں؟ مقدمہ کیسے ختم ہوگا؟‘‘

’’حشمت جلالی خود اسے ختم کررہا ہے۔یہاں آؤ گے اور میری رہائی تک محبوب بن کر رہو گے تو...‘‘

وہ بات کاٹ کر بولا۔ ’’میں آپ کی جگہ کیوں رہوں گا؟ سیدھا جیل میں اپنی جگہ آؤں گا اور آپ کو باہر کروں گا۔‘‘

’’مجھے کیسے باہر نکالو گے؟ اس کے لیے ان باپ بیٹی کا تعاون لازمی ہے اور وہ دشمن بنے ہوئے ہیں۔بھید کھلے گا

تو ایک مفرور قیدی کی جگہ لینے کے جرم میں پھر مجھے گرفتار کیا جائے گا۔“

”مراد...! قانون کو نہ چھیڑو۔ فی الحال مجھ سے دور رہو۔ میرے قانونی طور پر باہر آنے کا انتظار کرو۔“

”سائیں! مجھے شرم آرہی ہے۔ آپ میرے لیے کتنے دکھ اٹھاتے آرہے ہیں۔“

”اگر تم مجھے دکھ دیتے تو شرم کی بات ہوتی۔ میں تو اپنی مرضی سے یہاں آیا ہوں۔ یہ باتیں اب رہنے دو۔“ وہ سمجھانے کے انداز میں بولا۔ ”تمہیں اپنے موجودہ حالات سے نمٹنا ہے۔ مرینہ تم کو اور ماروی کو اس علاقے سے نکلنے نہیں دے گی۔ تم ابھی کہاں ہو؟“

اس نے بتایا کہ ماروی اس وقت سکھر کے ایک اسپتال میں ہے۔ فی الحال چاچی اور چاچا بھی اس کی دیکھ بھال کے لیے اسپتال کے برآمدے میں پڑے ہیں۔ اندیشہ ہے کہ مرینہ ادھر آئے گی تو وہ چھپ نہیں پائیں گے۔

وہ بڑی بے بسی سے بولا۔ ”کیا کروں سائیں...! اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ بڑی مشکل میں ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟ ماروی کو کہاں لے جا کر چھپاؤں۔“

”حوصلہ رکھو۔ میرے مسلح آدمی صبح تک تمہاری طاقت بننے کے لیے پہنچ جائیں گے۔ یہاں کا ایک خطرناک ٹارگٹ کلر لنگڑا جانی میرے لیے کام کرتا ہے۔ وہ تمہارے پاس آئے گا۔“

یہ باتیں کرتے وقت اس کے ذہن میں ایک اور بات آئی کہ مراد اور لنگڑا جانی اس شہر میں مجرمانہ جنگ لڑیں گے کیونکہ لنگڑا جانی ایک غنڈا قاتل ہے اور مراد مفرور مجرم ہے۔ اس کے برعکس مرینہ پولیس افسر کی حیثیت سے قانون کے مطابق انہیں دباؤ میں لائے گی۔ اس کا پلڑا بھاری رہے گا۔

مراد نے پوچھا۔ ”سائیں! آپ چپ کیوں ہوگئے؟“

وہ بولا۔ ”مرینہ پولیس افسر کی حیثیت سے تمہیں کمزور بنا دے گی۔ تم اس کے ہاتھ نہیں آؤ گے تو وہ اسپتال میں ماروی پر پہرے بٹھا دے گی۔ تم مفرور ہو۔ ماروی کو حاصل کرنے کے لیے اسپتال میں قدم نہیں رکھ سکو گے۔“

”آپ درست کہتے ہیں۔ وہ قانون کا سہارا لے کر ماروی کو لے جائے گی تو میں مر جاؤں گا یا اس چڑیل کو مار ڈالوں گا۔“

”جوش اور جنون میں ایسا کبھی نہ کرنا۔ میں ابھی معروف صاحب سے بات کرتا ہوں۔ وہ صبح تک سکھر پہنچیں گے اور ماروی کو اپنی منہ بولی بیٹی کہہ کر اپنی تحویل میں لے لیں گے۔ مرینہ کو اجازت نہیں دیں گے کہ وہ اسے کہیں لے جائے۔“

”آپ بہت عقل سے سوچتے ہیں سائیں! فوراً معروف صاحب کو یہاں بھیج دیں۔“

”لیکن تمہیں وہاں سے جانا ہوگا۔ تم معروف صاحب کی نظروں میں نہیں آؤ گے۔ ورنہ وہ تمہیں محبوب سمجھیں گے۔ پھر بھید کھل جائے گا کہ میں جیل میں بیٹھا ہوا ہوں۔“

”آپ میری طرف سے اطمینان رکھیں۔ میں ان کی نظروں میں نہیں آؤں گا۔“

محبوب نے اس سے رابطہ ختم کرکے معروف تجلی کو فون پر مخاطب کیا پھر کہا۔ ”میں آپ کو بہت پریشان کر رہا ہوں۔“

اس نے کہا۔ ”میری پریشانیوں کا احساس ہے تو ابھی آجاؤ۔“

آجاؤں گا۔ وعدہ کرتا ہوں۔ بہت جلد آؤں گا۔“

”خیریت تو ہے‘ اتنی رات کو فون کیا ہے؟“

”آپ کو تکلیف اٹھانی ہوگی۔ کیا آپ ابھی اسی وقت سکھر جاسکیں گے؟“

”میں تمہارے لیے جہنم میں بھی جاسکتا ہوں۔ اب کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟“

”وہاں اسپتال میں ماروی بے ہوش پڑی ہے۔“

”او گاڈ! یہ کیا کہہ رہے ہو؟ وہ سکھر کیسے پہنچ گئی؟“

”وہ بیچاری نہیں جانتی کہ کہاں پہنچی ہے۔ جیلر دلاور جان کی بیٹی مرینہ کے بارے میں اتنا کہہ دوں کہ وہ لندن کی ایک بہت ہی ضدی پولیس افسر ہے۔ ماروی کی دشمن ہے۔ یہ ایک لمبی داستان ہے کہ دشمن کیوں ہے؟

”فی الحال آپ کو وہاں پہنچ کر ماروی کو منہ بولی بیٹی بنا کر پولیس اور انٹیلی جنس والوں کو مطمئن کرنا ہے کہ ماروی لاوارث اور بے یار و مددگار نہیں ہے۔ وہ آپ کی سرپرستی میں ہے اور رہے گی۔ اس طرح مرینہ اسے اپنی کسٹڈی میں نہیں لے سکے گی۔“

”فکر نہ کرو۔ میں ماروی پر آنچ بھی نہیں آنے دوں گا۔ ابھی یہاں سے نکل رہا ہوں۔ ماروی کی دیکھ بھال کے لیے سمیرا کو ساتھ لے جا رہا ہوں۔“

”یہ بہتر ہوگا۔ ماروی کو سمیرا سے بڑا حوصلہ ملے گا۔ آپ اسے ضرور لے جائیں۔“

پولیس اور انٹیلی جنس والوں سے معروف تجی کے اچھے تعلقات تھے۔اس نے اسی وقت انسپکٹر جنرل آف پولیس کو فون پر مخاطب کیا۔وہ نیند میں تھا۔اس نے پوچھا۔"معروف صاحب! ایسی کیا اُفتاد آپڑی ہے کہ مجھے نیند سے جگا دیا ہے۔"

اس نے کہا۔"دوستی کا دعویٰ کرتے ہو تو پوری طرح آنکھیں کھولو اور سنو۔سکھر کے اسپتال میں میری ایک بیٹی ماروی بیہوش پڑی ہے۔دشمن اسے نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔تم ابھی وہاں کے پولیس افسران سے بولو کہ ماروی کو سخت سیکیورٹی میں رکھیں۔اس کے قریب صرف چاچا چاچی کو، سمیرا نامی لڑکی کو اور مجھ کو جانے کی اجازت ہوگی۔"

"میں ابھی وہاں فون کرتا ہوں۔"

"اور ایک اہم بات یہ ہے کہ مرینہ نامی لندن کی ایک پولیس افسر ماروی سے عداوت رکھتی ہے۔اسے ماروی کے قریب جانے کی اجازت نہ دی جائے۔"

آئی جی آف پولیس نے کہا۔"وہ بڑی افسر ہوگی لندن والوں کے لیے ہم اس کی دھونس میں آنے والے نہیں ہیں۔کیا تم ابھی سکھر میں ہو یا وہاں جانے والے ہو؟"

"میں ابھی جارہا ہوں۔بس یہاں سے نکلنے والا ہوں۔"

"جاؤ۔وہاں اگر سیکیورٹی میں کسی طرح کی کوتاہی ہوگی تو مجھے فوراً آگاہ کرنا۔"

اس نے وہاں سے رابطہ ختم کر کے سمیرا کو کال کی۔وہ سو رہی تھی۔نیند سے اٹھ کر بولی۔"معروف صاحب! خیریت تو ہے۔"

اس نے کہا۔"محبوب نہ خود خیریت سے رہتا ہے نہ ہمیں خیریت سے رہنے دیتا ہے۔ویسے پریشانی کی بات نہیں ہے۔اس کے کام سے ابھی سکھر جانا ہے۔کیا چلوگی؟"

"مجھ سے کیا پوچھتے ہیں۔محبوب کا کام ہے اور میں نہیں جاؤں گی؟ بولیں کب جانا ہے؟"

"ابھی اسی وقت میں آرہا ہوں۔تیار رہو۔"

باہر جو کچھ ہو رہا تھا، اس کی تحریک جیل کی چار دیواری سے ہو رہی تھی۔وہ قیدی نمبر سات سو سات وہاں بیٹھے بیٹھے مراد اور ماروی کی مشکلیں آسان کر رہا تھا۔

☆☆☆

رات دلِ دشمناں کی طرح کالی تھی۔گھڑی کے کانٹے ایک بجا رہے تھے۔مرینہ اور شاہ داد بھی دو چبھنے والے کانٹے تھے، لینڈ کروزر میں جاگ رہے تھے۔

اور شہر سو رہا تھا۔

ان کے پیچھے جیپ میں چار مسلح تابعدار تھے۔وہ سب بندوق کی نال سے پوچھنے آئے تھے کہ ماروی اور مراد کہاں ہیں؟

کہاں ہوں گے؟ سکھر کوئی چھوٹا شہر نہیں تھا کہ وہاں پہنچتے ہی ڈھونڈ نکالتے۔پہاڑ کو ڈھونڈنا نہیں پڑتا۔سوئی دھاگے کو ڈھونڈنے کے لیے گلی گلی گھر گھر جانا ہوتا ہے۔

شاہ داد نے ایک چوراہے کے پاس گاڑی روک دی۔پیچھے جیپ بھی رک گئی۔مرینہ نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے باہر دیکھا۔اِکّا دُکّا دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔انسان کم نظر آرہے تھے۔کتے خاصی تعداد میں اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔

اس نے ناگواری سے کہا۔"وہ کسی ہوٹل میں ہوں گے یا انہوں نے کسی کے گھر میں پناہ لی ہوگی۔"

شاہ داد نے کہا۔"کوئی ضروری نہیں ہے کہ وہ یہاں نیند پوری کرنے کے لیے رک گئے ہوں۔"

وہ بولی۔"ہاں مراد یہ سمجھتا ہے کہ میں پیچھا نہیں چھوڑوں گی۔ہوسکتا ہے یہاں نہ رکے۔آگے بھاگتا ہی جائے۔"

وہ سیٹ پر پہلو بدلتے ہوئے بولی۔"لیکن وہ دو راتوں سے جاگ رہا ہے۔میری طرح اسے بھی دن کو سونے اور تھکن دور کرنے کا موقع نہیں ملا ہوگا۔یہ ہوسکتا ہے کہ اسے یہاں پناہ لینے کی اور آرام سے سونے کی اچھی جگہ مل گئی ہو۔"

"یہاں ڈھونڈنا ہی ہوگا۔"

"مگر کیسے؟ کیا محلوں اور گلیوں میں جاکر لوگوں کی نیندیں خراب کریں۔"

مرینہ نے کہا۔"پولیس ہیڈ کوارٹر چلو۔قانون کے محافظ آدھی رات کو بھی گھروں کے دروازے کھلوا سکتے ہیں۔"

شاہ داد نے گاڑی آگے بڑھائی۔مرینہ نے ماروی کے فون پر کال کی۔جواب ملا کہ مطلوبہ نمبر بند ہے۔وہ حقارت سے بولی۔"بہت چالاک بنتا ہے۔اس نے ماروی سے کہا ہوگا کہ فون بند رکھے۔مجھ سے بات نہ کی جائے۔"

لینڈ کروزر ہیڈ کوارٹر کے احاطے میں داخل ہوئی۔جیپ کے مسلح تابعدار باہر رک گئے۔وہاں چند سپاہی جاگ رہے تھے۔عادات اور روایات کے مطابق دو افسران اپنی اپنی میز کے پاس ریوالونگ چیئر پر سو رہے تھے۔

ایک سپاہی نے انہیں افسران کے پاس جانے سے روکا۔شاہ داد تو رک گیا۔مرینہ طنطناتی ہوئی ایک افسر کے قریب آئی پھر اس نے میز پر ایک زور کا ہاتھ مارا۔رات کی خاموشی میں جیسے دھماکا ہوا۔افسر نیند سے ہڑبڑا کر کرسی سے

اُچھلا پھر گرتے گرتے سنبھل گیا۔پہلے چند لمحوں میں سمجھ نہ سکا کہ کیا ہوگیا ہے پھر ایک جوان عورت کو دیکھ کر طیش میں آگیا۔جیسے اسے مارنے کے لیے اٹھتے ہوئے بولا۔"یو نان سنس کون ہو تم؟"

وہ سخت لہجے میں بولی۔"اسپیشل آفیسر آن ڈیوٹی فرام اسکاٹ لینڈ یارڈ۔"

وہ اسے بے یقینی سے چپ ہوکر دیکھنے لگا۔مرینہ نے اپنا آئی ڈی کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔اس نے پڑھا تو منہ کھل گیا۔وہ کارڈ جیسے پتھر تھا، منہ کو لگا تھا۔اس نے فوراً ہی مرعوب ہوکر اسے سیلوٹ کیا۔

وہ سینہ تان کر بولی۔"میں ایک مفرور مجرم کو تلاش کرنے آئی ہوں۔اپنے اعلیٰ افسران سے بات کراؤ۔"

اس نے فوراً ہی اعلیٰ افسر کو کال کی۔دوسری طرف تھوڑی دیر تک بیل جاتی رہی۔پھر نیند بھری جھنجلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔"کیا آفت آگئی ہے؟ کیوں نیند سے جگا رہے ہو؟"

اس نے کہا۔"سر! معافی چاہتا ہوں۔لندن سے۔اسکاٹ لینڈ سے میرا مطلب ہے یو کے سے ایک بہت بڑی پولیس افسر آئی ہیں۔ان کا ایک مطلوبہ مفرور مجرم اس شہر میں کہیں چھپا ہوا ہے۔میں کیا بتاؤں، آگے آپ ان سے بات کریں۔"

مرینہ نے اس سے فون لے کر کان سے لگایا۔پھر بارعب دار آواز میں کہا۔"میں لندن کی میٹ MET آفیسر ہوں۔میٹروپولیٹن ایلائٹ ایس او فقطین اینٹی ٹررا اسکواڈ کی ڈٹیکٹو ہوں۔ہمارا ایک مطلوبہ مجرم اس شہر کی طرف آیا ہے۔آپ فوراً شہر کی ناکا بندی کرائیں اور ایک ایک گھر میں گھس کر اسے تلاش کرنے کا حکم دیں۔"

اعلیٰ افسر نے کہا۔"میڈم...! میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔آپ فون انسپکٹر کو دیں۔"

انسپکٹر نے فون کو لے کر کان سے لگایا۔وہاں سے کہا گیا۔"ڈیپارٹمنٹ کی تمام پولیس کو ڈیوٹی پر حاضر ہونے کا حکم دو۔شہر سے باہر جانے والے تمام راستوں کی ناکا بندی کراؤ۔میڈم سے معلوم کرو۔کیا مجرم تنہا ہے یا اس کے ساتھی بھی ہیں؟"

مرینہ نے اس سوال کے جواب میں کہا۔"اس کے ساتھ ایک جوان لڑکی ہے اور لڑکی کی چاچی اور چاچا ہیں۔وہ سب ایک ساتھ ہوں گے یا پھر ایک دوسرے سے دور رہ کر چھپ رہے ہوں گے لیکن وہ جوان لڑکی اس مفرور کے ساتھ ضرور ہوگی۔"

وہ ان کا حلیہ بتانے لگی۔ایک گھنٹے کے اندر شہر کی تمام پولیس حرکت میں آگئی۔جیسے شہر میں حاکم اعلیٰ آگیا ہو۔اس اعلیٰ افسر کے علاوہ دوسرے بڑے افسران بھی ہیڈ کوارٹر میں آگئے۔

وہ سب مرینہ سے مرعوب ہوگئے تھے اور اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے مستعد ہوگئے تھے۔انہوں نے اسے یقین دلایا کہ مجرم اس شہر میں ہوگا تو بچ کر نہیں جائے گا۔اسے صبح سے پہلے گرفتار کرلیا جائے گا۔

اس وقت ماروی اسپتال میں بیہوش پڑی تھی۔اسے خون پہنچایا جارہا تھا۔کمرے کے باہر برآمدے میں چاچی اور چاچا ایک طرف اپنا سامان رکھے بیٹھے تھے اور ماروی کے ہوش میں آنے کی دعائیں مانگ رہے تھے۔

جیل میں دن رات گزارنے اور ایک عرصے کی جدائی کے صدمات سے گزرنے کے بعد مراد کو ماروی ملی تھی۔لیکن مایوس کرنے والی ملاقات تھی۔وہ بیہوش تھی۔اسے خبر نہیں تھی کہ اپنے مراد کے پاس پہنچ گئی ہے۔

وہ اپنے دلدار کی ایک جھلک دیکھنے سے پہلے اپنے آپ سے ہی غافل ہوگئی تھی۔قسمت کا عجیب تماشا تھا۔ایک دیکھ رہا تھا۔دوسری نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔

مراد نے پریشان ہوکر ڈاکٹر سے پوچھا۔"چھ گھنٹے گزر چکے ہیں۔یہ ہوش میں کیوں نہیں آرہی ہے؟"

ڈاکٹر نے کہا۔"سر پر گہری چوٹ آئی ہے۔دماغ بڑی طرح متاثر ہوا ہوگا۔ہوش آنے میں دیر لگے گی۔آپ فکر نہ کریں۔صبح تک آنکھیں کھول دے گی۔"

وہ چاچی اور چاچا کے پاس آکر بیٹھ گیا۔بڑی فکر مندی سے بولا۔"ہمیں ایک جگہ نہیں رہنا چاہیے۔وہ دشمن عورت ہمیں تلاش کرتی ہوئی ادھر آسکتی ہے۔"

چاچی نے کہا۔"بیٹے! ہم ماروی کو ایسی حالت میں چھوڑ کر کہاں چھپنے جائیں؟"

وہ بولا۔"میرا ابھی دل نہیں مان رہا ہے اور عقل کہتی ہے مرینہ دوسرے مسلح بدمعاشوں کو خرید کر میرے پیچھے ضرور آئے گی اور وہ لندن کی پولیس والی ہے۔یہاں ہمارے خلاف پولیس والوں کی مدد حاصل کرسکتی ہے۔"

چاچا نے کہا۔"تمہیں تو فوراً کہیں جاکر چھپنا چاہیے۔"

وہ بولا۔"کسی ہوٹل میں، کسی گھر میں چھپنے نہیں جاسکتا۔پولیس والے ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں۔"

ماروی کے فون پر محبوب کا فون نمبر محفوظ تھا۔مراد نے

اسے اپنے فون میں Save کیا تھا۔اس نے وہ نمبر پنچ کیے۔رابطہ ہونے پر بولا۔"سائیں! میں مراد بول رہا ہوں۔"

وہ پریشان ہوکر بولا۔"مراد! کہاں ہو تم؟ تم نے فون پر کہا تھا کہ ماروی بیہوش ہے۔کیا ہوش میں آگئی ہے؟"

"یہ اسپتال میں ابھی تک بیہوش ہے۔مرینہ سے خطرہ ہے۔وہ پھر ہتھیاروں سے لیس ہوکر ادھر آئے گی۔"

"میں نے تم سے کہا ہے کہ تم لوگوں کے لیے حفاظتی انتظامات کر چکا ہوں۔لنگڑا جانی مسلح غنڈوں کے ساتھ آرہا ہے۔وہ مرینہ کی بدمعاشی کا جواب بدمعاشی سے دے گا۔معروف صاحب بھی صبح تک وہاں پہنچ جائیں گے۔وہ مرینہ سے قانونی جنگ لڑیں گے۔تم ماروی کی طرف سے مطمئن رہو۔اپنی فکر کرو۔اس شہر سے نکل جاؤ ورنہ پکڑے جاؤ گے۔"

"آپ درست کہتے ہیں۔مجھے یہاں سے دور جانا ہوگا لیکن دل نہیں مانے گا۔آپ ماروی کو بے ہوشی کی حالت میں دیکھتے تو تڑپ جاتے۔آپ بتائیں میں کس دل سے اسے چھوڑ کر جاؤں؟ میں اس شہر کے باہر کہیں آس پاس رہوں گا۔پھر کسی وقت آپ کو فون کروں گا۔"

وہ رابطہ ختم کرکے چاچی سے بولا۔"مجھے جانا ہی ہوگا مگر میں دور نہیں جاؤں گا۔آپ دونوں کو یہاں مجبوراً رہنا ہوگا۔مرینہ اِدھر ڈھونڈنے آئے گی۔آپ اسپتال سے باہر قدم نہ نکالیں۔وہ نظر آئے تو آپ کہیں چھپ جائیں۔"

وہ انہیں تاکید کرکے پھر کمرے کے پاس آیا۔اس نے دروازہ کھول کر بڑی بے چینی سے بڑے جذبے سے ماروی کو دیکھا۔وہ ساری دنیا سے، اپنے مراد سے اور اپنے آپ سے غافل پڑی تھی۔ایسے وقت اس کے چہرے کی معصومیت اور کشش اور بڑھ گئی تھی۔وہ اندر ہی اندر کھنچا چلا جا رہا تھا۔

وہ بڑی دیر تک اسے دیکھتا رہا۔پھر عقل نے سمجھایا۔"ساری عمر اسے دیکھتا رہوں گا۔پھر بھی دل نہیں بھرے گا۔خطرات کو سمجھنا ہے۔یہاں سے کہیں دور جانا ہوگا۔بس اتنی ہی دور کہ ضرورت پڑتے ہی فوراً یہاں پہنچ بھی سکوں۔"

اس کے جانے کے بعد چاچا نے کہا۔"بختی! ہمیں بھی ایک جگہ نہیں رہنا چاہیے۔تم یہاں برآمدے میں ماروی کے قریب رہو۔اسپتال کے احاطے میں کتنے ہی مریضوں کے رشتے دار سو رہے ہیں۔میں بھی وہیں رات گزاروں گا۔"

وہ اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔وہ فی الحال چھپنے کے لیے قرب و اطراف میں چلے گئے اور کہیں دور جا بھی نہیں سکتے تھے۔

اس وقت تک پولیس ہر سمت میں پھیل گئی تھی۔گھر گھر کی تلاشی لی جارہی تھی۔مرینہ نے شاہ داد سے کہا۔"میں سپاہیوں کے ساتھ اسکولوں کالجوں کے گرلز ہاسٹل میں جارہی ہوں۔تم اپنی جیپ میں مسجد مدرسوں اور اسپتالوں میں جاکر دیکھو۔"

وہ دو گاڑیوں میں مختلف سمت چلے گئے۔مرینہ کو گرلز ہاسٹل اور خواتین کے فلاحی اداروں سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں تھا۔وہ جھنجلا کر زیرلب بڑبڑانے لگی۔"جانے وہ ماروی کے ساتھ کہاں جاکر مر گیا ہے، نظر نہیں آرہا ہے۔پتا نہیں اس شہر میں ہے بھی یا آگے نکل گیا ہے؟"

شاہ داد انہیں تلاش کرتا ہوا اسی اسپتال میں پہنچ گیا تھا۔وہاں خاموشی اور ویرانی سی تھی۔تمام مریض اپنے وارڈز میں اور اسپیشل کمروں میں تھے۔ان کے رشتے دار برآمدوں میں اور اسپتال کے وسیع احاطوں میں پڑے ہوئے تھے۔

شاہ داد نے وہاں سے گزرتے ہوئے چاچا کو دیکھا۔وہاں اور بھی دو بوڑھے اور جوان اپنی عورتوں اور بچوں کے ساتھ سو رہے تھے۔مرینہ نے اسے چاچا اور چاچی کا حلیہ بتایا تھا۔وہاں جو بوڑھے سو رہے تھے وہ ایک ہی جیسے لگ رہے تھے۔کسی پر شبہ نہیں ہوا۔وہ وہاں سے گزر گیا۔

اسپتال کے کئی برآمدوں میں بوڑھی اور جوان عورتیں بیٹھی اور لیٹی ہوئی تھیں، کچھ جاگ رہی تھی۔کچھ سو رہی تھیں۔شاہ داد ان پر نگاہیں ڈالتے ہوئے چاچی بختی کے پاس آکر رک گیا۔

وہ کچھ بتائے ہوئے حلیے کے مطابق لگ رہی تھی۔پاس بیٹھی ہوئی ایک بوڑھی عورت سے باتیں کررہی تھی اور کن انکھیوں سے دیکھ رہی تھی کہ کوئی اسے دیکھ کر رک گیا ہے۔آگے نہیں جارہا ہے۔اسے دیکھے ہی جارہا ہے۔

پھر چاچی نے غصّہ سے پوچھا۔"کیا ہے؟ کیوں ایسے دیکھ رہا ہے؟ جوان لڑکیاں اُدھر ہیں، اِدھر کیا ہے؟"

شاہ داد نے کہا۔"ناراض نہ ہوں۔میں ایک بوڑھی خاتون کو تلاش کررہا ہوں۔"

"کیوں تلاش کررہے ہو؟ اس بوڑھی کا کوئی نام تو ہوگا کوئی پہچان تو ہوگی؟"

"تم اتنا بتادو کہ تم کون ہو؟ کہاں سے آئی ہو۔"

وہ اپنا موبائل فون ایک نیلے رنگ کے بیگ میں رکھتے ہوئے بولی۔"اِدھر قریب ہی ایک بستی ڈاڈھو سے آئی ہوں۔میرا نام نور بانو ہے۔سب مجھے نوری کہتے ہیں۔جوانی میں نور برستا تھا۔اب غریبی، بیماری اور بڑھاپے

نے سارے کس بل ڈھیلے کر دیے ہیں۔وارڈ میں جگہ نہیں ہے یہاں پڑی ہوئی ہوں۔"

"کیا بیماری ہے؟"

وہ گھور کر بولی۔"کیا عورتوں کی بیماری تمہیں بتاؤں؟ کون ہو تم؟ ڈاکٹر تو نہیں ہو۔تمہیں شرم نہیں آتی؟"

پاس بیٹھی ہوئی بوڑھی خاتون نے کہا۔"تم کسی کو ڈھونڈنے آئے ہو تو ڈھونڈو ہمارے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟"

دور لیٹی ہوئی عورتیں اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔وہ پلٹ کر تیزی سے چلتا ہوا اسپتال کے باہر آکر جیپ میں بیٹھ گیا۔

ایک شہر سے دوسرے شہروں کے پولیس افسران سے رابطہ رہتا ہے۔آپس میں دوستی اور رشتہ داری بھی ہوتی ہے۔کراچی کے آئی جی آف پولیس اور سکھر کے ڈی آئی جی میں دوستی اور محبت تھی۔اس نے فون پر کہا۔"بھئی نواز صاحب! اتنی رات کو نیند خراب کررہا ہوں۔"

ڈی آئی جی نواز نے کہا۔"نیند تو پہلے ہی ایک میڈم نے اڑادی ہے۔اتنی رات کو لندن سے آکر ہمارے سروں پر سوار ہوگئی ہے۔ایک مفرور مجرم کو تلاش کررہی ہے اور پوری پولیس فورس کو شہر میں دوڑا رہی ہے۔"

آئی جی آف پولیس نے کہا۔"او گاڈ! میں اسی کے بارے میں بات کرنے والا ہوں۔کیا اس کا نام مرینہ ہے؟"

"ہاں۔تم اسے جانتے ہو؟"

"میں نے اس کے خلاف اہم احکامات صادر کرنے کے لیے تمہیں فون کیا ہے۔"

"بھئی وہ بہت اونچی چیز ہے۔تم اس کے خلاف کیا کرنے کو کہہ رہے ہو؟"

"اپنے ملک، اپنے قوانین اور اپنے پولیس ڈیپارٹمنٹ کو اہمیت دو۔وہ اسکاٹ لینڈ یارڈ سے آئی ہے۔فارگاڈ سیک اس سے ہرگز متاثر نہ ہونا۔"

"وہ وہاں کی MET آفیسر ہے۔"

"ہونے دو۔اس سے قانوناً مطالبہ کرو کہ جس کی تلاش میں دوڑا رہی ہے۔اُصولاً اس کے خلاف پہلے گرفتاری کا وارنٹ لے کر آئے۔اگر گرفتاری کا وارنٹ نہیں ہے تو اسے کوئی اہمیت نہ دو۔"

وہ قائل ہوکر بولا۔"میں ابھی اس سے مطالبہ کروں گا۔"

"اور ایک اہم بات ہے۔ماروی نامی ایک لڑکی اسپتال میں زیرعلاج ہے۔وہاں سخت سیکیورٹی کا انتظام ابھی کرو۔ماروی کے کمرے میں مرینہ کو یا کسی کو نہ جانے دو۔"

"میں ابھی انتظام کرتا ہوں۔"

"اسپتال میں اس کی چاچی چاچا ہیں اور صبح سمیرا اور معروف تھیمی نام کے دو افراد وہاں پہنچیں گے صرف ان چار افراد کو ماروی کے پاس جانے کی اجازت دو۔"

"اطمینان رکھو۔وہ لندن والی ماروی کے کمرے میں قدم بھی نہیں رکھ سکے گی۔"

ابھی سرد جنگ جاری تھی۔ایک دوسرے کے مقابلے میں آنے سے پہلے اپنے اپنے حربے دور سے آزمائے جا رہے تھے۔

مرینہ کے قانونی ذرائع مضبوط تھے۔لیکن معروف نے اس کی یہ کمزوری پکڑلی تھی کہ اس میٹ آفیسر کے پاس مراد کی گرفتاری کا وارنٹ نہیں تھا اور وہ مراد کا نام بھی ظاہر نہیں کررہی تھی۔اگر ظاہر کرتی تو اس کا جیلر باپ قانونی گرفت میں آجاتا۔

اُدھر مرینہ کے لیے مراد جتنا ضروری تھا۔شاہ داد کے لیے ماروی اتنی ہی اہم تھی۔وہ اس کے ذریعہ لاکھوں کروڑوں روپے حاصل کرنے کے لیے مرینہ کے ساتھ دوڑ لگا رہا تھا۔

وہ دونوں اپنی لینڈ کروزر اور جیپ میں بھاگتے پھر رہے تھے۔ایک چوراہے پر ان کی گاڑیاں آمنے سامنے آکر رک گئیں۔شاہ داد نے جیپ سے اتر کر اس کے پاس آکر کہا۔"نہ وہ سونے کی چڑیا نظر آرہی ہے نہ ہی وہ نامراد دکھائی دے رہا ہے۔"

وہ بولی۔"چار بجنے والے ہیں۔ایک آدھ گھنٹے میں صبح ہوگی اور وہ کہیں نظر نہیں آرہے ہیں۔"

"پولیس والے شہر کی ہر گلی کوچے میں جاچکے ہیں پھر بھی ہزاروں مکانات اور بڑی بڑی عمارتیں ہیں۔کئی دنوں میں بھی مکمل تلاشی نہیں لی جاسکے گی۔"

"مشکل تو یہ ہے کہ تلاش کرنے والے انہیں چہروں سے نہیں پہچانتے ہیں۔جیسا ان کا حلیہ بتایا ہے اسی کے مطابق انہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔"

"ہاں۔بہت سوں کے حلیے ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔تصویریں نہ ہوں تو ایسی ہی مایوسی ہوتی ہے۔"

"کیا تمہیں کسی پر شبہ ہوا ہے؟"

اس نے ذہن پر زور ڈال کر سوچا پھر کہا۔"ہاں ایک بوڑھی عورت ذرا کھٹک رہی تھی۔مگر وہ..."

"وہ کہاں تھی؟ تم نے کہاں دیکھا تھا؟"

"ایک اسپتال کے برآمدے میں دوسری عورتوں

کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔"
"ذرا سوچو تمہیں کیوں کھٹک رہی تھی؟"
"وہ کہہ رہی تھی بہت بیمار ہے۔ وارڈ میں جگہ نہیں ملی تو برآمدے میں رہتی ہے۔ ایک بہت ہی پسماندہ بستی ڈاڑھو سے آئی ہے لیکن اس کے پاس جو سامان تھا' وہ شہری تھا۔"
"یعنی شہری سامان کیسا تھا؟"
"وہ مجھ سے باتیں کرتے وقت ایک بہت ہی قیمتی موبائل فون اپنے بیگ میں رکھ رہی تھی اور وہ بیگ نیلے رنگ کا بالکل نیا تھا۔ اس پر "اوڈیاس" لکھا تھا۔"
مرینہ ایکدم سے اچھل پڑی۔ چیخ کر بولی۔ "وہ چاچی ہے... ماروی کی چاچی ہے... کم آن فوراً چلو۔ اسے پکڑو۔ کس اسپتال میں ہے؟"
وہ دوڑتا ہوا اپنی جیپ میں آکر بیٹھ گیا۔ پھر وہ دونوں تیزی سے گاڑیاں دوڑاتے ہوئے ادھر جانے لگے۔ کئی گھنٹوں کی بھاگ دوڑ اور پریشانیوں کے بعد چاچی کا سراغ ملا تھا۔
یقین تھا کہ ماروی بھی وہیں اسپتال میں ہوگی اور مراد بھی کہیں آس پاس چھپا ہوگا۔ اس کے بدن میں جیسے بجلی بھر گئی تھی۔ وہ اپنی لینڈ کروزر سے بھی پہلے وہاں پہنچ جانا چاہتی تھی۔ وہ ایک شخص اسے ٹھکرا کر اسے اچھی طرح پاگل بنا چکا تھا۔
وہ اسپتال کے احاطے میں پہنچے تو مسلح پولیس دکھائی دی۔ شاہ داد نے جیپ سے اتر کر کہا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں ایک بھی سپاہی نہیں تھا۔ یہ اتنے سارے اچانک کیوں آگئے؟"
مریضوں کو یا ضرورت مندوں کو اندر جانے سے کوئی نہیں روک رہا تھا۔ وہ سمجھ نہ سکے کہ پولیس کیوں آئی ہے؟ وہ دونوں اسپتال کے اندر تیزی سے آئے پھر اس برآمدے کی طرف جانے لگے' جہاں چاچی مَتی دوسری عورتوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔
وہاں مرینہ نے دور ہی سے اسے دیکھ لیا۔ وہ بھی اسے دیکھتے ہی پریشان ہوگئی' اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ مرینہ نے حقارت سے کہا۔ "مجھ سے کہاں بھاگ کر جاؤ گی؟"
پھر اپنی کمر پر دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ "ماروی کہاں ہے؟ اور وہ نامراد کہاں ہے؟"
وہ بولی۔ "میں نہیں جانتی مراد کہاں ہے۔ ماروی یہاں بیہوش ہے۔ اس کمرے میں ہے۔"
اس نے آگے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں دروازے کے سامنے ایک پولیس افسر کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ دو مسلح سپاہی کھڑے ہوئے تھے۔ مرینہ نے اُدھر دیکھا پھر آگے بڑھنے لگی۔ ایک سپاہی نے سامنے آکر اسے روکا۔ "میڈم! کمرا نمبر بارہ میں کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔"
وہ ڈانٹ کر بولی۔ "نونسینس... کیا تم جانتے ہو میں لندن کی پولیس افسر ہوں۔ یہ دیکھو۔"
اس نے آئی ڈی کارڈ نکال کر دکھایا۔ کرسی پر بیٹھے ہوئے افسر نے کہا۔ "میڈم! ہم جانتے ہیں آپ مس مرینہ ولاور ہیں۔ لندن کی پولیس آفیسر ہیں۔ یہاں کسی مفرور مجرم کو تلاش کر رہی ہیں۔ فار یور انفارمیشن اس کمرے میں کوئی مجرم نہیں ہے۔ ایک بیہوش مریضہ کو ٹریٹمنٹ دیا جا رہا ہے۔"
"میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔"
"سوری۔ اوپر سے آرڈر آیا ہے۔ کسی کو کمرے کے قریب بھی آنے کی اجازت نہ دی جائے۔"
وہ غصہ سے پاؤں پٹخ کر بولی۔ "وہاٹ نان سنس... ! کس نے آرڈر دیا ہے۔ میری اس سے بات کراؤ۔ میں ابھی اسے سیدھا کر دوں گی۔"
"آپ باہر جا کر سیدھا کریں۔ یہاں مریض ہو رہے ہیں۔ پلیز شور نہ مچائیں۔"
اس نے فون نکال کر ڈی آئی جی کے نمبر پنچ کیے۔ پھر رابطہ ہونے پر پوچھا۔ "یہاں کیا ہو رہا ہے۔ میں اسپتال میں آئی ہوں اور مجھے روم نمبر بارہ میں جانے سے روکا جا رہا ہے۔"
وہ بولا۔ "سوری۔ میڈم روم نمبر بارہ کے متعلق خصوصی احکامات ہیں۔ کسی پولیس افسر کو بھی اس کمرے میں جانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔"
وہ چیخ کر بولی۔ "اس کمرے میں جو مریضہ ہے۔ اس کے ذریعہ میں اس مفرور مجرم کو آسانی سے گرفتار کر سکوں گی۔"
"آپ نے فرمایا ہے' کسی انتھونی نامی مجرم کو گرفتار کرنے لندن سے آئی ہیں اور بارہ نمبر میں اس ملک کی ایک دیہاتی غریب لڑکی ہے۔ اس کا تعلق کسی بیرونی ملک سے آنے والے مجرم سے ہو ہی نہیں سکتا۔"
"میرے پاس ثبوت ہیں۔ میں یہ ثابت کر دوں گی کہ اس کا تعلق ہمارے مفرور مجرم سے ہے۔"
"تو پھر آپ یہاں آئیں۔ انتھونی کی گرفتاری کے وارنٹ کی ایک فوٹو کاپی ہمیں دیں اور یہ تحریری بیان دیں کہ کمرا نمبر بارہ کی مریضہ ماروی سے انتھونی کا مجرمانہ رشتہ ہے۔"
مرینہ کو چپ لگ گئی۔ کوئی انتھونی نام کا مجرم نہیں تھا۔ وہ اپنے لندن پلٹ ہونے کا اور اپنے آئی ڈی کارڈ کا

رعب اور دبدبہ طاری کر کے جھوٹ بول کر وہاں کی پولیس فورس کو دوڑا رہی تھی۔
وہاں کے افسران جھوٹ اور فراڈ کے سلسلے میں اس کا محاسبہ اس لیے نہیں کر سکتے تھے کہ مطلوبہ مجرموں کو گرفتار کرنے کے اور انہیں تلاش کرنے کے سلسلے میں کسی بھی ملک کی پولیس جھوٹ بولنے کی گنجائش رکھتی تھی۔
اس ملک کی حکومت خود باہر سے آنے والے سیکریٹ ایجنٹس کا ساتھ دیتی ہے۔ برنارڈ جیسے قاتل اور ملک دشمن سیکریٹ ایجنٹ کو یہاں سے فرار کرانے کے سلسلے میں مرینہ کو رازداری سے سہولتیں دی جا رہی تھیں۔ یوں وہ اپنے معاملے میں بھی قانون کے خلاف من مانی کرنے لگی تھی۔
وہ کسی انتھونی کے خلاف وارنٹ پیپرز کی فوٹو کاپی نہیں دے سکتی تھی۔ ٹھیک ماروی کے دروازے پر آکر کمزور پڑ گئی تھی۔ اسے پیچھے ہٹنا تھا۔ لیکن مراد اس کے اندر شور مچا رہا تھا۔ "کہاں جا رہی ہو...؟ میں یہاں ماروی کے پیچھے چھپا ہوا ہوں۔ آؤ میری جان... ! اپنے یار کو لے چلو۔"
شاہ داد نے اس کے قریب جھک کر کہا۔ "مرینہ! اتنی بھاگ دوڑ کے بعد شکار سامنے ہے۔ کیا ہم ماروی کے اتنے قریب پہنچ کر ناکام رہیں گے؟"
مرینہ نے آگے بڑھ کر چاچی مَتی کی گردن دبوچ لی۔ پھر اسے جھٹکا دے کر کہا۔ "تمہیں تو لے جا سکتی ہوں۔ تمہارے پیچھے ماروی اور ماروی کے پیچھے وہ کھنچا چلا آئے گا۔"
اس بوڑھی کی گردن جیسے آہنی شکنجے میں آگئی تھی۔ وہ تکلیف سے بلبلاتی ہوئی بولی۔ "ہائے میں مر جاؤں گی۔ مجھے بچاؤ۔ میں اپنی بچی کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔"
کرسی پر بیٹھے ہوئے افسر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میڈم! پلیز اسے چھوڑ دیں۔ مریضہ کی یہ ایک چچی ہیں اور ایک چچا ہیں۔ ان کے لیے بھی ہمیں سیکیورٹی کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ ہماری نگرانی میں ہیں۔"
مرینہ نے چاچی کی گردن چھوڑ دی افسر کو گھورتے ہوئے بولی۔ "کس نے یہ احکامات صادر کیے ہیں۔ میں ابھی ہوم منسٹر سے بات کرتی ہوں۔"
وہ فون پر نمبر پنچ کرتے ہوئے وہاں سے تیزی سے چلتی ہوئی باہر اپنی گاڑی کے پاس آئی۔ شاہ داد نے کہا۔ "یہ ٹھیک ہے۔ ہوم منسٹر کو فون کرو۔ ابھی ماروی ہماری کسٹڈی میں آجائے گی۔"
وہ جھنجلا کر بولی۔ "ہوم منسٹر بھی کسی انتھونی کی گرفتاری کے وارنٹ پیپرز مانگے گا۔ میں اس شہر کے چھوٹے افسروں کو اپنے آئی ڈی کارڈ سے اپنے عہدے سے مرعوب کر رہی تھی۔ آگے یہ چالبازی کام نہیں آئے گی۔"
"میں ماروی کے لیے تمہارے ساتھ دوڑ رہا ہوں۔ یہ یہاں ہے۔ ہاتھ میں آتے آتے نہیں آرہی ہے۔"
"اور میں مراد کو یہاں کہیں دیکھ رہی ہوں۔ ماروی یہاں ہے تو وہ بھی یہیں کہیں چھپا ہوگا۔ وہ میرے ہاتھ آئے گا تو سمجھو ماروی تمہیں مل گئی۔"
"تم یہاں گراؤنڈ فلور اور فرسٹ فلور میں دیکھو۔ میں آخری فلور پر اور چھت پر جا کر دیکھتا ہوں۔"
وہ جانے لگا۔ مرینہ نے پوچھا۔ "اسے پہچان لو گے نا؟"
وہ جاتے ہوئے بولا۔ "ہاں جو بھی چھ فٹ سے اونچا باڈی بلڈر دکھائی دے گا' اسے نہیں چھوڑوں گا۔"
وہ دونوں اسپتال کے مختلف حصوں میں جا کر اسے تلاش کرنے لگے۔ مرینہ نے پہلے تو حیرانی سے سوچا کہ ماروی اور چاچی چاچا کو پوری پولیس فورس کی سیکیورٹی کیسے مل رہی ہے؟ ان غریبوں کے ذرائع کیا ہیں؟"
بات فوراً سمجھ میں آگئی کہ محبوب جیل کی چار دیواری میں بیٹھا اپنی ماروی کو تحفظ فراہم کر رہا ہے۔ اس نے جھنجلا کر باپ کو فون پر مخاطب کیا۔ "پاپا! پورے چالیس گھنٹوں سے اس کتے کے پیچھے بھاگ رہی ہوں۔ وہ ابھی ہاتھ آسکتا ہے۔ ماروی نظروں میں آگئی ہے لیکن میں اسے پکڑ نہیں پا رہی ہوں۔"
باپ نے پوچھا۔ "ایسی کیا بات ہے کہ وہ تمہارے سامنے ہیں اور تم انہیں پکڑ نہیں پا رہی ہو؟"
"آپ کو سمجھنا چاہیے' وہ دوسرا کتا جو جیل میں بیٹھا ہے۔ وہ وہاں سے رکاوٹیں پیدا کر رہا ہے۔"
وہ شدید حیرانی سے بولا۔ "ہائیں۔ یہ کیا کہہ رہی ہو؟ وہ کیسے رکاوٹیں پیدا کر رہا ہے؟"
"آپ نے جو فون اسے دیا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ وہ ارب پتی سرمایہ دار ہے پاپا... ! بڑے بڑے پولیس افسران تک پہنچ گیا ہے۔"
"میں نے تمہارے کہنے سے اسے فون دیا تھا۔"
"مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ اس فون کو زبردست ہتھیار کے طور پر استعمال کرے گا۔ آپ ابھی اس سے چھین لیں۔"
"کیا کہہ رہی ہو؟ وہ جس ہتھیار سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اسے کبھی واپس نہیں دے گا۔ میں زبردستی لینا

چاہوں گا تو جانتی ہو وہ میرے خلاف یہاں کیسے ہنگامے کرے گا؟“

وہ غصے سے چیخ پڑی۔ ”میں کچھ نہیں جانتی۔ وہ جو میری انسلٹ کر رہا ہے۔ اپنے پیچھے دوڑا رہا ہے۔ اسے دبوچ لوں گی۔ کچل ڈالوں گی۔ تب ہی سکون ملے گا۔ نہیں تو ہر پل مرتی رہوں گی۔“

”مرینہ! غصہ اور جنون تمہیں پاگل بنا رہا ہے۔ یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ جب تک محبوب یہاں سے باہر نہیں جائے گا۔ ہم اس کے دباؤ میں رہیں گے۔ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ اب توقع نہ رکھنا کہ یہاں سے کوئی نیا کھیل کھیل سکو گی۔“

باپ نے فون بند کر دیا۔ وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ آخر غصہ دکھانے اور جھنجلانے کی حد ہوتی ہے۔ عقل نے سمجھایا۔ نارمل ہو جائے۔ اسی میں بہتری ہے۔

وہ پجیرو کی پچھلی سیٹ پر آ کر لیٹ گئی۔ شاہ داد بھی مراد کو ڈھونڈنے میں ناکام رہا تھا۔ اب وہ ذرا آرام کر کے تازہ دم ہو کر پھر اسے تلاش کرنا چاہتے تھے۔ یہ تو کسی شک و شبہ کے بغیر یقین تھا کہ وہ ماروی کے آس پاس ہی کہیں قریب رہے گا۔ اسے چھوڑ کر دور نہیں جائے گا۔

ماروی کمرے میں بے ہوش تھی۔ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتی تھی۔ مراد بھی اس کے ساتھ نادیدہ زنجیروں سے بندھا ہوا تھا۔ مرینہ کو اطمینان تھا کہ شکار وہیں کہیں رہے گا اور وہ اپنی نیند پوری کر سکے گی۔ سمیرا اور معروف تجلی دوسرے دن آٹھ بجے وہاں پہنچ گئے۔ لنگڑا جانی بھی اپنے مسلح کارندوں کے ساتھ پہنچا ہوا تھا۔ انہوں نے سیدھے شریف انسانوں کا حلیہ بنا رکھا تھا۔ کوئی ان پر غنڈے بدمعاش ہونے کا شبہ نہیں کر سکتا تھا۔

ماروی ہوش میں آ گئی تھی۔ ڈاکٹر اس کا معائنہ کر رہا تھا۔ سمیرا، معروف، چاچی اور چاچا وہاں موجود تھے۔ اس کے لیے پریشان ہو رہے تھے۔ اس نے آنکھیں کھول دی تھیں لیکن ساکت پڑی ہوئی تھی۔ نہ کسی کو دیکھ رہی تھی۔ نہ بول رہی تھی۔ کسی کی آواز سن کر اس کی طرف دیکھتی بھی نہیں تھی۔

ڈاکٹر نے کہا۔ ”اسے شاک پہنچا ہے۔ یہ کوما میں ہے۔ رفتہ رفتہ نارمل ہو جائے گی۔“

یہ ایک نئی پریشانی تھی۔ کوما میں رہنے والے جلد ہی اُٹھنے بیٹھنے اور بولنے کے قابل نہیں ہوتے۔ وہ عجیب حالات سے گزر رہے تھے۔ ایک فکر ختم ہوتی تھی تو فوراً ہی دوسری سر پر سوار ہو جاتی تھی۔ وہ سب بے بسی سے ماروی کو دیکھ رہے تھے۔

پھر وہ اس کمرے سے باہر آ گئے۔ معروف نے چاچی سے پوچھا۔ ”تم سب کہاں تھیں؟ یہ زخمی کیسے ہو گئی، کیا مرینہ نے تم لوگوں سے دشمنی کی ہے؟“

چاچی نے کہا۔ ”وہ دشمن عورت ہمیں دھوکا دے کر کسی وڈیرے کی نجی جیل میں لے جا رہی تھی۔ جب ہمیں دھوکے کا علم ہوا اور ہم نے مخالفت کی تو وہ رات کے اندھیرے میں گولیاں چلانے لگی۔ ایسے ہی وقت ماروی ایک ڈھلان سے لڑھک کر بہت بڑے پتھر سے ٹکرا گئی تھی۔“

سمیرا نے پوچھا۔ ”وہ گولیاں چلا رہی تھی۔ تعجب ہے تم سب کیسے بچ گئے؟“

”مرینہ کے تین تابعدار اس کے دشمن ہو گئے تھے۔ ہم ان کی مدد سے بچ بچا کر یہاں آئے ہیں۔“

چاچی نے مراد کا ذکر نہیں کیا۔ محبوب نے پہلے ہی انہیں سمجھا دیا تھا کہ سمیرا اور معروف کے سامنے مراد کا نام بھی نہ لیا جائے اسی طرح یہ حقیقت چھپی رہ سکتی تھی کہ مراد جیل سے باہر ہے اور محبوب اس کی جگہ جیل کی کوٹھری میں پہنچا ہوا ہے۔

☆☆☆

مرینہ بڑی طرح تھکی ہوئی تھی۔ گہری نیند سے واپس نہیں آ رہی تھی۔ جب دھوپ چہرے پر پڑنے لگی تو آنکھیں کھل ہی گئیں۔ وہ فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر خود کو اپنی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر دیکھا۔ موبائل فون پر نو بج رہے تھے۔ اس نے فون پر شاہ داد سے پوچھا۔ ”کہاں ہو تم؟“

اس نے کہا۔ ”میں اسپتال کے اسی ممنوعہ برآمدے میں ہوں۔ جہاں ہمیں جانے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ ماروی کے ارب پتی عاشق کا ایک خاص آدمی معروف تجلی یہاں آ گیا ہے۔ انہی لوگوں نے ہمارے آگے دیواریں کھڑی کی ہیں ورنہ ہم اب تک ماروی کو یہاں سے لے گئے ہوتے۔“

وہ کان سے فون لگائے لینڈ کروزر سے باہر آ کر بولی۔ ”میں آ رہی ہوں۔ وہ معروف تجلی کہاں ہے؟“

”ڈاکٹر عابد خان کے چیمبر میں بیٹھا ہے۔ ابھی معلوم ہوا ہے کہ ماروی کو ہوش آ گیا ہے لیکن وہ کوما میں ہے۔“

وہ اسپتال کے اندر ایک برآمدے میں آتے ہوئے

بولی۔ ”میں کیا کروں؟ محبوب کی طرف سے سیکیورٹی سخت ہو گئی ہے۔ ہم ماروی کو ہاتھ نہیں لگا سکیں گے۔ تم مراد کے لیے سوچو اسے کہیں سے بھی ڈھونڈ نکالنا ہے۔ میں ابھی آ رہی ہوں۔“

وہ فون بند کر کے ڈاکٹر عابد خان کے چیمبر میں آئی۔ وہاں ڈاکٹر نہیں تھا۔ سمیرا اور معروف بیٹھے ہوئے تھے۔ مرینہ نے پوچھا۔ ”کیا آپ مسٹر معروف تجلی ہیں؟“

اس نے کہا۔ ”جی ہاں۔ فرمائیے؟“

وہ مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا کر بولی۔ ”آئی ایم مرینہ دلاورا سے میٹ آفیسر فرام لندن۔“

معروف نے مصافحہ کے لیے بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھا۔ پھر کہا۔ ”اگر تم وہی مرینہ ہو جو ماروی کو نقصان پہنچا رہی ہو تو سوری، میں اپنے ہاتھ میلے نہیں کروں گا۔“

وہ ایکدم سے سلگ گئی۔ ایسی توہین ہوگی یہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ یکبارگی چیخ پڑی۔ ”یو نان سنس۔ تم خود کو کیا سمجھتے ہو۔ میں تمہیں چٹکیوں میں اُڑا دوں گی۔ قانون کے ایسے شکنجے میں لاؤں گی کہ وہاں سے کبھی نکل نہیں سکو گے۔“

معروف نے فوراً ہی دروازہ کھول کر آواز دی۔ ”آفیسر! اس پاگل عورت کو یہاں سے بھگائیں۔ یہ ماروی کی طرح ہمیں بھی نقصان پہنچانے کی دھمکی دے رہی ہے۔“

افسر اور سپاہیوں کے آنے سے پہلے ہی مرینہ پاؤں پٹختی ہوئی کمرے سے باہر آ گئی۔ معروف کو گھونسا دکھاتی ہوئی وہاں سے جاتے ہوئے بولی۔ ”دیکھ لوں گی تمہیں...“

معروف نے دروازہ بند کر لیا۔ سمیرا نے کہا۔ ”یا خدا...! کیسی غصے والی عورت ہے۔ بے عزتی ہوتے ہی شعلے کی طرح بھڑک گئی۔“

”اپنے مقاصد میں ناکام ہو رہی ہے۔ اس لیے دو دو ہاتھ اچھل رہی ہے۔ جلد ہی بیٹھ جائے گی۔“

اس نے فون پر محبوب کو مخاطب کیا پھر کہا۔ ”سکھر پہنچتے ہی مصروف ہو گیا تھا۔ تم سے رابطہ نہ کر سکا۔ ماروی ہوش میں آ گئی ہے لیکن اس کی حالت اب بھی تشویشناک ہے۔“

محبوب نے پوچھا۔ ”کیا زخم گہرے ہیں؟“

”ڈاکٹر کہتے ہیں اسے شاک پہنچا ہے۔ اس لیے نہ کسی کو دیکھتی ہے نہ بولتی ہے نہ سنتی ہے۔ فی الحال کوما میں ہے۔ رفتہ رفتہ نارمل ہو جائے گی۔“

”آپ اسے کراچی لے آئیں۔ یہاں علاج کی سہولتیں زیادہ ہیں۔“

سمیرا نے معروف کا فون لے کر کہا۔ ”ہم آپ کی ماروی کے لیے یہاں تک آئے ہیں۔ دنیا کے آخری سرے تک بھی جائیں گے۔ جس کی خاطر آپ گھر چھوڑ کر گئے ہیں۔ وہ آج یا کل تک آپ کی کوٹھی میں آ جائے گی۔ اب تو آپ آ جائیں۔“

معروف نے فون کی طرف جھک کر کہا۔ ”خدا کے لیے واپس آ جاؤ۔ اب ہمیں ٹینشن میں مبتلا نہ کرو۔“

یہ بہت ہی جائز مطالبہ تھا۔ وہ پریشان ہو گیا۔ نہ آہنی سلاخوں سے باہر آ سکتا تھا۔ نہ اپنے چاہنے والوں کو فکر و پریشانی سے نجات دلا سکتا تھا۔

سمیرا نے پوچھا۔ ”چپ کیوں ہو گئے؟“

اس نے کہا۔ ”میں۔ آؤں گا۔ جلد ہی آؤں گا۔ لیکن کل نہیں آ سکوں گا۔ ایک اہم معاملے میں الجھا ہوا ہوں۔“

”کیا ہمارے پاس آ کر وہ معاملہ نہیں سلجھے گا؟“

”نہیں ضد نہ کرو۔ کہہ دیا نا۔ جلد ہی آؤں گا۔“

یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔ سمیرا نے خاموش فون کو دیکھا پھر کہا۔ ”معروف صاحب! کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ وہ ماروی کے دیوانے ہیں۔ ہم کل تک اسے یہاں سے کراچی لے جائیں گے۔ انہیں تو سر کے بل وہاں پہنچنا چاہیے۔“

”اور وہ آنے سے کترا رہا ہے۔ جس ماروی کے لیے جان کی بازی لگا دیتا ہے۔ اس کے پاس آنے سے کترا رہا ہے۔“

وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”عقل کام نہیں کر رہی ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کہاں چھپا ہوا ہے؟ کیوں چھپا ہوا ہے؟؟ اگر آ جائے گا تو کیا قیامت آ جائے گی۔ اس مجنوں کی اولاد نے تو میرا سر گھما کر رکھ دیا ہے۔“

☆☆☆

مرینہ اور شاہ داد مایوس ہو چکے تھے۔ ماروی ان کے سامنے تھی اور وہ اسے حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ اسے چھو بھی نہیں سکتے تھے۔ حتیٰ کہ اسے دیکھ بھی نہیں سکتے تھے۔ مراد کے سلسلے میں امید تھی کہ اس چیونٹی سے ہاتھی بننے والے کو اسی شہر سے ڈھونڈ نکالیں گے جبکہ وہ بھی انہیں مایوس کر رہا تھا۔

شاہ داد نے لینڈ کروزر کی باڈی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”ماروی تو ہاتھ نہیں آئے گی کوئی بات نہیں۔ اس سالے نامراد کو ہم جانے نہیں دیں گے۔“

مرینہ نے کہا۔ ”وہ نظروں میں آئے گا تو ہم اسے

کہیں جانے نہیں دیں گے اسے دونوں پیروں سے بھاگنے کے قابل نہیں رہنے دیں گے۔سمجھ میں نہیں آتا' کہاں غائب ہوگیا ہے؟"

"ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے۔وہ دن کے وقت یہاں شہر میں نہیں رہتا ہوگا۔آس پاس کے گاؤں دیہاتوں میں جاکر چھپ جاتا ہوگا۔پھر شاید رات کو ادھر آتا ہوگا۔"

وہ دور خالی خالی نظروں سے دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔پھر بولی۔"ہمیں شہر کے باہر کچھ دور تک جانا چاہیے۔ہوسکتا ہے اس کی گن گن مل جائے۔"

وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولی۔"کیا خیال ہے؟ہمیں کس طرف جانا چاہیے؟"

وہ ایک طرف دیکھتے ہوئے بولا۔"یہاں سے دس کلو میٹر کے فاصلے پر تاریخی عمارتوں کے کھنڈرات ہیں۔ادھر چلتے ہیں۔"

مرینہ نے چونک کر کہا۔"پہلے کیوں نہیں بتایا کہ وہاں کھنڈرات ہیں۔ایسی جگہ چھپنے کے لیے بڑی سازگار ہوتی ہے۔وہ ضرور وہیں چھپ کر رہتا ہوگا۔"

وہ اپنے مسلح کارندوں کے ساتھ اُدھر چل پڑے۔اس بار ان کا اندازہ درست تھا۔مراد تقریباً چالیس گھنٹوں سے بھاگتے رہنے کے بعد تھکن سے چور ہوگیا تھا۔ایک آدھ گھنٹے کی نیند پوری کرنے کے لیے اس کھنڈر میں چلا آیا تھا۔اس سہ منزلہ کھنڈر میں نیچے سے لے کر اوپر تک چھپنے کے لیے اچھی خاصی جگہیں تھیں۔اس نے گہری نیند سونے کے لیے ایسی جگہ کا انتخاب کیا' جہاں سے وہ مصیبت کے وقت بہ آسانی فرار ہوسکتا تھا۔اس نے نیچے سے اوپر تک گھوم پھر کر اس جگہ کو اچھی طرح دیکھا تھا۔اپنے آپ کو سمجھایا تھا کہ وہاں محفوظ رہے گا۔گہری نیند میں پتا نہ چلا کہ وہ چھ گھنٹے تک اپنے آپ سے بے خبر رہا۔

جب سورج سر پر آیا اور منہ پر دھوپ پڑی تو آنکھ کھل گئی۔ٹھیک اسی وقت گاڑیوں کی آوازیں سنائی دیں۔خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔سرہانے رکھی ہوئی گن اٹھا کر دوڑتا ہوا ایک جھجے کی طرف آیا۔وہاں سے چمکیلی دھوپ میں ایک لینڈ کروزر اور ایک جیپ دکھائی دیں۔اس نے دیوار کی آڑ میں ہو کر دیکھا۔دونوں گاڑیاں آگے پیچھے آہستہ آہستہ چل رہی تھیں۔کھنڈر کے چاروں طرف ایک چکر لگا رہی تھیں۔کھلی ہوئی جیپ میں چار مسلح شخص دکھائی دے رہے تھے۔ایسے وقت ایک گن مین کھنڈر کی طرف سے دوڑتا ہوا تیرو کی طرف جاتے ہوئے بولا۔"وہ اُدھر ہے۔وہاں چھپا ہوا ہے۔یہ دیکھو۔"

مرینہ اور شاہ داد تیرو سے باہر آگئے۔اس گن مین نے ایک پھٹا ہوا اخبار دکھاتے ہوئے کہا۔"یہ اُدھر پڑا ہوا تھا۔اس میں روٹی کے ٹکڑے تھے۔اس نے یہاں روٹیاں کھائی ہیں۔وہ یہاں چھپا ہوا ہے۔"

اس کی موجودگی کے آثار ملتے ہی وہ محتاط ہوگئے۔انہوں نے اپنے چار مسلح آدمیوں کو کھنڈر کے چاروں طرف دوڑایا تاکہ مراد کسی طرف سے فرار نہ ہوسکے۔وہ دونوں بھی دوڑتے ہوئے اِدھر اُدھر جاکر چھپ گئے۔

پھر مرینہ نے چیخ کر کہا۔"مراد...!بہت ہوچکا۔میں یہاں سے تمہیں نکلنے نہیں دوں گی۔ہتھیار پھینک کر سامنے آجاؤ۔تمہیں ایک گولی بھی نہیں لگے گی۔تم زندہ سلامت رہو گے۔"

شاہ داد نے چیخ کر کہا۔"یہ خون خرابہ ختم کرو۔ہم تمہیں ماروی کے ساتھ عیش و آرام سے رہنے دیں گے۔"

مرینہ نے دور چھپے ہوئے شاہ داد کو گھور کر دیکھا پھر کہا۔"اس کے ساتھ ماروی کا نام نہ لو۔وہ صرف میرا ہے میرا ہی رہے گا۔"

وہ بولا۔"اس کے ساتھ ماروی نہیں آئے گی۔تم آنے نہیں دوگی تو میری اتنی بھاگ دوڑ سے کیا حاصل ہوگا؟مجھے تو ہر حال میں ماروی کو لے جانا ہے۔"

"تم اسے لے جاؤ گے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ابھی یہ باتیں رہنے دو۔پہلے اسے قابو میں کرو۔"

پھر اس نے ایک طرف منہ اٹھا کر کہا۔"میں تمہاری خاموشی سے دھوکا نہیں کھاؤں گی۔یہ اچھی طرح جانتی ہوں تم یہاں چھپے ہوئے ہو۔مجھ سے بات کرو اور سامنے آؤ۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی ایک فائر کی زوردار آواز ابھری پھر پورے کھنڈر میں گونجنے لگی۔مراد کی آواز سنائی دی۔"مرینہ!واپس جاؤ۔میں اس حد تک دشمنی کے باوجود تمہارے لہو سے کھیلنا نہیں چاہتا۔"

"تم نے میرا کھیل تو دیکھا ہی نہیں ہے مراد...!میں آخری بار محبت سے کہہ رہی ہوں۔ہتھیار پھینک کر آجاؤ۔ورنہ قسم کھا چکی ہوں' اپاہج بنا کر لے جاؤں گی۔"

دوسری گولی چلی اور ایک گن مین کی چیخ سنائی دی۔وہ مراد کی نظروں میں آگیا تھا۔آسانی سے مارا گیا۔اس کی آواز سنائی دی۔"کیوں اپنے آدمیوں کو حرام موت مرنے کے لیے لائی ہو؟"

شاہ داد کھنڈر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے حقارت سے کہا۔ "کیا تم سمجھتے ہو ہماری گولیوں سے بچ کر نکل جاؤ گے؟"

"نہیں۔ جب گولیاں چلتی رہیں گی تو میں بھی مارا جاؤں گا۔ لیکن زندہ مرینہ کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔"

ایک گن مین نے کہا۔ "وہ اوپر والی منزل میں ہے۔"

"اوپر جانے کے دو زینے ہیں۔ ہم دونوں طرف سے جائیں گے۔ وہ ایک طرف سے آنے والوں پر گولیاں چلائے گا تو دوسری طرف سے آنے والے اسے بھون ڈالیں گے۔"

تھوڑی ہی دیر میں تڑاتڑ فائرنگ کی آوازیں گونجنے لگیں۔ وہ سب گولیاں چلاتے ہوئے اوپر آرہے تھے۔ مراد کا بچنا محال تھا۔ لیکن وہ چھت پر چلا گیا تھا اس کی فائرنگ سے دو اوپر آنے والے گولیاں کھا کر گرے۔ دو واپس بھاگتے چلے گئے۔"

شاہ داد کی کھوپڑی میں یہ بات آئی کہ میرے آدمی مارے جائیں گے۔ اگر مراد ہاتھ آئے گا تو مجھے کیا حاصل ہوگا؟ حاصل تو اس وقت ہوگا' جب میں مراد کو اپنی نجی جیل میں لے جاؤں گا۔ ماروی مراد کی دیوانی ہے اور محبوب ماروی کا دیوانہ ہے۔ وہ ارب پتی معشوقہ کے دلدار کو میری جیل سے نکالنے کے لیے کروڑ نہ سہی لاکھوں روپے ضرور ادا کرے گا۔ وہ مرینہ سے بولا۔ "میں اپنے آدمیوں کا نقصان اٹھا رہا ہوں۔ ان کے ساتھ مجھے واپس جانا چاہیے۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو؟ وہ ابھی ہمارے ہاتھوں مارا جائے گا۔ میں اسے اپاہج بنا کر لے جاؤں گی۔ حوصلہ کرو۔"

"حوصلہ کرنے سے مجھے کیا ملے گا؟ مراد کو تم لے جاؤ گی پھر ماروی مجھے کبھی ملے گی نہیں۔"

"یہ تو ہمارے درمیان پہلے طے ہوگیا تھا کہ مراد کو میں لے جاؤں گی اور ماروی کو تم۔"

"ماروی کا نام نہ لو۔ وہ نہیں ملے گی۔ میرے آدمی جان سے جارہے ہیں۔ میں مراد کو لے جاؤں گا۔"

"بکواس مت کرو۔"

یہ بکواس نہیں ہے۔ میں اس ارب پتی سے مراد کی رہائی کی بھاری قیمت لوں گا۔ تب ہی میرا نقصان پورا ہوگا۔"

"مراد میرا قیدی بن کر رہے گا۔ تب بھی تم اس ارب پتی سے لاکھوں روپے وصول کرسکو گے۔"

"مجھے اُلّو نہ بناؤ۔ تم مراد کو اپنی قید سے کبھی رہا نہیں کرو گی پھر وہ ارب پتی مجھے رہائی کی قیمت کیوں دے گا؟"

"پلیز یہ بحث یہاں نہ کرو۔ ہم پھر کسی وقت بات کریں گے۔ ابھی اسے تو پکڑو۔ مال ہاتھ میں نہیں آیا ہے اور تم ہو کہ بٹوارہ پہلے کررہے ہو۔"

"بٹوارہ تو ابھی اس طرح ہوگا کہ میں مراد کو لے جاؤں گا۔ ارب پتی سے سودا کروں گا۔ جب وہ ادائیگی کے بعد اسے لے جائے گا تو اس کے بعد تم اپنا کھیل شروع کرنا۔ ابھی میرے نقصان کو دیکھو۔ میرے دو بندے مارے جاچکے ہیں۔"

اُدھر اس کے تابعداروں نے اوپری منزل کی طرف مسلسل گولیاں برسائیں۔ مراد دوسری جگہ چھپنے کے لیے بھاگ رہا تھا۔ ایسے وقت اس کا بیگ شانے سے نکل کر گرتا ہوا نیچے ان دونوں کے درمیان آگیا۔

شاہ داد نے اسے اٹھاتے ہوئے خوشی کا نعرہ لگایا۔ "وہ مارا۔ شاباش جوانو۔۔۔! وہ زخمی ضرور ہوا ہوگا۔"

اس نے بیگ کھول کر دیکھا۔ اس میں ایک پستول بھلٹس اور نوٹوں کی گڈیاں تھیں وہ خوش ہو کر بولا۔ "یہ تو لاکھوں روپے ہوں گے اور پستول بھی ہے۔ کیا وہ نہتا ہوگیا ہے؟ نہیں۔ اس کے پاس اب بھی ایک ہتھیار اور گنتی کے بلٹس رہ گئے ہوں گے۔"

مرینہ سوچتی ہوئی نظروں سے اوپری منزل کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شاہ داد نے اپنے آدمیوں سے کہا۔ "فائر کرو۔ اوپر جاؤ۔ اس کے پاس گولیاں کم ہیں۔ وہ مجبوراً جوابی فائر کرے گا تو خالی ہوجائے گا۔"

اس کے تابعدار حکم کے مطابق گولیاں چلانے لگے۔ مراد کی طرف سے جوابی فائرنگ نہیں ہوئی۔ خاموشی کہہ رہی تھی کہ اس کے پاس گولیاں کم رہ گئی ہیں۔ یا پھر ختم ہوچکی ہیں۔

شاہ داد نے اپنے آدمیوں سے کہا۔ "اس پر نظر رکھو۔ وہ یہاں سے بھاگنا چاہے گا۔ اسے صرف زخمی کرو۔ بھاگنے نہ دو۔"

مرینہ کے سامنے بازی پلٹ رہی تھی۔ وہ جس دلدار کے لیے جان لڑا رہی تھی اسے شاہ داد لے جانے والا تھا۔ وہ چیخ کر بولی۔ "مراد! تم کہاں ہو؟ کیا نہتے ہوگئے ہو؟ ایسا ہے تو مجھے بولو میں تمہیں کسی کے ہاتھوں مرنے نہیں دوں گی۔"

شاہ داد نے چیخ کر کہا۔ "مراد! ہم تمہیں نہیں ماریں

گے۔ مجھ سے دوستی کرو۔ میں تمہیں مرینہ کے ہاتھ لگنے نہیں دوں گا۔ تمہیں ماروی کے پاس پہنچا دوں گا۔"

مرینہ نے یکبارگی پلٹ کر شاہ داد پر گولی چلائی۔ گولی اسے لگی لیکن بدن کی جلد کو چھیلتی ہوئی گزر گئی۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے کی طرف گر پڑا۔ مسلح تابعدار اسے چھوڑنے والے نہیں تھے۔ انہوں نے مرینہ پر گولیاں برسائیں۔ وہ چھلانگیں لگاتی ہوئی ایک دیوار کے پیچھے جا رہی تھی۔ ایک گولی نے اسے گرا دیا۔ لیکن بڑی جیدار تھی زمین پر گھسٹتی ہوئی دیوار کے پیچھے چلی گئی۔

جنگ کا نقشہ پلٹ گیا تھا۔ وہ دونوں آپس میں لڑ پڑے تھے۔ مراد کی حیثیت ثانوی ہوگئی تھی۔ آخرکار دو میں سے جو بچ جاتا وہ مراد سے نمٹنے والا تھا۔

وہ جو مراد پر حملہ کرنے آئے تھے۔ اب ایک دوسرے پر چھپ چھپ کر حملے کرنے لگے۔ شاہ داد کے تابعدار اپنی جان بچا رہے تھے اور مرینہ کی جان لے کر قصہ ختم کرنے کی فکر میں تھے۔

گولیاں چلتی رہیں تو کسی نہ کسی کو لگتی ہی ہیں۔ آدھے گھنٹے بعد مرینہ گولی کھا کر ایک وسیع و عریض کمرے کے فرش پر آکر گری۔ یوں لگ رہا تھا کہ جان سے گئی۔ ویسے وہ آسانی سے جان دینے والی نہیں تھی۔

شاہ داد نے اس کے پاس آکر اس کا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ "تم جاؤ۔ ہمارا پیچھا چھوڑ دو۔"

اس نے ٹریگر دبایا۔ لیکن چیخ اس کے حلق سے نکلی۔ مراد کی چلائی ہوئی گولی اسے آکر لگی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر اوپری منزل پر مراد کو ایک ستون کی آڑ میں دیکھا۔ پھر دھپ سے مرینہ کے قریب ہی زمین پر گر پڑا۔

اس کے تابعدار دور چھپے ہوئے تھے اور زمین پر پڑے ہوئے آقا کو گہری گہری سانسیں لیتے دیکھ رہے۔ مرینہ بھی زندگی کی طرف لوٹ آنے کے لیے اپنی سانسوں سے لڑ رہی تھی۔

پھر کھنڈر میں مراد کی آواز گونجی۔ وہ ایک ستون کی آڑ میں کھڑا ہوا تھا۔ "میرے مقدر سے کھیلنے والو۔۔۔! کیا اب بھی اپنا مقدر آزماؤ گے۔۔۔؟ دیکھو کیسی بے بسی سے پڑے ہو؟

بولو۔ آگے کیا خیال ہے؟ کیا تمہارے حواری تمہیں بچالیں گے؟ کیا تم زندہ رہ سکو گے یا مجھے فنا کر کے جاؤ گے؟ شاید ڈاکٹر تمہیں بچا سکیں گے' اگر میں تمہیں یہاں سے اسپتال تک جانے دوں۔"

مرینہ نے کراہتے ہوئے کہا۔ "مجھے لے چلو۔ میں بچ جاؤں گی۔ تمہارے لیے زندہ رہوں گی۔"

شاہ داد نے کہا۔ "مجھے جانے دو۔ میرے آدمی مجھے لے جائیں گے۔ میں پھر کبھی تم سے دشمنی کرنے نہیں آؤں گا۔"

"میں نے اور ماروی نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ ہم تمہیں جانتے بھی نہیں تھے پھر بھی لہو اچھالنے آگئے۔ تم سے انسانیت اور شرافت کی امید رکھنے والا کوئی احمق ہی ہوگا۔"

اس نے ٹھائیں ٹھائیں کی آواز کے ساتھ اس کے جسم میں دو گولیاں اتار دیں۔ پھر اس کے تابعداروں سے کہا۔ "آؤ اور اپنے آقا کو اٹھا کر لے جاؤ۔"

وہ آقا کے مرتے ہی بھاگتے ہوئے جیپ کے پاس گئے پھر اس پر بیٹھ کر تیز رفتاری سے دور ہوتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہونے لگے۔ وہ وفادار اپنے آقا کی لاش اٹھانے آتے تو خود لاش میں تبدیل ہوجاتے۔

مراد سیڑھیاں اُترتا ہوا نیچے آیا۔ وہاں مرینہ فرش پر پڑی کراہ رہی تھی۔ وہ اپنا بیگ اٹھا کر شانے سے لٹکا کر بولا۔ "اب تمہارا جنازہ کون اٹھائے گا۔۔۔؟"

وہ بولی۔ "تم مجھے بچاؤ گے۔ مرد کے بچے ہو تو ایسی عورت کو نہ مارو' جو کمزور ہوگئی ہے اور اپنے بچاؤ کے لیے تم سے مقابلہ کرنے کے قابل نہیں ہے۔ مجھے زندگی کی طرف لوٹ کر آنے دو۔ مرد ہو تو مجھے مقابلے کے قابل ہونے دو۔ پلیز مجھے اسپتال پہنچاؤ۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "یہ مردانگی کا طعنہ مجھ پر اثر نہیں کرے گا۔ پھر بھی میں تمہیں گاڑی میں لے جا کر ڈال رہا ہوں۔ اگر تم اسپتال تک جاسکو تو چلی جاؤ۔"

اس نے آگے بڑھ کر اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا کر لینڈ کروزر کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی تھی کہ میری ماروی کو ہوش آجائے گا۔ اس پر سے بلائیں ٹل جائیں گی تو آج کسی کے ساتھ بہت بڑی نیکی کروں گا۔ میرا خیال ہے کہ بڑی نیکی وہ ہے جو دشمن کی جان بچانے کے لیے کی جائے اور میں کر رہا ہوں۔ باقی اللہ مالک ہے۔"

اس نے مرینہ کو ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھا کر کہا۔ "جاؤ۔ تمہارا فیصلہ اللہ کے ہاتھ ہے۔"

اسے دو گولیاں لگی تھیں۔ دیکھنے سے لگتا تھا کہ آدھی جان نکل چکی ہے۔ اس نے بڑی تکلیف سے کراہتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی پھر اسے آگے بڑھاتے ہوئے جانے لگی۔

مراد چپ چاپ کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ گاڑی دائیں بائیں بہکتی ہوئی جارہی تھی۔ مگر جارہی تھی۔ مرینہ کی خود اعتمادی اور ضدی طبیعت اسے لے جارہی تھی۔

☆☆☆

وہ اسپتال کے بیڈ پر چاروں شانے چت لیٹی ہوئی تھی۔ چاچی نتی اس کے قریب کرسی پر بیٹھے بیٹھے سوگئی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا' وہ کسی وقت بھی کوما سے نکل سکتی ہے۔ ایسے وقت کسی کو اس کے قریب رہنا چاہیے۔

چاچی بچاری تھکی ہوئی تھی۔ ایسے حالات سے دو چار ہورہی تھی کہ مسلسل آنکھ بھر کے سونا نصیب نہیں ہورہا تھا۔ بند کمرے کی خاموشی میں آرام ملتے ہی نیند آگئی تھی۔

کمرے میں ایک بلب روشن تھا۔ ماروی کی کھلی ہوئی آنکھیں چھت کو تک رہی تھیں وہ شاید نہیں سمجھ رہی تھی کہ چھت کو دیکھ رہی ہے۔ کان کسی آہٹ کو بھی نہیں سن رہے تھے۔ وہ ایسی ساکت اور ناتواں ہوگئی تھی کہ اپنی ایک انگلی کو بھی جنبش دینے کے قابل نہیں رہی تھی۔

اس سیدھی سادی لڑکی نے یہ نہیں کہا تھا کہ اس کی طلب میں دشمن بن جاؤ۔ اسے اغوا کرو۔ اسے ہلاک کرنے کی سازشیں کرواور اسے گھر سے بے گھر ہونے پر مجبور کردو۔

وہ تو ایک عام لڑکی کی طرح پیدا ہوئی تھی۔ اب وہ کیا کرے کہ عاشقوں نے' طالبوں نے' رقیبوں نے اور ہوس پرستوں نے اسے خاص بنا دیا تھا۔

رات کے سناٹے میں دور کہیں سے ٹن ٹن کی آواز سنائی دی۔ گھڑیال کہیں رات کے دو بجا رہا تھا۔ ایسے ہی وقت وہ کوما سے نکلی۔ اس کی پلکیں جھپک گئیں۔ جیسے آنکھیں زندہ ہوگئیں۔

دل کی دھڑکنیں نارمل ہورہی تھیں۔ وہ معمول کے مطابق سانسیں لے رہی تھی۔ اس نے ایک ذرا دیدے گھما کر دیکھا۔ قریب ہی چاچی کرسی پر سورہی تھی۔

پھر اس کے حلق سے دھیمی سی آواز نکلی... "ہا...!" جیسے ہائے نکلتی ہے۔ "ہائے..." پھر وہ "ہائے" کراہ میں بدل گئی۔ تب چاچی کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے فوراً ہی اٹھ کر اسے دیکھا پھر اس پر جھک کر سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "میری جان! تم بول رہی ہو۔ کچھ بول رہی ہو۔ ہاں بولو۔ کیسی طبیعت ہے؟ کمزوری لگ رہی ہے؟"

وہ چاچی کو دیکھ رہی تھی۔ کچھ بول نہیں پا رہی تھی۔ اس نے تھپک کر کہا۔ "حوصلہ کرو۔ میں ابھی ڈاکٹر کو بلاتی ہوں۔"

وہ دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ وہ گم صم سی کچھ پریشان سی تھی۔ اس نے اپنی انگلیوں کو جنبش دی۔ پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر مٹھیاں بند کرنے اور کھولنے لگی۔ اس نے گردن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر دوسری طرف واش روم کے بند دروازے کو دیکھا۔ اپنے ایک ہاتھ سے سر کو تھام کر سوچنے لگی۔ "یہ کون سی جگہ ہے؟ میں کہاں ہوں؟ میں..."

اس نے خلا میں تکتے ہوئے خود سے پوچھا۔ "میں... کون ہوں...؟"

ڈاکٹر نے چاچی کے ساتھ کمرے میں آکر اسے دیکھا۔ پھر رک گیا۔ وہ کروٹ بدل کر اٹھ کر بیٹھ رہی تھی۔ جب وہ بیٹھ گئی تو ڈاکٹر نے کہا۔ "تھینکس گاڈ! تم نارمل ہوگئی ہو۔ ابھی تم جوس پیو گی۔ تمہیں توانائی کے لیے مزید دوائیں دی جائیں گی تو ایکدم سے چلنے پھرنے کے قابل ہوجاؤ گی۔"

وہ اسٹیتھسکوپ سے اس کا معائنہ کررہا تھا۔ چاچی سے کہنے لگا۔ "اسے سخت دماغی چوٹیں پہنچی ہیں۔ اس کے باوجود آپ کی بیٹی بڑی ہمت والی ہے۔ دیکھیں کس طرح آپ ہی اٹھ کر بیٹھ گئی ہے۔ کم آن بے بی! کچھ بولو۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

اس سوال پر اس نے ڈاکٹر سے سوال کیا۔ "کیا ہے...؟ میرا نام کیا ہے...؟"

چاچی اور ڈاکٹر نے اسے چونک کر حیرانی سے دیکھا۔ اس نے پوچھا۔ "میں کون ہوں...؟"

دوسرے سوال نے سمجھا دیا کہ وہ اپنے آپ کو بھول گئی ہے۔ چاچی نے کہا۔ "بیٹی! تمہارا نام ماروی ہے۔ اور یہ کیا کہہ رہی ہو؟ کیا مجھے نہیں پہچانتی ہو؟ میں نے تمہیں گود میں کھلایا ہے۔"

اس نے معصومیت سے پوچھا۔ "میں اتنی بڑی ہوں آپ نے مجھے گود میں کیسے کھلایا ہے؟ آپ کون ہیں؟"

"میں تمہاری چاچی ہوں۔ جب تم ننھی سی بچی تھیں۔ تب میری گود میں کھیلتی تھیں۔"

وہ سن رہی تھی اور دماغ پر زور ڈال کر یاد کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ یہ صاف سمجھ میں آگیا کہ دماغ کمزور ہوگیا ہے۔ یادداشت گم ہوگئی ہے۔ سر پر چوٹ لگنے سے پہلے کی تمام باتیں' تمام یادیں اور تمام رشتے دماغ کی اسکرین سے مٹ گئے ہیں۔

وہ پریشان ہوکر بولی۔ "میں نہیں جانتی آپ کون ہیں؟ میں پہلی بار آپ کو دیکھ رہی ہوں۔"

ڈاکٹر نے اسے تھپک کر کہا۔ "کوئی بات نہیں۔ دماغ پر زور نہ ڈالو۔ جس طرح بے ہوشی دور ہوگئی۔ جس طرح کوما سے واپس آگئیں۔ اسی طرح یادداشت بھی واپس آجائے گی۔"

چاچی نے پوچھا۔ "کیا یادداشت ایسے جاتی ہے؟ یہ تو اپنے آپ کو بھول گئی ہے۔"

"یہ تشویش کی بات ہے۔ میں ابھی دماغی امراض کے ماہر انعام الحق سے بات کرتا ہوں۔ وہ مرض کی صحیح تشخیص کریں گے اور بھولی ہوئی باتیں یاد دلانے کی تدابیر بتائیں گے۔"

وہ فون پر ڈاکٹر انعام الحق سے رابطہ کرنے لگا۔ چاچی پریشان ہوگئی تھی۔ ایک پلی پلائی جوان لڑکی اچانک ہی اجنبی بن گئی تھی اور ماں بن کر پالنے والی بے چاری غیر ہوگئی تھی۔

پھر اس کے اندر اچانک ہی سوالات پیدا ہوئے۔ "کیا یہ مراد کو بھی بھول گئی ہے؟ کیا پہاڑ جیسے احسانات کرنے والے سائیں محبوب کو بھی نہیں پہچانے گی؟"

ڈاکٹر نے اپنا فون بند کرکے چاچی سے کہا۔ "حق صاحب نے کہا ہے۔ ماروی کے سامنے اس مسئلے کو سنگین نہ بنائیں۔ یہ احساس نہ دلائیں کہ یہ ایک ناقابل علاج مرض میں مبتلا ہوگئی ہے۔ اسے کچھ یاد آئے تو یہ یاد کرے اور ہمیں بتائے ورنہ یاد کرنے کے لیے ذہن پر زور نہ ڈالے۔ حق صاحب بہت مصروف رہتے ہیں پھر بھی وہ کل صبح دس بجے آئیں گے۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بولا۔ "میں جارہا ہوں۔ یہیں ڈیوٹی پر ہوں۔ جب بھی میری ضرورت ہو مجھے بلا لینا۔"

وہ ماروی کے سر پر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیر کر چلا گیا۔ وہ دونوں ایک دوسری کے سامنے رہ گئیں۔ ماروی نے چند لمحوں تک سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر کہا۔ "میں سوچ رہی ہوں تو عجیب سا لگ رہا ہے کہ میں کوئی بھی نہیں ہوں۔"

چاچی نے اسے بڑے صدمے سے دیکھا۔ وہ بول رہی تھی۔ "یہ کیسی بات ہے کہ میں اپنا نام بھی نہیں جانتی۔ تم جانتی ہو۔ تم مجھے ماروی کہہ رہی ہو۔"

وہ بڑے صدمے سے بڑے کرب سے بولی۔ "میرا اس دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے۔"

چاچی نے تڑپ کر اس کے شانوں کو تھام کر کہا۔ "بیٹی! ہم سب ہیں۔ میں ہوں۔ تمہارے چاچا ہیں۔ تمہارا ایک منگیتر ہے۔ اس کا نام مراد ہے۔ کیا تمہیں یہ نام یاد ہے؟"

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ "تمہیں دل و جان سے چاہنے والا ایک دیوانہ دولتمند ہے۔ اس کا نام محبوب علی چانڈیو ہے۔ کیا وہ یاد آرہا ہے؟"

اس نے پھر انکار میں سر ہلایا۔ وہ بڑے دکھ سے بولی۔ "یا اللہ...! یہ میری بچی کے ساتھ کیا ہورہا ہے؟"

اس نے فون نکال کر معروف جگی سے رابطہ کیا۔ وہ اور سمیرا اسپتال کے قریب ہی ایک ہوٹل میں تھے۔ اس نے چاچی سے کہا تھا۔ "جب ماروی کوما سے نکلے یا کوئی پریشانی کی بات ہو تو مجھے اطلاع دینا۔ میں اسی وقت آجاؤں گا۔"

اس وقت رات کے تین بج رہے تھے۔ دوسری طرف کال بیل جارہی تھی۔ معروف گہری نیند میں تھا۔ وہ کال بیل پکارتے پکارتے خاموش ہوگئی۔ چاچی نے سمجھ لیا بڑے لوگ ہیں فون کی کالنگ ٹون کو بے آواز رکھ کر سورہے ہیں۔

ایک وارڈ بوائے ایک ٹرے میں تازہ پھل اور دودھ سے بھرا ہوا گلاس لے آیا۔ اسپتالوں میں ایسی مہنگی خوراک نہیں دی جاتی۔ یہ مہنگے انتظامات معروف جگی نے کیے تھے۔

ماروی نے کہا۔ "میں سوچ رہی ہوں اور پریشان ہورہی ہوں۔ مجھ سے کچھ کھایا نہیں جائے گا۔"

چاچی اسے بڑے پیار سے سمجھا منا کر ایک سیب کھلانے لگی۔ پھر اس نے اپنے ہاتھوں سے دودھ پلایا۔ وہ اس کے پیار سے متاثر ہوکر بڑی اپنائیت سے بولی۔ "آپ بہت اچھی ہیں۔ کیا مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں؟"

"ہاں بیٹی! میں تمہاری ماں ہوں۔ اللہ نے چاہا تو جلد ہی مجھے پہچان لوگی۔"

اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا۔ مراد نے تیزی سے کمرے میں آکر اسے اندر سے بند کردیا۔ پھر ماروی کو ہوش و حواس میں دیکھ کر اس کے قریب آتے ہوئے بولا۔ "مجھے معلوم ہوا تھا کہ تم کوما میں ہو۔ خدا کا شکر ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

مراد کے قریب آنے سے وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی تھی۔ چاچی کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ چاچی نے کہا۔ "یہ مراد ہے۔ تمہارا منگیتر..."

مراد نے کہا۔ "چاچی! تم تو ایسے کہہ رہی ہو۔ جیسے یہ مجھے پہچانتی نہیں ہے۔"

"ہاں بیٹے! یہ ہماری ہوتے ہوئے بھی پرائی ہوگئی

ہے۔ نہ تمہیں نہ مجھے اور نہ ہی اپنے آپ کو پہچان رہی ہے۔"

"کیا۔۔؟" مراد کا منہ شدید حیرانی سے اور بے یقینی سے کھل گیا۔ یہ یقین نہیں آرہا تھا کہ دل و جان سے چاہنے والی اسے نہیں پہچان رہی ہے۔

وہ جانِ حیات کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے سر پر بندھی ہوئی پٹی کہہ رہی تھی کہ بھاری پتھر سے سر ٹکرایا تھا۔ دماغ کو چوٹ پہنچی ہے۔ یادداشت متاثر ہوئی ہے۔

چاچی ڈاکٹر کے حوالے سے یہی بات کہہ رہی تھی۔ مراد کا دل نہیں مان رہا تھا کہ اسے بچپن سے چاہنے والی ایک ہی حادثاتی جھٹکے میں اسے بھول گئی ہے۔ اس نے بڑے جذبے سے کہا۔ "ماروی! کیا چاچی سچ بول رہی ہیں؟ ہم نے تو مرتے دم تک نہ بھولنے' نہ بچھڑنے کی قسم کھائی تھی۔ کیا قسم بھی یاد نہیں ہے؟"

وہ گم صم سی بیٹھی اس کا منہ تک رہی تھی۔ اس کے سامنے ایک اجنبی کھڑا ہوا تھا۔ اسے مسلسل دیکھنے کے باوجود یاد نہیں آرہا تھا کہ کبھی اسے دیکھا ہے۔

چاچی انہیں تنہا چھوڑنا چاہتی تھی۔ وہاں سے اٹھ کر بولی۔ "میں تمہارے چاچا کو بلا کر لاتی ہوں۔ ویسے مراد تمہیں یہاں آتے ہوئے کسی نے دیکھا تو نہیں ہے؟"

وہ بولا۔ "اب کسی کا ڈر نہیں ہے۔ مجھے چہرے سے صرف مرینہ پہچانتی ہے اور وہ مرچکی ہوگی یا کسی اسپتال میں پڑی ہوگی۔"

وہ دروازے کی طرف دیکھ کر بولی۔ "یہاں جو سپاہی ہیں وہ کسی کو کمرے میں آنے نہیں دیتے۔ تم کیسے آگئے؟"

"سپاہی بہت فرض شناس ہیں۔ گہری نیند سو رہے ہیں۔"

"توبہ ہے۔۔۔"

وہ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد ماروی کو خیال آیا کہ ایک اجنبی کے ساتھ کمرے میں تنہا ہے۔ وہ بیڈ پر رکھی ہوئی چادر اٹھا کر خود کو ادھر ادھر سے چھپانے لگی۔

مراد اسے دیکھ رہا تھا اور بڑے دکھ سے سمجھ رہا تھا کہ وہ اسے اجنبی اور غیر سمجھ رہی ہے۔ وہ بڑی محبت سے بولا۔ "ماروی! خود کو نہ چھپاؤ۔ میں غیر نہیں ہوں۔ کچھ تو یاد کرو' تم مجھے اپنے دل و جان کا مالک کہتی تھیں۔"

اس نے اپنے آپ میں سمٹتے ہوئے التجا کی۔ "خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کریں۔ وہ اماں کیوں چلی گئیں۔ آپ جائیں آپ کو خدا کا واسطہ ہے۔ آپ چلے جائیں۔"

وہ التجا کررہی تھی۔ اس نے بے بسی سے دروازے کی طرف دیکھا۔ سپاہیوں سے چھپ کر آیا تھا۔ وہاں سے جانے کا مطلب یہ ہوتا کہ پھر چاچی کے ساتھ واپس نہیں آسکتا تھا۔

ایک مدت کے بعد پچھلی رات اسے چھونے کا موقع ملا تھا۔ وہ بے ہوش تھی اعتراض نہیں کرسکتی تھی۔ اس نے دونوں بازوؤں میں اسے اٹھا لیا تھا اور سینے سے لگا کر اسپتال لایا تھا۔

بدن کا وہ لمس اس کے احساسات میں جاگ رہا تھا اور وہ اعتراض کرنے والی سامنے سکڑی سمٹی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ جتنا خود کو چھپا رہی تھی' اتنی ہی اس کے بدن کی شعریت خیالوں میں گنگنا رہی تھی۔ کیسی تشنگی تھی کہ اسے جتنا دیکھ رہا تھا' اتنی ہی پیاس بڑھتی جارہی تھی۔

اس نے کہا۔ "تم مجھ سے کترا رہی ہو۔ تمہاری جھجک اور شرم و حیا بجا ہے۔ لیکن یہ بہت ضروری ہے کہ تمہیں بھولی ہوئی باتیں اور بھولے ہوئے چہرے یاد دلائے جائیں۔"

وہ جیب سے فون نکال کر بولا۔ "بے شک ابھی اجنبی ہوں۔ تمہارے ساتھ تنہا بند کمرے میں نہیں رہنا چاہیے۔ میں چاچی اور چاچا کو بلا رہا ہوں۔"

اس نے نمبر پنچ کیے پھر فون کو کان سے لگایا۔ رابطہ ہونے پر بولا۔ "چاچی! فوراً آئیں۔ ماروی میری موجودگی سے پریشان ہورہی ہے۔ مجھے یہاں سے جانے کو کہہ رہی ہے۔ آپ نہیں آئیں گی تو مجھے یہاں سے جانا ہوگا۔"

چاچی نے کہا۔ "تم نہ جاؤ۔ میں ابھی آ۔۔۔"

بات پوری نہیں ہوئی۔ لائن کٹ گئی۔ چاچی نے اپنے فون کو دیکھا۔ معلوم ہوا کہ بیٹری ڈاؤن ہوگئی ہے۔ بہر حال بات ہوگئی تھی۔ وہ ماروی کے کمرے میں جا کر فون کو چارجر سے لگا سکتی تھی۔

ادھر ہوٹل کے کمرے میں معروف تجگی کی آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ بیڈ سے اتر کر واش روم میں گیا پھر واپس آیا تو اپنے فون پر نظر گئی۔ اس نے اٹھا کر دیکھا۔ اسکرین پر مس کال کی اطلاع تھی۔

اس نے پریشان ہوکر زیر لب کہا۔ "او گاڈ! چاچی نے کال کی تھی اور میں سوتا رہا۔ ضرور کوئی خاص بات ہوگی۔ اسی لیے اتنی رات کو فون کیا تھا۔"

اس نے نمبر پنچ کیے چاچی کو کال کی دوسری طرف سے نسوانی آواز سنائی دی۔ "آپ کے مطلوبہ نمبر سے فی الحال رابطہ نہیں ہوسکتا۔ کچھ دیر بعد کوشش کریں۔۔۔"

کچھ دیر بعد فون کیا تو پھر وہی آواز سنائی دی۔ وہاں

چاچی ماروی کے کمرے میں مراد کے پاس آکر فون کو چارجر سے لگانا بھول گئی تھی۔ ادھر معروف تشویش میں مبتلا ہوگیا تھا۔

وہ فوراً ہی لباس تبدیل کرکے کمرے سے باہر آگیا۔ ساتھ والے کمرے میں سمیرا تھی۔ اسے نیند سے جگانا اور اپنے ساتھ اسپتال لے جانا ضروری نہیں تھا۔ وہ وہاں سے زینے کی طرف جانے لگا۔ ایسے ہی وقت سمیرا نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا۔ پھر دونوں نے ایک دوسرے کو تعجب سے دیکھا۔ سمیرا نے پوچھا۔ "آپ کہاں جارہے ہیں؟"

معروف نے پوچھا۔ "یہی سوال میرا ہے۔ تم دروازہ کھول کر کہاں جارہی تھیں؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "میں کیا بولوں؟ آپ طعنے دیں گے کہ میں انہیں سوتے جاگتے دیکھتی رہتی ہوں۔"

"اچھا تو تم دروازہ کھول کر محبوب کو دیکھ رہی تھیں؟"

اس نے اپنے کمرے کے اندر کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے اس کھڑکی سے دیکھا ہے۔ آپ یقین نہیں کریں گے۔ وہ محبوب صاحب ہی تھے۔ اسپتال کے مین گیٹ سے اندر جارہے تھے۔"

معروف نے بے یقینی سے پوچھا۔ "تم اتنی رات کو کھڑکی کے باہر دیکھ رہی تھیں۔ جیسے تمہیں پہلے سے معلوم ہوگیا ہو کہ وہ اُدھر سے گزرنے والا ہو۔"

"مجھے پہلے سے معلوم نہیں تھا۔ میری نیند اچاٹ ہوگئی تھی۔ اس چھوٹے سے کمرے میں گھٹن سی ہورہی تھی۔ میں تازہ ہوا کے لیے کھڑکی کے پاس چلی گئی تھی۔"

وہ ذرا قریب ہوکر بولی۔ "پلیز یقین کریں۔ آدھے گھنٹے سے کچھ زیادہ ہی وقت گزر چکا ہے۔ جب سے دیکھا ہے ادھر جانے کے لیے دل پاگل ہورہا ہے۔ کتنی بار سوچا آپ کو نیند سے جگاؤں۔ لیکن یہ مناسب نہیں لگا۔ میں کیا بتاؤں کہ میری کیا حالت ہورہی ہے۔ آخر برداشت نہ ہوسکا تو دل سے مجبور ہوکر آپ کو جگانے کے لیے دروازہ کھول کر نکل رہی تھی۔"

معروف نے سر ہلا کر کہا۔ "وہ عاشق کم تھے کہ تم تیسری ہوگئیں۔ آؤ میں وہیں جارہا ہوں۔"

وہ دروازہ بند کرکے فوراً ہی اس کے ساتھ چل پڑی۔ محبت کسی کی جاگیر نہیں ہوتی۔ کوئی بھی کسی سے پیار کرسکتا ہے۔ دل کسی پر بھی آسکتا ہے۔ سمیرا دل سے مجبور تھی۔ اس کے پیار میں بھی وہی سچائی تھی جو ماروی مراد اور محبوب کے پیار میں تھی۔

وہ ہوٹل سے نکل کر مختصر سا فاصلہ طے کرکے اسپتال میں آگئے۔ ماروی کے کمرے کے سامنے پہرا دینے والے سپاہی کرسیوں پر بیٹھے خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ معروف نے فرش پر زور سے پاؤں مارا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے پھر کھڑے ہوگئے۔ اس نے ناگواری سے پوچھا۔ "یہ ڈیوٹی دی جارہی ہے؟"

ایک نے شرمندگی سے کہا۔ "سوری سر! آنکھ لگ گئی تھی۔"

سمیرا نے کہا۔ "ایک کی نہیں تینوں کی آنکھ لگ گئی تھی۔ کسی ایک کو تو فرض شناس ہونا چاہیے۔"

"سوری میڈم! ہمارے بڑوں سے شکایت نہ کریں۔ ہم غریب بال بچوں والے ہیں۔"

انہوں نے بند دروازے کی طرف دیکھا۔ اس دروازے کے پیچھے مراد' چاچی اور چاچا تھے۔ وہ بڑے پیار بھرے جذبے سے رات کی تاریکی میں چھپ کر اس سے ملنے آیا تھا۔ یہ خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ وہ اچانک ہی غیر اور نامحرم بن جائے گی۔ پیار سے آنے والے کو کمرے سے جانے کے لیے کہے گی۔

وہ کہہ رہا تھا۔ میں تمہیں بوجھ لگ رہا ہوں لیکن مجھ سے ملتی رہوگی تو تمہیں بھولی ہوئی باتیں یاد آتی رہیں گی۔

اسی وقت دروازہ کھلا سمیرا اور معروف نے اندر آتے ہوئے ان سب کو دیکھا۔ مراد کی پشت ان کی طرف تھی۔ چہرہ سامنے نہیں تھا لیکن جو شناسا ہوتے ہیں' ان کی صورت نہ بھی دکھائی دے تو وہ پیچھے سے بھی پہچان لیے جاتے ہیں۔

معروف نے چونک کر اسے دیکھا۔ پہچاننے کے باوجود صورت دیکھ کر تصدیق ہوسکتی تھی۔ سمیرا کا دل تو پاگل ہوگیا تھا بے تحاشا سینے کی دیوار سے ٹکرا رہا تھا۔

مراد مشکل میں پڑگیا۔ محبوب نے سمجھایا تھا کہ اسے سکھر میں سمیرا اور معروف کے سامنے نہیں آنا چاہیے۔ ورنہ یہ بھید کھل جائے گا کہ قیدی آزاد ہے اور جسے آزاد رہنا چاہیے' وہ قید و بند میں' زنجیر سلاسل میں ہے۔

سمیرا تیزی سے چلتی ہوئی پیچھے سے آگے آئی۔ پھر حیرت سے اور مسرت سے چیخ پڑی۔ "آپ ہیں۔۔۔؟"

اس نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں یوں پھنسا لیا جیسے محبوب سے لپٹ گئی ہو۔ "محبوب صاحب۔۔۔! آپ ہیں۔ میں نے ابھی کھڑکی سے دیکھا تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا۔ آپ آئے ہیں۔ میں آپ کو دیکھ سکوں گی اور میں دیکھ رہی ہوں۔"

وہ بولتے بولتے خوشی سے رونے لگی۔ مراد کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے؟ معروف نے سامنے آکر اسے گہری سنجیدگی سے دیکھا پھر کہا۔ ''آخر تم گوشہ نشینی سے نکل آئے؟''

پھر وہ بڑے دکھ سے ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''لیکن خود نہیں آئے۔ اچانک سامنا ہوگیا۔ نہ ہوتا تو پھر چپ چاپ ہم سے ملے بغیر چلے جاتے۔ کیوں محبوب...! تم ہم سے دور کیوں بھاگ رہے ہو؟ ایسی کیا بات ہے؟ کیا راز ہے؟ کیا مجبوری ہے کہ ہماری وفاداری تمہیں متاثر نہیں کر رہی ہے؟''

وہ جلدی سے دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''اور مجھے شرمندہ نہ کریں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے' آپ سے کیا کہوں؟''

وہ ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے تھوڑی دیر کے لیے اجازت دیں۔ بس ابھی واش روم سے ہو کر آتا ہوں۔''

وہ جواب سنے بغیر اپنی جیب سے فون نکال کر تیزی سے چلتا ہوا واش روم میں چلا گیا۔ وہاں اندر جاتے ہی اس نے دروازے کو اندر سے بند کرلیا۔

سمیرا اور معروف کچھ سمجھنے نہ سمجھنے کے انداز میں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں مراد کا یہ انداز کھٹک رہا تھا کہ اس نے ہاتھ جوڑ کر جس طرح بات کی تھی۔

اور ایسا محبوب جیسا آقا نہیں' مراد جیسا احسان مند بندہ کرتا ہے۔ اس کے چہرے سے پریشانی اور گھبراہٹ ظاہر ہو رہی تھی اور محبوب یوں کبھی پریشان ہو کر نہیں بولتا تھا۔

معروف نے چاچی سے پوچھا۔ ''یہ کون ہے؟''

چاچی نے پہلے سے سوچا ہوا جواب دیا۔ ''میں کیا بتاؤں؟ میں تو پہلی بار یہاں دیکھ رہی ہوں۔ انہیں پہچاننا مشکل ہوتا ہے۔ ابھی میں پوچھنا ہی چاہتی تھی کہ یہ مراد ہے یا سائیں محبوب ہیں۔ پوچھنے سے پہلے آپ آگئے۔''

سمیرا نے ماروی کے پاس آکر کہا۔ ''تم چپ بیٹھی ہو۔ ایک ایک کا منہ تک رہی ہو۔ یہاں تو محبوب صاحب ہی آسکتے ہیں۔ مراد تو جیل میں ہے۔''

چاچی نے سمیرا سے کہا۔ ''اس بدنصیب سے کچھ نہ بولو۔ یہ پچھلی تمام باتیں بھول گئی ہے۔ خود کو نہیں پہچان رہی ہے۔ مراد کو محبوب سائیں کو اور ہم سب کو بھول گئی ہے۔''

معروف نے بڑی تشویش سے اسے دیکھا۔ سمیرا نے اور قریب ہو کر پوچھا۔ ''ماروی! کیا واقعی ہمیں بھول گئی ہو؟ میں تو تمہاری بہت اچھی سہیلی ہوں۔ تمہیں مراد سے ملانے کی کوششیں کرتی رہی ہوں۔ مجھے تو پہچانتی ہو نا؟''

ماروی نے اسے بڑی توجہ سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جو آتا ہے' مجھے پہچانتا ہے۔ اپنا کوئی رشتہ بتاتا ہے۔ یا خدا...! میں کیوں نہیں پہچان رہی ہوں؟''

سمیرا اسے ہمدردی سے دیکھنے لگی۔ وہ پوچھ رہی تھی۔ ''میں کب تک ساری دنیا سے الگ رہوں گی؟ کب تک ایسی اجنبی رہوں گی۔ مجھے کوئی بھی اپنا کیوں نہیں لگ رہا ہے؟''

اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ سمیرا اور معروف اسے ہمدردی اور محبت سے دیکھ رہے تھے۔ پھر وہ واش روم کی طرف دیکھنے لگے۔

اس واش روم میں ایک فون کرنے والا بند تھا اور دوسرا جیل کی کوٹھری میں قیدی تھا۔ وہ پریشان ہو کر بولا۔ ''مراد! یہ کیا ہوگیا؟ میں نے کہا تھا' تمہیں سکھر میں سمیرا اور معروف صاحب سے چھپ کر رہنا ہوگا۔''

مراد نے کہا۔ ''میں اب تک چھپ کر ہی تھا۔ ماروی کوما سے نکل آئی ہے۔ میں اسے دیکھے بغیر اس سے ملے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ یہاں ملنے آیا تو ایک دماغی صدمہ پہنچ رہا ہے۔ آپ سنیں گے تو آپ بھی سکتے میں آجائیں گے۔''

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''ایسا کیا ہوگیا ہے؟''

''ماروی اپنی یادداشت کھو بیٹھی ہے۔ نہ ہمیں پہچانتی ہے نہ اپنے آپ کو پہچان پا رہی ہے۔''

واقعی دماغ کو جھٹکا پہنچانے والی بات تھی۔ محبوب کو چند ساعت کے لیے چپ لگ گئی۔ پھر وہ حیرانی اور پریشانی سے بولا۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو؟ تم ابھی ماروی کے سامنے گئے تھے اور اس نے تمہیں نہیں پہچانا...؟''

''نہیں۔ دماغی چوٹ نے یادداشت کمزور کردی ہے۔ بلکہ پچھلی تمام یادوں کو ختم کر دیا ہے۔ اس سے زیادہ دکھ کی بات کیا ہوگی کہ وہ اپنے آپ کو بھول گئی ہے۔''

محبوب نے گہرے صدمے سے ایک گہری سانس لی۔ پھر کہا۔ ''اور یہ بھی بہت بڑا المیہ ہے کہ وہ تمہیں بھول گئی ہے۔ مجھے بھی بھول گئی ہوگی۔ اس وقت میرے سینے میں دل تڑپ رہا ہے۔ میں ابھی اس کے سامنے پہنچنا چاہتا ہوں۔ دیکھنا چاہتا ہوں کیا وہ مجھے ایک ذرا بھی نہیں پہچانے گی؟''

''نہیں سائیں میری خوش فہمی تو ختم ہوگئی ہے۔ یہ قدرت کا تماشا ہے۔ ہم پر ظلم ہے جو محبت دلوں میں جڑ پکڑ

بچی تھی وہ پلک جھپکتے ہی جڑ سے اکھڑ گئی ہے۔"

محبوب گم صم سا رہ گیا تھا۔ وہ کوٹھری کی تاریکی میں ماروی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں شناسائی اور بھرپور اپنائیت تھی۔ دل کہہ رہا تھا کہ وہ اسے نہیں بھولے گی۔

مراد کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ "سائیں! اللہ مہربان ہے۔ ماروی کو دھیرے دھیرے ہم یاد آجائیں گے۔ یہ بتائیں ابھی کیا کرنا ہے۔ معروف صاحب انتظار کر رہے ہیں۔"

"انہیں حقیقت بتانی ہوگی۔"

"جب انہیں معلوم ہوگا کہ آپ جیل میں ہیں تو وہ تڑپ جائیں گے آپ کو ابھی وہاں سے نکالنے کے لیے یہاں سے دوڑتے چلے جائیں گے۔"

"انہیں کسی طرح سمجھانا ہوگا۔ یہ فون انہیں دو۔"

وہ واش روم کا دروازہ کھول کر کمرے میں آیا۔ سمیرا اور معروف نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس نے قریب آکر معروف کی طرف فون بڑھاتے ہوئے کہا۔ "بات کریں۔"

معروف نے اس کے فون کو دیکھا۔ اس کی نظروں میں سوال تھا کہ کس سے بات کرے؟ اور کیوں کرے؟

مراد نے کہا۔ "آپ کچھ نہ پوچھیں۔ اسے لیں اور بات کریں۔ اس کے بعد آپ مجھ سے کوئی سوال نہیں کریں گے۔"

اس نے سوچتے ہوئے فون کو ہاتھ میں لیا۔ اسے دیکھا پھر کان سے لگایا تو محبوب کی آواز سنتے ہی ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ اس نے سامنے کھڑے ہوئے مراد کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تم۔ تم محبوب بول رہے ہو؟"

اس نے کہا۔ "It's me you believe me (آپ یقین کریں۔ میں ہی ہوں)"

انگریزی بولنے والا محبوب ہی ہوسکتا تھا۔ سمیرا فوراً ہی قریب آگئی تھی فون سے کان لگا کر سن رہی تھی۔ معروف شدید حیرانی سے بول رہا تھا۔ "محبوب! تم کہاں ہو...؟ پھر تو یہ میرے سامنے مراد ہے۔"

محبوب نے کہا۔ "جی ہاں۔ وہ مراد ہے۔"

"یہ یہاں کیسے ہے؟ یہ تو جیل میں تھا؟ کیا یہ مفرور ہے؟ کیا مرینہ اسی کو گرفتار کرنے یہاں آئی ہے اور اسے گرفتار کرنے کے لیے ماروی کو ٹریپ کرنا چاہتی ہے؟"

"مراد مفرور نہیں ہے اور نہ ہی اس کے نام گرفتاری کا وارنٹ جاری کیا گیا ہے۔"

"کیا تم یہ کہہ رہے ہو کہ مراد جیل میں ہے؟"

"جی ہاں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔"

"مجھے پریشان کر رہے ہو اور کہتے ہو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ وہ جیل میں ہے تو یہ میرے سامنے کون ہے؟"

وہ ذرا چپ رہا۔ پھر بولا۔ "معروف صاحب! آگے کچھ نہ پوچھیں۔ یہ۔ یہ جو آپ کے سامنے ہے اس کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں۔ یوں سمجھ لیں کہ اسے دیکھا نہیں ہے۔ وہ ابھی وہاں سے چلا جائے گا۔"

"میں آنکھیں رکھتے ہوئے اندھا کیوں بن جاؤں؟ مجھے چشم پوشی کے لیے کیوں کہہ رہے ہو؟ اگر یہ مفرور نہیں ہے تو جیل سے باہر کیسے ہے؟ اور اگر باہر ہے تو جیل میں کون ہے؟"

وہ بہت ہی دھیمی آواز میں بولا۔ "میں ہوں..."

وہ دھیمی آواز دھماکا ثابت ہوئی۔ وہ چیخ پڑا۔ "کیا... ! تم کیا کہہ رہے ہو...؟"

اس نے سمیرا کو دیکھا۔ پھر پوچھا۔ "تم ہو...؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے...؟ یہ نہیں ہوسکتا... تم کہاں ہو...؟"

اسے یقین نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اندر سے ہل کر رہ گیا تھا۔ تڑپ کر پوچھ رہا تھا۔ "پھر سے بولو محبوب! پریشان نہ کرو۔ میرا سر گھوم رہا ہے۔ سچ سچ بولو تم کہاں ہو...؟"

"آپ چیخنا بند کریں۔ آہستہ بولیں۔ شور مچائیں گے تو بھید کھل جائے گا کہ وہ ہم شکل نے اپنی جگہ بدل دی ہے۔ میری جگہ وہ آزاد ہے اور میں اس کی جگہ قیدی نمبر سات سو سات ہوں۔"

وہ پھر چیخ کر بولا۔ "محبوب! میں حیرت سے مر جاؤں گا۔ بولو۔ یہ جھوٹ ہے۔"

"سچ ہے۔ اگر آپ شور مچائیں گے اور مجھ سے یہاں ملنے آئیں گے تو راز کھل جائے گا۔ میں ایک قیدی کو یہاں سے فرار کرانے کا خود اس کی جگہ قیدی بننے کا اور قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کا مجرم کہلاؤں گا۔

جذباتی اور جنونی نہ بنیں۔ ہوش و حواس میں رہ کر سمجھیں وہ جو حشمت جلالی سے سمجھوتا ہو رہا ہے اور مجھے رہائی ملنے والی ہے تو رہائی پانے سے پہلے پھر گرفتار کرلیا جاؤں گا۔"

وہ بول رہا تھا۔ معروف حیرانی اور پریشانی سے منہ کھولے سن رہا تھا۔ سمیرا فون سے کان لگائے معروف کے کاندھے پر سر رکھے رو رہی تھی۔ ہائے...! یہ سب کس کی

خاطر ہو رہا ہے...؟

وہ دور بیڈ پر بیٹھی ہوئی ماروی کو آنسو بھری آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ ٹھنڈی آگ تھی۔ اسے چھونے سے کوئی جلتا نہیں تھا۔ پھر بھی دو پاگل دیوانے یہاں سے وہاں تک آگ سے کھیلتے چلے جا رہے تھے۔

وہ کاندھے سے سر اٹھا کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بیڈ کے پاس آئی۔ اس کی طرف جھک کر بولی۔ "تم نہیں جانتیں کہ کتنی خوش نصیب ہو۔ تمہارا ایک دیوانہ تمہارے دوسرے دیوانے کی سزائے موت پانے کے لیے تمہارے پیار کی' تمہارے دلدار کی سلامتی کے لیے قیدی بن گیا ہے۔

اگر سمجھوتا نہ ہوگا۔ رہائی نہیں ملے گی تو تمہاری خاطر صرف تمہاری خاطر وہ سولی پر چڑھ جائے گا۔

ہمیں تو اتفاقاً معلوم ہوگیا۔ نہ معلوم ہوتا تو وہ خاموشی سے تم پر قربان ہو جاتا۔"

مراد سر جھکائے سن رہا تھا۔ وہ محبوب کا اتنا بڑا احسان کبھی نہ لیتا۔ اپنی جگہ کبھی اسے قیدی بننے نہ دیتا لیکن محبوب نے اور مرینہ نے اس کی لاعلمی میں قیدی کی جگہ بدل دی تھی۔ اسے یہ سمجھایا گیا تھا کہ جیلر کی اور اس کی بیٹی کی چالاکی سے اسے فرار کرایا جا رہا ہے۔ اور یہ بات محبوب فون پر معروف سے کہہ رہا تھا کہ وہ مراد کو دھوکے میں رکھ کر اس کی جگہ قیدی بن گیا ہے۔

وہ فون پر کہہ رہا تھا۔ "آپ ماروی اور مراد کو کراچی لے جائیں۔ وہ بے چاری یادداشت کے اندھیروں میں گم ہے۔ وہاں نامی گرامی تجربہ کار دماغی امراض کے ماہرین سے اس کا علاج کرائیں اور میرے آنے تک مراد کو کسی جگہ چھپا کر رکھیں۔ اسے بھرپور سیکیورٹی دیں۔"

فی الحال ماروی اور مراد کے سروں سے خطرات ٹل گئے تھے۔ محبوب جلد ہی رہائی پاکر آنے والا تھا۔ وہ فون پر بول رہے تھے۔ کراچی شہر میں پھر نئے سرے سے زندگی گزارنے کی پلاننگ ہو رہی تھی۔

ویسے پلاننگ جیسی بھی ہوتی' جتنی بھی ٹھوس ہوتی' تین محبت کرنے والوں کا مثلث نہ رہتا۔ وہ دو دیوانے اس نئی ماروی کے پیار سے محروم رہنے والے تھے۔

☆☆☆

یوں کہنا چاہیے کہ یہ ماروی کا نیا جنم تھا۔ وہ ابھی پیدا ہوئی تھی اور پہلی بار اس دنیا کو دیکھ رہی تھی۔ اکثر بچے اسپتال میں پیدا ہوتے ہیں۔ وہ بھی سکھر کے اس اسپتال کے ایک کمرے میں پیدا ہو کر اپنے آپ کو دیکھ رہی تھی۔

عام طور سے بچے پیدا ہوتے ہی سمجھ نہیں پاتے کہ وہ کون ہیں اور کہاں آگئے ہیں؟ وہ سمجھ رہی تھی کہ ایک چار دیواری میں ہے اور ایک آرام دہ بستر پر ہے۔ دماغ اس حد تک بیدار تھا کہ آس پاس کی تمام چیزوں کو سمجھ رہا تھا۔

یوں سمجھنا چاہیے کہ معمولات سے تعلق رکھنے والی عام چیزوں کو ذہن سمجھ رہا تھا اور خاص باتیں اور رشتے جو سب سے اہم تھے' انہیں بھول چکا تھا۔

وہ تمام انسانی رشتوں کو بھول گئی تھی۔ ماں باپ' دور کے اور قریب کے رشتے' سہیلیاں اور دل میں دھڑکنے والے یار اور دلدار سب اس کے ذہن سے نکل گئے تھے۔

آئندہ نئے سرے سے نئے رشتے بننے والے تھے۔ دماغ کے کورے کاغذ پر نئے نام لکھے جانے والے تھے۔

ایک نئی ماروی' نئے پیار کے نئے گل کھلانے والی تھی۔

محبوب نے اور معروف نے فیصلہ کیا کہ کراچی کے معروف ماہرین سائیکاٹرسٹ کی خدمات حاصل کی جائیں۔ ماروی کو دماغی امراض کے اسپتال میں نہ رکھا جائے۔ محبوب کی وسیع و عریض کوٹھی کے خوبصورت اور آرام دہ ماحول میں وہ جلد ہی بھولی ہوئی باتوں کو یاد کرسکے گی۔

یہ بات سب سے اہم تھی کہ ماروی کو ایسی جگہ رکھا جائے' جہاں وہ دو چاہنے والوں کے قریب ہو۔ کوئی ضروری نہیں کہ تینوں ایک ہی چھت کے نیچے ایک ہی چار دیواری میں ہوں لیکن قریب ہوں اور دونوں کسی روک ٹوک کے بغیر اس سے جب چاہیں' ملتے رہیں۔

محبوب نے جیل کی چار دیواری میں بیٹھ کر یہ فیصلہ کیا تھا کہ دونوں چاہنے والوں کو برابر کی سہولتیں ملنی چاہئیں۔ تاکہ ماروی نئے ذہن سے نئے دل سے پھر عشق و محبت کی نئی کہانی کا آغاز کرے۔

معروف کے ذہن میں یہ بات پک رہی تھی کہ یہی سنہری موقع ہے۔ ماروی مراد کو یکسر بھول چکی ہے۔ اب دل اس کا دیوانہ نہیں ہے۔ اگر حکمت عملی سے کام لیا جائے اور ماروی کو رفتہ رفتہ محبوب کی طرف مائل کیا جائے تو تمام کاروباری مسائل حل ہو جائیں گے۔ تمام بھاگ دوڑ اور ذہنی پریشانیاں ختم ہو جائیں گی۔

یہ معروف کی سوچ تھی کہ جب محبوبہ بیوی بن جاتی ہے تو رفتہ رفتہ گھر کی مرغی دال برابر ہو جاتی ہے۔ محبوب ماروی کو بیوی بنا کر محبت تو کرتا رہے گا لیکن دیوانگی ختم ہو جائے گی وہ پھر پہلے کی طرح بزنس کے معاملات میں مصروف ہو جائے گا۔

وہ محبوب سمیرا کے دل میں بھی دھڑک رہا تھا۔ وہ پیار کے پاگل پن کو چھپائے رہتی تھی۔ موجودہ حالات میں بھی وہ معروف کی پلاننگ میں اس کے ساتھ تھی کہ ماروی کو محبوب کی شریک حیات بنا کر عشق کے جنون کو ٹھنڈا کر دینا چاہیے۔

لیکن اندر سے دل کہہ رہا تھا۔ ”یہی سنہری موقع ہے۔ میں بڑی رازداری سے ماروی کو مراد کی طرف جھکاتی رہوں گی۔ اس کے ذہن کے کورے کاغذ پر چپکے چپکے مراد کو نقش کرتی رہوں گی تو وہ ایک دن اسی کی دلہن بنے گی۔ محبوب نامراد عاشق رہے گا۔ میرے لیے اس کی لائف پارٹنر بننے کے چانس ہمیشہ رہیں گے۔“

لوگ اپنے اپنے طور پر سوچتے ہیں۔ جو سوچتے ہیں اس پر اپنے مزاج کے مطابق عمل کرتے ہیں اور سب ہی اپنے طریقہ کار کو درست سمجھتے ہیں۔

معروف بھی اپنے طور پر درست تھا۔ وہ محبوب کے والد کے زمانے سے ان کا وفادار قابلِ اعتماد مشیر تھا۔ ان کی کاروباری، گھریلو اور ذاتی زندگی اسی کی ذہانت اور مشوروں سے رواں دواں تھی۔

اس نے اب سے پہلے سوچا تھا کہ مراد کا مقدمہ کمزور کر کے اسے سزائے موت تک پہنچائے گا تو ماروی ایک عاشق کی موت کے بعد کچھ روز ماتم کرے گی۔ پھر دوسرے عاشق کے نکاح میں آجائے گی۔ یوں محبوب اپنے کاروبار کی طرف لوٹ آئے گا۔

اب حالات بدل گئے تھے۔ قدرت نے ایسا تماشا دکھایا تھا کہ سزائے موت پانے والے کی جگہ محبوب پہنچ گیا تھا۔ اگر حشمت جلالی وہ مقدمہ ختم کرنے پر راضی نہ ہوتا تو محبوب سولی پر لٹک جاتا۔

اور معروف ایسا ہونے نہ دیتا۔ اب وقت اور حالات کے مطابق اس کا ارادہ اس کا منصوبہ بدل رہا تھا۔ مراد کو تو زندہ رہنا ہی تھا لیکن محبوب کو زندگی دینی تھی، ماروی کو اس کی جھولی میں ڈال کر...

یہی بہترین موقع تھا۔ ماروی ہی بدل گئی تھی۔ نہ اِس عاشق کی رہی تھی نہ اُس عاشق کی۔ اس نئی تبدیلی کے مطابق معروف اب مراد کا جانی دشمن نہیں تھا۔ صرف اپنے محبوب کی خیرخواہی میں رازداری سے ماروی کو مراد سے متنفر کر کے یا بیزار کر کے اسے محبوب کی شریک حیات بنا دینا چاہتا تھا۔

اگر وہ ایسا کرنا چاہتا تھا تو یہ اس کا فرض تھا، یہ اس کا ایمان تھا کہ ایک وفادار مشیر کو کاروبار کی سلامتی کے لیے یہی کرنا تھا۔ اس کی سوچ اور اس کے عمل پر انگلی نہیں اٹھائی جا سکتی تھی۔

سمیرا بھی بے شک و شبہ محبوب کی وفادار تھی۔ بڑی ذہانت اور محنت سے اس کے کاروبار کو سنبھال رہی تھی۔ معروف جیسا بوڑھا اور تجربہ کار شخص اس کی محنت، لگن اور دیانت داری سے مطمئن تھا۔

بے شک وہ جوان لڑکی ہے۔ اس کے دل میں چاہنے اور چاہے جانے کے ارمان ہیں۔ وہ محبت کرے لیکن دیوانہ وار عشق کرنا سراسر حماقت ہے۔ محبت کہاں ایک جگہ ٹھہرتی ہے؟ وہ تو شدید سے شدید تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ محبوب کی محبوبیت کا جنون بڑھتا جا رہا تھا۔ معروف نے پہلے ماروی کے اغوا کا اور ہلاکت کا ڈراما رچا کر اسے محبوب سے دور کیا۔ یہ آدمی کی سمجھ میں آنا چاہیے کہ تقدیر ہمیشہ تدبیر کو الٹ دیتی ہے۔ ماروی الٹ پلٹ کر پھر واپس آگئی تھی۔

کھیل اب بھی سمیرا کے ہاتھ میں تھا۔ ماروی یادداشت کے اندھیروں میں گم ہو گئی تھی۔ وہ اس کی سہیلی بن کر چپکے چپکے اسے مراد کی طرف مائل کر سکتی تھی۔ یہ اس کی حکمت عملی ہوتی اور محبوب سے وفاداری یوں ہوتی کہ اسے رفتہ رفتہ کاروبار کی طرف واپس لے آتی۔ وہ اپنے محبوب کو اربوں کے خسارے سے بھی بچاتی اور اپنے لیے بھی بچا کر رکھتی۔ یہ انسانی کھیل تماشے ہوتے ہیں۔ یک طرفہ دیانت داری سے چلتے ہیں اور اپنا اُلو بھی سیدھا کرتے رہتے ہیں۔

اب مراد کا مزاج بدل رہا تھا۔ حالات نے اس گدھا گاڑی والے کو جیل پہنچا کر، جیل سے بھگا کر اس کے ہاتھ میں بندوق پکڑا کر، بارود، آگ اور لہو میں بھگو کر یہ سکھا دیا تھا کہ مرد کیا ہوتا ہے؟

معروف نے مراد کو محبوب کا فیصلہ سنایا کہ ماروی کا علاج کراچی میں ہوگا اور مراد بھی ان کے ساتھ جائے گا اور ان کے ساتھ رہا کرے گا۔

مراد نے کہا۔ ”کراچی تو مجھے جانا ہے۔ ہم پر سائیں کے اتنے احسانات ہیں کہ ساری زندگی ان کے احسانات کا بوجھ نہیں اتار سکیں گے لیکن میں جتنا قرض اتار سکتا ہوں، اتاروں گا۔ سائیں کو جیل سے باہر نکالوں گا۔ میرا ایمان سلامت رہے۔ میں اپنے حصے کی سزا انہیں کاٹنے نہیں دوں گا۔“

معروف نے کہا۔ ”میں نے محبوب سے یہی کہا تھا کہ اسے باہر آنا چاہیے۔ لیکن وہ تمہیں ماروی سے دور نہیں ہونے دے گا۔“

”سائیں کا پیار نرالا ہے۔ خود اس سے دور ہیں لیکن اسے مجھ سے دور نہیں ہونے دیں گے۔ پیار کا یہ انداز نہ میں نے کبھی دیکھا ہے، نہ کبھی سنا ہے۔“

اس نے ماروی کی طرف دیکھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ خود کو یادداشت کی تاریکیوں میں ڈھونڈ رہی تھی۔ مراد کے اندر عجیب سی بے چینی پیدا ہوئی۔ اس نے کہا۔ ”یہ سب کچھ بھول گئی ہے۔ اسے یاد آئے گا اور یہ معلوم ہوگا کہ سائیں میرے حصے کی سزا کاٹ رہے تھے اور میں بڑی بے حسی اور بے غیرتی سے آزاد گھوم رہا تھا تو اپنی ماروی کی نظروں سے گر جاؤں گا۔“

معروف اور سمیرا نے سوچتی ہوئی نظروں سے مراد کو دیکھا۔ معروف سوچ رہا تھا۔ ”اچھا ہے۔ ماروی کی یادداشت واپس آجائے۔ وہ مراد کو بے حس اور بے غیرت سمجھے اور محبوب کی بے مثال قربانیوں سے متاثر ہو کر اس کی طرف مائل ہو جائے۔ میں مراد کو واپس جیل میں جانے نہیں دوں گا۔“

سمیرا سوچ رہی تھی۔ ”میں مراد کو ماروی کی نظروں سے گرنے نہیں دوں گی۔ اسے واپس جیل میں جانا چاہیے۔ میں اس کے لیے راستہ ہموار کروں گی۔“

☆☆☆

وہ قریب المرگ تھی۔ یہ ذہن جانتی تھی کہ کس طرح لینڈ کروزر کو ڈرائیو کرتی ہوئی شہر میں داخل ہوئی تھی اور جو اسپتال قریب تھا اس کے سامنے پہنچتے ہی بے دم ہو گئی تھی۔ اسٹیئرنگ کے ہارن پر ہاتھ اور سر رکھ کر بے ہوش ہو گئی تھی۔

بے ہوشی کے بعد بھی ہارن چنگھاڑ رہا تھا۔ اسپتال کے چوکیدار اور وارڈ بوائز دوڑتے ہوئے آئے تھے۔ انہوں نے اسٹیئرنگ سیٹ کا دروازہ کھول کر دیکھا تو حیران رہ گئے۔ ایک جوان عورت لہو میں بھیگی ہوئی دکھائی دی۔

اسے فوراً ہی ایمرجنسی وارڈ میں پہنچایا گیا۔ قریبی تھانے میں اطلاع دی گئی۔ ایک افسر نے چند سپاہیوں کے ساتھ آکر اس کے لباس سے آئی ڈی کارڈ نکالا تب معلوم ہوا کہ وہ لندن سے آنے والی سیٹ آفیسر ہے۔ پھر تو اسے وی آئی پی ٹریٹمنٹ دیا جانے لگا۔ کئی ڈاکٹروں کو اس کے علاج کے لیے کال کیا گیا۔ پولیس کے اعلیٰ افسران آگئے۔ یہ تفتیش کرنے لگے کہ اسے کس نے گولیاں ماری ہیں اور وہ کہاں سے نیم مردہ ہو کر آئی ہے؟

شام تک معلوم ہوا کہ شہر سے دور تاریخی کھنڈرات میں تین لاشیں پڑی ہوئی ہیں۔ قانون کے رکھوالے اُدھر دوڑے چلے آئے۔ وہاں کے پولیس افسران جام تھارو کے وڈیرے شاہ ولی میاں اور اس کے بیٹوں کو جانتے تھے۔ انہوں نے شاہ داد میاں کی لاش پہچان لی۔ وہ پچھلی رات مرینہ کے ساتھ شہر میں آیا تھا اور اسی کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔

ایسے وقت شاہ ولی میاں نے پولیس افسران کے پاس آکر کہا۔ ”میرا بیٹا مرینہ کی دشمنی سے ہلاک ہوا ہے۔ یہ میں دعوے سے کہتا ہوں۔ میرے دو کارندے چشم دید گواہ ہیں۔ وہ فائرنگ کے وقت کھنڈر میں موجود تھے۔“

کئی افسران نے کہا۔ ”ہم پچھلی رات سے دیکھتے رہے ہیں، مرینہ اور شاہ داد دشمن نہیں تھے، دوست تھے۔ پھر اچانک ایک دوسرے کے دشمن کیسے ہو گئے؟“

ایک کارندے نے کہا۔ ”مرینہ اپنے ایک ولدار مراد کو گرفتار کر کے لے جانا چاہتی تھی۔ ہمارے سائیں شاہ داد یہ نہیں چاہتے تھے۔ مراد کو عزت سے اپنی حویلی میں لے جانا چاہتے تھے۔ اسی بات پر بات بڑھ گئی۔ ہمارے سائیں نے مرینہ پر گولیاں چلائیں، مراد نے ہمارے سائیں کو مار ڈالا۔ ہمیں وہاں سے بھاگنے پر مجبور کیا گیا پھر ہم نہیں جانتے کہ وہ کہاں چلا گیا ہے۔“

وہاں کی پولیس اور انٹیلی جنس والوں کے لیے یہ الجھانے والی باتیں تھیں کہ مرینہ کسی مفرور مجرم کو تلاش کرنے آئی تھی اور اس کا نام انتونی بتایا تھا۔ شاہ داد کے کارندے کہہ رہے تھے کہ وہ کسی مراد کو گرفتار کرنے آئی تھی اور وہ مراد اس کا آئیڈیل اور معشوق بھی ہے۔ جب اس کا معشوق ہے تو اسے نیم مردہ حالت میں چھوڑ کر کہاں منہ چھپا رہا ہے؟

شاہ ولی میاں نے جیلر دلاور جان سے فون پر کہا۔ ”تمہاری بیٹی تو آستین کا سانپ نکلی۔ اس نے میرے جوان بیٹے کو، میرے ایک مضبوط بازو کو ڈس لیا ہے۔ وہ بھی گولیوں سے چھلنی ہو کر اسپتال میں پڑی ہے۔ اگر ڈاکٹروں نے اسے بچا لیا تو میرے ہاتھوں سے نہیں بچے گی۔“

اس نے دھمکی دے کر رابطہ ختم کر دیا۔ کالنگ ٹون پھر ابھرنے لگی۔ اس بار سکھر کی پولیس اسے اطلاع دے رہی تھی کہ اس کی بیٹی ایک اسپتال میں ہے۔ حالت تشویش ناک ہے۔ ڈاکٹر اسے بچانے کی پوری کوششیں کر رہے ہیں۔

جیلر دلاور جان اسی وقت چھٹی کی درخواست لکھ کر وہاں سے سکھر کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ چار

بہترین گن شوٹرز تھے۔ وہاں پولیس والے مرینہ کو سیکیورٹی دے رہے تھے۔ باپ اپنی طرف سے بھی حفاظتی انتظامات کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔

اس نے وہاں پہنچ کر فون پر کہا۔ ”شاہ ولی! میں سکھر پہنچ گیا ہوں۔ تیری دھمکی کا جواب دے کر واپس جاؤں گا۔ میری بیٹی نے تیرے ایک بیٹے کو مارا ہے۔ باقی دو بیٹوں کو میں جہنم میں پہنچاؤں گا۔ ماں کا دودھ پیا ہے تو یہاں میری بیٹی کے قریب آ...“

اس نے جواب سنے بغیر فون بند کر دیا پھر وہاں کے پولیس افسران سے ملاقات کی۔ مرینہ کی طرف سے وضاحت کی کہ وہ مفرور انتھونی کو گرفتار کرنے آئی ہے۔ مراد اس کا ایک ذاتی معاملہ ہے۔ وہ ہوش میں آنے کے بعد اپنے طور پر تفصیلی بیان دے گی۔

اس کی حالت ایسی تھی کہ مسلسل ہوش میں نہیں رہتی تھی۔ رہ رہ کر اس پر بے ہوشی طاری ہو جاتی تھی۔ کبھی گھنٹوں گہری غفلت کی نیند سوتی رہتی تھی۔ مراد سے عشق کرنے اس کو اپنے شکنجے میں رکھنے کی ضد نے اسے اچھی طرح توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ دو دنوں میں ہڈیوں کا ڈھانچا بن گئی تھی۔

باپ نے اس کی تیمارداری اور نگرانی کے لیے لمبی چھٹی لی تھی۔ ماں بھی اس کی دیکھ بھال کے لیے آگئی تھی۔ دوسرے دن دارا اکبر اور بہرام اس سے ملنے آئے۔ بہرام نے کہا۔ ”تم اسپتال میں پڑی ہو۔ برنارڈ کو یہاں سے نکال کر لے جانے کی جو تاریخ مقرر ہوئی تھی وہ پرسوں ہے۔“

دارا نے کہا۔ ”تمہاری حالت ایسی ہے کہ مہینوں تک چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہو گی۔“

بہرام نے کہا۔ ”ہیڈ کوارٹر نے تمہارے خلاف چارج شیٹ جاری ہوئی ہے۔ لو اسے پڑھو۔“

اس نے ایک لفافہ سے تہہ کیا ہوا کاغذ نکال کر دیا۔ اس پر الزام لگایا تھا کہ وہ جس مشن میں ایک اہم کارکردگی دکھانے پاکستان گئی تھی۔ اس میں سراسر ناکام رہی ہے۔ ناکامی کی وجہ یہ ہے کہ وہ فرائض سے غافل رہ کر اپنے ذاتی معاملات میں ملوث رہی۔ اس نے موجودہ مشن میں خود کو بہت ہی نااہل ثابت کیا ہے۔ لہٰذا اسے چھ ماہ کے لیے ملازمت سے برخاست کیا جاتا ہے۔ وہ آئندہ METادارے کا بیج اور وردی استعمال نہیں کرے گی۔ ایک MET آفیسر کے تمام اختیارات اور ذرائع اس سے واپس لیے جا رہے ہیں۔

مرینہ نے وہ چارج شیٹ پڑھ کر اپنے اعلیٰ افسران کا فیصلہ سن کر آنکھیں بند کر لیں۔ دارا اکبر اور بہرام اس کے باپ کے ساتھ بیڈ کے اطراف کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے انتظار کیا کہ وہ آنکھیں کھول کر کچھ بولے گی لیکن آنکھیں بند رہیں۔

ڈاکٹر نے معائنہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ بے ہوش ہو گئی ہے۔ لندن سے ملنے والی چارج شیٹ نے اسے شاک پہنچایا تھا۔ اسے جلد ہی ہوش میں لایا گیا۔ وہ دو گھنٹے بعد بولنے کے قابل ہوئی۔ اس نے باپ سے کہا۔ ”اگر آپ چاہتے ہیں کہ چھ ماہ بعد میری ملازمت بحال ہو جائے تو اس کی ایک ہی صورت ہے۔ آپ فوراً ڈیوٹی پر واپس جائیں اور برنارڈ کو فرار کرانے کے سلسلے میں دارا اکبر اور بہرام سے بھرپور تعاون کریں۔“

وہ قائل ہو کر بولا۔ ”ہاں میری کارکردگی کی رپورٹ وہاں پہنچے گی تو تمہاری ملازمت ضرور تمہیں واپس ملے گی۔“

جیلر کی وہاں موجودگی لازمی تھی وہ فرار کے راستے ہموار کرنے کے لیے بہرام اور دارا اکبر سے بھرپور تعاون کرتا آ رہا تھا۔ وہاں اس کی موجودگی لازمی تھی۔ وہ مجرمانہ تعاون جاری رکھنے کے لیے ان کے ساتھ کراچی چلا گیا۔

سکھر کے پولیس افسران سے یہ حقیقت چھپائی گئی کہ اسے چھ ماہ کے لیے ملازمت سے نکال دیا گیا ہے۔ حقیقت کھلتی تو وہ پولیس اور انٹیلی جنس والوں کی نظروں میں دو کوڑی کی ہو جاتی۔ ابھی تو اسے وی آئی پی ٹریٹمنٹ مل رہا تھا اور وڈیرے شاہ ولی جیسے دشمنوں سے تحفظ حاصل ہو رہا تھا۔ اب اس نے چپ سادھ لی تھی۔

☆☆☆

وہ سب کراچی آگئے۔ ماروی' چاچی اور چاچا کے لیے اس کوٹھی میں رہائش کا انتظام کیا جہاں محبوب ایک رات میمن گوٹھ سے زخمی ہو کر ماروی کے ساتھ روپوش ہونے آیا تھا۔ میڈم روزی کو فون کیا گیا تھا۔ وہ وہاں پہنچنے والی تھی۔ دو سیکیورٹی گارڈز پہلے سے تھے۔ مزید دو گارڈز کی خدمات حاصل کر لی گئیں۔

محبوب نے کہا تھا کہ یہاں آتے ہی دماغی امراض کے ماہرین سے رابطہ کیا جائے۔ معروف نے ایک بزرگ تجربہ کار ماہر نفسیات و دماغی امراض ڈاکٹر انوار الحق سے فون پر رابطہ کیا۔ اسے ماروی کی مختصر سی ہسٹری بتائی پھر کہا۔ ”مریضہ اسپتال نہیں آسکے گی آپ کسی وقت تشریف لے آئیں۔“

اس نے کہا۔ ”ابھی مصروف ہوں۔ یہ رات گزار لیں۔ کل صبح دس بجے حاضر ہو جاؤں گا۔“

مراد نے محبوب کو فون پر مخاطب کیا۔ ”سائیں! ہم کراچی آگئے ہیں۔ معروف صاحب نے آتے ہی ڈاکٹر انوار الحق سے بات کی ہے وہ کل دس بجے ماروی کے علاج کے لیے آئیں گے۔ میں آپ سے کل ملنا چاہتا ہوں۔“

”مجھ سے ملنا ضروری نہیں ہے۔ وہاں ماروی کا خیال رکھو۔ میں جلد ہی رہائی پا کر آنے والا ہوں۔“

”خدا کرے کل کے رہائی پانے والے آج ہی آزادی حاصل کر لیں۔ لیکن آپ سے وہاں ملاقات ضروری ہے۔“

”ملاقات کے سلسلے میں بڑے جھمیلے ہیں۔ باقاعدہ اجازت نامہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔“

”سائیں... آپ کے ہاتھوں میں چاندی کا جوتا ہے۔ بس ایک جوتا رسید کریں۔ اجازت مل جائے گی۔“

”تم نہیں جانتے۔ وہ جوتا کھانے والا جیلر اچانک ہی چھٹی پر کہیں گیا ہے۔“

”میں جانتا ہوں' وہ سکھر گیا ہو گا۔ میں نے اس کی بیٹی کو اسپتال پہنچا دیا تھا۔“

”او گاڈ! تم نے ایسا کیوں کیا؟ وہ باپ بیٹی تمہارے جانی دشمن بن جائیں گے۔“

”پہلے بھی دشمن تھے۔ بیٹی جان کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ آپ معروف صاحب سے بولیں۔ وہ موجودہ قائم مقام جیلر سے لین دین کی بات کریں گے۔ وہ راضی ہو جائے گا۔“

”مراد! تمہارا یہاں آنا مناسب نہیں ہے۔“

”سائیں! ماروی کی بارے میں کچھ ایسی باتیں کہنی ہیں' جو فون پر نہیں کہہ سکتا ہوں۔“

محبوب سوچ میں پڑ گیا پھر بولا۔ ”ایسی کیا بات ہے؟“

”ایک نہیں کئی باتیں ہیں۔ میں آپ سے چھپانا نہیں چاہتا۔ آپ کو یہ سب معلوم ہونا چاہیے۔“

ماروی کی کوئی بات ہو اور وہ سننا نہ چاہے؟ اس نے بے چین ہو کر کہا۔ ”معروف صاحب کو فون دو۔“

مراد ڈرائنگ روم میں تھا۔ وہاں سے اٹھ کر ماروی کے بیڈ روم میں آیا۔ معروف کی طرف فون بڑھا کر بولا۔ ”جناب...! سائیں سے بات کریں۔“

اس نے فون لے کر کان سے لگا کر کہا۔ ”ہیلو محبوب! میں ابھی کال کر رہا تھا اور کہا جا رہا تھا کہ تمہارا فون مصروف ہے۔“

”ہاں مراد مجھ سے باتیں کر رہا تھا۔ آپ بہت اچھے ہیں۔ آپ نے یہاں آتے ہی ڈاکٹر انوار الحق سے بات کی ہے۔ ایک اور ضروری کام کر دیں۔“

”ہاں۔ بولو کیا چاہتے ہو؟“

”کل یہاں مراد سے میری ملاقات کرا دیں۔“

معروف نے چور نظروں سے مراد کو دیکھا پھر تیزی سے چلتا ہوا بیڈ روم سے باہر آ کر دھیمی آواز میں بولا۔ ”مراد کو جیل کا رخ بھی نہیں کرنا چاہیے۔ اگر بھید کھل جائے گا تو تمہاری ممکنہ رہائی کا معاملہ کھٹائی میں پڑ جائے گا۔“

”ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ وہ ماروی کے بارے میں کچھ ایسی اہم باتیں کہنا چاہتا ہے' جنہیں میں سنے بغیر سکون سے نہیں رہ سکوں گا۔ یہ ملاقات بہت ضروری ہے۔“

”میں نہیں سمجھتا کہ وہ ایسی کیا باتیں کرے گا؟ اور وہ باتیں کل ہی سننا کیوں ضروری ہیں؟ ذرا عقل سے کام لو۔ وڈیرے سے سمجھوتا ہو گیا ہے' تمہیں رہائی ملنے والی ہے۔ کیوں بنتے ہوئے کام کو بگاڑنا چاہتے ہو؟“

”کچھ نہیں بگڑے گا۔ میں جو کہہ رہا ہوں' وہ کریں اگر نہ کرنا چاہیں تو فون سمیرا کو دیں۔“

سمیرا بھی بیڈ روم سے نکل کر باہر آگئی تھی۔ کچھ فاصلے پر کھڑی اسے فون پر باتیں کرتے سن رہی تھی۔ اس نے بھی سر گھما کر اسے دیکھ کر فون پر کہا۔ ”تم بہت ضدی ہو۔ ماروی کے معاملے میں کسی کی نہیں سنتے ہو۔ اپنی ہی کرتے رہتے ہو۔ نتیجہ دیکھ رہے ہو کہ کوٹھی کا آرام چھوڑ کر کوٹھری میں پڑے ہوئے ہو۔ بہرحال میں جیلر سے ابھی بات کر رہا ہوں۔“

اس نے فون بند کر کے سمیرا سے کہا۔ ”پھر محبوب کی کھوپڑی گھوم رہی ہے۔ کل ہی مراد سے ملنا چاہتا ہے۔“

وہ دل ہی دل میں خوش ہو کر بولی۔ ”حکم حاکم مرگ مفاجات۔ جھنجلانے سے کیا ہوتا ہے۔ حکم تو ماننا ہی پڑے گا۔“

معروف کو اپنے فون پر رنگ ٹون سنائی دی۔ اس نے بٹن دبا کر کان سے لگایا۔ محبوب نے کہا۔ ”میں یہ بتانا بھول گیا کہ جیلر دلاور جان چھٹی پر گیا ہے۔ اس کی جگہ دوسرا ہے میں اس کا نام نہیں جانتا۔ آپ معلوم کر لیں۔“

”میں ابھی معلوم کرتا ہوں پھر تمہیں کال کروں گا۔“

اس نے فون بند کیا۔ مراد نے بیڈ روم سے باہر آ کر پوچھا۔ ”سائیں سے بات ہو گئی؟“

وہ اس کا فون اسے دیتے ہوئے بولا۔ ”ہاں ہوگئی۔ میں ابھی جیلر سے بات کر رہا ہوں۔“

اس نے جیل کے پی ٹی سی ایل کے نمبر پنچ کیے۔ دوسری طرف بیل جاتی رہی پھر کسی کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو کون ہے؟“

اس نے کہا۔ ”میں ارب پتی تاجر محبوب علی چانڈیو کا ایڈوائزر' کنسلٹنٹ اور جنرل منیجر معروف تگی بول رہا ہوں۔“

”اچھا اچھا چانڈیو صاحب کا نام سنا ہے۔ یہاں ان کا ایک ہم شکل قیدی نمبر سات سو سات ہے۔“

”جی ہاں۔ چانڈیو صاحب اپنے ہم شکل سے کل ہی ملنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ عدالتی اجازت نامہ کے بغیر کسی قیدی سے ملاقات نہیں کرائی جاتی۔ لیکن آپ تو جیل کے بادشاہ ہیں۔ آپ کی اپنی ایک عدالت ہے۔“

”ہاں۔ یہ تو ہے۔ میں جانتا ہوں' دلاور جان سے کیسی لین دین رہتی ہے۔ فی ملاقات کے حساب سے نذرانہ بھی معلوم ہے۔ لیکن نذرانہ میرے نصیب میں نہیں ہے۔“

”آپ کے نصیب میں کیوں نہیں ہے؟“

”ابھی سکھر سے فون آیا ہے۔ وہ اپنی چھٹیاں ختم کر کے واپس آرہے ہیں۔ کل بارہ ایک بجے تک آکر ڈیوٹی جوائن کریں گے۔“

”آپ ان کے آنے سے پہلے اپنی چاندی کر سکتے ہیں۔“

”میں نہیں چاہتا کہ جان صاحب کو میری کمائی کا علم ہو۔ وہ اپنا حصہ طلب کریں گے۔“

”انہیں علم نہیں ہوگا۔ میں وعدہ کرتا ہوں' ان سے اس ملاقات کا ذکر بھی نہیں کروں گا۔“

”پھر تو ابھی اسی وقت ملاقات کرا سکتا ہوں۔ کل کا کیا بھروسا وہ صبح ہی یہاں ٹپک سکتے ہیں۔“

معروف نے مراد کو دیکھا پھر کہا۔ ”جناب! اس سے اچھی بات کیا ہوگی کہ ابھی ملاقات ہو جائے گی۔ کیا ہم آجائیں۔“

”آجائیں۔ ابھی آجائیں۔“

”بس ایک گھنٹے میں پہنچ رہے ہیں۔“

اس نے فون بند کر کے مراد سے کہا۔ ”ابھی چلو۔ دلاور جان کی جگہ کوئی دوسرا ہے۔ لیکن پیسا بھی کیا چیز ہے۔ دوسرا ہو تیسرا ہو۔ سب ہی سکہ رائج الوقت کے پیچھے بھاگتے ہیں۔“

وہ دونوں وہاں سے چلتے ہوئے باہر پورچ میں آئے۔ معروف نے کار کی اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ کر فون پر محبوب سے کہا۔ ”خوش ہو جاؤ۔ بات بن گئی ہے۔ ابھی ملاقات ہوگی۔ میں مراد کے ساتھ آرہا ہوں۔“

ادھر سے محبوب نے خوشی کا اظہار کیا۔ معروف نے فون بند کر کے گاڑی اسٹارٹ کی۔ مراد پچھلی سیٹ پر تھا۔ معروف نے اسے اپنے برابر بیٹھنے کو نہیں کہا۔ گاڑی آگے بڑھا دی۔

سمیرا بیرونی دروازے پر کھڑی مراد کو جاتے دیکھ رہی تھی۔ سوچ رہی تھی۔ اس سے تنہائی میں باتیں کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اسے ایک بات تو یہ سمجھانی تھی کہ جیل سے واپس نہ آئے۔ دوسری بات اس کے دماغ میں یہ ٹھونسنی تھی کہ ماروی کے سامنے خود کو خود دار اور غیرت مند ثابت کرے کہ اس نے محبوب کو اپنی سزا کاٹنے نہیں دی۔ آزادی جیسی نعمت کو ٹھکرا کر پھر قیدی بننے کے لیے جیل گیا ہے۔

اور یہ ثابت کرے کہ اس نے ایمانداری اور انصاف کے تقاضے پورے کیے ہیں۔ اب اگر سزائے موت ہوگی تو اسے ہوگی وہ اپنے حصے کی موت اپنے محسن کو نہیں دے گا۔

لیکن وہ سوچتی رہ گئی تھی اور وہ چلا گیا تھا۔

وہ سنٹرل جیل کی چار دیواری میں آگئے۔ وہاں قائم مقام جیلر ان کا منتظر تھا۔ معروف نے اپنا تعارف کراتے ہوئے اس سے مصافحہ کیا۔ پھر مراد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ قیدی کے ہم شکل کو کسی تعارف کے بغیر پہچان گئے ہوں گے۔“

جیلر نے مسکرا کر مراد سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ سے مل کر خوشی ہو رہی ہے چانڈیو صاحب!“

معروف نے اسے نذرانہ پیش کیا۔ جیلر نے سپاہی کو بلا کر کہا۔ ”مراد کو لے آؤ۔“

سامنے بیٹھا ہوا مراد مسکرانے لگا۔ محبوب کو ساتھ والے کمرے میں بٹھایا گیا تھا۔ وہ ایک منٹ میں وہاں آگیا۔

کمرے میں قدم رکھتے ہی معروف تگی سے نظر ملیں۔ وہ اب تک اس کی نظروں سے چھپتا رہا تھا۔ اپنے ذہین' دیانتدار اور وفادار مشیر اور بزرگ سے یہ صدمہ پہنچانے والی بات چھپاتا رہا تھا کہ ایک قیدی بن کر اسی شہر میں موجود ہے۔

معروف کو اس سے بڑی شکایتیں تھیں۔ اس وقت اسے ایک قیدی کے لباس میں دیکھ کر بڑی تکلیف ہو رہی تھی۔ شاہوں اور شہنشاہوں کی طرح عیش و آرام سے رہنے

والا اس کے سامنے چور بدمعاشوں اور قاتلوں کے لباس میں آیا تھا۔ اور وہاں ذلت آمیز زندگی گزار رہا تھا۔ وہ یک بارگی تڑپ کر آگے بڑھا پھر اس کے دونوں بازوؤں کو تھام کر اسے کھینچ کر سینے سے لگاتے ہوئے بولا۔ ”خدا تمہیں سلامتی اور شریفانہ زندگی دے آج تمہیں دیکھ کر بری طرح ٹوٹ پھوٹ رہا ہوں۔“

وہ آگے بھی بے اختیار بہت کچھ کہنے والا تھا۔ محبوب نے اسے جوانی کی قوت سے بھینچ لیا۔ بڑھاپے کی آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ وہ کان کے پاس منہ لا کر دھیمی آواز میں بولا۔ ”فار گاڈ سیک معروف صاحب...! چپ ہو جائیں کیا بھید کھول کر ایک اور جرم میں سزا بڑھانا چاہتے ہیں؟“

وہ جیسے ہوش میں آکر بولا۔ ”آں۔ ہاں۔ میں۔ میں ایسا کچھ نہیں بول رہا ہوں۔“

پھر وہ ذرا اونچی آواز میں بولا۔ ”تم میرے محبوب علی چانڈیو کی صورت شکل والے ہو۔ بے اختیار تم پر پیار آجاتا ہے۔“

وہ محبوب سے الگ ہو کر بولا۔ ”اللہ نے چاہا تو تمہیں جلد ہی رہائی ملے گی۔“

جیلر نے میز پر سے ایک فائل اٹھا کر کہا۔ ”اس میں عدالت کا ایک نوٹس ہے۔ آج ہی آیا ہے۔ آج سے پانچ دن بعد اس مقدمہ کی آخری سماعت ہے۔ میں بھی دعا کروں گا کہ اس بیچارے کو رہائی مل جائے۔“

معروف نے خوش ہو کر لپک کر وہ فائل لی پھر اسے کھول کر پڑھنے لگا۔ محبوب نے مراد سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”جیلر صاحب نے یہ بہت بڑی خوش خبری سنائی ہے۔ جب وڈیرا ہتھیار ڈال چکا ہے تو مجھے رہائی ضرور ملے گی۔“

اس نے مراد سے کہا۔ ”چانڈیو صاحب! اب آپ لوگوں کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ میں باہر آنے والا ہوں۔“

”ہم خوش ہیں۔ تمہاری رہائی کی دعائیں مانگتے رہیں گے۔ فی الحال ہمیں تنہائی میں باتیں کرنی ہیں۔“

جیلر نے کہا۔ ”ملاقات مختصر سی ہونی چاہیے۔“

محبوب نے کہا۔ ”جناب...! دلاور جان صاحب ایک گھنٹا کی اجازت دیا کرتے تھے۔“

”چلو ایک گھنٹا ہی سہی۔ اس سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔“

مراد نے کہا۔ ”اور وہ جیلر صاحب تنہائی میں باتیں کرنے دیتے تھے۔ ہم اس باتھ روم میں جائیں گے۔“

اس نے جانے کی اجازت دے دی۔ وہ دونوں باتھ

3 پولٹری فارم میں معائنہ کار ٹیم پہنچی۔
انسپکٹر۔ ”تم چوزوں کو کیا دیتے ہو؟“
سردار۔ ”باجرہ۔“
انسپکٹر۔ ”غلط خوراک گرفتار کیا جائے۔“
انسپکٹر دوسرے سردار سے۔ ”اور تم چوزوں کو کیا دیتے ہو؟“
دوسرا سردار۔ ”رائس، انسپکٹر اس کو بھی گرفتار کرو یہ بھی غلط خوراک دیتا ہے۔“
تیسرا سردار گھبرا گیا اور انسپکٹر سے بولا۔ ”سر جی میں اپنے پولٹری فارم کے سارے چوزوں کو 10,10 روپے دے کے بولتا ہوں جا کر جو مرضی چاہے کھالو۔“
مرسلہ: رضوان تنولی کریڑوی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

روم میں آئے۔ محبوب نے دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے کہا۔ ”تم نے تو مجھے اضطراب اور تجسس میں مبتلا کر دیا ہے۔ ماروی کی بات نہ ہوتی تو میں تمہیں بھی یہاں آنے کی اجازت نہ دیتا۔“

مراد نے کہا۔ ”جانتا ہوں۔ اسی لیے میں نے ماروی کی بات کی جسے سن کر آپ بے چین ہو گئے۔ جبکہ کوئی بات نہیں ہے۔“

”کیا...؟“ محبوب نے چونک کر اسے دیکھا۔

وہ بولا۔ ”آپ کیوں چاہتے ہیں کہ یہاں واپس نہ آؤں؟“

”اب یہاں قیدی بن کر رہو گے تو وہ باپ بیٹی تمہیں چکی کی طرح پیس کر رکھ دیں گے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے دلاور جان فون پر مجھے غصہ دکھا رہا تھا۔ مراد...! تم نے تو مرینہ کو مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔“

اس نے قریب ہو کر کہا۔ ”سنا ہے' وہ ہڈیوں کا ڈھانچا بن گئی ہے۔ چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہی ہے۔“

”میں اسے اسپتال نہ پہنچاتا تو وہ مجھے اوپر پہنچا دیتی یا اپاہج غلام بنا کر رکھتی۔“

”یہاں رہو گے تو وہ یہی کرے گی اور اس کا باپ تم پر تارچر کرنے کی انتہا کر دے گا۔“

”میں ان سے نمٹ لوں گا۔ میری فکر نہ کریں۔ اپنا لباس مجھے دیں۔“

وہ اپنی قمیص کے بٹن کھولنے لگا۔ محبوب نے اس کا

ہاتھ پکڑ کر قمیص اُتارنے سے روکتے ہوئے کہا۔ ''فضول باتیں نہ کرو۔ میں تمھیں یہاں مرنے کے لیے چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔''

''اور میں بھی ماروی کی نظروں سے گرنے کے لیے آپ کو اپنی جگہ یہاں رہنے نہیں دوں گا۔''

''تم نظروں سے نہیں گرو گے۔ میں نے فون پر ماروی کو بتایا ہے کہ میں تمھیں دھوکے میں رکھ کر یہاں آیا ہوں۔''

''اور جب اسے معلوم ہوگا کہ میں نے اپنے حصے کی سزا تمھیں پانے نہیں دی۔ آزادی کو ٹھکرا کر پھر قیدی بن کر تمھیں رہائی دی ہے تو اس کا سر فخر سے تن جائے گا۔''

''مراد! وہ تمھاری محبت پر فخر کرتی ہے۔ کرتی رہے گی۔ تم جوش اور جذبے میں یہاں مرنے نہ آؤ۔ معروف صاحب کے ساتھ واپس جاؤ۔''

''پیار کے جوش اور جذبے میں صرف میں نہیں ہوں۔ آپ بھی ہیں۔ ہم دونوں اندر کی بات چھپا رہے ہیں۔

اور اندر کی بات یہ ہے کہ ہم دونوں اپنی کارکردگی سے اپنی قربانیوں سے ماروی کے دل میں زیادہ سے زیادہ جگہ بنانا چاہتے ہیں۔ آپ اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتے۔''

''تم بچپن سے جگہ بنا چکے ہو۔''

''آپ نے جوانی میں آکر چھکا مارا ہے۔ اپنی دولت لٹائی ہے۔ اپنا خون بہایا ہے انتہا یہ کردی کہ میرے حصے کی سزائے موت پانے یہاں آگئے۔ ایسی جنونی محبت سے کون لڑکی ہے جو متاثر نہیں ہوگی اور صدقے واری نہیں جائے گی۔

آپ بازی مار رہے ہیں۔ اب مجھے اپنی بازی کھیلنے دیں۔ یہاں سے باہر جائیں۔''

اس نے قمیص اتار کر اس کی طرف بڑھائی۔ محبوب نے پریشان ہوکر اسے دیکھا پھر پوچھا۔ ''اگر میں نہ جانا چاہوں تو کیا دھکے دے کر یہاں سے نکالو گے؟''

وہ بڑے مستحکم لہجے میں بولا۔ ''میں ہر قیمت پر یہاں رہوں گا۔ آپ نہیں جائیں گے تو بھید کھول دوں گا۔''

''کیا دماغ خراب ہوا ہے؟ ایسی حماقت کرو گے تو قیدی کو فرار کرانے اور اس کی جگہ رہ کر قانون کو دھوکا دینے کے جرم میں مجھے گرفتار کیا جائے گا۔ تم میری رہائی کی نیک تمنا لے کر آئے ہو۔ یہ تمنا پوری نہیں ہوگی۔ تمھاری نادانی ہم دونوں کو لے ڈوبے گی۔''

''آپ مجھ سے زیادہ سمجھ دار ہیں۔ ڈوبنے سے بچالیں میں تو قیدی کا یہ لباس پہن کر ہی دروازہ کھولوں گا۔''

''میں نے کبھی تمھارا برا نہیں چاہا۔ کبھی تمھیں دھوکا نہیں دیا۔ تم مجھے دھوکا دے کر آئے ہو۔''

''پہلے آپ نے دھوکا دیا ہے۔ جب مرینہ مجھے یہاں سے لے جارہی تھی تو آپ پہلے سے یہاں اس لباس میں قیدی نمبر سات سو سات بن چکے تھے۔ نہ مجھ سے یہاں ملاقات کی تھی۔ نہ حقیقت بتائی تھی کہ میری جگہ آچکے ہیں۔''

''میں نے ماروی کو ڈھونڈنے کے لیے تمھاری بہتری کے لیے ایسا کیا تھا۔''

''میں بھی آپ کی بہتری کے لیے ایسا کر رہا ہوں۔ آپ مجھ سے نیکی کر چکے۔ اب مجھے بھی کچھ نیکی کرنے دیں۔''

اب وہ کچھ بول نہیں پارہا تھا۔ انکار کرنے کے انداز میں اس کی اتاری ہوئی قمیص کو دیکھ رہا تھا۔ ''مراد عقل سے سوچو صرف پانچ دن رہ گئے ہیں۔ میں باہر آجاؤں گا۔''

''ان پانچ دنوں میں کچھ اور بھی ہوسکتا ہے۔ ایک پل میں بازیاں پلٹ جایا کرتی ہیں۔ آپ بحث نہ کریں محترم محبوب صاحب...! وقت گزر رہا ہے۔''

وہ بولا۔ ''میں نے کبھی احسانات کا صلہ نہیں مانگا۔ آج مجبور ہوکر مانگ رہا ہوں۔ بس یہ ایک احسان کرو۔ جیسے آئے ہو ویسے ہی معروف صاحب کے ساتھ چلے جاؤ۔''

''مجھے افسوس ہے۔ آج احسان فراموش بن کر ہی آپ کو رہائی دلاسکوں گا۔''

محبوب پھر بے بسی سے سوچنے لگا۔ اس نے کہا۔ ''ہم دونوں اسی طرح کھڑے رہیں گے اور وقت گزر جائے گا پھر دروازہ کھولنا پڑے گا۔ پھر کیا ہوگا...؟''

اس نے شکست تسلیم کرلی۔ اپنا لباس اتارنے لگا۔

دفتری کمرے میں جیلر اور معروف تجلی میز کے اطراف بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے واش روم کے کھلنے والے دروازے کو دیکھا۔ وہ دونوں باہر آرہے تھے۔

وہ دونوں وہی تھے۔ چہرے بھی وہی تھے۔ لباس بھی وہی تھے۔ یہ سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا کہ صرف لباس کی جگہ بدلنے سے قیدی بدل گئے ہیں۔

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور
سنسنی خیز گردش ایام کی دلچسپ داستان
کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

نسخہ

منظر امام

کبھی کبھی بڑے مسائل کا حل چھوٹے چھوٹے نسخوں میں مل جاتا ہے۔ مگر کوئی تلاش کرنا چاہے تب ہی... ورنہ عمر بھر کی خواری مقدر بن جاتی ہے۔ البتہ یہاں چند لوگوں کی ہوشیاری کام کرگئی کیونکہ زندگی کو خوشگوار بسر کرنے کا ایک کامیاب نسخہ ان کے ہاتھ لگ چکا تھا۔

روتی دھوتی زیست سے ہنسی کشید کرنے والی تحریر

اس آدمی کی عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان ہوگی۔ خوش لباس اور باوقار سا آدمی تھا اور وہ عورت میرے اندازے کے مطابق تیس سے کم ہوگی اور بہت طرحدار قسم کی عورت تھی۔

وہ ان عورتوں میں سے تھی جن پر زمانے کے اثرات ذرا کم ہی ہوا کرتے ہیں اور جن کی شادابیاں بہت دنوں تک برقرار رہتی ہیں۔ میں اس وقت ٹیکسی اسٹینڈ کے پاس کھڑا تھا کہ وہ عورت بھی آکر کھڑی ہو

گئی۔

ایسی کسی عورت کو دیکھ کر سینے میں ہلچل سی ہونے لگتی ہے۔ خاص طور پر کسی خوبصورت عورت کو...... شاید وہ بھی ٹیکسی کے لیے آئی ہوگی اور میری طرح کسی دفتر میں کام کرتی ہوگی۔

اب ایسی باتیں میں اس سے کہاں معلوم کر سکتا تھا۔ خواہش تو یہی تھی کہ آگے بڑھ کر اس سے بات کرلوں۔ اس سے پوچھوں کہ وہ کس طرف جارہی ہے اور یہ جھوٹ بھی بول دوں کہ میں بھی اسی طرف جارہا ہوں۔ چلیں میں آپ کو ڈراپ کردیتا ہوں۔

میں یہ سب سوچ رہا تھا کہ اچانک وہ آدمی آگیا۔ وہ آگے جارہا تھا لیکن اس عورت کو دیکھ کر رک گیا۔ اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوگئی اور وہ اس عورت سے چند قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔

عورت نے ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر اپنا چہرہ میری طرف کرلیا۔ اتنے میں ایک ٹیکسی آئی۔ اس آدمی نے ٹیکسی والے سے کچھ بات کی پھر اچانک اس عورت کے پاس آگیا۔

''محترمہ آپ کس طرف جارہی ہیں؟'' اس نے بڑے ادب سے اس عورت کو مخاطب کیا۔ وہ دونوں میرے قریب ہی کھڑے تھے اس لیے میں نے ان کی باتیں سن لی۔

''جی صدر کی طرف۔'' اس عورت نے تھوڑا سا ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

''چلیں میں آپ کو ڈراپ کردیتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''میں بھی اسی طرف جارہا ہوں، آجائیں پلیز۔''

بالکل وہی باتیں جو میں نے سوچ رکھی تھیں لیکن میں صرف سوچتا رہ گیا اور اس کم بخت نے بازی مارلی۔ وہ عورت ہچکچاتی ہوئی آگے بڑھی اور ٹیکسی کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئی جبکہ وہ آدمی آگے بیٹھا تھا۔

میں اپنی جگہ کڑھ کر رہ گیا۔ اچھا خاصا معقول آدمی معلوم ہوتا تھا اور کتنی آسانی سے ایک خوبصورت عورت کو اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب بھی ہوگیا۔

ان دونوں کے درمیان یقیناً راستے بھر باتیں ہوتی رہی ہوں گی۔ ایک دوسرے کو نام بتائے گئے ہوں گے پھر فون نمبر بھی دیے گئے ہوں گے اور ہوسکتا ہے اس نے چائے کی دعوت بھی دے دی ہو۔ اب دونوں کہیں چائے پینے بیٹھ گئے ہوں گے۔ یہ سب سوچ سوچ کر میرا دماغ کھولتا رہا۔

میرے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ میں بہت کچھ سوچ تو لیتا ہوں لیکن عمل نہیں کرپاتا اور بازی کسی اور کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔

کبھی مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہوتی یا میں ہمیشہ دیر کردیتا ہوں اور وقت گزر جاتا ہے۔ بہرحال اس وقت میں بہت غصے میں تھا کیونکہ مجھ سے کچھ بھی نہیں ہوسکا تھا۔

کئی دن بعد وہ آدمی مجھے پھر دکھائی دیا۔ ان دونوں کی صورتیں تو میرے ذہن پر نقش ہوگئی تھیں۔ میں کیسے بھول سکتا تھا۔ وہ آدمی ایک مہنگے سے ریستوران کے سامنے کھڑا تھا۔

اس کے ہاتھ میں گلاب کا ایک خوبصورت پھول بھی تھا۔ اس کے انداز سے یہ ظاہر ہورہا تھا کہ وہ کسی کے انتظار میں ہے۔ میں سامنے سے گزر رہا تھا اسے دیکھ کر میں آڑ میں ہوگیا۔

یہ آدمی شاید اسی عورت کا انتظار کررہا ہوگا۔ میرا اندازہ بالکل درست نکلا۔ ایک ٹیکسی آکر رکی اور اس میں سے وہی عورت مسکراتی ہوئی باہر آگئی۔ اس دن اس نے بہت خوبصورت ڈریسنگ کر رکھی تھی۔ ہلکے میک اپ اور خوبصورت لباس نے اس کی طرحداری اور دلکشی میں اضافہ کردیا تھا۔

مرد اسے دیکھ کر تیزی سے اس کے پاس آگیا۔ اس نے وہ پھول ایک ادا سے اس کی طرف بڑھا دیا۔ عورت نے پھول لے لیا پھر وہ دونوں ہنستے مسکراتے ہوئے ریستوران کے اندر چلے گئے اور میں وہیں اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔

اس وقت مجھے اس آدمی پر بے پناہ غصہ آرہا تھا۔ کم بخت اچھا خاصا باوقار سا آدمی ہے اور اس قسم کی چھچھوری حرکت کررہا ہے یا شاید میرا احساسِ محرومی بول رہا تھا۔

میرا دل چاہا کہ میں بھی ریستوران میں داخل ہوکر ان کی باتیں سنوں لیکن پھر خیال آیا کہ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوگی۔ ممکن ہے کہ دونوں مجھے شناخت کرلیں۔

کئی دن گزر گئے۔ ایک دن وہ پھر اپنے علاقے کی ایک مارکیٹ میں دکھائی دیا۔ ایک چھوٹا سا بچہ تقریباً چار پانچ برس کا اس کے ساتھ تھا یعنی وہ شادی شدہ

آدمی تھا اور ایک بچہ بھی تھا یا ہوسکتا ہے اور بھی ہوں۔

وہ شادی شدہ ہوکر ایک عورت سے عشق لڑا رہا تھا۔ اس کی بیوی کا یہ خیال ہوگا کہ اس کا شوہر بہت باوفا ہے لیکن اس بے چاری کو کیا معلوم تھا کہ اس کا شوہر گھر سے باہر کیا کرتا پھر رہا ہے۔

لگتا تھا جیسے قدرت جان بوجھ کر یہ تماشا دکھانے کے لیے اس آدمی کو کسی نہ کسی بہانے میرے سامنے لارہی ہو۔

ایک بار میں اپنے ایک دوست کے دفتر میں اس کے کمرے میں بیٹھا تھا کہ ہلکی سی دستک کے ساتھ وہ شخص کمرے میں داخل ہوگیا۔ میرا دوست اسے دیکھتے ہی کھڑا ہوگیا۔

''ارے، رضوان صاحب...... آیئے...... آیئے۔'' دونوں نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ میرے دوست نے میری طرف اشارہ کیا۔ ''ان سے ملیں، یہ میرے دوست نوید ہیں اور یہ رضوان ہیں۔'' اس نے اس آدمی کی طرف اشارہ کیا۔

''جی ہاں میں ان سے مل چکا ہوں۔'' میں نے رضوان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اوہ، اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟''

''جانتے نہیں ہیں، صرف دیکھا ہوا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ ایک بار ٹیکسی اسٹینڈ پر دکھائی دیے تھے۔ دوسری بار ریستوران کے سامنے پھر ایک مارکیٹ میں بھی ان سے مڈھ بھیڑ ہوچکی ہے۔''

ایک لمحے کے لیے رضوان کے چہرے کے تاثرات کچھ بدل سے گئے۔ پھر اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ایسا لگتا ہے جیسے آپ نے شاید باقاعدہ میرا تعاقب شروع کردیا ہے۔''

''ایسا ہی سمجھ لیں۔'' چائے آگئی پھر چائے کے دوران اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں اور اندازہ ہوا کہ وہ خاصا پڑھا لکھا آدمی ہے۔ خاص طور پر ادب اور فلسفے پر اس کی بہت گہری نظر ہے۔

میں اس کی باتیں سن سن کر دل ہی دل میں ہنستا رہا۔ انسان کے کتنے روپ ہوتے ہیں۔ ایک طرف تو یہ روح کی پاکیزگی پر لیکچر دے رہا ہے تو دوسری طرف یہ حال ہے کہ ایک غیر عورت سے دوستی کرتا پھر رہا ہے۔

رضوان کچھ دیر بیٹھ کر چلا گیا۔

''ہاں بھئی کیسا لگا میرا دوست؟'' میرے دوست نے پوچھا۔

''پڑھا لکھا آدمی ہے لیکن اندر سے کھوکھلا ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ کس طرح؟''

''تم یہ بتاؤ اس کے گھر کے حالات کیسے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت اچھے ہیں۔'' میرے دوست نے بتایا۔ ''میں دو تین دفعہ اس کے گھر جاچکا ہوں۔ جہاں تم رہتے ہو اس سے کچھ فاصلے پر اس کا اپنا خوبصورت سا گھر ہے۔''

''اور اس کی بیوی بچے؟''

''بہت خوبصورت بیوی ہے، ایک بچہ ہے یعنی وہ سب کچھ ہے جو ایک مطمئن زندگی کی ضمانت ہوا کرتا ہے لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو تمہیں اس سے کیا دلچسپی ہوگئی؟''

''یہ موصوف عشق لڑاتے پھر رہے ہیں۔'' میں نے بتایا۔

''ارے نہیں، رضوان ایسا آدمی نہیں ہے۔'' میرے دوست نے کہا۔ ''میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔''

''تم سے زیادہ میں نے جان لیا ہے بھائی کبھی میں تمہیں فون کرکے بلاؤں گا۔''

''کہاں بلالوگے؟''

''جہاں یہ دونوں بیٹھے ہوں گے۔''

''ایک بات تو بتاؤ، آخر تم اس کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟'' میرے دوست نے پوچھا۔ ''فرض کرو رضوان کسی لڑکی سے ملتا بھی ہے۔ دونوں ایک ساتھ سیر کرتے ہیں تو تمہیں کیا مسئلہ ہے؟''

''یار سچ یہ ہے کہ وہ عورت مجھے پسند آگئی ہے۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''تم اسے میری جھلاہٹ کہہ لو یا کچھ بھی سمجھ لو میں جب ان دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ دیکھتا ہوں تا تو غصہ آنے لگتا ہے۔''

میرا دوست میری اس بات پر بہت دیر تک ہنستا رہا۔ اس کا یہی خیال تھا کہ مجھے یا تو غلط فہمی ہوئی ہے یا کوئی اور بات ہے کیونکہ وہ رضوان پر شک کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔

کئی دن بعد مجھے اپنی بات ثابت کرنے کا موقع

مل ہی گیا۔

رضوان اسی خوبصورت عورت کے ساتھ ریسٹورنٹ میں موجود تھا۔ دونوں بہت ہنس ہنس کر بات کر رہے تھے یعنی اب معاملہ بہت آگے جا چکا تھا۔ رضوان نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اسی وقت اپنے دوست کو فون کر دیا۔ ''اگر اپنے دوست کی اصلیت جاننا چاہتے ہو تو فوراً البوم اسٹار آ جاؤ۔'' میں نے بتایا۔

میرے دوست کو بھی کرید لگ گئی تھی۔ اس لیے اس نے وعدہ کیا کہ وہ پندرہ منٹ میں پہنچ رہا ہے۔ اس دوران میں وہ عورت رضوان سے اجازت لے کر چلی گئی جبکہ رضوان ریسٹورنٹ میں ہی بیٹھا رہا۔

میں ریسٹورنٹ سے باہر ہی کھڑا تھا پھر میرا دوست بھی پہنچ گیا۔ ''ہاں اب بتاؤ، کہاں ہے وہ دونوں؟''

''یار وہ عورت تو جا چکی ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''اندر صرف رضوان بیٹھا ہے۔''

''کوئی بات نہیں اس سے پوچھ لیتے ہیں کہ کیا چکر ہے۔''

''کیا پاگل ہو گئے ہو، کیوں شرمندہ کرواؤ گے۔''

''کچھ بھی نہیں ہوگا۔ وہ ایسا آدمی نہیں ہے۔'' میرے دوست نے کہا۔ ''بلکہ وہ خود بھی انجوائے کرے گا۔''

میں منع کرتا رہا لیکن میرا دوست مجھے کھینچ کر رضوان کے پاس لے آیا تھا رضوان ہم دونوں سے بہت گرم جوشی سے ملا۔

''یار میں تو تمہاری محبوبہ کو دیکھنے آیا تھا۔'' میرے دوست نے کہا۔

''میری محبوبہ......!'' رضوان نے حیرت ظاہر کی۔ میرے دوست نے نہایت مفصل انداز میں پھر میرے حوالے سے وہ سب کچھ کہہ دیا جو میں نے اسے بتایا تھا۔ اس وقت مجھے خاصی شرمندگی ہو رہی تھی جبکہ رضوان سنجیدہ تھا۔

اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے بالکل ٹھیک سمجھا ہے بھائی۔ میں واقعی ایک عورت سے محبت کرنے لگا ہوں اور اس جذبے پر کوئی اختیار بھی نہیں ہوتا۔''

''حد ہو گئی۔'' میرا دوست غصے سے بولا۔ ''یار اتنی اچھی بھابی کے ہوتے ہوئے تم ایسی حرکت کر رہے ہو۔''

''تم اسے میری مجبوری بھی سمجھ سکتے ہو۔''

''یہ کیسی مجبوری ہے؟''

''تم دونوں میرے ساتھ گھر چلو۔ میں تمہیں تفصیل سے بتاؤں گا کہ یہ کیسی مجبوری ہے۔''

اب پتا نہیں اس کے گھر جانا مناسب تھا بھی یا نہیں۔ بہرحال تجسس اتنا تھا کہ میں اور میرا دوست دونوں رضوان کے گھر پہنچ گئے۔ یہ گھر میرے ہی علاقے میں تھا۔

انتہائی خوبصورتی اور سلیقے سے سجا ہوا گھر۔ رضوان نے ہم دونوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ کچھ دیر میں رضوان کی بیوی ٹرالی میں ناشتے کے لوازمات لیے ہوئے اندر آ گئی اور میں اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا کیونکہ یہ وہی عورت تھی۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کہوں جبکہ رضوان اور وہ عورت دونوں ہنسے جا رہے تھے۔

''یہ کیا سلسلہ ہے یار......؟'' میرے دوست نے پوچھا۔

''یہ ایک نسخہ ہے، محبت میں گرم جوشی پیدا کرنے کا۔'' رضوان نے بتایا۔ ''بات یہ تھی کہ ہم دونوں یہ محسوس کر رہے تھے کہ ہماری محبت میں سرد مہری سی پیدا ہو گئی ہے۔ ہم ایک ہی لوکیشن پر ایک دوسرے کو دیکھتے دیکھتے بور ہو گئے تھے۔ اس لیے ہم دونوں نے سوچا کہ کیوں نہ اس طرح ملاقاتیں کی جائیں جس طرح محبوب اور محبوبہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں چھپ چھپ کر اور تم یقین کرو کہ اب ہمارے درمیان وہی پہلے والی گرم جوشی پیدا ہو گئی ہے۔''

''او خدا......'' میں شرم سے پسینے پسینے ہو رہا تھا۔

''بھائی صاحب۔'' رضوان کی بیوی نے مجھے مخاطب کیا۔ ''ویسے یہ نسخہ ہے بہت زبردست۔ آپ بھی چاہیں تو بھابی کے ساتھ یہ نسخہ استعمال کر سکتے ہیں۔'' وہ سب ہنسنے لگے تھے۔

ویسے میں نے بھی گھر آ کر اپنی بیوی کے لیے یہ نسخہ آزمایا ہے اور بہت مفید پایا ہے۔ اگر آپ بھی اس قسم کی صورتِ حال سے دوچار ہیں تو بے جھجک یہ نسخہ استعمال کر سکتے ہیں۔ میری طرف سے اجازت ہے۔

سید عبداللہ ولی رحمتہ اللہ علیہ

ضیا تسنیم بلگرامی

یوں تو ہر بشر اپنی زندگی اپنے لیے جیلیتا ہے لیکن... اوروں کے لیے اپنی ذات کو وقف کر دینا یقیناً بڑے لوگوں کی عظمتوں کی دلیل ہے اور یہی اعلیٰ ظرفی انہیں مختلف دشوار گزار مراحل کے ذریعے انسانیت کی معراج پر فائز کر دیتی ہے۔ آپ کا تعلق بھی انہی مقبول بندوں میں سے تھا جنہیں اللہ پاک نے ولی کا درجہ دیا۔

جنگل جنگل بستی بستی فیوض کی برسات کا عجب انداز

اکبر آباد کے قریب بارہہ کے نواح میں کھیڑی نامی قصبے کے لوگ زیادہ تر ادھر اُدھر سے آ کر بس گئے تھے اور اسے اپنا وطن بنا لیا تھا۔ ان نو آبادوں میں ایک سید گھرانا بھی تھا۔ یہاں آنے کے بعد ان لوگوں نے بڑی ترقی کی۔ اور ان میں سے بعض کا امراء میں شمار ہونے لگا۔ ان کی نسلیں پھلنے پھولنے لگیں۔ مغل دورِ حکومت تھا، یہ سید خاندان مغلیہ سرکار میں ایک معزز مقام رکھتا تھا۔ اسی خانوادے میں دو میاں بیوی ایسے بھی تھے جنہیں اولاد کی بڑی تمنا تھی مگر یہ پوری نہ ہوتی تھی، جب دونوں ادھیڑ عمر میں داخل ہو گئے

اور اولاد کی خواہش مایوسی میں بدلنے لگی تو ایک دن اچانک بیوی نے یہ خوش خبری سنائی کہ اللہ نے ان کی سن لی اور وہ دن دور نہیں جب ان کے گھر میں ایک تیسرا وجود بھی کلکاریاں مارنے لگے گا۔

شوہر اپنی بیوی کا یوں بھی بہت خیال رکھتا تھا۔ لیکن اب اور زیادہ توجہ رہنے لگی۔ دونوں میاں بیوی اپنے رب سے یہی دعا کرتے رہتے کہ ”لڑکی یا لڑکا، صالح پیدا فرما۔ اے میرے رب ایسی اولاد نہ دے جو شرمندگی کا باعث بن جائے، اولاد ہماری بہت بڑی خواہش ہے، لیکن وہ اولاد نہیں جو خود شناسی اور خدا شناسی سے محروم ہو۔“

مقررہ مدت پوری ہونے کے بعد گھر کی چہار دیواری میں نومولود کے رونے کی آواز سنائی دی اور والدین کو یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ نومولود لڑکا ہے۔ خاندان والے بھی بہت خوش ہوئے اور مبارکباد دینے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ بچے میں کچھ غیر معمولی باتیں ایسی تھیں جنہیں ہر کوئی محسوس کرسکتا تھا۔ آواز میں بلا کی کشش تھی، وہ روتا تو سننے والوں کا بھی جی چاہتا کہ بس آواز سنتے رہیں۔

بچے کا نام عبداللہ رکھا گیا اور سید عبداللہ کے نام سے مخاطب کیا جانے لگا۔ نیک اور متقی باپ نے بیٹے کو دینی تعلیم دلوانا چاہی مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ابھی چار ساڑھے چار سال کے تھے کہ ماں اور باپ دونوں ہی یکے بعد دیگرے چل بسے۔ چچا اور چچا زاد بھائی موجود تھے۔ چچا نے ان کی کفالت کی ذمے داری قبول کی۔ لیکن سید عبداللہ نے ان کے رویے اور سلوک میں معلوم نہیں کیا محسوس کیا کہ ترکِ وطن کا ارادہ کرلیا چند سال چچا کے ساتھ رہ کر خدا طلبی میں نکل کھڑے ہوئے۔ اولیائے کرام کا ذکر سنتے رہے تھے۔ اب ان سے ملاقات کا شوق پیدا ہوا اور ان کی تلاش میں راہ نوردی شروع کردی۔ ایک بچہ، جس کا شعور پوری طرح بیدار نہ ہوا ہو، جس کو اپنے ہی قصبے کے راستوں کا علم نہ ہو، جو یہ نہ جانتا ہو کہ کون اپنا ہے اور کون پرایا۔ وہ اللہ کے برگزیدہ بندوں کی جستجو میں نکل کھڑا ہوا۔

سواری میسر نہ تھی۔ ایک قافلے میں پیدل ہی شامل ہو گئے، یہ قافلہ مشرقی پنجاب جا رہا تھا۔ قافلے والوں نے ایک بچے کو یوں ہم سفر جو دیکھا تو حیران رہ گئے۔ اس قافلے میں فوجی، تاجر، اہل حرفہ و اہل کسب، ہنرمند، کاریگر بھی تھے، ایک تاجر کو سید عبداللہ پر بہت رحم آیا۔ اپنے گھوڑے سے اتر پڑا اور سید عبداللہ سے پوچھا۔ ”میاں صاحبزادے! تم کس کے ساتھ ہو؟“

سید عبداللہ نے جواب دیا۔ ”کسی کے بھی ساتھ نہیں۔“

تاجر نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا مطلب؟ کیا تنہا ہو؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”میں تنہا بھی نہیں، میرا اللہ میرے ساتھ ہے۔“

تاجر کھسیا کر کہنے لگا۔ ”میاں صاحبزادے! تم میرا مطلب نہیں سمجھے اس قافلے میں تمہارے ساتھ اور کون کون ہے؟“

سید عبداللہ نے جواب دیا۔ ”اس قافلے میں میرے اللہ کے علاوہ پورا قافلہ شریکِ سفر ہے۔“

بچے کے جوابات سے تاجر کو یہ اندازہ تو ہوگیا کہ یہ کوئی معمولی بچہ نہیں ہے۔ تاجر کی دلچسپی بڑھی اور اس نے بچے سے درخواست کی کہ وہ اس کے ساتھ گھوڑے پر بیٹھ جائے۔

سید عبداللہ نے جواب دیا۔ ”آپ کی پیش کش کا شکریہ! لیکن میں اپنی طلب صادق کو زیر بار احسان نہیں کرنا چاہتا۔“

تاجر کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ باتوں سے یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ اس سے کوئی بچہ مخاطب ہے۔

اس گفتگو میں قافلہ آگے نکل چکا تھا اور یہ دونوں پیچھے رہ گئے تھے گرد و غبار قافلے کو نظروں سے اوجھل کیے دے رہا تھا۔ تاجر نے عاجزی سے کہا۔ ”صاحبزادے! میں آپ کا دل سے معترف اور عقیدت مند ہوں مجھے خدمت کا موقع دیجیے۔ اور یہ سمجھیے کہ مجھے اللہ نے آپ ہی کی خدمت کے لیے اس قافلے میں بھیجا ہے، اگر آپ میرے ساتھ گھوڑے پر بیٹھ جائیں گے، تو میں آپ پر کوئی احسان نہیں کروں گا بلکہ آپ مجھ پر احسان فرمائیں گے۔“

سید عبداللہ نے قافلے کی طرف دیکھا، وہ گرد و غبار میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس عالم میں انہوں نے کسی بزرگ کی آواز سنی جو انہیں بلا رہا تھا۔ ”سید عبداللہ! دیر نہ کر، تاجر کی بات مان لے، میں تیرا انتظار کر رہا ہوں۔“

سید عبداللہ نے تاجر سے پوچھا۔ ”میرے کرم فرما! آپ کوئی آواز سن رہے ہیں؟“

تاجر نے سکوت اختیار کیا اور آواز سننے کی کوشش کرتا رہا مگر کچھ سنائی نہ دیا۔ اس نے جواب دیا۔ ”میاں صاحبزادے! مجھے تو کوئی آواز بھی نہیں سنائی دے رہی ہے۔“

سید عبداللہ نے کہا۔ ”پنجاب کے کسی جنگل سے مجھے بلایا جا رہا ہے، وہاں کوئی شخص میرا انتظار کر رہا ہے۔ مجھے حکم ملا ہے کہ میں تمہاری پیش کش قبول کرلوں۔“

تاجر کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی اس نے سید عبداللہ کو اپنے گھوڑے پر آگے بٹھا لیا اور گھوڑے کو ایڑ جو لگائی تو وہ آناً فاناً قافلے سے جا ملا۔ تاجر سید عبداللہ کی ذات کو غنیمت سمجھ رہا تھا۔ یہ ذات بابرکات تھی۔ کئی دن سفر کرنے کے بعد سید عبداللہ نے مراقبہ کیا اور اللہ سے رجوع کیا، پوچھا۔ ”اے رب العالمین! تو خوب واقف ہے کہ میں کیا ہوں اور میری کیا حیثیت ہے۔ میں نے جس چیز کی ہمت کی ہے وہ میرے سن اور شعور سے بہت بڑی ہے۔ مجھے کہاں اور کس کے پاس جانا ہے، میں نہیں جانتا، میری راہنمائی تیرے ذمے ہے، میں اپنی آنکھیں بند کیے بھاگا چلا جا رہا ہوں اب تو ہی بتائے گا کہ مجھے کہاں رکنا ہے اور کس کی صحبت اختیار کرنا ہے۔“

تاجر نے آپ کو مراقبے میں جو دیکھا تو اور زیادہ سکتے میں رہ گیا۔ جب سید عبداللہ نے مراقبہ ختم کیا تو تاجر نے کہا۔

”صاحبزادے! آپ کی ذات میرے لیے باعث برکت ہے، آپ خود پسند فرمائیں تو آپ کو زندگی بھر اپنے ساتھ رکھنے کو تیار ہوں۔“

سید عبداللہ نے جواب دیا۔ ”میں نے جس شے کی تلاش میں اپنے عزیزوں، رشتہ داروں کو چھوڑ دیا۔ ان کے بعد کسی اور کو قبول کرکے اپنی طلب سے کس طرح منہ موڑ سکتا ہوں۔ بہر حال تمہاری پیش کش کا میں شکرگزار ہوں۔“

تاجر نے عاجزی سے پوچھا۔ ”تب پھر آپ یہ بتائیں کہ آپ کو جانا کہاں ہے؟ تاکہ میں آپ کو وہاں تک پہنچانے کی سعادت حاصل کرسکوں۔“

آپ نے سادگی سے جواب دیا۔ ”مجھے کچھ پتا نہیں کہ کہاں جانا ہے، میں خود ابھی تک لاعلم ہوں۔“

یہ قافلہ چند دنوں بعد ایک خطرناک گھنے جنگل سے گزرنے لگا۔ قافلے والوں کا ڈر سے برا حال تھا۔ وہ نہایت سوچ سمجھ کر بااحتیاط اس جنگل کو عبور کرنے کی فکر میں تھے۔ تھوڑی دیر بعد جنگلی درندوں کے بولنے اور دہاڑنے کی آواز سے پورا جنگل گونج اٹھتا تھا۔ قافلے کا ہر شخص خوفزدہ اور پریشان تھا لیکن سید عبداللہ پر خوف یا پریشانی کا ذرا سا بھی اثر نہ تھا۔ تاجر نے پوچھا۔ ”میاں صاحبزادے! میں جانتا ہوں کہ آپ اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں۔ آخر آپ پر اس جنگل کی خوفناکی اور خطرناکی کا اثر کیوں نہیں ہوتا؟“

سید عبداللہ نے جواب دیا۔ ”مجھے اس کا یقین ہے کہ اگر میری زندگی کا خاتمہ کسی درندے کی خوراک بن جانے کی شکل میں ہوگا تو مجھے اپنے اس انجام سے کوئی محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ لیکن اگر میری زندگی باقی ہے تو کوئی درندہ مجھے ہلاک نہیں کرسکتا۔ بس یہی اندازِ فکر مجھے بے خوف رکھے ہوئے ہے۔“

رات کو قافلے والوں نے جس جگہ قیام کیا، اس کے چاروں طرف آگ جلا دی۔ اس کی روشنی دور دور تک پھیل گئی۔ قافلے والوں نے جنگلی جانوروں کے سائے متحرک دیکھے۔

سید عبداللہ ان سب سے الگ تھلگ ہو کر اپنے آنے والے دنوں کی بابت سوچنے لگے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہے تھے کہ کسی نے سرگوشی میں کہا۔ ”سید عبداللہ، قافلے کو جانے دے، تو اس سے الگ ہو جا۔ جانوروں کی پروا کیے بغیر تو شمال کی طرف چلتا رہ۔ آگے تجھے ایک مسجد ملے گی۔ تیری پہلی منزل یہی مسجد ہے۔ وہیں رک جا اور جو بتایا جائے اس پر عمل کر۔“

سید عبداللہ نے اسی وقت قافلے سے علیحدگی اختیار کرلی اور شمال کی طرف چل پڑے۔ درندوں کی بھیانک آوازیں پورے جنگل کو لرزا رہی تھیں تاجر نے انہیں جاتے ہوئے دیکھ لیا اور ان کے پیچھے دوڑا۔ ”میاں صاحبزادے! تم کہاں چل دیے؟ کچھ تو سوچو، ادھر نہ جاؤ، ورنہ جنگلی درندے چیر پھاڑ کر رکھ دیں گے۔“

لیکن سید عبداللہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ برابر چلتے رہے۔ تاجر نے کچھ دور تک ان کا پیچھا کیا، اس کے بعد خوف نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ وہ رک گیا، قافلے کے دوسرے لوگ بھی حیرت زدہ تھے۔ تاجر سے کہنے لگے۔ ”یہ لڑکا اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے شاید...... ورنہ رات کی تاریکی میں تن تنہا ادھر نہ جاتا جہاں ہلاکت اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔“

تاجر کی نظریں سید عبداللہ کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ اس نے کہا۔ ”لوگو! تم نے اس حیرت انگیز بچے کو سمجھا ہی نہیں۔ ہلاکت...... کیسی ہلاکت؟ یہ ایک غیر معمولی بچہ ہے۔ جنگلی درندے اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے، مجھے یقین ہے کہ درندے اس کی حفاظت کریں گے۔“

سید عبداللہ آگ کی روشنی سے بھی آگے نکل گئے...... اور ان کے چاروں طرف تاریکی کی چادر بچھ گئی۔ جھاڑیاں ان کو روکنے لگیں لیکن یہ چلتے رہے۔ ایک درخت کی جڑ میں کالا ریچھ بیٹھا تھا۔ رات کی تاریکی نے اس کے وجود کو چھپا دیا تھا۔ آپ اس کے پاس سے گزرے تو ریچھ کی بھیانک آواز سنائی دی۔ سید عبداللہ اس کی پروا کیے بغیر آگے بڑھ گئے۔ ریچھ ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

کچھ دور آگے ایک بھیڑیے نے آپ پر جست لگائی۔ مگر ریچھ نے جوابی حملہ کر کے بھیڑیے کو ہلاک کر دیا۔ آپ کا سفر جاری رہا۔

سید عبداللہ نے رات کے پچھلے پہر درختوں کے بیچ میں روشنی کی جھلک دیکھی۔ یہ اس روشنی کی طرف بڑھے اور کچھ دیر بعد جب یہ روشنی کے قریب پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ وہ ایک مسجد کے سامنے کھڑے ہیں۔ گھنے جنگل میں مسجد ایک عجیب حیرت انگیز بات تھی۔ سید عبداللہ نے مسجد میں داخل ہو کر حجرے کا در کھٹکھٹایا تو اندر سے جواب ملا۔ ”سید عبداللہؒ دروازہ کھلا ہے، اندر آجاؤ۔“

سید عبداللہؒ نے آہستہ سے دروازے کو دھکا دیا تو وہ کھل گیا۔ سید عبداللہؒ کو جھرجھری آ گئی تھی۔ ان کے رونگٹے کھڑے ہو چکے تھے، اندر داخل ہوئے تو وہاں ایک سن رسیدہ بزرگ کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ ان کی پلکیں تک سفید ہو چکی تھیں۔ گھنی بھوؤں تلے بڑی بڑی آنکھیں جنہیں جھریوں نے محصور کر رکھا تھا، اوپر اٹھیں اور سید عبداللہ سے کہا۔

”صاحبزادے! بیٹھ جاؤ۔“

سید عبداللہؒ ان کے پاس ہی ادب سے بیٹھ گئے۔ انہوں نے کہا۔ ”میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ بیٹے! یاد رکھو جس نے اللہ کی طلب میں قدم اٹھایا اللہ اس کا نگہبان اور راہ نما ہو گیا۔ تو میرے پاس آیا ہے یہ سوچ کر کہ میں تجھے کچھ دوں گا، تیری راہبری کروں گا لیکن میرے ذمے یہ کام نہیں ہیں۔ تربیت اور تلقین وہدایت ایک دوسرے ہی بزرگ کے ذمے ہے۔ تجھے یہاں سے کہیں اور جانا پڑے گا لیکن جانے سے پہلے میں اپنے حصے کا کام ضرور انجام دوں گا۔“

سید عبداللہؒ نے سہم کر پوچھا۔ ”آپ کے ذمے کیا کام ہے؟“

بزرگ نے جواب دیا۔ ”میں تمہیں قرآن پاک حفظ کراؤں گا، گوشہ نشینی اور ترک دنیا کے آداب سکھاؤں گا۔ نفس اور شیطان کی کج رویوں سے کنارہ کشی اختیار کرنے کے انداز بتاؤں گا۔“

سید عبداللہؒ نے فرط جذبات میں بزرگ کے ہاتھ پکڑ لیے۔ انہیں ہونٹوں سے لگا کر بوسہ دیا اور آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”اس دربار سے مجھے جو کچھ بھی مل جائے گا میں اسے غنیمت سمجھوں گا۔“

بزرگ نے اس تھکے ہوئے بچے کو آرام کی تلقین کی اور سلا دیا۔ لیکن سید عبداللہؒ کی خوشی اور شوق کا یہ عالم تھا کہ بڑی مشکل سے نیند آئی۔ ان بزرگ کی شخصیت اتنی شدت سے ذہن ودماغ پر طاری ہو چکی تھی کہ وہی عالم رویا میں بھی موجود رہی۔

☆☆☆

صبح فجر کی نماز ان بزرگؒ کے ساتھ پڑھنے کے بعد سید عبداللہؒ نے قرآن پاک کو حفظ کرنے کا آغاز کر دیا۔ ان بزرگ کو سید عبداللہؒ کی آواز بہت پسند آئی، فرمایا۔ ”سید عبداللہؒ! تیری آواز میں جو درد اور سوز ہے وہ فرشتوں تک کو بے خود کر دے گا۔ خدا اسے برقرار رکھے اور نظر بد سے محفوظ کرے۔“

ان بزرگ نے کچھ ہی عرصہ بعد قرآن حفظ کرا دیا اور ترک دنیا کے آداب سکھا دیے۔

کافی دنوں بعد ان بزرگ نے کہا۔ ”سید عبداللہؒ! آؤ آج ہم دونوں ایک ساتھ قرآن پاک کا ورد کریں۔ پھر دیکھنا کیسا سماں بندھ جائے گا۔“

سید عبداللہؒ نے کہا۔ ”حضرت! مجھے کیا انکار ہو سکتا ہے!“

یہ صبح کا وقت تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ان بزرگ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور قرآن پاک کا ورد شروع کر دیا۔ سید عبداللہؒ نے ان کا ساتھ دیا۔ دونوں کی آواز کے سوز نے ماحول میں آگ سی لگا دی اور پرندے وجد میں آ کر مسجد کی دیواروں پر بیٹھ گئے، دونوں کو کچھ ہوش نہ تھا کہ وہ کس حال میں ہیں اور زمانہ کس حال میں ہے۔

اتنے میں سید عبداللہؒ نے دیکھا کہ عربی لباس میں، ملبوس لوگوں کی آمد شروع ہو گئی۔ اور وہ صحن مسجد میں جمع ہونے لگے۔ اتنے میں ایک خوبصورت اور وجیہہ شخص بھی آ گیا یہ شخص اپنی وضع قطع اور انداز واطوار سے آنے والوں کا سردار معلوم ہوتا تھا۔ وہ کھڑا ہو کر کچھ دیر تو سنتا رہا۔ اس کے بعد کہا۔ ”بارک اللہ ادیت حق قرآن“ (اللہ برکت دے، تلاوت قرآن کا حق تو نے خوب ادا کیا ہے)

اس کے بعد وہ لوگ چلے گئے۔

کچھ دیر بعد جب تلاوت ختم ہو گئی تو ان بزرگ نے سید عبداللہؒ سے پوچھا۔ ”سید عبداللہؒ! ابھی یہاں کوئی آیا تھا؟“

سید عبداللہؒ نے جواب دیا۔ ”حضرت! میں انہیں نہیں پہچانتا۔ لیکن وہ سب اپنے لباس سے عربی نظر آتے تھے۔“

بزرگ نے کہا۔ ”صاحبزادے! اس وقت میری آنکھیں بند تھیں اور میں انہیں نہیں دیکھ سکا۔ لیکن تو یقین کر کہ اس وقت میں اتنا زیادہ ہیبت زدہ تھا کہ اگر آنکھیں کھول کر انہیں دیکھنا چاہتا تو یہ کام ناممکن ہوتا۔“

سید عبداللہؒ نے جواب دیا۔ ”حضرت! جیسا کہ میں نے عرض کیا وہ سب عرب معلوم ہوتے تھے۔“

ان دونوں میں یہ باتیں جاری تھیں کہ مسجد میں ایک عرب داخل ہوا اور ان دونوں سے کہا۔ ”حضرات! کل رسول مقبول ﷺ اپنے اصحاب میں بیٹھے ہوئے اس جنگل کے حافظ کی تعریف وتوصیف فرما رہے تھے اور یہ بھی فرمایا تھا کہ کل ہم سب علی الصباح اسے دیکھنے جائیں گے اور اس کی قرأت بھی سنیں گے۔“

دونوں اس شخص کی باتیں سنتے رہے۔ عرب نے پوچھا۔ ”صاحبان کیا آپ ﷺ تشریف لائے تھے؟“

انہوں نے کہا۔ ”کیا وہ رسول مقبول ﷺ اور ان کے ساتھی تھے؟“

عرب نے جواب دیا۔ ”ہاں۔“

اب ان دونوں کو اس کا ہوش کہاں تھا کہ وہیں بیٹھے رہتے۔ دونوں اٹھ کر ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔ بڑی دیر تک ادھر اُدھر بھاگ دوڑ کر انہیں تلاش کرتے رہے لیکن ناکام رہے۔ اس جدوجہد میں ایک بات واضح طور پر ان دونوں کو محسوس ہوتی رہی۔ پورا جنگل خوشبو سے معطر تھا۔ ہر طرف سے خوشبو کے فوارے سے چھوٹ رہے تھے۔ ہر طرف سے ناکام ہو کر جب واپس ہوئے تو سید عبداللہؒ کے استاد کے دل میں یہ خیال آیا کہ آخر عرب یہ کون تھا جس نے انہیں یہ اطلاع دی تھی۔ اب وہ عرب بھی غائب تھا۔ ان دونوں نے اس کو بھی تلاش کیا لیکن ناکام رہے۔

اس واقعہ کے عرصہ بعد تک جنگل خوشبو سے مہکتا رہا اور اس جنگل سے جو بھی گزرا اس خوشبو سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

☆☆☆

حفظ قرآن کے کچھ عرصہ بعد ان بزرگ نے سید عبداللہؒ سے کہا۔ ”صاحبزادے! میرا کام ختم ہوا، اب تم جا سکتے ہو۔“

سید عبداللہؒ کو جدائی کے خیال سے دکھ پہنچا۔ پوچھا۔ ”اب میں کہاں جاؤں......؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”میں نہیں جانتا کہ تم کہاں جاؤ، لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ میرا کام ختم ہوا اور خدا تمہیں کسی صاحب ولایت کی خدمت میں ضرور پہنچا دے گا۔“

سید عبداللہؒ نے بہ چشم پرنم استاد کو جنگل ہی میں چھوڑا۔ اور خود مشرق کا رخ کیا۔ یہ گھومتے پھرتے سامانہ میں داخل ہوئے۔ ان دنوں شیخ ادریسؒ سامانی کا بڑا چرچا تھا اور طالبان حق دور دور سے ان کی خدمت میں پہنچا کرتے تھے۔ جن دنوں سید عبداللہ سامانہ میں داخل ہوئے، شیخ ادریسؒ سامانی نے مکمل طور پر گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی اور لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا تھا۔

سید عبداللہؒ ان کے در پر پہنچے اور اندر پیغام پہنچا دیا کہ۔ ”ایک بے نوا زیارت کو حاضر ہوا ہے، باریابی کی اجازت دی جائے ورنہ میں اسی در پر پڑا رہوں گا۔“

شیخ ادریسؒ نے جواب میں کہلوا دیا۔ ”میں نے عرصہ گزرا دنیا کو چھوڑ دیا۔ اب دنیا والوں سے کیا ملوں؟“

سید عبداللہؒ نے جواباً کہلوایا۔ ”حضرت! میں بھی دنیا کو چھوڑ چکا، بس زیارت کر کے چلا جاؤں گا۔“

شیخ نے اس ضدی کو اندر بلوا لیا۔ دیکھتے ہی کہا۔ ”زیارت کر لی اب واپس جاؤ۔“

سید عبداللہؒ نے عرض کیا۔ ”حضرت! سیری نہیں ہوئی، کچھ دیر اور......“

شیخ نے فرمایا۔ ”جانتے بھی ہو سیری کسے کہتے ہیں۔ یہ وہ شے ہے کہ اسے پوری زندگی حاصل نہ کر سکو گے، اور جب اس دنیا سے جاؤ گے تو تشنگیوں کا ذخیرہ تمہارے ساتھ ہو گا۔“

سید عبداللہؒ رونے لگے، بولے۔ ”حضرت! مجھے جدا نہ کیجیے، میں آپ کے قدموں سے کہیں بھی نہ جاؤں گا۔“

شیخ مسکرا دیے فرمایا۔ ”زیارت کرنے آیا تھا کہ اس در پر پڑے رہنے کی ٹھان لی۔ میاں ہم جیسوں کی کوئی کمی نہیں، بہت مل جائیں گے کہیں بھی چلے جاؤ۔“

سید عبداللہؒ نے عاجزی سے کہا۔ ”لیکن میں اس درویش کو چھوڑ کر کہیں بھی نہ جاؤں گا۔“

شیخ نے فرمایا۔ ”جانتے ہو، میرے پاس کون رہ سکتا ہے؟“

سید عبداللہؒ نے عرض کیا۔ ”پتا نہیں، لیکن میں یہاں رہنا چاہتا ہوں۔“

شیخ نے جواب دیا۔ ”یہاں ایک مردہ ہی رہ سکتا ہے، کسی زندہ کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔“

سید عبداللہؒ نے کہا۔ ”حضرت! اگر اس کی وضاحت ہو جائے تو میں جواب میں کچھ عرض کرنے کی جرأت کروں۔“

شیخ نے فرمایا۔ ”وہ شخص جو طعام ولباس اور تعلقات دنیوی سے بالکل کٹ چکا ہو اور حوائج ضروریہ کے بغیر میرے دروازے

سے باہر قدم نہ نکلے میرے لیے مردہ ہے۔"

سید عبداللہ نے جواب دیا۔ "حضرت! میں ایک عرصہ سے مذکورہ چیزوں سے بے نیاز ہو چکا، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ جو کچھ فرمائیں گے اس پر عمل کروں گا۔ آپ مجھے مردہ تصور فرمائیں۔"

شیخ نے کچھ تامل کے بعد فیصلہ فرمایا۔ "اچھا اگر یہ بات ہے تو تم میرے پاس رہ جاؤ۔"

سید عبداللہ، شیخ ادریسؒ سامانی کے پاس رہ گئے اور راہ سلوک طے کرنے لگے۔

اس دوران سید عبداللہ شیخ ادریسؒ کے لڑکے کو قرآن حفظ کرانے لگے۔ جب شیخ کو یہ بات معلوم ہوئی تو انہیں بڑی خوشی ہوئی اور اس کے نتیجے میں انہوں نے سید عبداللہ پر دوگنی توجہ مبذول کر دی۔

سید عبداللہ نے جب شیخ کی توجہ بہت زیادہ دیکھی تو وہ شیخ اور ان کے متعلقین کے کپڑے دریا پر لے جانے لگے اور انہیں دھو لاتے۔ یہ کام عموماً جمعرات کو انجام دیتے۔ سید عبداللہ توں یہ خدمت انجام دیتے رہے۔

ایک بار وہ فاقے سے تھے۔ جمعرات جو آئی تو کپڑوں کی لادی لے کر دریا کے کنارے پہنچ گئے۔ بھوک سے بہت برا حال تھا اوپر سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ ذرا دیر بعد پیاس نے بھی۔ شدت اختیار کی۔ انہوں نے بھوک اور پیاس کی پروا کیے بغیر اپنا کام جاری رکھا انہیں اپنے سینے میں دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا معدہ روٹی کا مطالبہ کر رہا تھا ایسا لگتا تھا جیسے اندر کوئی معدے کو کھرچ ڈال رہا ہے، پیاس کی شدت نے آنکھوں تلے اندھیرا سا پھیلا دیا اس وقت ان کے ہاتھ میں شیخ کی قمیص تھی۔ انہوں نے قمیص کے میل کو رگڑ رگڑ کر صاف کرنے کی کوشش کی۔ مگر چکر آ گیا اور وہ گر گئے اور بے ہوشی نے غلبہ کر لیا۔ وہ معلوم نہیں کتنی دیر تک بے ہوش پڑے رہے جب آنکھ کھلی تو انہوں نے اپنے چہرے پر ایک نقاب پوش کو جھکا ہوا دیکھا، گھبرا کر پوچھا۔ "تم کون ہو......؟"

نقاب پوش نے پوچھا۔ "یہ تیرا کیا حال ہو گیا؟"

سید عبداللہ نے جواب دیا۔ "اگر تم کوئی صاحب کمال شخص ہو، تو مجھے کچھ بتانے کی ضرورت ہی نہیں اور اگر تم کوئی دنیادار ہو تو میں کچھ بتا کر خدا کا شکوہ نہیں کرنا چاہتا۔"

نقاب پوش نے کہا۔ "سید عبداللہ! کیا تو نے قرآن پاک میں یہ نہیں پڑھا۔ ولا تلقوا بایدیکم الی التهلكة (اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو) جب بھوک اور پیاس غلبہ کر رہے تھے تو تمہیں ان کی فکر پہلے کرنا تھی۔ بعد میں کوئی دوسرا کام کرتے۔"

سید عبداللہ نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے دل میں رب سے کہا۔ "الٰہ العالمین! میں نہیں جانتا کہ یہ شخص کون ہے لیکن جس طرح یہ مجھ سے مخاطب ہے اس سے میں اس کشمکش و پیچ میں ہوں کہ کہیں یہ شیطان نہ ہو جو میرے نفس کو ورغلا کر ہلاکت میں ڈال رہا ہو۔"

نقاب پوش نے پوچھا۔ "کیا سوچنے لگے؟"

سید عبداللہ نے الٹا اس سے سوال کر دیا۔ "اور میں یہ سوچ رہا ہوں کہ تم مجھ پر مہربان کیوں ہو؟"

نقاب پوش نے اپنے لباس کے اندر سے روٹی نکال کر ان کی طرف بڑھا دی اور کہا۔ "سید عبداللہ! شک کو اپنے دل سے نکال دو میں شیطان نہیں ہوں، یہ روٹی کھالو۔"

اب سید عبداللہ کو یہ یقین ہو گیا کہ یہ شخص شیطان ہرگز نہیں۔ اس سے روٹی لے لی اور کھانے لگے۔ جب روٹی ختم ہو گئی تو سید عبداللہ نے دل میں سوچا کہ اس گرمی میں اگر کہیں سے ٹھنڈا پانی بھی میسر آ جائے تو خوب رہتا ہے، ابھی سید عبداللہ سوچ ہی رہے تھے کہ نقاب پوش نے نقاب کے اندر سے پانی کا پیالہ نکال کر ان کی طرف بڑھا دیا، کہا۔ "لے، یہ ٹھنڈا پانی بھی پی لے۔"

سید عبداللہ نے پیالہ لے لیا اور جب اس کو ہونٹوں سے لگایا تو دل خوش ہو گیا۔ کیونکہ وہ اتنا ٹھنڈا تھا کہ طبیعت خوش ہو گئی۔

کچھ دیر بعد نقاب پوش نے کہا۔ "سید عبداللہ! میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ بلاوجہ اپنی جان کو کبھی ہلاکت میں نہ ڈالنا۔ اس سے اللہ خوش نہیں ہوتا۔"

سید عبداللہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ دیر بعد نقاب پوش چلا گیا اور سید عبداللہ کپڑے دھو کر اپنے شیخ کے پاس چلے گئے۔ شیخ نے انہیں دیکھتے ہی کہا۔ "سید عبداللہ! آج تم نے خضر علیہ السلام سے روٹی لے کر کھائی اور ٹھنڈا پانی بھی پی لیا۔"

سید عبداللہ نے حیرت سے پوچھا۔ "تو وہ خواجہ خضر علیہ السلام تھے؟"

آپؒ نے جواب دیا۔ "ہاں وہ خواجہ خضر علیہ السلام تھے۔ ان کی روٹی کھالی اور پانی پی لیا۔ لیکن تو محمدی ہے اور محمدیوں کو خضر علیہ السلام کا احسان نہیں لینا چاہیے۔"

سید عبداللہ نے سوچا میں نے روٹی اور پانی سے بھوک پیاس بجھا کر سخت غلطی کی ہے۔ شیخ سے کہا۔ "حضرتؒ! میں اپنی غلطی پر نادم ہوں، کفارے میں جو کرنا ہے فرما دیں میں ادا کرنے کو تیار ہوں۔"

شیخ نے متبسم ہو کر جواب دیا۔ "میں غلطی کب کہہ رہا ہوں۔ اس کے کفارے کی بھی ضرورت نہیں۔ میں نے تو یہ کہا تھا کہ محمدیوں کو خضر علیہ السلام کا احسان نہیں لینا چاہیے۔"

سید عبداللہ نے کہا۔ "پیر و مرشد! آئندہ میں اس کا خیال رکھوں گا۔"

اس طرح ایک جمعرات کو جب سید عبداللہ دریا پر سے کپڑے دھو کر لائے تو گھر میں کہرام برپا تھا۔ شیخ ادریسؒ کا کہیں پتا نہ تھا۔ اور ہر شخص ان کی تلاش میں ہراساں اور سرگرداں تھا۔ یہ خبر سید عبداللہ نے سنی تو ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ گھر والوں سے پوچھا۔ "کیا اس سے پہلے بھی کبھی ایسا ہوا ہے؟"

گھر والوں نے متفقہ طور پر جواب دیا۔ "نہیں! ایسا کبھی نہیں ہوا۔"

اب سید عبداللہ بہت زیادہ پریشان ہو گئے۔ شیخ کی تلاش میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ ایک ہفتہ بعد بے نیل و مرام واپس آ گئے۔ اور شرمندگی سے عرض کیا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں انہیں کہاں تلاش کروں؟"

گھر والوں نے جواب دیا۔ "اب تلاش فضول ہے وہ جس طرح غائب ہوئے ہیں، اسی طرح انہیں آ بھی جانا چاہیے۔"

بات ختم ہو گئی۔ مگر شیخ کا کہیں پتا نہ تھا۔

ایک دن گھاس کے گودام سے گھاس کا ذخیرہ کم کیا جانے لگا۔ تو اس میں سے شیخ ادریسؒ بھی برآمد ہو گئے۔ ملازم نے گھبرا کر دل پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ بہت آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ ملازم کی جان میں جان آ گئی۔ اس نے پانی کا چھینٹا منہ پر مارا اور انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ آخر انہوں نے آنکھیں کھول دیں اور ملازم سے کمزور آواز میں دریافت کیا۔

"کیا بات ہے تو پریشان کیوں ہے؟"

ملازم نے اپنی پیشانی کو انگلیوں میں لے کر سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "حضرت! میں معلوم نہیں کب سے آپ کو تلاش کر رہا ہوں۔ تمام گھر والوں کا بھی یہی حال ہے۔ اب آپؒ کو گھاس کے ذخیرے میں سے نکال کر میں پریشان ہو رہا ہوں کہ جب آپ اپنے کنبے والوں سے یہ فرمائیں گے کہ آپ کو گائے بھینس کے بھوسے والے ذخیرے سے نکالا گیا ہے تو وہ سب میری جان کو آ جائیں گے۔"

آپؒ نے فرمایا۔ "میں خاموش رہوں گا تو بھی چپ رہ۔"

سید عبداللہ نے بڑی بے قراری سے پوچھا۔ "حضرت! یہ قصہ کیا ہے؟ آخر اتنے دنوں تک آپ رہے کہاں؟ کچھ مجھے بھی تو بتائیے۔"

آپ نے فرمایا۔ "بات زیادہ بڑی نہیں ہے۔ چھ ماہ پہلے میں گھاس کے ذخیرے میں کسی کام سے گیا تھا۔ وہاں اتنا اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ تک نہیں دکھائی دے رہے تھے۔ اسی عالم میں ایک شخص گھاس کی گٹھری لے کر گودام میں داخل ہوا۔ اور مجھ کو دیکھے بغیر مجھ پر گھاس ڈال کر چلا گیا۔ لیکن خدا نے مجھ پر مہربانی کی کہ اس وقت مجھ پر مدہوشی کا دورہ پڑ گیا اور میں مراقبے میں چلا گیا۔ اور اب ہوش میں آیا۔"

شیخ نے جو کچھ فرمایا۔ سید عبداللہ کے علاوہ اس پر کسی کو بھی یقین نہ آیا۔

سید عبداللہ نے رو رو کر ان کے کپڑے جھاڑے اور بڑی عاجزی سے ان کا جسم دبانے لگے۔

شیخ نے سید عبداللہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔ "مت پریشان ہو سید عبداللہ۔ اللہ کو یہی منظور تھا۔ اس میں کسی انسان کا بس نہیں چلتا۔"

ان کی شفقت نے سید عبداللہ کی بے قراری دور کر دی اور حالت میں اعتدال پیدا ہو گیا۔

☆☆☆

چاشت کے بعد شیخ نے قلم دوات اور کاغذ طلب کیا۔ سید عبداللہ کو بڑی حیرت ہوئی یہ کیا معاملہ ہے۔ لیکن پیر و مرشد سے پوچھ نہیں سکتے تھے۔

شیخ ادریسؒ نے کاغذ پر کچھ لکھنا شروع کر دیا اور کبھی کبھی سید عبداللہ پر ایک نگاہ غلط انداز بھی ڈال دیتے۔ آخر کچھ توقف کے بعد پوچھا۔ "سید! تیرا حال کیا ہے؟ تجھے کس فکر نے پریشان کر رکھا ہے؟"

سید عبداللہؒ نے عرض کی۔ ''حضرت! کیا عرض کروں، کچھ کہتا ہوں تو آپ فرمائیں گے کہ یہ جستجو کیسی؟''
آپ نے فرمایا۔ ''نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ آ، میرے پاس آجا۔''
سید عبداللہؒ اپنے پیرو مرشد کے پاس جا بیٹھے۔ شیخ نے فرمایا۔ ''سید! میں اس عہد کے ایک بہت بڑے ولی کو خط لکھ رہا ہوں۔ خط لکھ چکنے کے بعد تجھے پڑھوا دوں گا۔ پریشان نہ ہو۔''
سید عبداللہؒ نے اپنے دل میں سوچا کہ کیا اس عہد میں شیخ ادریسؒ سے بڑا ولی بھی موجود ہے؟ اگر ہے تو کہاں ہے؟
شیخ نے فرمایا۔ ''سید! مت پریشان ہو۔ میں اس ولی سے تجھ کو بھی ملوا دوں گا۔''
اس کے بعد وہ پھر خط لکھنے لگے۔ پھر وہ خط سید عبداللہؒ کی طرف بڑھا دیا۔ فرمایا۔ ''سید لے، اسے پڑھ لے۔ اس میں ایسی کوئی بات نہیں جس کو تجھ سے چھپایا جائے۔''
سید عبداللہؒ نے بڑی بے تابی سے خط لے لیا اور پڑھنے لگے اس میں لکھا تھا۔
''میرے آقا! ولیوں کے سردار حضرت آدم بنوریؒ! ان دنوں میرا عجیب حال ہے۔ مجھ کو ہر چیز میں ایک خدا نظر آتا ہے اور ہر در و دیوار کو اس ایک نور کی تجلیات سے بھرپور پاتا ہوں۔ اگر میں زمین کی طرف دیکھتا ہوں تو زمین کو نہیں پاتا۔ اور اگر آسمان کی طرف نگاہ اٹھاتا ہوں تو اس کو معدوم پاتا ہوں۔ اس طرح عرش و کرسی، بہشت اور دوزخ بھی موجود نہیں پاتا۔ اگر میں کسی کے سامنے جاتا ہوں تو اس کا وجود بھی نہیں پاتا۔ یہاں تک کہ اب میں اپنے وجود کو بھی موجود نہیں پاتا۔ اور وجود حق سبحانہ تعالیٰ مجھے بے پایاں نظر آتا ہے۔ اس کی حد اور انتہا کو میں نہیں پاسکا۔ تمام مشائخ بھی محض یہی نکتہ کہہ کر رہ گئے ہیں اور اس مقام سے آگے نہیں جاسکے۔ اگر آپ بھی اسی انتہا کو اپنا کمال سمجھتے ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اگر کوئی دوسری بات اس کمال سے بلند معلوم ہوتی ہے تو اس سے ہمیں بھی مطلع فرمایئے، تاکہ ہم اور ہمارے ایک ایسے دوست جو اس مقام تک پہنچنے کی بڑی خواہش رکھتے ہیں۔ وہاں تک پہنچ سکیں۔''
خط پڑھ چکنے کے بعد سید عبداللہؒ نے سوالیہ نظروں سے پیرو مرشد کی طرف دیکھا۔ آپ ان کا مطلب سمجھ گئے، فرمایا۔
''میں جانتا ہوں، تو مجھ سے کیا پوچھنا چاہتا ہے! تو یہ جاننا چاہتا ہے کہ کیا آدم بنوریؒ اتنے پائے کے ولی ہیں جو میں ایک شاگرد کی طرح ان سے رجوع ہو رہا ہوں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہم سب ان اعلیٰ کے سامنے ادنیٰ ہیں۔ وہ علم کا آفتاب ہیں، ہم سب ذرّے۔'' اس کے بعد کچھ توقف اختیار کیا اور کہا۔ ''اور دوسری بات تو یہ جاننا چاہتا ہے کہ میں نے اپنے خط کی آخری سطروں میں جس دوست کا ذکر کیا ہے وہ کون ہے؟ تو سن لے میرا وہ دوست تو خود ہے۔''
سید عبداللہؒ نے شرمندگی سے کہا۔ ''میں آپ کا دوست نہیں ادنیٰ مرید ہوں، دوست کہہ کر مجھے شرمندہ نہ کیجیے۔''
شیخ نے ان کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی، بولے۔ ''شاید تو یہ بھی سوچ رہا ہے کہ جب اس خط کا جواب آجائے تو تجھے بھی دکھا دیا جائے تو اس کا جواب پڑھنے کے لیے بے چین ہو رہا ہے۔''
سید عبداللہؒ نے کہا۔ ''آپ بجا فرما رہے ہیں یہی فکریں اور یہی وسوسے مجھے پریشان کررہے ہیں۔''
شیخ نے جواب دیا۔ ''سید! تو فکر نہ کر، تیری ہر خواہش پوری کی جائے گی۔ بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی سلوک کیا جائے گا۔ تو میرا مرید بھی ہے اور میرا دوست بھی۔''
اس دن سید عبداللہؒ کو جو خوشی محسوس ہوئی تھی وہ زندگی بھر پھر کبھی نہیں مل سکی۔
یہ خط آدم بنوریؒ کو بھیج دیا گیا اس کے جواب کا دونوں ہی کو انتظار تھا۔ لیکن شیخ ادریسؒ سے زیادہ سید عبداللہؒ کو انتظار تھا۔
کچھ عرصہ بعد جب آدم بنوریؒ کا جواب آگیا تو شیخ نے جواب پڑھ کر سید عبداللہؒ کے حوالے کردیا۔ اس میں لکھا تھا۔
''شیخ سامانی! آپ نے جو کچھ لکھا ہے، بابرکت اور عجیب ہے۔ لیکن اگر کاملین سلوک کے حالات سے موازنہ کیا جائے تو مجھے یہ کہنا پڑے گا کہ بھائی! کسی کوچۂ تنگ سے گزرنے کا سوال نہیں۔ راہ سلوک میں اتنے سمٹ کررہ گئے ہو۔ یہاں تو ایک شاہراہ عظیم کھلی ہوئی ہے جس پر توسنِ فکر و خیال کو بڑھا چڑھا کر دوڑایا جاسکتا ہے۔''
سید عبداللہؒ خط پڑھ رہے تھے اور شیخ ان کی حالت پر غور کررہے تھے۔ آخر میں پوچھا۔ ''سید! کیا حال ہے؟ اب کیا کہتے ہو؟''
سید عبداللہؒ نے کہا۔ ''حضرت! یہ تو بڑے پائے کے بزرگ ہیں۔''
''آپ نے فرمایا۔'' کیا خیال ہے؟ کیا تمہیں ان کے پاس بھیج دیا جائے؟''
سید عبداللہؒ نے عرض کیا۔ ''میں آپ کا در چھوڑ کر کہیں اور جانے کو تیار نہیں۔''

شیخ نے فرمایا۔ ''لیکن تمہیں ان کے پاس جانا پڑے گا۔''
سید عبداللہؒ نے جواب دیا۔ ''اگر آپ جبر فرمائیں گے اور مجھ کو اپنے پاس سے دور ہی فرمادیں گے تو میں چلا جاؤں گا۔''
شیخ نے فرمایا۔ ''نہیں، یہ بات نہیں ہے، میں تم کو زبردستی نہیں بھیجوں گا تم ہنسی خوشی اور اپنی مرضی سے ان کے پاس چلے جاؤ گے۔''
سید عبداللہؒ نے دبی زبان میں کہا۔ ''ممکن ہے ایسا ہوجائے میں آپ کو جھٹلا نہیں سکتا۔''
شیخ نے فرمایا۔ ''بہرحال میں خود بھی اس ولی کامل سے ملاقات کا اشتیاق رکھتا ہوں، خدا پورا فرمادے۔''
سید عبداللہؒ نے سکوت اختیار کیا۔ انہوں نے اپنی رائے نہیں دی۔
چند دنوں بعد شیخ ادریسؒ کی طبیعت بگڑنے لگی اور وہ اپنی صحت سے مایوس نظر آنے لگے۔ سید عبداللہؒ اس دن کا انتظار کررہے تھے۔ جب وہ اپنے شیخ کے ساتھ آدم بنوریؒ کی خدمت میں حاضری دیتے۔ ایک دن شیخ سامانی نے سید عبداللہؒ کو اپنے سامنے بٹھالیا اور ان سے باتیں کرنے لگے۔ ان کی آواز میں نقاہت پائی جاتی تھی۔ دوران گفتگو شیخ نے فرمایا۔ ''کیوں سید! آدم بنوریؒ کی بابت تم کیا سوچتے رہے ہو؟''
سید عبداللہؒ نے کہا۔ ''میں اللہ تعالیٰ سے آپ کی صحت اور درازی عمر کی دعائیں مانگ رہا ہوں تاکہ میں آپ کے ہمراہ آدم بنوریؒ کی زیارت کرسکوں۔''
شیخ نے فرمایا۔ ''یہ کوئی ایسی خواہش تو نہیں کہ اگر میں موجود ہوں تو پوری ہو۔ تم اکیلے بھی ان کے پاس جاسکتے ہو۔''
سید عبداللہؒ رونے لگے۔ ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ شیخ نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرنا شروع کردیا اور کہا۔ ''ارے! یہ تم رو کیوں رہے ہو؟''
سید عبداللہؒ نے روتے ہوئے جواب دیا۔ ''آپ نے اکیلے جانے کی بات کی تو میں نے اس کا یہ نتیجہ نکالا کہ اب آپ مجھے اکیلا چھوڑ دیں گے۔ آپ کی صحبت غنیمت ہے۔''
شیخ نے تبسم فرمایا۔ بولے۔ ''اس دنیا میں سدا کون رہا ہے، جو میں رہوں گا۔ جو دم ہے غنیمت ہے۔'' پھر فرمایا۔ ''جب تم اکیلے رہ جاؤ تو اپنا ایک لمحہ ضائع کیے بغیر آدم بنوریؒ کی صحبت میں پہنچ جانا، وہ تمہیں مایوس نہیں کریں گے۔ ان سے تمہیں بہت فیض پہنچے گا۔''
اس کے چند دنوں بعد شیخ ادریسؒ نے وصال فرمایا اور سید عبداللہؒ تجہیز کے بعد آدم بنوریؒ کی خدمت میں روانہ ہوگئے۔
در پر کھڑے ہوکر انہوں نے صدا لگائی۔ ''حضور والا۔ شیخ سامانیؒ کا فرستادہ سید عبداللہ حاضر ہے، باریابی کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔''
اندر سے جواب ملا۔ ''آجاؤ، وہاں کیوں کھڑے ہو۔''
سید عبداللہؒ اجازت پاتے ہی اندر چلے گئے، آدم بنوریؒ نے انہیں سینے سے لگالیا اور سر پر ہاتھ پھیرا۔ انہیں ایک دم ایسا لگا گویا ان کا سب کچھ چھن گیا۔ کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ خالی خالی سینہ اذیتیں پہنچانے لگا۔ سید عبداللہؒ کو اپنی تہی دستی پر رونا آگیا۔ شکایتاً کہا۔ ''حضرت میں تو آپ کے پاس اس لیے آیا تھا کہ مجھے جو کچھ مل چکا ہے اس میں کچھ اضافہ کروں لیکن یہاں تو جو کچھ تھا وہ بھی چھن گیا۔ اب میرے پاس کچھ بھی نہیں، حضرت! یہ کیا ہوگیا؟''
آدم بنوریؒ نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''سید! میرے ہاتھ ایک بوتل آگئی میں اس بوتل کو کام میں لانا چاہتا تھا۔ اور اس میں عرق گلاب رکھنا چاہتا تھا۔ مگر بوتل کو سونگھنے پر معلوم ہوا کہ اس میں سرکہ رکھا تھا چنانچہ میرے لیے یہ ضروری ہوگیا کہ پہلے اس سرکے کے اثر کو زائل کروں اس کے بعد اس میں گلاب کا عرق بھروں۔ میرے لیے تو تیری مثال بوتل جیسی ہے، جب تک تیرے سینے کو خالی نہ کردیا جاتا تو مجھ سے فیض نہیں پاسکتا تھا۔''
سید عبداللہؒ مطمئن ہوگئے اور آہستہ آہستہ انہیں یہ محسوس ہونے لگا کہ ان کا خالی سینہ بھرتا جارہا پھر جیسے وہ لبالب ہوگیا۔ اب ان میں آسودگی سی آگئی تھی۔
سید عبداللہؒ کو قرأت کا بڑا شوق تھا جب بھی موقع ملتا وہ قرأت میں مدہوش ہوجاتے۔ ایک دن وہ کسی ایسے درخت کے سائے میں بیٹھ کر قرأت فرما رہے تھے جہاں پر بے شمار چڑیاں ہر وقت چوں چوں کرتی رہتی تھیں۔ سید عبداللہؒ نے آنکھیں بند کرلیں اور دنیا و مافیہا سے غافل ہوکر قرأت فرمانے لگے۔ پرندوں پر اس قرأت کا اتنا اثر ہوا کہ وہ درخت پر سے بے ہوش ہوکر گرنے لگے۔ سید عبداللہؒ کو کسی بات کا ہوش ہی نہ تھا۔ وہ قرأت میں گم رہے۔ کسی نے آدم بنوریؒ کو اس صورتِ حال کی خبر کی۔ وہ بھاگے بھاگے آئے

اور سید عبداللہ کی قراءت میں گم ہو گئے۔ پھر فرمایا۔ ”سید! ہوش میں آؤ، یہ کیا کر رہے ہو؟“
سید عبداللہ اب بھی ہوش میں نہیں آئے۔ آخر آدم بنوریؒ نے حکماً کہا۔ ”حافظ! اب بس بھی کرو، ہوش میں آؤ۔“
سید عبداللہؒ نے آنکھیں کھول دیں اور انکساری سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے سامنے بے ہوش چڑیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔
آدم بنوریؒ نے پوچھا۔ ”سید! یہ تم نے کیا کیا؟“
سید نے جواب دیا۔ ”میں نے کیا کیا؟ مجھے ہوش ہی نہیں، آپ کے سوال کا میں کیا جواب دوں؟“
آدم بنوریؒ نے نصیحت کی۔ ”سید احتیاط سے کام لو۔“
سید عبداللہؒ چپ ہو گئے اور اس کے بعد واقعی احتیاط کرتے رہے۔
سید عبداللہؒ آدم بنوریؒ کی خدمت کرنا چاہتے تھے لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کون سی خدمت اپنے ذمے لیں۔ اس دربار میں جو بھی تھا اس نے کوئی نہ کوئی ذمے داری قبول کر رکھی تھی۔ ناگاہ ان کی نظر اس شخص پر پڑی جو جنگل سے لکڑیاں لایا کرتا تھا۔ یہ ایک انتہائی لاغر اور کمزور شخص تھا۔ سید عبداللہؒ نے اس سے کہا۔ ”اے بھائی! میں دیکھتا ہوں کہ تمہاری صحت اس لائق نہیں کہ جنگل سے لکڑیاں لانے کا فرض انجام دیتے رہو۔ اس لیے یہ کام میرے سپرد کر دو۔ میں پیرو مرشد کو یہ نہیں بتاؤں گا کہ تمہارا کام میں کر رہا ہوں۔“
اس شخص نے جواب دیا۔ ”بہتر ہے، اس طرح میں چند دن آرام کر لوں گا۔“
اب انہوں نے جنگل سے لکڑیاں لانا شروع کر دیں۔ کچھ عرصہ بعد آدم بنوریؒ دریا پر غسل کرنے گئے۔ چند مریدین نے جسم کی صفائی ستھرائی شروع کر دی۔ آپ نے فرمایا۔ ”سید عبداللہؒ کو بلاؤ۔“
سید عبداللہؒ کو ان کے پاس پہنچا دیا گیا۔ مرشد نے کہا۔ ”سید! تم میرا جسم صاف کرو۔“
سید عبداللہؒ نے اس انہماک اور محنت سے یہ کام کیا کہ آدم بنوریؒ بہت خوش ہوئے۔ سید عبداللہؒ سے فرمایا۔ ”سید! تیرے انہماک اور محنت نے میرا دل جیت لیا ہے۔ ذرا میری طرف تو دیکھو!“
سید عبداللہؒ نے جیسے ہی ان کی طرف دیکھا، بے ہوش ہو گئے۔ آدم بنوریؒ کی نظروں میں معلوم نہیں کیا تھا جس کی وہ تاب نہیں لا سکے۔ سید عبداللہؒ مردے کی طرح دیر تک پڑے رہے۔ آخر آدم بنوریؒ کے حکم پر ان کے مریدوں نے انہیں اٹھایا اور پیرو مرشد کے گھر تک پہنچا دیا۔ دیر بعد جب ہوش میں آئے تو ان کا سینہ معرفت روحانی سے مالا مال ہو چکا تھا۔
چھ ماہ بعد وہی صورت پیش آئی۔ شیخ آدم بنوریؒ دریا کے کنارے غسل فرما رہے تھے اور سید عبداللہؒ ان کا جسم مل رہے تھے۔ شیخ آدم بنوریؒ نے اچانک سید عبداللہؒ پر نظر ڈالی اور پوچھا۔ ”سید! کیا بات ہے؟ تم کچھ بولتے نہیں، خیریت تو ہے؟“
پرسش احوال سے سید عبداللہؒ کی حالت ہی غیر ہو گئی۔ انہیں ایسا محسوس ہوا، جیسے دل میں ایک شعلہ سا چمکا اور پوری کائنات پر جلوہ فگن ہو گیا انہیں کچھ ہوش ہی نہ رہا اور بے ہوش ہو کر گر پڑے۔
شیخ نے متبسم ہو کر مریدوں کو حکم دیا۔ ”اس کو میرے حجرے تک پہنچا دیا جائے۔“
مریدوں نے حکم کی تکمیل کی اور سید عبداللہؒ کو حجرے تک پہنچا دیا۔ دیر بعد جب انہیں ہوش آیا تو دیکھا شیخ بنوریؒ ان کے پاس بیٹھے انہماک سے دیکھ رہے ہیں۔ شیخ نے پوچھا۔ ”سید! کیا حال ہے۔“
سید عبداللہؒ نے کمزور آواز میں جواب دیا۔ ”پیرو مرشد کیا عرض کروں اب میں خود کچھ محسوس کرنے لگا ہوں اور میرا سینہ معرفت کا گنجینہ بنتا جا رہا ہے۔“
شیخ نے فرمایا۔ ”سید! اب تو آزاد ہے، میری صحبت میں رہنے کی ضرورت نہیں رہی۔“
سید عبداللہؒ نے عرض کیا۔ ”حضرت! میں آزادی نہیں چاہتا، میں اس در کو نہیں چھوڑ سکتا۔“
شیخ آدم نے کہا۔ ”سید میں اپنے کنبے کے ساتھ حج کرنے جا رہا ہوں۔“
سید عبداللہؒ نے کہا۔ ”تب پھر مجھے بھی اپنے ساتھ لیتے جائیے۔“
شیخ نے سختی سے منع کر دیا۔ ”نہیں! تم نہیں جاؤ گے۔“
سید عبداللہؒ نے کہا۔ ”حضرت! مجھ پر تو کوئی ذمے داری بھی نہیں۔ میں نے..... شادی تک نہیں کی، میں تو آپ کے ساتھ بہ آسانی سفر حج کر سکتا ہوں۔“
لیکن شیخ نے سختی سے جواب دیا۔ ”سید! اس میں ایک مصلحت ہے جس کا بعد میں تمہیں بھی پتا چل جائے گا۔ افسوس کہ میں تمہیں نہیں لے جاؤں گا۔“

شیخ آدم بنوریؒ سفر پر روانہ ہو گئے اور سید عبداللہ کو ساتھ نہیں لیا۔ ان کی عدم موجودگی میں ایک لڑکے عبدالرحیم کی تعلیم و تربیت سید عبداللہؒ کے سپرد تھی۔ بعد میں یہ لڑکا شاہ عبدالرحیمؒ کہلایا۔ اور یہ بہت بڑے فرزند کا باپ کہلایا۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے والد بزرگوار شاہ عبدالرحیمؒ اس مصلحت نے سید عبداللہؒ کو حج سے باز رکھا تھا۔ کیونکہ اگر وہ اپنے پیرو مرشد کے ساتھ چلے جاتے تو شاہ عبدالرحیمؒ کی تعلیم تربیت کے اعزاز سے محروم رہ جاتے۔

☆☆☆

شیخ آدم بنوریؒ حج کرنے چلے گئے تو سید عبداللہؒ نے کامل آزادی سے اپنا منصب سنبھالا۔ اب ان کے پاس لوگوں کا ہجوم ہونے لگا۔ ان کا شہرہ اور چرچا بادشاہ، امراء اور دوسرے بڑوں تک پہنچنے لگا۔
کسی نے آپ سے کہا۔ ”حضرت! میں نے ایک مجذوب کو دیکھا ہے جو بازاروں میں ننگ دھڑنگ پھرتا رہتا ہے۔ وہ عورتوں اور مردوں کی پروا کیے بغیر ننگا بھاگتا پھرتا ہے۔“
آپ نے پوچھا ”اس کو کسی نے منع نہیں کیا۔ کہ وہ ایسا نہ کرے۔“
اس نے جواب دیا۔ ”منع کیا کیوں نہیں، لیکن وہ کسی کی سنتا ہی نہیں۔“
آپ نے کہا۔ ”اچھا تب پھر تم مجھ کو وہاں لے چلو۔ میں اس کو منع کروں گا۔“
اس شخص نے کہا۔ ”تو پھر اس میں دیر کیوں آپ اسی وقت چلیے میرے ساتھ۔“
آپ جانے کے لیے تیار ہو گئے اور اس شخص کو ساتھ لیا اور پیدل ہی چل پڑے۔ گلیوں کوچوں اور بازاروں سے گزرتے ہوئے وہ شہر کے ایک نہایت گنجان علاقے میں پہنچے اور وہاں لوگوں کا ٹھٹھ کا ٹھٹھ ایک جگہ جمع دیکھا۔ اس شخص نے اس ہجوم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”دیکھیے اس جگہ موجود ہو گا وہ مجذوب ننگ دھڑنگ۔“
آپ نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ”اچھا اب تو یہیں کھڑا رہ، میں اس سے بات کر کے ابھی آتا ہوں۔“
سید عبداللہؒ اس مجذوب کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ مجمع کو چیرتے پھاڑتے مجذوب کے پاس پہنچے تو اس نے آپ کو دیکھتے ہی دیوانہ وار بھاگنا شروع کر دیا۔
سید عبداللہؒ نے اس کو آواز دی۔ ”ارے بھائی! کہاں جاتا ہے میری بات تو سن لے۔“
لیکن وہ نہیں رکا اور مسلسل بھاگتا رہا۔ سید عبداللہؒ بھی اس کا پیچھا کرتے رہے۔ مجذوب شہر سے باہر نکل گیا۔ وہاں ایک درخت کے نیچے ایک بڑی بی لکڑیاں جمع کرنے میں مشغول تھیں۔ مجذوب نے بڑی بی کا دوپٹا چھین لیا اور اس کو اپنے جسم کے گرد باندھ کر وہیں بیٹھ گیا۔ اتنی دیر میں سید عبداللہؒ بھی وہیں پہنچ گئے اور مجذوب سے پوچھا۔ ”ارے بھائی! یہ تم بھاگ کیوں رہے تھے؟“
مجذوب نے سر جھکا لیا، بولا۔ ”سید! تم نے میرا پیچھا کر کے ہلکان کر ڈالا۔“
سید عبداللہؒ نے کہا۔ ”لیکن تم بھاگے کیوں تھے؟ مجھ سے خوفزدہ کیوں تھے؟“
مجذوب نے جواب دیا۔ ”میں بھاگا ہی اس لیے تھا کہ کسی انسان کے سامنے برہنہ پھرنا کسی طرح مناسب یا جائز نہیں، تمہاری شکل میں ایک انسان میرے سامنے آ گیا تھا۔“
سید عبداللہؒ نے فرمایا۔ ”مجذوب! میں کہتا ہوں ہوش میں رہ! انسانوں میں انسان بن کے رہ، اگر وہ تجھے جانور نظر آتے ہیں مگر یہ جانور تو ایک دوسرے کو انسان ہی کی شکل میں دیکھ رہے ہیں۔ پھر ان کے سامنے برہنہ پھرنا کہاں کی انسانیت ہے؟“
مجذوب نے بڑی حسرت سے آپ کی طرف دیکھا اور عرض کیا۔ ”آپ کہتے ہیں تو میں کپڑے پہن لوں گا۔ ورنہ جی تو نہیں چاہتا۔“
اس کے بعد اس مجذوب نے کپڑے پہننا شروع کر دیے۔

☆☆☆

اب سید عبداللہ کے در پر ہجوم رہنے لگا۔ ان میں سبھی شامل تھے۔ غرباء بھی امراء بھی، درباری بھی سرکاری بھی اور عامی بازاری بھی۔ ان میں بہت سے وہ لوگ بھی تھے، جو سید عبداللہؒ سے کشف و کرامت کے متمنی ہوئے۔ آپ انہیں اس خواہش سے باز رکھنے کی کوشش کرتے اور فرماتے۔ ”لوگو! تم اہل اللہ سے کشف و کرامت کا مطالبہ مت کرو بلکہ یہ دیکھو کہ ان میں استقامت کتنی ہے۔“
کسی جاہل نے عرض کیا۔ ”حضرت! ہم آپ کے پاس اسی لیے آئے تھے کہ کشف و کرامت کا مشاہدہ کریں۔ اگر ایسا ممکن نہیں تو ہم یہاں اپنا وقت کیوں ضایع کریں۔“
آپ کو جوش آ گیا۔ غصے میں فرمایا۔ ”کفش بر سر کشف و کرامت کے سر پر جوتے۔ تو نکل جا اس محفل سے، صوفیاء کے نزدیک

استقامت معتبر ہے۔ اگر استقامت نہیں تو کچھ بھی نہیں۔"

آپ نے کشف و کرامت کے طالبوں کو نکال باہر کیا اور ان کا اپنی محفل میں آنا ممنوع قرار دے دیا۔

آپ کا یہ دستور تھا کہ ہر روز اِدھر اُدھر نکل جاتے اور کمزوروں ضعیفوں اور بیماروں کے کام آتے۔ ان کی خدمتیں کرتے اور انہیں یہ احساس نہ ہونے دیتے کہ ایسا کر کے وہ کوئی احسان کر رہے ہیں۔ شہر کے گلی کوچوں میں سید کے تذکرے گونجنے لگے۔ لگائی بجھائی کرنے والوں نے یہ خبریں بادشاہ اور شہزادگان تک پہنچانا شروع کر دیں، یہ شاہجہاں کا دورِ حکومت تھا اور ملک داراشکوہ کو ولی عہد سمجھ رہا تھا۔

داراشکوہ کو جب سید عبداللہؒ کی سرگرمیوں کا علم ہوا تو اس نے ان کے آس پاس جاسوسوں اور مخبروں کے پہرے بٹھا دیے اور انہیں حکم دیا کہ جب بھی مشتبہ بات دکھائی دے...... تو وہ شہزادہ داراشکوہ کو ضرور معلوم ہونا چاہیے۔ اس کے بعد شہزادہ داراشکوہ ذرا مطمئن ہو گیا۔ لوگوں نے آپ کو بتایا کہ شہزادہ داراشکوہ کا دل آپ کی طرف سے صاف نہیں ہے اس لیے آپ اس سے ہوشیار رہیں۔

آپ نے جواب دیا۔ "میں اس سے کیا ہوشیار رہوں، ہوشیار تو اس کو ہم فقیروں سے رہنا چاہیے۔"

ایک دردمند، ارادت مند بولا۔ "حضرت! ہم جانتے ہیں۔ کہ شہزادہ یا بادشاہ آپ کو نقصان نہیں پہنچا سکتے لیکن اس کے باوجود اگر آپ ان سے ہوشیار اور چوکس رہیں تو کیا حرج ہے۔"

آپ نے بے پروائی سے فرمایا۔ "چوکس میں کیا رہوں، میرے پاس ہے ہی کیا جو وہ چھین لے گا۔ ہاں اس کے پاس جو کچھ ہے اگر وہ چھن گیا تو شہزادہ کہیں کا بھی نہ رہے گا۔ اس لیے چوکس رہے یا نہ رہے تو وہ رہے ہیں۔ میں اس کی پروا کیوں کروں۔"

چند دنوں بعد فجر کے بعد سید عبداللہؒ کی خدمت میں نو قاری حاضر ہوئے اور ان سے بحثیں کرنے لگے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ "جناب سید! میں نے یہ سنا ہے کہ آپ کو قرأت بہت اچھی آتی ہے۔ آج ہم سب یہی دیکھنے آئے ہیں۔ امید ہے آپ مایوس نہیں کریں گے۔"

آپ نے پوچھا۔ "تم لوگ میرا امتحان کس کی ہدایت یا حکم پر لے رہے ہو، میرا خیال ہے اس میں شہزادہ داراشکوہ پیش پیش ہے، یہ وہی ڈور ہلا رہا ہے۔ مجھے اس سے نمٹنا آتا ہے۔ خوب اچھی طرح نمٹنا آتا ہے، دوستو! پروا نہ کرو۔"

آپ نے ان قاریوں کے روبرو قرأت شروع کر دی اور نو قاری پورے انہماک سے سننے لگے۔ انہیں ایک بات بھی ایسی نہیں ملی جو قابلِ گرفت ہوتی۔ انہوں نے داراشکوہ کو مطلع کیا کہ عبداللہؒ جیسا قاری شاید روئے زمین پر نہ مل سکے۔

شہزادے نے آپ سے کہلا بھیجا۔ "حضرت! میں آپ کا مداح اور قدردان ہوں، ہمیں بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے اور اپنی خدمت کا موقع دیجیے۔"

آپ نے شہزادے کو کوئی جواب نہ دیا لیکن دل میں گرہ پڑ چکی تھی۔

داراشکوہ مطمئن ہو، شاہجہاں شک و شبے میں پڑ گیا۔ دربار کے بڑے بڑے لوگ سید عبداللہؒ سے حسد کرتے تھے۔ اور ان کے زوال کے خواہاں رہتے تھے۔ ان میں ایسوں کی تعداد حد و شمار سے باہر تھی جو سید عبداللہؒ کے بدخواہ تھے اور بادشاہ کو بھی گمراہ کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔

ایک دن شاہجہاں نے اپنے وزیر سعد اللہ خان اور عالمِ دین ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کو حکم دیا۔ "دونوں سید عبداللہ کے پاس جائیں اور ان سے ادق مسائل پر بات شروع کر دیں۔ اگر یہ دنیادار ہے تو کوئی عالمِ دین اس کا پردہ بہ آسانی چاک کر دے گا۔"

چنانچہ چند دنوں بعد سعد اللہ خان وزیر اور عالمِ دین ملا عبدالحکیم سیالکوٹی آپ کے پاس پہنچے اور حاضری کی اجازت چاہی۔ آپ نے ان دونوں کو حجرے کے اندر بلوا لیا۔ اس وقت آپ مراقبے میں تھے، دونوں حضرات ان کے روبرو ادب سے بیٹھ گئے۔

کچھ دیر بعد آپ نے آنکھیں کھول دیں اور پوچھا۔ "ہاں بھائی اب بتاؤ کہ یاروں کے پاس کس لیے آنا ہو گیا۔"

سعد اللہ خان وزیر کا خیال تھا کہ سید عبداللہؒ ان دونوں کی تعظیم بجا لائیں گے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا تو وزیر چراغ پا ہو گیا بولا۔ "جنابِ والا! میں تو اہلِ دنیا ہوں مشائخ کے نزدیک تعظیم کا مستحق نہیں ٹھہرتا لیکن ملا عبدالحکیم سیالکوٹی تو عالمِ دین ہیں، ان کی تعظیم ضروری ہے۔"

سید عبداللہؒ نے فرمایا۔ "سعد اللہ خان! زیادہ برہم ہونے کی ضرورت نہیں۔ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی عالمِ دین ہیں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث تو ضرور پڑھی ہوگی۔ علماء محافظِ دین ہیں جب تک کہ بادشاہوں سے دور رہیں۔ جب سلاطین کی بارگاہوں تک جا پہنچیں تو وہ علماء نہیں چور ہیں۔

دونوں کے چہروں کا رنگ اڑ گیا۔ وزیر نے پوچھا۔ "آپ کا نسب کیا ہے؟"

سید عبداللہؒ نے جواب دیا۔ "سید ہوں لیکن ہماری مائیں افغان قبائل سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس لیے عوام کی زبان پر افغان مشہور ہو گئے۔"

وزیر نے کہا۔ "میں نے سنا ہے آپ علمِ لدنی رکھتے ہیں۔"

انہوں نے جواب دیا۔ "ہاں اور اس پر میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتا رہتا ہوں۔"

اس کے بعد دونوں آپ کے پاس سے چلے آئے اور شاہجہاں کو مطلع کیا۔ "سید عبداللہؒ ایک عامی اور متکبر فقیر ہے، یہ بڑے لمبے چوڑے دعوے کرتا ہے اس کی اصل افغان ہے لیکن سید کہلاتا ہے۔ اگر اس کو چھیڑا گیا تو فتنہ اٹھ کھڑا ہوگا۔ اس لیے اس کے خلاف جو قدم بھی اٹھایا جائے نہایت سوچ سمجھ کر اٹھایا جائے۔"

شاہجہاں بگڑ گیا اور اس نے اسی وقت اپنے قاصد کے ذریعے حکم روانہ کیا کہ۔ "آپ حج کرنے چلے جائیں۔"

قاصد کا خیال تھا کہ آپ اتنی آسانی سے یہ حکم نہیں مانیں گے لیکن وہ یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ آپ نے اسی وقت سے سفر کی تیاری شروع کر دی۔

کسی ارادت مند نے عرض کیا۔ "آپ اتنی جلدی حج کرنے کیوں جا رہے ہیں؟ بادشاہ کے حکم کو ٹال دیجیے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "میں اس لیے جا رہا ہوں کہ کہیں بادشاہ اپنا یہ حکم واپس نہ لے لے۔ میری عدم موجودگی میں تم دیکھو گے کہ بادشاہ میری واپسی کا حکم صادر کرے گا اور میرے چلے جانے سے وہ بہت پریشان ہو جائے گا۔"

ارادت مند کی سمجھ میں آپ کی باتیں نہیں آئیں۔

آپ نے سفر کی تیاریاں کیں اور سورت بندرگاہ پہنچ گئے، وہاں کا حاکم آپ کا بے حد معتقد اور ارادت مند تھا۔ آپ نے اس سے کہا کہ۔ "مجھ کو یہاں سے جلد از جلد چلا جانے دے۔"

حاکمِ سورت نے آپ کو اسی وقت جہاز پر سوار کرا دیا۔ جہاز جیسے ہی ساحل سے آگے بڑھا۔ بادشاہ کا دوسرا فرمان حاکمِ سورت کے پاس پہنچ گیا۔ اس میں لکھا تھا۔

"حاکمِ سورت کو معلوم ہونا چاہیے کہ ایک درویش سید عبداللہؒ نامی بغرضِ سفرِ حج وہاں پہنچا ہوگا۔ درویش کو روک لیا جائے اور ہمارے پاس واپس بھیج دیا جائے۔ ہم سے اس درویش کی شان میں چند گستاخیاں ہوگئی ہیں۔ پہلے میں اس کے بارے میں سوءِ ظنی کا شکار تھا۔ لیکن اب میں نے خواب میں دیکھا کہ مجھے کوئی خبردار کر رہا ہے کہ اس کو مت ناراض کرو۔ کیونکہ یہ صاحبِ ولایت ہے اور تیری حکومت کو کسی اور کے حوالے کر دے گا۔"

"مکرر تاکید کہ اس درویش کو فوراً ہمارے پاس روانہ کر دو۔"

لیکن درویش تو سورت سے روانہ ہو چکا تھا۔ اور وہ جہاز میں لوگوں سے کہہ رہا تھا۔ "اب شاہجہاں اس لائق نہیں رہ گیا کہ بادشاہ رہے۔ میں نے اس کے ولی عہد کو بھی ہٹا دیا۔ اب اس کی جگہ وہ حکومت کرے گا جس کے دل میں اسلام اور اسلام کے پرستاروں کا درد ہوگا۔"

سید عبداللہؒ یہ فرما رہے تھے اور ہندوستان میں گڑبڑ شروع ہو چکی تھی۔ شاہجہاں اور داراشکوہ ایک طرف تھے اور دوسری طرف اورنگ زیب اور مراد بخش تھے، اس کشمکش میں شاہجہاں سے حکومت چھن گئی اور وہ قید کر دیا گیا۔ حکومت اورنگ زیب کو منتقل ہوگئی، کچھ عرصہ بعد داراشکوہ قتل کر دیا گیا۔

☆☆☆

حج سے واپس آئے تو شاہجہاں کی جگہ اورنگ زیب حکومت کر رہا تھا آپ اکبرآباد میں مقیم ہوئے۔ واپسی میں صحت نے جواب دے دیا اور سید عبداللہ بیمار رہنے لگے۔ مریدوں اور ارادت مندوں نے بڑی کوشش کی کہ صحت یاب ہو جائیں لیکن آپ نے فرمایا کہ۔ "یہ میرا آخری وقت ہے۔"

مریدوں نے روتے ہوئے کہا۔ "ایسا نہ کہیے، خدا آپ کو بہت زیادہ عمر دے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "بہت زیادہ عمر دے یا کم دے، انجام دونوں ہی صورتوں میں موت ہے پھر کم زیادہ کی خواہش کیوں کی جائے۔"

حالت جب زیادہ خراب ہوگئی تو آپ نے مریدوں سے فرمایا۔ "لوگو، مجھے مسکینوں کے قبرستان میں دفن کرنا تاکہ میں پہچانا نہ جاؤں۔"

چنانچہ جب آپ وصال فرما گئے تو انہیں حسب خواہش اس طرح دفن کیا گیا کہ بعد میں لوگوں کو آپ کی قبر تک یاد نہ رہی۔ ایک مرید نے قبر کے محل وقوع کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیا اور دل میں فیصلہ کیا کہ جب کوئی ارادت منداس سے آپ کی قبر کا اتا پتا پوچھے گا تو پہنچا دیا کرے گا۔

ان دنوں شاہ عبدالرحیمؒ (شاہ ولی اللہ دہلوی کے والد) سخت بیمار تھے اور بیماری اور کمزوری کی وجہ سے جنازے میں شریک نہیں ہوسکتے تھے، جب اللہ نے انہیں صحت یاب کیا تو اس مرید کا سہارا لیا جس نے سید عبداللہ کی قبر کو اس کے محل وقوع کے ساتھ ذہن نشین رکھا تھا۔

شاہ عبدالرحیمؒ نے پوچھا۔ ”کیا تجھے پیر ومرشد کی قبر کا تہ پتا معلوم ہے؟“

مرید نے جواب دیا۔ ”ہاں! مجھے معلوم ہے اور میں آپ کو ان کی قبر تک پہنچا سکتا ہوں۔“

شاہ عبدالرحیمؒ نے فرمایا۔ ”تب پھر میرے ساتھ چلو۔“

وہ مرید انہیں اپنے ساتھ لے کر قبرستان چلا گیا۔ وہ بڑی دیر تک اِدھر اُدھر پھرتا رہا لیکن قبر کی شناخت نہ کرسکا۔

شاہ عبدالرحیمؒ نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے، وہ قبر مل کیوں نہیں رہی؟“

مرید نے جواب دیا۔ ”اس کے سوا کیا عرض کروں کہ اس میں بھی سید کی کرامت کا دخل ہے، انہوں نے فرمایا تھا کہ مجھے مسکینوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے، تاکہ لوگ میری قبر تک نہ پہنچ سکیں۔ چنانچہ میں پہچان اور شناخت کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھنے کے باوجود ان کی قبر تک نہیں پہنچ پا رہا۔“

شاہ عبدالرحیمؒ بہت پریشان ہوئے اور انہوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ کچھ بھی ہو وہ سید عبداللہؒ کی قبر تک پہنچ کر رہیں گے۔ انہوں نے اپنے راہنما سے کہا۔ ”بھائی! ذرا توجہ سے قبر تلاش کرو، بہت زیادہ دنوں کی بات تو نہیں۔“

مرید نے عرض کیا۔ ”حضرت! میں کوشش کررہا ہوں آپ بھی دعا فرمائیں کہ خدا میری مشکل حل کردے۔“

شاہ عبدالرحیمؒ کی آنکھوں میں آنسو آگئے زیرلب کہنے لگے۔

”پیر ومرشد! میں آپ کی آخری رسوم میں بدوجہ مجبوری شریک نہ ہوسکا تھا۔ اب آیا ہوں تو آپ کی آخری آرام گاہ نہیں مل رہی۔ کیا میں واپس مایوس جاؤں؟“

ایک طرف سے مرید نے آواز دی۔ ”حضرت! یہ رہی وہ قبر ادھر آجایے۔“

شاہ عبدالرحیمؒ خوش خوش اس قبر کے پاس بیٹھ کر قرآن پاک کی تلاوت کرنے لگے۔

ابھی وہ قرآن پاک پڑھ ہی رہے تھے کہ پیچھے سے آواز آئی۔

”شاہ عبدالرحیمؒ! میری یہ قبر نہیں۔ میری قبر تمہاری پشت پر ہے۔ تلاوت جاری رکھو اور اس کا ثواب بھی اس کو پہنچاؤ جس کے پاس بیٹھے تلاوت کررہے ہو۔“

شاہ عبدالرحیمؒ نے مرید سے پوچھا۔ ”تم نے کوئی آواز سنی؟“

مرید نے جواب دیا۔ ”نہیں تو......“

شاہ عبدالرحیمؒ نے کہا۔ ”دیکھو تم ایک بار پھر غور کرو کہ پیر ومرشد کی قبر کون سی ہے؟“

مرید نے ایک بار پھر اِدھر اُدھر غور سے دیکھا اور ایک دم شرمندگی سے عرض کیا۔ ”حضرت! مجھ سے غلطی ہوئی۔ پیر ومرشد کی قبر تو آپ کی پشت پر ہے۔“

تھوڑی دیر بعد شاہ عبدالرحیمؒ نے قبر کی طرف منہ کیا اور تلاوت کرنے لگے اس بار ان کا دل بھر آیا اور طبیعت قابو میں نہیں رہی، تلاوت میں جذباتی دباؤ کی وجہ سے قرأت کے قواعد کی پابندی برقرار نہ رہی۔ اسی عالم میں شاہ عبدالرحیمؒ نے سنا، سید عبداللہؒ فرما رہے ہیں۔ ”شاہ عبدالرحیمؒ! یہ کیا کررہے ہو، ہوش میں آؤ۔ یہ قرآن پاک ہے تساہل سے کام نہ لو اور احتیاط کو ہاتھ سے جانے نہ دو۔“

اس بار شاہ عبدالرحیمؒ نے نہایت احتیاط سے قرآن پاک کی تلاوت کی اور بہ چشم گریاں گھر واپس گئے۔

کہتے ہیں شاہ عبدالرحیمؒ اور شاہ ولی اللہؒ کے فیضان ربی میں سید عبداللہؒ کی نوازشوں کا بھی بڑا دخل ہے۔

ماخذات

الطبقات الکبریٰ، علامہ عبدالوہاب الشعرانی۔ روضتہ الریاحین، ابی محمد عبداللہ۔
سفینۃ الاولیاء، شہزادہ دارا شکوہ۔ تذکرۃ الاولیاء، شیخ فرید الدین عطار

موڑ

ابوزرتاب

زندگی ایک ایسا گھن چکر ہے جس کے ہر موڑ پر ایک نئی کہانی جنم لیتی ہے اور ہر کہانی کا انت دوسری کہانی کے آغاز سے جڑا ہوتا ہے... اور پھر یہ نئے اور پرانے کردار مل کر زیست کے نشیب و فراز سے ہوتے ہوئے اختتام کی جانب بڑھتے رہتے ہیں... یہ کردار بھی آس و امید کے دائرے میں قید اپنی تمام تر معصومیت کے ساتھ آنے والے کل کی جوت جگائے ہونے والے سویرے کا انتظار کررہا تھا... اسے اچھے دنوں کا شدت سے انتظار تھا۔

قدم قدم پر کسی انہونی کے انتظار میں گم ایک عاشق کی ناکامیوں کا احوال

سوچ رہا ہوں اس کہانی کو کیا عنوان دوں؟ اصل میں یہ کہانی اس شخص کی ہے جس نے کھانے ہی کو اپنا پیشہ بنا لیا تھا اور کہانی رائے گڑھ کے ٹھاکر صاحب کے محل کی بھی ہے جس میں چھ رانیاں الگ الگ محلوں میں اپنی باندیوں اور خدمت گار عورتوں کے ساتھ رہتی تھیں۔ ان میں سے چھوٹی رانی...... لیکن شروع ہی میں کہانی کا انجام کیوں بتاؤں؟

ooo

یہ کہانی مجھے اجمیر شریف کی بنگالی دھرم شالا کے منیجر

اننت رام اپادھیائے نے سنائی تھی۔ اگر میں وہاں سے دو روز پہلے چل دیتا تو دامودر پانڈے سے ملاقات ہوتی نہ یہ کہانی ملتی۔

سفر پر روانہ ہونے سے پہلے میرے ایک جیوتشی دوست نے کہا تھا کہ میری آئندہ زندگی میں مشکلات اور مصیبتوں کا دور شروع ہونے والا ہے، ذرا ہوشیار رہنا ہوگا۔

دشواریاں کیا ہوتی ہیں، کیوں آتی ہیں اور ان سے کیسے بچا جا سکتا ہے، اس بارے میں، میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ البتہ زندگی اب تک نہ جانے ایسے کتنے واقعات جھیل چکی ہے۔ کسی کسی حادثے نے تو مجھے اتنا تباہ اور مایوس کر دیا کہ میں ہمت ہار بیٹھا لیکن وقت گزرنے پر جب میں دوبارہ اسی دم خم سے اٹھ کھڑا ہوا تو سب کچھ بدل گیا۔ میں دکھ سکھ دونوں حالتوں میں ایک جیسا ہی رہا...... اور یہی مزاج میری زندگی کی سب سے بڑی دولت ہے۔

پنکر کے دامودر پانڈے نے بتایا تھا۔

”صرف خوراک کے لیے بھگوان کی پوجا کرتا ہوں بابو صاحب! آپ لوگ تیرتھ کرتے ہیں، ڈھیروں روپے خرچ کر کے یاترا کے لیے جاتے ہیں، ثواب کماتے ہیں لیکن میں کھا کر ثواب کماتا ہوں اور اس اوپر والے کے نام پر کھاتا ہوں تاکہ میری روح آسودہ رہے اور اس باعث پرمیشور بھی خوش ہوگا۔“

❦❦❦

اپنے سفر کے دوران میں نے مختلف جگہوں پر جا کر کیسے ثواب کمایا اس کا حساب کتاب شاید اوپر والے کے کھاتوں میں درج ہوگا اور ممکن ہے پوری زندگی کا میرا کیا کرایا محض یہی ہو۔ کوئی نیک وقت ملا تو توبہ استغفار کرلوں گا نہ بھی ملا تو کوئی بات نہیں۔ لیکن تیرتھ یاترا کے دوران گھاٹ باٹ، ریڑھا تانگا، ریل، ویٹنگ روم وغیرہ میں بیٹھے اجنبی لوگوں اور ان کے درشنوں سے بھی بڑا ثواب ملتا ہے۔ میری سوچ کے مطابق یہی میری زندگی کی پونجی ہیں اور انہی سے مجھے نت نئی کہانیاں ملتی ہیں۔

❦❦❦

میں درگاہ شریف پر ماتھا ٹیک آیا۔ پرتھوی راج کا ڈھائی دن کا جھونپڑا بھی دیکھ لیا۔ تارا گڑھ، عجائب گھر، دولت باغ، ساحلِ سمندر، سارا کچھ دیکھ لیا۔ اب کہیں کچھ دیکھنا باقی نہیں رہا۔ میرا خیال تھا میں نے سارا کچھ دیکھ ڈالا لیکن عین روانہ ہونے کے وقت ایک مشکل آن پڑی۔

پانڈا مہاراج یعنی ڈی۔ این کالے صاحب نے پوچھا۔ ”تیرتھ استھان میں آ کر آپ نے براہمن بھوجن نہیں کرایا بابو جی؟“

واقعی یہ سوچنے کی بات تھی۔ پورے سفر کے دوران میں نے کوئی کسر نہیں رکھی۔ پنکر میں پرشاد پوجا چڑھایا۔ ساوتری پہاڑ پر دیوی درشن بھی کر آیا۔ مچھوؤں کو چنے کھلائے۔ دیر دیر تک بھرت رکھ کر دان دھیان، پوجا، گؤدان، پکوان چڑھاوے...... سارے رواج پورے کیے۔ چونکہ کافی دیر ہوگئی تھی اس لیے براہمن بھوجن نہیں کرا پایا...... میں نے سوچا، بعد میں روپے لٹا دینے ہی سے کام پورا کرلوں گا۔ یا پھر اجمیر واپس لوٹ کر کوئی انتظام کروں گا۔ براہمن تو آخر وہاں بھی موجود ہوں گے لیکن وہاں بھی یہ رسم پوری نہ ہوسکی۔

پانڈا مہاراج کی بات سن کر میں فکر میں پڑ گیا۔ میں نے پوچھا ”کتنا خرچ آئے گا؟“

ڈی این کالے نے کہا۔ ”پانچ براہمنوں کو کھانا کھلانے میں آپ کے......“

اپادھیائے اتنی دیر سے ہماری بات چیت سن رہا تھا۔ اب اس نے زبان کھولی۔ ”پانچ کیوں؟ صرف ایک براہمن کو کھلا پلا دینا ہی کافی ہوگا۔“

پانڈا مہاراج کے چلے جانے کے بعد اپادھیائے نے کہا۔ ”دیکھیے ان سب پنڈت پانڈوں کی باتوں میں مت آیئے۔ جانے کہاں کہاں کے النتو فالتو براہمن لا کر حاضر کرے گا اور بیچ سے موٹا کمیشن مارے گا۔ آپ براہمن کو جو کچھ دیں گے وہ بھی آدھے سے زیادہ ہڑپ کرلے گا۔ اس سے تو بہتر ہے میں دامودر پانڈے کو بھیج دوں گا۔ بہت شریف آدمی ہے، پانچ براہمنوں کا کھانا وہ اکیلا ہی کھالے گا۔ سو ایک آدمی کو کھلا کر پانچ براہمن بھوجن کا ثواب بالکل پکا۔“

میں نے کہا۔ ”تو پھر یہی انتظام کرا دیجیے۔“

معمولی سی بات تھی۔ ایک براہمن کو کھانا کھلانا تھا۔ اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ لیکن اجمیر میں پہلی بار مجھے کہانی بھی ملی۔ ہاں اس سے پہلے کبھی کسی پانڈے پنڈت کی زندگی کی طرف کوئی دھیان نہیں گیا تھا۔ شاید اجمیر میں بھی اس کی ضرورت نہ پڑتی۔ کیونکہ طے یہی ہوا تھا کہ اس کی ساری ذمے داری اپادھیائے کے سر پر ہوگی۔

❦❦❦

اگلے روز صبح جب سو کر اٹھا تو باہر لوہے کی بینچ پر پوری آستین کی بنیان پہنے کسی اجنبی پر نظر پڑ گئی۔

مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”بھوجن کرانے کے لیے آپ نے کسی براہمن کو بلایا تھا بابو جی؟ میں دامودر ہوں۔ بھوجن کرتا ہوں۔“ میں اس شخص کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔

لیکن پانڈے جی نے خود ہی باتوں میں پہل کی۔ ”میں خالص براہمن ہوں بابو جی۔ چونکہ میں یہاں کے پانڈوں کو کمیشن نہیں دیتا اس لیے ان لوگوں نے مجھے برباد کر ڈالا ہے۔ لیکن یہاں جو بنگالی تیرتھ یاتری آتے ہیں وہ مجھے ہی بھوجن کراتے ہیں۔ اپادھیائے جی کو سارا قصہ معلوم ہے۔“

”آپ یہاں کرتے کیا ہیں؟“

پانڈے جی کو میرا سوال سمجھ نہیں آیا۔ وہ بھونچکا ہو کر سوالیہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

میں نے اپنا سوال دہراتے ہوئے کہا۔ ”آپ یہاں کوئی نوکری دوکری یا کسی اور کام میں بھی لگے ہیں یا صرف براہمن بھوجن ہی کرتے ہیں؟ میرا مطلب ہے آپ کرتے کیا ہیں؟“

پانڈے جی نے سر ہلا کر کہا۔ ”بابو جی اور کچھ نہیں کرتا۔ صرف بھوجن کرتا ہوں۔ پنکر جی کی کرپا سے بھوجن کرنا ہی میرا پیشہ ہے۔“ دامودر پانڈے کا چہرہ مانو اپنے پیشے کی برتری سے چمک اٹھا۔

اس نے دوبارہ کہا۔ ”آپ نند کشور جی کو جانتے ہیں؟ کلکتے کے نند کشور بابو؟“

میں نے انکار میں سر ہلایا۔

پانڈے نے کہا۔ ”ارے وہ تو کلکتے کے اتنے بڑے سیٹھ صاحب ہیں۔ بڑے بازار میں ان کی گدی ہے۔ یہاں آئے تو مجھے بھوجن کرا گئے۔ ان کی عورت بہت بڑی بھگت ہے بابو جی۔ پورے پانچ سیر دہی، آدھے من آٹے کی پوریاں، لڈو، دہی بڑے...... میرا بھوجن دیکھ کر خوب تعریف کی۔ آخر میں پورے دس روپے دان بھی کیے۔“

پانڈے جی شاید اور لمبی فہرست گنواتے لیکن میں نے ان کی بات بیچ میں ہی کاٹتے ہوئے کہا۔ ”اچھا اچھا...... اپادھیائے جی کو آ لینے دیجیے۔ میں نے ان سے سارا انتظام کرنے کو کہہ دیا ہے۔“

رات کو اپادھیائے جی نے پوچھا۔ ”صبح پانڈے آیا تھا؟“ دھرم شالا کے منیجر اننت رام اپادھیائے جی اس وقت کھاٹ بچھا کر سونے کی تیاری میں تھے۔

انہوں نے دوبارہ کہا۔ ”تب میں کل ہی سارا انتظام کرائے دیتا ہوں، کیوں ٹھیک ہے ناں؟“

میں نے کہا۔ ”کل شام کو تو میں چتوڑ چلا جاؤں گا۔“

اپادھیائے نے کہا۔ ”ارے...... لیکن گاڑی تو رات کی ہے۔ صبح ہی کھلا دیں گے۔ اگر آپ گیارہ بجے کھانے کو بلائیں گے تو دو بجے تک پتری چاٹ پونچھ کر بالکل صاف کر دے گا۔ آپ خود ہی دیکھ لیجیے گا۔ ویسے میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ آج دن بھر وہ فاقہ کرے گا۔“

میں حیران رہ گیا۔ ”فاقہ کیوں؟ کل کھائے گا اس کے لیے فاقہ آج سے کیوں؟“

”جی...... فاقہ نہیں کرے گا تو کل پانچ براہمنوں کا کھانا اکیلے کھائے گا کیسے؟ آخر آدمی کا ہی پیٹ ہے۔ ہر روز کیا ایک جیسی بھوک رہتی ہے؟ اس کے علاوہ آج کل تو کھانے کی ہر چیز میں ملاوٹ ہو رہی ہے۔ خیر بے چارے پانڈے جیسے لوگ اب بہت مشکل میں ہیں۔ کھانے میں پہلے جیسا کرتب نہیں دکھا پاتے۔ کھانے کے بعد ہضم کرنے کے لیے چھوٹے لال کی ہاضم گولیاں بھی کھانی پڑتی ہیں۔ سچ سچ ایسے لوگوں کے خاصے برے دن آ گئے ہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”بھئی دنیا میں اتنے اتنے پیشوں کے ہوتے ہوئے پانڈے نے بھوجن کا پیشہ ہی کیوں اپنایا؟“

اپادھیائے نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر کچھ دیر بعد ہنستے ہوئے بولا۔ ”آپ یہیں اسی کھاٹ پر آ جایئے بابو صاحب! آپ کو ایک مزے دار قصہ سناؤں۔“ اپادھیائے نے دامودر پانڈے کی کہانی شروع کی۔

❦❦❦

اس رات کو میں ابھی تک نہیں بھول پایا جو میں نے راجپوتانے میں گزاری تھی۔ اس روز کہانی سنتے سنتے کافی رات ہوگئی تھی۔ دور جودھ پور کے پہاڑوں میں مشرق کی طرف بادل چھائے ہوئے تھے۔ ادھر دکھن میں تارا گڑھ کے اونچے اونچے مکانوں میں جلتی ہوئی روشنی ایک ایک کر کے بجھتی جا رہی تھی۔ اجمیر جنکشن پر آنے جانے والی ٹرینوں کی چیخ پکار اس رات کی خاموشی کو چیر کر ٹکڑے ٹکڑے کیے دے رہی تھی...... لیکن میں اس وقت وہاں سے کافی دور پہنچ چکا تھا۔ کہاں بھوج پور کہاں قنوج، کچھ ہوش نہیں، مشرقی ریاست کے کسی گاؤں میں...... شاید رام گڑھ کے راجا ٹھاکر صاحب آئے ہیں۔ ٹھاکر صاحب کو شکار کا بہت شوق، نربدا ندی کے کنارے پڑاؤ بھی پڑ چکا ہے۔ اپنے مصاحبوں، خوشامدیوں، یار دوستوں کے ساتھ شکار پر نکلے ہوئے ٹھاکر صاحب، دو دو شیر مار کر اپنے دربارِ خاص میں لوٹ آئے ہیں۔ اس وقت اسی کا ذکر چل رہا ہے۔ جو لوگ

ڈاک ڈول، کنستر پیٹ پیٹ کر شیر کو گھیر کھار کر بندوق کی نال کے سامنے لے آئے تھے۔ انہی لوگوں کو کھلانے پلانے کا دور چل رہا ہے۔ لگ بھگ تین سو لوگوں کی بھیڑ، پلاؤ، لڈو، ترکاری، دہی، گلاب جامن، کہیں کسی چیز کی کمی نہیں رکھی۔ سب کے سب مرے بھوکے کھٹملوں کی طرح پترل چاٹ چوٹ کر صاف کر گئے۔

''زبدا پرساد نے حکم دیا تھا...... جو جتنا کھا سکے پیٹ بھر کر کھائے۔ جو جتنا مانگے اسے کھلایا جائے۔''

تبھی سب لوگ کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ کسی کو بھی کسی کی طرف دیکھنے کی فرصت نہیں تھی، آخر میں سب کا پیٹ بھر گیا۔ بھنڈار خالی ہو گیا۔ سبھی لمبی لمبی ڈکاریں لیتے ہوئے ٹھاکر صاحب کو سلام ٹھونک کر اپنی اپنی راہ لگے۔

لیکن ایک آدمی ابھی تک ڈٹا ہوا تھا۔ اسے اور کھانا چاہیے۔ لڈو یا گلاب جامن یا پیڑا یا دہی کچھ بھی مل جائے۔ لیکن اب تو بھنڈار میں کچھ بھی نہیں بچا۔ کہاں سے دیا جائے؟ سارا کچھ تو ختم ہو چکا۔

ٹھاکر صاحب کو خبر بھیجی گئی۔ ''ایک شخص ابھی بھوکا رہ گیا ہے۔''

''کون ہے وہ؟''

''حضور، کوئی گنی آدمی ہے۔ اس علاقے میں رہتا ہے، آپ کی رعایا میں سے ہے۔''

''ہاں چل کر دیکھنا چاہیے۔ کیسی رعایا ہے کیا حیرت انگیز کھویا ہے جو سارا کچھ کھا پی کر اجاڑ سکتا ہے۔''

زبدا پرساد نے اس کے سامنے ہنٹر گھماتے ہوئے پوچھا۔ ''کون ہو تم؟ کیا نام ہے؟''

''حضور کی پرجا یعنی رعایا۔'' وہ شخص اس وقت خالی پترل کے سامنے چپ چاپ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا تھا۔ اس نے جواب دیا۔ ''حضور، میں دامودر پانڈے ہوں۔ ذات کا براہمن۔''

''ہوں......'' زبدا پرساد نے لمبی سی ہنکاری بھری۔ شاید وہ کسی سوچ میں پڑ گئے تھے۔ کچھ لمحے بعد انہوں نے پوچھا۔ ''کیوں، تمہارا پیٹ نہیں بھرا کیا؟''

''ن...... ناں حضور!''

''اور کھاؤ گے؟''

''جی ہاں......''

''اور کتنا کھا سکتے ہو؟''

''آپ جتنا کھلائیں حضور!''

حضور پھر کسی سوچ میں ڈوب گئے۔ ٹھیک گاؤں کے اندران کی کچہری، آس پاس کہیں حلوائی کی دکان بھی نہیں۔ شہر یہاں سے تیس کوس دور۔ مصاحب، دوست، یار بخشی بھی پاس ہی کھڑے تھے۔ وہ لوگ بھی ساری بات چیت سن رہے تھے۔

حضور نے سوال کیا۔ ''میرے ساتھ راج محل میں چلو گے؟ نوکری کرو گے؟''

ان دنوں دامودر پانڈے بے کار تھا۔ اپنا پیٹ پالنا بھی پہاڑ ہو رہا تھا۔ دونوں وقت کھانا بھی میسر نہیں۔ ساری دنیا کو ہضم کر جانے والی بھوک، ایسے انسان کو نوکری کی امید دلانا؟ یہ تو وہی حال ہوا۔ ''کھانے کا بلاوا پیٹ میں بیٹھا ہوا۔''

دامودر نے صرف اتنا ہی پوچھا۔ ''کام کیا کرنا ہوگا؟ حضور...... میں تو پڑھا لکھا بھی نہیں ہوں۔ اپنا نام تک نہیں لکھ سکتا۔''

ٹھاکر صاحب نے کہا۔ ''نہیں، لکھنے پڑھنے کا کام نہیں کرنا ہوگا...... صرف بھوجن کرنا ہوگا۔''

''بھوجن...... بھلا یہ بھی کوئی کام ہے؟''

ٹھاکر صاحب کے لاؤ لشکر کے ساتھ دامودر پانڈے بھی روانہ ہو گیا۔ یہاں سے تیس کوس دور رائے گڑھ کے ٹھاکر صاحب کا راج محل تھا۔

ٹھاکر صاحب کی نیند صبح دیر سے ٹوٹی۔ دیوان جی ہی سارا کام کاج نمٹاتے ہیں۔ ایسے بھی دو ایک کام نکل ہی آتے جو ٹھاکر صاحب کے بنا نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ بھی دیوان جی ہی پورا کر کے ان کے سامنے رکھ دیتے۔ یہ کوٹھی راج محل سے بالکل الگ ہے۔ اوپر نیچے کئی کمرے، ٹھیکیداروں نے کافی سارے روپے ہضم کرنے کے بعد یہ کوٹھی بنوا دی تھی۔

پہلے روز ہی ٹھاکر صاحب کو دامودر پانڈے کا خیال آ گیا۔ اسے طلب کیا۔ سارا کمرا تماشائیوں سے بھر گیا۔ ایسا مرگلا سا آدمی بھلا کتنا کھاتا ہوگا۔

ٹھاکر صاحب زبدا پرساد تکیے سے کمر لگائے بیٹھے تھے۔ پان قوام کی جیسے لوٹ مچی ہوئی تھی۔ دامودر پانڈے حاضر ہوا۔ رسم کے مطابق سلام کر کے حکم کے انتظار میں کھڑا رہا۔

زبدا پرساد نے پوچھا۔ ''کیوں، بیس سیر جلیبی کھا سکو گے پانڈے؟''

''جی ہاں......'' دامودر ہاتھ جوڑے اسی طرح کھڑا رہا۔ بہت دنوں سے جلیبی نہیں کھائی تھی۔ من ہی من میں اسے لالچ بھی آ گیا۔

سبھی آنکھوں میں تجسس جھلک اٹھا۔ ''پورے آدھا من جلیبی کھا جائے گا؟''

حلوائی کو خبر دی گئی۔ ''پکا بیس سیر جلیبی، ہاں رس نچوڑ لیا جائے۔''

ٹھاکر صاحب کے خاص ملازم کے سامنے جلیبی کا سامان ترازو پر تولا گیا تاکہ حساب میں کہیں کوئی گول مول نہ رہے۔ شام کو راج محل میں دربار بیٹھے گا۔ وہاں دامودر اپنا کھیل دکھائے گا۔

⁂

شام کو آنگن میں چاندنی بچھا دی گئی۔ نوکر چاکر، بابو مصاحب، بہت بھیڑ لگ گئی۔ ٹھاکر زبدا پرساد پاؤں پر پاؤں چڑھائے بیچ میں براجمان، ہاتھوں ہاتھ پان قوام کی گلوریاں، دامودر پانڈے دربار کے بیچوں بیچ آ کر بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے جلیبی کا ہنڈا رکھ دیا گیا۔ دامودر نے ایک بار چاروں طرف نظر دوڑا کر دیکھا۔ اس نے ٹھاکر صاحب کو دوبارہ سلام کیا۔ ان گنت متجسس آنکھیں اس کے چہرے پر ٹکی تھیں۔ اس کے بعد کھیل شروع ہو گیا۔

دامودر ایک ایک جلیبی منہ میں رکھتا گیا اور بنا کسی سانس ڈکار کے گلے سے نیچے اتارتا گیا۔ سنہرے رنگ کی نرم ملائم جلیبیاں، ابھی تک ہلکی ہلکی گرم تھیں۔ انہیں چبانے یا دانت سے کاٹنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ صرف گپا گپ منہ میں ڈالتے جاؤ۔

کھانے کا خاموش سلسلہ جاری رہا۔ سب کے سب حیران ہو کر اسے دیکھ رہے تھے۔ موٹی موٹی بڑی بڑی بیس سیر جلیبیاں، سیر بھر میں قریباً تیس جلیبیاں، کل ملا کر چھ سو جلیبیاں۔

جلیبیاں کھانے کا سلسلہ دوپہر تین بجے شروع ہوا اور ختم ہوتے ہوتے شام ہو گئی۔

آخری جلیبی منہ میں ڈالتے ہی ٹھاکر صاحب نے شاباش دی۔ ''شاباش استاد، شاباش، جیتے رہو۔ دل خوش کر دیا۔''

دامودر نے سر جھکا کر دوبارہ سلام کیا۔

ٹھاکر صاحب نے دامودر کو انعام دینے کا اعلان کیا۔ انہوں نے اس کے سر پر قیمتی سلک کی پگڑی رکھی۔ اس کے لیے شہر سے بادامی رنگ کا ناگرہ جوتا منگوایا گیا تھا۔ وہ پہنایا گیا۔

محفل کے تمام لوگ تعجب میں پڑ گئے۔

اس کے بعد چاروں طرف پانڈے کی دھوم مچ گئی۔ زبدا پرساد کی بھی تعریفیں کی گئیں۔

سب نے کہا۔ ''ٹھاکر ہو تو ٹھاکر زبدا پرساد جیسا۔''

سبھی دامودر کو دیکھنے کے لیے اُمڈ آئے۔ کبھی کبھار ضلع حاکم ادھر آ نکلتے۔ سرزمین کی جانچ پڑتال کے لیے انہیں اکثر دورے پر آنا پڑتا تھا۔

یہ کہانی سن کر انہوں نے بھی حیرت کا اظہار کیا۔ ''واقعی! بہت تعجب کی بات ہے۔ آدھا من جلیبی؟ آپ اس آدمی کو مجھے دکھا سکتے ہیں؟''

ٹھاکر صاحب نے کہا۔ ''سر! جس دن آپ چاہیں، دکھا سکتا ہوں۔''

⁂

دامودر کو طلب کیا گیا۔ دامودر آ کر دونوں کو سلام بجالایا۔ مرگلا سا چہرہ۔ صاحب نے اسے سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے انگریزی میں کہا۔ ''چڑیا گھر کا کوئی جانور لگتا ہے۔''

چونکہ یہ جملہ انگریزی میں کہا گیا تھا اس لیے وہ سمجھ نہیں پایا۔

ٹھاکر زبدا پرساد نے کہا۔ ''لیکن کھاتا بالکل شیطانوں جیسا ہے سر!''

صاحب نے پوچھا۔ ''بھات دال بھی کھاتا ہے؟''

''جی سر، بھات دال تو خیر کھاتا ہی ہے لیکن ضرورت پڑنے پر پیٹ کو بالکل خندق بنا سکتا ہے۔ جانے کیسے اتنا کھا لیتا ہے۔ گپا گپ بس کھائے چلا جاتا ہے۔ پیٹ میں جاتے ہی سارا کا سارا جانے کہاں چھومنتر ہو جاتا ہے۔''

''ایسا عجوبہ آپ کو ملا کہاں سے ٹھاکر صاحب؟ حیرت کی بات ہے۔''

⁂

مجسٹریٹ نے بھی دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس بار جلیبی کی جگہ لڈو بنوائے گئے۔ ''پورا آدھا من لڈو کھانے ہوں گے۔ اگر اس نے کھا لیے تو خود مجسٹریٹ صاحب کی طرف سے اسے پورے پچاس روپے بخشش ملے گی۔''

''کھانے کا پھر ویسا ہی مظاہرہ ہوگا۔ حلوائی بلوا کر فرمائش کی گئی۔'' شام تک آدھا من لڈو تیار کرنا ہے۔'' مال بھی سامنے سامنے تول لیا گیا۔ چاروں طرف پھر لوگوں کی بھیڑ جم گئی۔ اس بار چبا چبا کر کھانا تھا۔ کافی مشکل معاملہ تھا لیکن دامودر پانڈے بھی پیچھے نہیں رہا۔ لوگوں کے دیکھتے ہی دیکھتے آدھا من لڈو چبا چبا کر کھا گیا۔ مجسٹریٹ صاحب نے

اسے روپے دیے۔ چاروں طرف سے شاباش ہونے لگی۔

ایسا کیا ایک آدھ بار ہی ہوا؟ آج مجسٹریٹ صاحب، کل ٹھاکر صاحب کا بھتیجا۔ پرسوں پڑوسی زمیندار، جو سنتا وہی ایک بار اسے دیکھنے کی فرمائش کر بیٹھتا۔ اسے پھر وہی کھیل دکھانا پڑتا۔ انعام ہی انعام برسنے لگا۔

⚬⚬⚬

ایسے ہی ایک روز اس راج محل کے سامنے ایک موٹر گاڑی آگئی تھی۔ اس روز بھی ایسی ہی دھوم مچ گئی تھی۔ موٹر دیکھنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ گاڑی کا ہارن سنتے ہی بچے، بوڑھے، جوان۔ سب کے سب سڑک پر آکھڑے ہوئے۔ کبھی جب شیر کا شکار کر کے لایا جاتا۔ تب بھی ایسی بھیڑ لگ جاتی۔ دامودر پانڈے بھی انہی جانوروں کی طرح مانو کوئی عجوبہ تھا۔ شروع شروع میں اس کی خوب خاطر تواضع ہوئی۔ ایکدم سے سر پر ہی بٹھا لیا گیا۔ اس کے کھانے میں کہیں کوئی کمی نہ رہ جائے۔

⚬⚬⚬

"انہی دنوں ایک اور واقعہ ہوگیا۔ ایسا ہی ایک عجیب وغریب واقعہ لالہ بابو کی زندگی میں بھی ہوا تھا۔ جو لوگ بہت بہادر بننے کی کوشش کرتے ہیں ان کی زندگی میں ایسا ہی کوئی نہ کوئی واقعہ ضرور ہوتا ہے۔"

اپادھیائے پل بھر کو چپ ہو رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے دریافت کیا۔ "رات کے کتنے بجے ہوں گے؟"

مجھے یاد ہے اس وقت اجمیر جنکشن کی آخری ٹرین دھواں اگلتی ہوئی پلیٹ فارم چھوڑ رہی تھی۔ عام راستے پر سندھیوں کی پاؤر وٹی کی دکان پوری طرح بند ہو چکی تھی۔

اپادھیائے نے کہا۔ "پانڈے کو تو آپ نے بھی دیکھا ہوگا۔ اسے دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ کوئی ایسا ویسا معمولی پیٹو براہمن ہوگا۔ کھانے پینے کا شوقین، لیکن......" اپادھیائے نے باتوں کی کڑی دوبارہ جوڑتے ہوئے کہا۔ "یہ سب میں نے پانڈے کے منہ سے ہی سنا ہے۔ ان دنوں اس سے زیادہ جان پہچان نہیں ہوئی تھی۔ جب جان پہچان گہری ہوئی۔ وہ بڈھا ہو چکا تھا۔ آخری برسوں میں اکثر سنکھیا کھاتا ہوا نظر آتا تھا۔ کبھی بدن پر راکھ لپیٹے دھونی رمائے پڑا رہتا تھا۔"

میں نے سوال کیا۔ "سنکھیا کیا چیز ہے؟"

اپادھیائے نے بتایا۔ "سنکھ کی راکھ...... سادھو لوگ سنکھ جلا کر راکھ بناتے ہیں اور اسی راکھ کی گولی چڑھا کر دھت پڑے رہتے ہیں۔ سنکھیا کھا کر بدن اتنا گرم رہتا ہے کہ ماگھ کے مہینے میں کڑکڑاتی سردی میں بھی پنکر تیرتھ میں اگر نہایا جائے تو بھی پسینا نہیں مرے گا۔ آپ یہ سمجھ لیجیے کہ بھوک مٹانے کے لیے دامودر پانڈے مانو کوئی تپسیا کر رہا تھا۔"

میں نے پوچھا۔ "کیوں؟"

اپادھیائے نے ہی بتایا۔ "ایسا عجوبہ میں نے پہلی بار دیکھا۔ حضور! دامودر کو اور کوئی چاہ نہیں تھی۔ وہ صرف اپنی بھوک کو بھول جانا چاہتا تھا۔ خیر...... میں بھی سادھو بننے کے ارادے سے ہی اس اکھاڑے میں گیا تھا۔ وہاں پانڈے کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ میں حیران تھا کہ اوپر والے کا یہ کیسا انوکھا کھیل ہے۔ ایک روز میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔ آج تمہیں اپنی پوری کہانی بتانی ہی پڑے گی۔ پانڈے جی۔

اس روز پہلی بار مجھے پانڈے جی کا سارا قصہ معلوم ہوا۔

اس لیے تو میں کہتا ہوں بابوجی! پنکر جی، کب کس وقت پر، کون سی کرپا کر بیٹھیں۔ اس کا بھید کون سمجھ سکتا ہے۔ پانڈے ان دنوں ٹھاکر صاحب کے یہاں ہی رہتا تھا۔ عیش سے کھاتا پیتا اور کافی مستی میں دن گزارتا تھا...... جب تک کھا کھا کر ہضم کرتا رہا۔ تب تک نوکری پر بحال...... باقی کہانی دامودر پانڈے کی زبانی سنیے۔

⚬⚬⚬

گانجے کا لمبا دم لگانے کے بعد پانڈے نے اپنی کہانی شروع کی۔ "کچھ ہی دنوں کے اندر دوبارہ ایک واقعہ ہوگیا۔ اس بار خاص رانی محل سے بلاوا آپہنچا کہ رانی محل کی رانی صاحبہ مجھے اپنے سامنے بٹھا کر کھلائیں گی یعنی دامودر کو ان کے سامنے کھیل دکھانا ہوگا۔ رانی کا شوق جو ٹھہرا۔

ٹھاکر صاحب نے تو محض حکم سنا دیا لیکن میں عجیب مصیبت میں پھنس گیا۔ اس وقت دن کے تین بج رہے تھے۔ ٹھاکر صاحب کا آدمی مجھے بلانے آن پہنچا۔

میری آنکھوں پر دہری پٹی باندھ کر مجھے اندر محل میں لے جایا گیا۔ اندر محل کے بڑے دروازے پر مجھے کسی باندی کے سپرد کر دیا گیا۔ باندی کا ہاتھ تھامے اندھیرے ہی میں ادھر ادھر ٹکراتے لڑکھڑاتے میں آگے بڑھتا گیا۔ کچھ دور جانے کے بعد یک بارگی سناٹا، اچانک مجھے احساس ہوا۔ اب ہم رانی محل میں داخل ہو چکے ہیں۔ اف! آواز تھی کہ بانسری، آواز سن کر ہی میں نے عمر کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ نربدا پرساد شوقین مزاج ٹھہرے۔ ان کے شوق کا کیا ٹھکانا۔ ہزاروں طرح کے شوق۔ شوق کی بھوک میں کئی کئی شادیاں رچاتے رہے۔ خوب صورت اور حسین عورتیں لیکن آج تک کسی نے ان کی صورت نہیں دیکھی۔ کسی

کی نظر پڑ جاتی تو ان کی عزت چلی جاتی۔ انہیں دیکھنے کا حق صرف ایک ہی مرد کو تھا۔ وہ تھا ان کا مالک سرتاج...... مالک ٹھاکر صاحب نربدا پرساد۔ رات دس بجے کے بعد صرف نربدا پرساد ہی رانی محل میں داخل ہوتے۔ ان کے رانی محل میں کل ملا کر چھ رانیاں تھیں۔

نربدا پرساد کے سونے کا کمرا بالکل الگ محل میں تھا۔ وہاں کا سارا انتظام بالکل الگ۔ ٹھاکر صاحب باری باری ہر رانی کے پہلو میں رات گزارنے آتے۔ دو مہینے ختم ہوتے ہی رانی بدل جاتی۔ کوئی دوسری رانی ان کا پہلو گرم کرنے کے لیے حاضر ہوتی۔

ایسے ہی پورا سال گزر جاتا۔ لیکن ان دو مہینوں رانی کے عیش و آرام کا بھرپور انتظام۔ رانی گلاب جل میں نہا کر راجا کے ساتھ باہر نکلے گی۔ پان میں کستوری ڈالے گی۔ چاندی کی تھالی میں کھانا کھائے گی۔ ہاتھی دانت کے پلنگ پر آرام کرے گی۔ چھ چھ باندیاں، چار چار نوکرانیاں...... کتنا کتنا بیان کروں۔ ان سارے نظاروں کی بھی جھلک تک نہیں ملی۔ ساری سنی سنائی باتیں ہیں حضور...... اسی طرح دو مہینے گزر جانے پر اس رانی کو اپنے محل میں لوٹ آنا پڑتا۔

مجھے کس رانی نے بلایا تھا، مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا۔

باندی کے ساتھ میں اس کا ہاتھ تھامے چلتا گیا۔ آخر کار ہم ایک محل کے دروازے پر رک گئے۔ وہاں کے محل میں گلاب کی خوشبو آرہی تھی۔ کمرے میں ریڈیو بج رہا تھا۔ ریشمی ساڑی کی سرسراہٹ بھی سنائی پڑی۔ چوڑی، بازو بند اور تاگے کی جھنکار بھی کانوں میں آئی۔ شاید کوئی بلا تھا۔ مجھے لگا، خود رانی صاحبہ میرے سامنے کھڑی ہیں۔

رانی کی خاص باندی نے مجھے حکم دیا۔ "لو کھاؤ، گلاب جامن ہیں۔ کھانا شروع کرو۔ آدھے من گلاب جامن کا کھیل دکھاؤ۔"

میں نے ٹٹول کر دیکھا، پھر ایک ایک کر کے کھانا شروع کیا۔ کھانے میں بھلا کیا تکلیف؟ کھانے کی تو نوکری کرتا ہوں۔ کھانا تو پڑے گا ہی...... اگر میں نہیں کھا سکا تو ٹھاکر صاحب کی ہیٹی ہوگی۔ اس لیے چاہے میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے مجھے کھانا ہی ہوگا۔ میں نے آدھا من گلاب جامن کھا کر ہضم کر ڈالا۔

ہاتھ دھونے کے لیے پانی بھی آگیا۔ تعریف کرنے والی صرف ایک ہستی۔

میں ختم کر کے لوٹ آیا۔

باندی میرا ہاتھ پکڑ کر باہر کے دروازے تک چھوڑ گئی۔ وہاں کسی نوکر نے میری آنکھوں کی پٹی کھول دی۔ میں کہاں گیا تھا۔ کس طرف سے گیا۔ کیسے کھیل دکھایا، اس کی صورت شکل کیسی تھی۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔

کچھ دنوں بعد ٹھاکر صاحب نے مجھے بلا کر کہا۔ "پانڈے! اب منجھلی رانی پیچھے پڑی ہیں۔ وہ بھی تمہارا کھیل دیکھنا چاہتی ہیں۔ وہ بھی تمہیں گلاب جامن کھلائیں گی لیکن بیس سیر کی جگہ اکیس سیر کھلائیں گی۔ یعنی سیر بھر زیادہ۔ تم کھا سکو گے ناں؟"

مجھے راضی ہونا ہی پڑا۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔

اس دن بھی وہی سب دہرایا گیا۔ اسی طرح آنکھوں پر دہری پٹی باندھ کر، باندی کا ہاتھ پکڑے پکڑے میں رانی محل میں پہنچا۔ یہ ٹھاکر صاحب کا محل نہیں تھا۔ یہاں ہوا میں ویسی خوشبو بھی نہیں تھی۔ ماحول میں ویسی خاموشی بھی نہیں تھی۔ اس بار بھی کسی نے کوئی بات چیت نہیں کی۔ نہ کہیں کوئی آہٹ سنائی دی۔ پورے اکیس سیر گلاب جامن کھا کر میں چپ چاپ لوٹ آیا۔ نوکری جوں کی توں قائم رہی۔

اسی طرح رانی محل سے تیسری بار بلاوا آیا۔ اس بار تیجھلی رانی نے بلایا تھا اور مجھے بائیس سیر گلاب جامن کھانا تھے۔ یعنی ایک سیر اور زیادہ۔ میں بھی بائیس سیر گلاب جامن سپوٹ کر چپ چاپ لوٹ آیا۔ میرے لیے جیسے بیس سیر ویسے بائیس سیر۔

اسی طرح پانچ رانیوں کے یہاں کھانے کے بعد اب چھوٹی رانی کی باری تھی۔ اسی چھوٹی رانی کے یہاں ایک حادثہ ہوگیا۔ چھوٹی رانی نے پچیس سیر گلاب جامن کھلایا۔

کھانا پینا ختم کرنے کے بعد، جب میں ہاتھ دھو کر لوٹنے والا تھا۔ مجھے لگا چھوٹی رانی کچھ کہہ رہی ہے۔

"پان لیجیے بابو صاحب!"

ہائے۔ کانوں میں جیسے حلاوت سی گھل گئی۔ بے حد میٹھی سریلی آواز۔ کسی دوسری رانی کی آواز اتنی میٹھی نہیں تھی۔ مجھے لگا چھوٹی رانی شاید دیکھنے میں بھی سب سے زیادہ خوب صورت ہے۔ اس کی آواز کے سہارے ہی میں نے ان کی جھلک بھی پالی۔

پان کا بیڑا منہ میں ڈالنے ہی والا تھا کہ پھر وہی آواز سنائی دی۔ "یہاں نہیں باہر جا کر اسے کھول کر دیکھیے گا بابو صاحب۔"

اتنا کہہ کر وہ چلی گئی۔ جاتے جاتے اس نے باندی کو آواز دے کر مجھے باہر تک چھوڑ آنے کو کہا۔

باہر آنے پر میری پٹی کھول دی گئی۔ اپنے کمرے

میں آکر میں نے وہ پان کا بیڑا کھول ڈالا۔ بیڑے میں ایک ٹکڑا کاغذ، میں تو سن۔ پان کے بیڑے کے اندر تہ کیا ہوا کاغذ۔ میں نے کاغذ کھول کر دیکھا۔ کاغذ پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ حضور! لکھنے پڑھنے کی بات تو دور، اپنا نام تک نہیں لکھ سکتا۔ اب کس سے پڑھوانے جاؤں؟ اس میں آخر کیا لکھا ہے؟ اگر کہیں کوئی بھید کی بات ہو؟ میں نے وہ کاغذ موڑ کر اپنی فتوہی میں رکھ لیا۔ پتا نہیں کب کسی کی نظر پڑ جائے۔

اس دن ٹھاکر صاحب نے پوچھا۔ ''کیوں، سارا کھا لیا تھا ناں پانڈے؟''

''جی ہاں حضور......''

ٹھاکر صاحب خوش ہو گئے۔ ''شاباش استاد جیتے رہو۔''

⊘⊘⊘

رات کو اپنے کمرے میں لوٹ کر میں نے وہ خط نما پان کا بیڑا دوبارہ کھولا۔ سیاہی سے لکھے ہوئے کچھ الفاظ۔ میرے لیے ان کا کوئی مطلب معنی نہیں۔ حضور! اس دن میں پہلی بار رویا تھا۔ مجھے بار بار یہ احساس ہوتا رہا کہ میں نے لکھنا پڑھنا کیوں نہیں سیکھا۔ اب بھلا میں اس خط کا کیا جواب دوں؟ جواب مانگا بھی ہو تو مجھے لکھنا کہاں آتا ہے۔ میں وہ خط اپنی جیب میں رکھے رکھے سو گیا۔ اگلا دن بھی گہری سوچ میں گزر گیا۔ مجھے کوئی کل کنارا نہیں ملا۔ بس میں سوچتا رہتا۔ کبھی کبھی یہ خیال بھی آتا کہ آخر اس خط میں کیا لکھا ہوگا۔ ضرور کوئی راز کی بات ہے۔ اتنا تو سمجھ میں آ گیا تھا۔ راج محل کی رانی نے پان کے اندر کوئی خط دیا ہے۔ اس میں کوئی معمولی بات نہیں ہو سکتی لیکن کون پڑھ دے گا اس خط کو؟

جیسے جیسے دن گزرتے گئے، میں فکر میں گھلتا گیا۔ ہر وقت گھبراہٹ سے میری چھاتی دھڑکتی رہتی۔ اگر کہیں ایک اور خط آ پہنچا تو؟ کیا کہوں گا...... اب پیٹ میں بھوک کی ویسی آگ بھی نہیں بھڑکتی تھی۔ من مزاج، طبیعت، دماغ، سب چوپٹ۔

ٹھاکر صاحب نے میرا دنوں دن سوکھتا ہوا چہرہ دیکھ کر دریافت کیا۔ ''کیوں طبیعت تو ٹھیک ہے ناں پانڈے جی؟''

میں ٹھاکر صاحب کے منشی کے سامنے جا کر گڑگڑایا۔

''مجھے تھوڑا سا لکھنا پڑھنا سکھا دیں گے منشی جی؟''

منشی جی ہنس پڑے۔ انہوں نے پوچھا۔ ''اس کے بجائے اگر تم مجھے اپنا ہنر سکھا دیتے......''

اب کیا کروں؟ میں خود ہی بازار جا کر ہندی کی پہلی کتاب خرید لایا۔ میں نے سیکھنے کی بہت کوشش کی حضور، بہت مشکل کام تھا۔ یہ اپنے آپ نہیں سیکھی جا سکتی۔ پھر میں نے خط کے لفظوں کے ساتھ...... کتاب کے لفظ ملا کر پڑھنے کی کوشش کی۔ شاید کچھ سمجھ میں آئے۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ دن رات وہ خط اپنے سینے سے چپکائے، میں بھگوان کو یاد کرتا رہا۔ اس سے پہلے اپنی زبان پر بھگوان کا نام لانے کی کبھی ضرورت نہیں پڑی۔ زندگی میں پہلی بار میں بھگوان کو یاد کر رہا تھا۔

رات کے وقت جب پورا شہر نیند میں بے ہوش ہو جاتا۔ کہیں کوئی آہٹ سنائی نہ دیتی۔ اس وقت بھی صرف میں جاگتا رہتا تھا۔ اکثر میں اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کر آسمان کی طرف ٹکٹکی لگائے بھگوان کو ڈھونڈتا رہتا۔ شاید ان کے درشن پا جاؤں۔ خیر بھگوان کا درشن اگر اتنا ہی آسان ہوتا تب تو کوئی بھی پریشانی نہیں تھی۔ مجھے معلوم تھا، میں کتنے پانی میں ہوں۔ مجھ میں ایسی کوئی خوبی نہیں۔ نہ میرے پاس روپے پیسے، نہ روپ جوانی، نہ باڑی گاڑی، یہاں تک کہ لکھنا پڑھنا بھی نہیں جانتا تھا۔

خیر اس رات بھی کھڑکی کے پار آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اچانک میری نگاہ ٹھاکر صاحب کے محل پر جا پڑی۔ آسمان چھوتی ہوئی حویلی۔ بالکل دھندلی پر چھائیں۔ ٹھاکر صاحب کے خاص محل میں روشنی ذرا دیر سے بجھائی جاتی ہے۔ ان دنوں راجا صاحب کی جو خاص رانی ہوتی، اسی کی قسمت بلند ہوتی۔ دو مہینے تک وہی اپنے پیا کی سہاگن بنی رہتی۔ باقی رانیوں کا محل اس وقت اندھیرے میں ڈوبا ہوتا۔ اتنی دور سے ہی میں آنکھ پھاڑ کے اس وسیع راج محل کی طرف دیکھتا رہتا۔ اس محل کے کسی کمرے میں کوئی اپنے خط کے جواب میں امید باندھے بیٹھا ہوگا۔ میرا من ہوتا، کاش آسمان کے ستاروں میں اس خط کے لفظ روشن ہو جاتے تو ان کا مطلب سمجھنا آسان ہو جاتا۔ لیکن ہر وقت سر بھنایا رہتا۔ نربدا پرساد ہمیشہ کی طرح کبھی شکار پر، کبھی پکنک پر نکل جاتے۔ اکثر ہم سب بھی ان کے ساتھ ہوتے، ہم سب یار دوستوں کی جماعت ان کے فرصت کے لمحوں میں اپنے کرتب دکھا دکھا کر ان کی دل بستگی کرتے، زندگی میں خوشی لانے کے لیے ہی تو ہمیں ملازم رکھا گیا تھا۔

اس بار ہردوار میں کنبھ میلا تھا۔ اس میلے میں ہم بھی گئے تھے۔ نربدا پرساد کا تنبو تن گیا۔ اس دل میں، میں بھی شامل تھا۔ بابو لوگ ٹھاکر صاحب کو گھیر کر گانے بجانے

میں مشغول تھے۔ میں بھی دن بھر وہیں رہتا اور کام کاج میں جتا رہتا تھا۔ لیکن وہاں بھی اس خط کی بات ایک پل کو بھی نہیں بھول پایا۔ بیچ بیچ میں، میں اسے ٹٹول کر دیکھ لیتا۔ مجھے کسی ایسے آدمی کی تلاش تھی جس سے وہ خط پڑھوا سکتا اور جو میرے راز کو راز بھی رکھتا۔ لیکن ایسا بھروسے دار آدمی آخر کون ہے؟ آخر کس سے میں اپنے من کی باتیں بتانے جاؤں؟

چاروں طرف سادھو سنیاسیوں کا جمگھٹ۔ پورے ہندوستان بھر سے سادھو آئے تھے۔ ہر وقت دھونی جلتی رہتی۔ ایک طرف بڑے بڑے لاؤڈ اسپیکروں سے گیتا پاٹھ کی آواز، دوسری طرف گراموفون پر بھجن۔

پھیری والے گھی میں گرم گرم پوریاں اور جلیبیاں اتارتے رہتے اور آوازیں بھی لگاتے رہتے۔

کسی سادھو بابا کو گھیر کر اس کے چیلے چانٹے گانجے کے دم لگا رہے تھے۔ سادھو بابا راکھ ملے بیٹھے تھے۔ انہیں دیکھ کر اچانک من میں یہ بات آئی کہ کاش میں بھی ان کی طرح کوئی سادھو سنت ہوتا۔ کاش میں بھی سب کچھ تیاگ پاتا۔ پاپی پیٹ کی خاطر جھوٹ موٹ ٹھاکر صاحب کی نوکری کرتا ہوں۔ چونکہ وہ جلیبی، لڈو کھلاتے ہیں۔ اس لیے ان کے یہاں چاکروں کی طرح پڑا رہتا ہوں۔ معمولی سے معمولی کیڑے مکوڑے بھی آزاد زندگی جیتے ہیں۔ ایک یہ لوگ ہیں کسی کی پروا نہیں کرتے۔ انہیں کپڑے لتوں کی ضرورت ہے نہ مالش کے لیے تیل پھلیل کی۔ کسی بات کے لیے یہ کسی کے محتاج تو نہیں رہتے۔ کھانا مل گیا تو کھا لیا ورنہ فاقہ۔ ایک میں ہوں۔ ہر وقت کھانے کے لیے رال ٹپکاتا رہتا ہوں۔ پیٹ ہے یا کنواں کبھی بھرتا ہی نہیں۔

میں بھی سادھوؤں کے جتھے میں جا بیٹھا۔ وہ مجھے چمٹا لے کر مارنے دوڑے۔ ''بھاگ بیٹا بھاگ یہاں سے۔ چل بھاگ۔''

میں وہاں سے ہٹ آیا لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری۔

اب میں روزانہ سادھوؤں کی منڈلی میں بیٹھنے لگا۔ صبح شام رات، ہر وقت وہاں پڑا رہتا۔ اپنے ساتھ تھوڑا بہت کھانا بھی لے جاتا۔ بالائی یا دہی یا آتا۔ کچھ نہ کچھ لے ہی جاتا۔ ان سادھوؤں کو چڑھاوا دیتا لیکن پھر بھی کسی کا من منہ نہیں ملا۔ وہ لوگ جب بھجن گاتے میں تالی بجاتا، تال دے دے کر سر ہلاتا۔ کبھی کبھی ان کے سر میں سر ملا کر گانے کی بھی کوشش کرتا۔ میں گاتے گاتے مست ہو جاتا۔ میری طرف دیکھنے کی کسی کو فرصت بھی نہیں تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں چپ چاپ لوٹ آتا اور ٹھاکر صاحب کے تنبو میں گھس جاتا۔ تنبو

میں ٹھاکر صاحب اپنے یار دوستوں کے ساتھ گانے بجانے اور کھانے پینے میں لگے رہتے۔ سب کی آنکھیں لال لال، وہاں بھی مجھ پر کسی کی نگاہ نہیں پڑتی تھی۔

⁂

اس دن سب سے چھپ چھپا کر، رات کے وقت میں تنبو سے باہر نکلا۔ رات کافی جا چکی تھی۔ شاید دوسرا پہر بیت رہا تھا۔ میں پیدل ہی اکیلے اکیلے سادھوؤں کے اڈے پر جا کر حاضر ہوا۔ اس وقت سب سو چکے تھے۔ اکیلے سادھو مہاراج الاؤ کے سامنے بیٹھے بیٹھے بھگوت گیتا پڑھ رہے تھے۔

مجھے دیکھ کر سادھو جی نے پوچھا۔ ”کون ہو تم؟“

میں نے بتایا۔ ”میں دامودر پانڈے ہوں بابا۔ براہمن ہوں۔“

سادھو بابا نے جلتی ہوئی دھونی میں سے ایک چٹکی راکھ نکال کر میرے ہاتھ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”لے بھاگ۔“

مجھے اسی طرح بیٹھا دیکھ کر سادھو بابا نے دوبارہ سوال کیا۔ ”بچہ کچھ اور چاہیے؟“

میں نے کہا۔ ”تھوڑی سی کرپا چاہیے بابا۔“

سادھو بابا کو شاید مجھ پر ترس آ گیا۔ انہوں نے کہا۔ ”بول...... جلدی بول بچہ۔“

میں نے کہا۔ ”ایک خط پڑھ دینا ہوگا بابا۔ میں لکھنا پڑھنا نہیں جانتا۔ ان پڑھ آدمی ہوں۔“

سادھو نے کہا۔ ”کیسا خط؟ کس کا خط؟ اچھا جا لے آ۔“

میں نے خط نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ لیکن خط غائب تھا۔ سامنے اگل بغل ساری جیبیں دیکھ ڈالیں۔ میں بوکھلا گیا۔ چپا چپا ڈھونڈ ڈالا۔ ساری جیبیں الٹ ڈالیں، بیکار۔ خط آخر گیا کہاں؟ میرا خون کھول گیا۔ ایسی انمول امانت، دن رات اپنے سینے سے چپکائے گھومتا رہا۔ جب ضرورت پڑی اور پڑھ سکنے والا ملا تو گم گیا۔ میں جانے کیسے کیسے خیالوں میں بھٹک گیا۔ جب اپنا کرتا دھو رہا تھا تب میں نے وہ خط اپنے نیفے میں ٹھونس لیا تھا۔ جب گیلا کرتا سکھا کر دوبارہ پہنا تب اس خط کو دوبارہ اپنی جیب کے حوالے کیا۔ آخر گیا کہاں؟ اب کیا کروں؟ کہیں تنبو میں ہی تو نہیں گر گیا؟ رات کو تنبو بھی چھان مارا۔ اندھیرے میں کہیں کسی کی آنکھ نہ کھل جائے۔ اس کا بھی ڈر تھا۔ کہیں کسی نے چرا تو نہیں لیا۔ کسی نے پڑھ تو نہیں لیا؟ تب تو وہ خط کا مطلب بھی جان گیا ہوگا۔ ساری رات خط کی فکر میں جاگتے ہوئے کٹ گئی حضور۔ مجھے نیند ہی نہیں آئی۔ اگلے پل سب بھاؤ رونا آنے لگا۔ اگر میں خود لکھ پڑھ سکتا تو ایسا نہ ہوتا۔ رونے کے باعث میری چھاتی تنگ تنگ ہو گئی۔“

⁂

اپادھیائے نے تھوڑا دم لے کر کہا۔ ”اس طرح پانڈے سے وہ خط گم ہو گیا۔ جب سادھو منڈلی اپنا خیمہ اکھاڑ کر جانے لگے تو جانے کیا سوچ کر وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے ہولیا کیونکہ اب راج محل میں لوٹ کر کیا کرتا تھا۔ اسے اپنی زندگی پر افسوس ہونے لگا۔ اس نے من ہی من میں فیصلہ کر لیا۔ اب وہ ٹھاکر صاحب کے تنبو میں لوٹ کر نہیں جائے گا۔ وہاں جا کر پھر وہی خوشامد یا مصاحبی۔ خوشامد اگر کرنی ہی ہے تو بہتر ہے وہ بھگوان کی خوشامد کرے تاکہ کچھ سوجھ بوجھ حاصل ہو۔ ذرا دین دھرم کا پتا چلے۔ پتا ہے بابو جی بڑے بڑے لوگوں کی زندگی میں کوئی اہم موڑ شاید ایسا ہی آتا ہے۔ بابا تلسی داس کی زندگی بھی شاید ایسے ہی بدل گئی تھی۔

خیر صاحب سادھوؤں کے دل میں پانڈے رام بس تو گئے لیکن سادھو بابا کے چیلے بھلا اسے اپنے ساتھ کیوں لینے لگے۔ وہ تو اسے چمٹا اٹھا کر مارنے دوڑے لیکن اس نے ساتھ نہیں چھوڑا۔ وہ لوگ ریل پر سوار ہوئے۔ دامودر بھی ان کے ساتھ ساتھ ڈبے میں بیٹھ گیا۔ کسی کی اچانک اس پر نظر پڑی۔ دامودر دل ہی دل میں طے کر چکا تھا۔ اب وہ باقی زندگی ان سادھوؤں کے اکھاڑے میں رہ کر مذہب کو سمجھنے لگا۔ خیر صاحب ٹرین چلتی رہی۔ اسٹیشن پیچھے چھٹتے رہے۔ سادھو لوگ گانجے کا دم لگانے بیٹھ گئے۔ لوگ باگ ان کے لیے طرح طرح کے پکوان لے آئے۔ وہ لوگ پکوان اڑانے میں جٹ گئے صاحب۔ ہوا یہ کہ دامودر کو بھی زوروں کی بھوک لگ گئی۔ بھوک بھی کوئی ایسی ویسی بالکل شیطانوں جیسی بھوک۔ سامنے پھیری والوں کو چکر لگاتے دیکھ کر اس کی آنکھوں تک میں بھوک لپلپا اٹھی۔ بھوک کے مارے زبان اینٹھنے لگی۔ اس نے دھوتی سے پیٹ کو کس کر باندھ لیا۔ تاکہ بھوک کی آگ کچھ کم ہو سکے لیکن بھوک کو بھلا جھانسا دیا جا سکتا ہے۔ اس کا نام دامودر تھا حضور۔ پیٹ کی بھوک بھلا وہ کیسے بھول پاتا۔

دامودر پانڈے شاید اسی طرح سادھوؤں کے پیچھے پیچھے کیدار ناتھ، بدری ناتھ یا نیپال تبت پہنچ جاتا۔ لیکن بے چارہ اجمیر اسٹیشن پر پکڑا گیا۔ چیلوں کی نظر پڑ گئی۔ فالتو سا آدمی سنگ لگ لیا تھا۔ سب نے مل کر اسے زور زبردستی اجمیر جنکشن پر اتار دیا۔ دنیا میں کون ایسا شخص ہے جو بھگوان کے بھید سمجھ سکے۔

انجان، اجنبی جگہ، خیر تیرتھ یاتریوں کے ساتھ چلتے چلتے ایک دن وہ ٹھاکر جی کے علاقے میں جا پہنچا۔ پھر وہی جنس کا قفس۔ پھر وہی پیٹ کی فکر۔ پشکر جی پہنچ کر کھانے کے بجائے گاؤں گھاٹ پر ڈھیروں پانی گٹک گیا۔ پانی پی کر اس نے سو جانے کی کوشش کی۔ وہ گھاٹ کنارے ہی سو گیا۔ جانے کس نے آکر اسے جگایا۔ یہاں کیوں سوئے ہو؟ یہاں بچھو کاٹ کھائے گا یا مگرمچھ نگل جائے گا۔ وہ اٹھ کر راستے پر آنکلا۔

پشکر تیرتھ کو دنیا کا بڑا تیرتھ سمجھا جاتا ہے۔ آپ تو پڑھے لکھے ہیں۔ آپ تو سب جانتے ہی ہیں یہاں ہر روز پنجابی، سندھی، گجراتی، مراٹھی، بنگالی بھی ذاتوں کے لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ یہاں آکر لوگ پوجا چڑھاتے ہیں، چیزیں دیتے ہیں۔ گئو دان بھی کرتے ہیں۔ پشکر جی میں تیرتھ یاتریوں کی کمی نہیں، ہر مہینے ہزاروں لوگ پشکر تالاب میں جے پشکر جی کی جے، کہہ کر پانی میں ڈبکیاں لگاتے ہیں

دامودر پانڈے بھی ان یاتریوں کے پیچھے پیچھے لگا رہا۔ سویرا ہوتے ہی بس اور تانگوں کے اڈوں پر حاضری بھرنے لگا۔ اس نے وہاں کے پانڈوں سے بھی ہاتھ ملایا۔ یاتریوں سے ملی ہوئی رقم میں سے آدھا حصہ ان کا۔

روز راستے میں کھڑے ہوکر وہ آوازیں لگاتا۔ براہمن ہوں حضور! براہمن کو بھی کچھ بھوجن کے لیے دیا جائے حضور!

بھگوان کی لیلا دیکھیے، اسی طرح دن گزرتے رہے۔ جانے کتنے دن گزر گئے۔ مہینے سال بیت گئے۔ دامودر نے کوئی حساب نہیں رکھا۔ اس بار کوئی زمیندار صاحب تیرتھ پر آئے تھے۔ پانڈا مہاراج نے خبر بھیجی۔ کل دھرم شالا میں موجود رہنا۔ پانڈے، براہمن بھوجن ہوگا......

دامودر پانڈے ٹھاکر صاحب کا دیا ہوا نا گرہ جوتا اور سلک کی پگڑی جمائے حاضر ہوا۔ وہاں بھر پیٹ پوری ترکاری، لڈو ملائی کھانے کے بعد اس نے دان میں ملی ہوئی آدھی رقم پانڈے مہاراج کو تھمادی اور اپنے گھر لوٹ آیا۔ خیر، دن کسی طرح گزرتے جا رہے تھے اچانک پھر ایک واقعہ ہوا۔

''اسے بھگوان کی لیلا نہیں تو اور کیا کہوں بابو جی......''

اپادھیائے پل بھر کو پھر چپ ہو رہا۔ اچانک اس نے پوچھا۔ ''کتنی رات ہوگئی۔ آپ کو سونے میں دیر تو نہیں ہو رہی بابو جی؟''

میں نے کہا۔ ''نہیں نہیں، آپ کہتے جائیے۔''

اپادھیائے نہیں جانتا کہ میں اتنی دور تیرتھ کرنے نہیں آیا۔ یہاں سچی کہانیاں سننے آیا ہوں۔ راجستھان کی گلیوں میں نئی نئی شکلیں دیکھنے کو ملیں گی۔ اس لیے تو اتنی تکلیف اٹھا کر آیا ہوں۔ اپنے جیوتشی دوست کی پیش گوئی کے باوجود میں کوئی حل نہیں نکال سکا اور نہ ہی دولت سمیٹنے میں کامیاب ہوسکا۔

اپادھیائے نے کہا۔ ''سنیے پانڈے کی زبانی جیسا سنا، وہی بتاتا ہوں۔''

٭٭٭

پانڈے نے گانجے کا دم لگانے کے بعد کہنا شروع کیا۔ ''ایک دن پانڈا مہاراج آکر مجھے خبر دے گئے کہ رائے گڑھ کے ٹھاکر صاحب آئے ہیں۔ دھرم شالا میں ٹھہرے ہیں۔ براہمن بھوجن کرائیں گے۔ تم ٹھیک وقت پر پہنچ جانا۔

میرا من بے چین ہوگیا۔ وہی رائے گڑھ کے ٹھاکر صاحب نربدا پرساد۔ وہ پشکر تیرتھ پر آئے ہیں۔ ان کا ہی دیا ہوا ناگرہ جوتا، پگڑی پہن کر میں ان کے یہاں حاضر ہوا۔ پشکر کا ہر براہمن وہاں موجود تھا۔ دھرم شالا میں کافی شور و غل مچا تھا۔ پورے پانچ سو براہمن اکٹھے تھے۔ مہاراج کا حکم تھا، جو جتنا کھا سکے اطمینان سے کھائے۔ پوری دھرم شالا میں ٹھاکر صاحب کے آدمی بھرے ہوئے تھے...... میں جا کر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ کھانے کا بلاوا آپہنچا۔ مجھے صرف یہی ڈر تھا کہ کہیں ٹھاکر صاحب سے ٹکراؤ ہو گیا تو میں کیا کہوں گا؟

میں کھانے بیٹھا۔ وہاں پہلے کی طرح ملائی، بڑے، گلاب جامن، مال پوری، پوری ترکاری، سب نے پیٹ بھر کے کھایا لیکن ٹھاکر صاحب نربدا پرساد نہیں دکھے۔ میں بس یہ جاننا چاہتا تھا کہ ان کے ساتھ چھوٹی رانی بھی تشریف لائی ہیں یا نہیں۔

سب کھا کھا کر اٹھ گئے۔ میں اس وقت بھی پترل کے سامنے ڈٹا رہا۔ میرا پیٹ مانو بھرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ بہت دنوں بعد ایسا پکوان ملا تھا۔

مجھے بار بار لگ رہا تھا۔ ابھی نربدا پرساد آکر کہیں گے۔ ''ارے! تم پانڈے جی ہو ناں؟ دامودر پانڈے؟'' لیکن کہیں کچھ نہیں ہوا۔ کھانے کا سارا انتظام پانڈے مہاراج نے ہی کیا تھا۔ ٹھاکر صاحب باہر بھی نہیں آئے۔ خیر میں کھانا کھا کر اٹھ گیا لیکن گھر نہیں گیا۔

وہاں چپ چاپ کھڑا رہا۔ اچانک منشی جی سے ٹکر

ہوگئی۔ ''ارے تم پانڈے جی؟''

میں نے پوچھا۔ ''منشی جی! ٹھاکر صاحب نہیں آئے؟''

منشی جی نے جواب دیا۔ ''ناں۔ وہ تو سورگ چلے گئے۔ ان کے بیٹے اور بیوہ رانیاں آئی ہیں۔''

مجھے مانو چین نہیں آیا۔ میں کچھ اور سننے کو بھی بے چین تھا۔

میں نے دوبارہ پوچھا۔ ''سبھی رانیاں آئی ہیں؟''

''ہاں، مہارانی جی اور باقی پانچ رانیاں۔''

''پانچ کیوں...... رانیاں تو چھ تھیں؟''

''لیکن ایک رانی تو چل بسی۔ چھوٹی رانی، تمہیں نہیں معلوم؟''

''کون سی رانی؟''

''چھوٹی رانی نے خودکشی کرلی۔ سات برس پہلے، یہ سب کیا آج کی باتیں ہیں۔ پچھلے سال راجا صاحب بھی جنگل میں شکار کھیلتے ہوئے رام کو پیارے ہوگئے۔''

''سات...... برس...... میں نے من ہی من حساب لگایا۔ مجھے بھی پشکر جی آئے سات برس ہوگئے تھے۔

میں اسی وقت وہاں سے چل پڑا حضور! پیدل پیدل چلتے چلتے پشکر جی سے اجمیر چلا آیا۔ اس کے بعد ساری رات مسافر خانے میں گزار کر صبح ٹرین پر سوار ہوگیا۔ یہاں آبو پہاڑ چلا آیا۔

سب جھوٹ موٹ کی دنیا ہے۔ اسے تیاگ کرنا ہوگا۔ بھوک پیاس، سب کچھ، یہی سب فساد کی جڑ ہے۔''

٭٭٭

میں نے پوچھا۔ ''اس کے بعد؟''

اپادھیائے نے بتایا۔ ''اس کے بعد دامودر پانڈے تری پانند جی کے اکھاڑے میں گانجے کا دم لگانے لگا۔ ہر وقت سنکھیا کے نشے میں دھت۔ وہ اپنی بھوک بھلانا چاہتا تھا۔ ہاں وہ پیٹ کی بھوک بھلا کر کوئی ایسی چیز چاہتا تھا جس کو حاصل کرنے کے بعد کسی طرح کی بھوک پیاس نہیں رہتی۔ آپ کے ہی بنگال کے تھے، لٹو مہاراج...... آپ نے ان کا نام نہیں سنا؟ جگن ناتھ مہاراج نے خود انہیں درشن دیے تھے۔ لٹو مہاراج بھی پنڈت تھے۔ جگن ناتھ مہاراج نے انہیں اجازت دی تھی کہ جو ملے سب کھانا سب کھانا، سب ہضم ہوجائے گا۔

تری پانند نے ایک دن دامودر کو بلا بھیجا۔

انہوں نے کہا...... ''کیا مانگتا ہے بیٹا؟''

پانڈے نے کہا۔ ''پربھو! میں بھوک کی آگ میں جلتا رہتا ہوں۔ میری بھوک بھلا دیجیے۔''

تری پانند نے کہا۔ ''جا اب تو بے فکر ہوکر کھاتا رہ۔ لوگ پوجا کرتے ہیں، تیرے لیے بھوجن ہی سب سے بڑی اور اصل پوجا ہے۔ جا بیٹا، جو تو چاہتا تھا تجھے دیا۔''

پانڈے نے ان کی باتوں کا کیا اندازہ لگایا وہی جانے۔ جب میں اس دھرم شالے کا منیجر بحال ہوا تو اسے بھی ساتھ لیتا آیا۔ یہاں وہ کچھ نہیں کرتا صرف بھوجن کرتا ہے۔ یہی اس کا بھجن بھوجن ہے، یہی اس کی پوجا پاٹھ اور نوکری پیشہ۔ کسی رانی کا دل موہ لینا کوئی معمولی بات ہے صاحب! جو اس قسم کی تمام خواہشوں، اندر کے تمام دشمنوں کو ختم کر پاتا ہے، اسے سب کچھ مل جاتا ہے۔

اچھا اب سونے جائیے۔ کافی رات ہوگئی ہے...... کتنے بج گئے ہوں گے کون جانے؟''

میں نے پوچھا۔ ''اور اس خط کا کیا ہوا، چھوٹی رانی کا خط؟''

اپادھیائے نے کہا۔ ''ارے وہ خط تو محض ایک بہانہ ثابت ہوا جس کی وجہ سے اس نے بھگوان کو پالیا تھا۔ لالہ بابو کو ہی لے لیں۔ جس دن انہیں بھگوان مل گئے۔ اسی دن سے ان کا راج پاٹھ، بیوی بچے، عیش عشرت سب چھوٹ گئے...... لٹو مہاراج جس دن......''

٭٭٭

اگلی صبح دامودر پانڈے بھوجن کرنے کے لیے آپہنچا۔ میں نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ میرا اندازہ تھا۔ اپنی جوانی کے دنوں میں وہ خاصا خوب صورت رہا ہوگا۔ چھ فٹ لمبا قد، گٹھا ہوا بدن، خوب صورت رنگ...... لیکن میں اسے کسی خاص نظر سے پڑھ رہا تھا۔

اس نے بڑے اطمینان سے بھوجن کیا۔ مانو یہ بھوجن ہی اس کی زندگی کا اصل مقصد ہو۔ پجاری جیسے دیوتا کے پرساد کی عزت کرتا ہے۔ وہ بھی اسی طرح خلوص کے ساتھ بھوجن کرتا رہا تھا۔ ویسا ہی اعتماد۔

جاتے وقت دامودر پانڈے نے کہا۔ ''بھگوان کرے آپ کا منگل ہو بابو صاحب! کلیان ہو۔''

لیکن مجھے اپنے جیوتشی دوست کی بات یاد ہے۔ میری قسمت کا ستارہ گردش میں ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی میں یاترا پر نکل پڑا تھا۔ مجھے کون سی دولت ملی، یہ نہ اپادھیائے جان پایا نہ دامودر پانڈے۔

نظریۂ حیات

نشور ہادی

"اپنی مرضی سے اپنی زندگی جینے کا حق ہر انسان کو ہے" اگرچہ یہ ایک اچھا مگر کچھ جذباتی سا جملہ ہے لیکن... جب اس پر مکمل عمل درآمد کا وقت آتا ہے تو اصل حقیقت کُھل کر سامنے آجاتی ہے اور سوچ کی مضبوط دیواروں میں بھی دراڑ پڑجاتی ہے کیونکہ جب یہ جملہ صرف اپنی ذات کے بارے میں کہا اور سوچا جائے تو نتائج بڑے خوشگوار اور... جب دوسروں کی ذات کے بارے میں کہا جائے تو انجام بہت دلدوز ہوتا ہے... گویا جب دل چاہے ہم نے کسی کے ساتھ وفا نبھائی اور جب من کرتا دغا کا داغ لگا کر کسی کا بھی دامن میلا کر دیتے... اس کا مطلب واضح طور پر یہی نکلتا ہے "یعنی ہر شخص اپنی مرضی سے اپنی زندگی جینے کا حق وصول کر رہا ہے" لیکن اگر... باہمی محبت اور مفاہمت کے اصولوں پر عمل کیا جائے تو زندگی کی سمت ہی بدل جاتی ہے گویا کچھ لو اور دو کے اصول پر عمل کیا جائے تو زندگی پھوار کے مانند محسوس ہونے لگتی ہے۔ یہ فارمولا بہت دیر بعد اس پر اپنی حقیقت واضح کر سکا۔ جو لوگ اپنی ذات کے حصار میں کسی اور کو داخل نہیں ہونے دیتے وہ کسی کے دل تک رسائی بھی حاصل نہیں کر پاتے۔ وہ جو نظر کے فریب کا شکار تھی اسے منظر کے بدل جانے کا یقین نہیں تھا۔ اسے تو بس رشتوں کی ڈوری میں گرہیں لگانے کا جنون تھا۔ خواہ ڈوری کتنی ہی تنگ پڑ جائے اسے پروا نہ تھی۔

تنگ نظری اور روشن خیالی کے درمیان کھڑی ایک حسینہ کی خوش گمانیوں اور غلط فہمیوں کا عذاب

عادل کو ریلوے اسٹیشن پر پہنچنے میں دیر ہو گئی تھی۔ وہ جب پلیٹ فارم میں داخل ہوا تو ٹرین نہ صرف حرکت میں آچکی تھی بلکہ اس کی رفتار میں اضافہ بھی ہوتا جا رہا تھا۔ عادل ایک ہاتھ میں بریف کیس سنبھالے ٹرین کی طرف دوڑا۔ جب وہ ٹرین کے قریب پہنچا تو اس نے محسوس کیا کہ اب ٹرین کی رفتار مزید بڑھے گی تو وہ کسی بھی بوگی میں سوار نہیں ہو سکے گا لہٰذا جس بوگی کا دروازہ اس کے سامنے سے گزرنے والا تھا، وہ دوڑتے ہوئے اسی میں سوار ہو گیا اور پھر دروازے ہی پر رک کر اپنی چڑھی ہوئی سانسیں درست ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

اس نے دیکھا کہ وہ جس بوگی میں سوار ہوا تھا، وہ ایئر کنڈیشنڈ یا فرسٹ کلاس کی بوگی تھی۔ وہ اس کی چار پانچ فٹ کی راہداری میں کھڑا تھا۔ راہداری کی بائیں جانب چار کمپارٹمنٹس کے دروازے تھے جو فرسٹ کلاس یا ایئر کنڈیشنڈ کمپارٹمنٹس ہو سکتے تھے۔ عادل کے پاس ایئر کنڈیشنڈ کا ٹکٹ تھا لیکن اب اگلا اسٹیشن آنے تک اسے بہرحال اسی بوگی میں رکنا تھا خواہ وہ ایئر کنڈیشنڈ نہ ہوتا۔

ٹرین تیز رفتاری سے فراٹے بھرنے لگی تھی جب عادل نے قریب کے کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر اس کمپارٹمنٹ کے مسافر پورے ہوں گے تو دروازہ اندر سے بند ہوگا۔ اس کے بعد وہ باقی تینوں کمپارٹمنٹس کو آزماتا اور اگر ان کے دروازے بھی اندر سے بند ملتے تو اسے راہداری ہی میں کھڑے رہ کر سفر کرنا پڑتا لیکن اس کی پہلی ہی کوشش بارآور ہوئی۔

دروازہ کھلتے ہی اسے ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ وہ کمپارٹمنٹ ایئر کنڈیشنڈ ہی تھا۔ جس میں صرف ایک عورت سفر کر رہی تھی جبکہ ان کمپارٹمنٹس میں چھ یا کم از کم چار برتھ ہوتی تھیں۔ یعنی چار یا چھ مسافر سفر کر سکتے تھے۔

عورت فولڈنگ ٹیبل پر رکھے ہوئے گلاس میں تھرماس سے کوئی مشروب انڈیل رہی تھی۔ اس کا رخ تھرماس اور گلاس کی طرف ہونے کے باعث اس کا سر

دروازے کی طرف تھا۔ اس کے گھونگریالے ہنی کلر بال بھی اس کا چہرہ چھپائے ہوئے تھے۔

''سوری!'' عادل کے منہ سے نکلا۔

وہ کمپارٹمنٹ سے نکل آنا چاہتا تھا مگر اسی وقت عورت نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ عادل چونکا اور جہاں تھا، وہیں ساکت ہو گیا۔ کچھ ایسی ہی کیفیت اس عورت کی بھی ہوئی تھی۔

اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہو سکتی تھی۔ اس کے نقوش دل آویز اور جسامت نہایت متناسب تھی۔ ہلکے گلابی رنگ کی سادہ سلکن ساری کے باعث اس کی شخصیت پروقار بھی نظر آ رہی تھی۔ کانوں میں چھوٹے چھوٹے ٹاپس تھے۔ دائیں ہاتھ کی کلائی میں سنہری گھڑی تھی۔ بائیں کلائی میں کچھ نہیں تھا۔

''شمی۔'' عادل کے متحرک ہونے والے ہونٹوں کی آواز اتنی مدھم تھی کہ عادل خود بھی بہ مشکل سن سکا۔

''آؤ عادل!'' شمی خفیف سا مسکرائی۔

عادل نے آہستگی سے قدم بڑھایا۔

''دروازہ بند کر دو۔'' شمی بولی۔ ''میں نہ جانے کن خیالوں میں تھی کہ بند کرنا بھول گئی۔''

عادل دروازہ بند کر کے شمی کے سامنے کی برتھ کی طرف بڑھا۔ اس نے ایک اچٹتی سی نظر گلاس پر ڈالی اور سمجھ گیا کہ وہ کس قسم کا مشروب تھا۔

شمی تھرماس بند کر رہی تھی۔

عادل نے بریف کیس ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ ''تم دروازہ بند کرنا بھول گئی تھیں، اب تمہارے کیا احساسات ہیں۔ تمہاری یہ بھول اچھی ثابت ہوئی یا بری؟''

''سوال کو پیچیدہ کیوں بنایا ہے تم نے؟'' شمی کی مسکراہٹ اس مرتبہ خاصی گہری تھی۔

عادل دھیرے سے ہنس پڑا۔ ''تم بھی پیچیدہ جواب دے دو۔''

''نہیں، میں سیدھا ہی جواب دوں گی۔'' شمی نے گلاس اٹھاتے اور عادل سے نظریں چراتے ہوئے کہا، پھر گلاس ہونٹوں کے قریب لے جا کر ہاتھ روکتے ہوئے عادل کی طرف دیکھا۔

عادل نے محسوس کیا جیسے شمی کی بڑی بڑی آنکھوں میں ساون نے امڈنا چاہا تھا۔

''اچھا ہوا کہ میں بھول گئی تھی۔'' شمی نے کہا اور پلکیں گلاس کی طرف جھکا کر دو تین گھونٹ لے گئی۔ اس کی گھنیری پلکوں نے اس کی آنکھوں میں آتا ہوا ساون، چھپا لیا تھا۔

''مجھے تمہارا یہ جواب اچھا لگا۔'' عادل کی مسکراہٹ میں خفیف سی افسردگی تھی۔ ''اگر تم اس کے برخلاف جواب دیتیں تو......'' عادل کی آواز کانپ گئی اور شمی سے نظریں چرانے کے لیے وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اس کی پلکیں اتنی گھنیری نہیں تھیں کہ آنکھوں میں آیا ہوا ساون چھپا سکتیں۔

شمی نے گلاس فولڈنگ ٹیبل پر رکھ کر ٹشو پیپر سے اپنے ہونٹ خشک کیے۔ ''نعیمہ کیسی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ٹھیک ہے، خوش ہے، بس کبھی کبھی......''

''چپ کیوں ہو گئے...... کبھی کبھی؟''

عادل نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''کبھی کبھی...... یاد آ جاتا ہے کچھ...... تو...... اداس ہو جاتی ہے۔''

شمی کی آنکھوں میں ساون نے شاید پھر امڈنا چاہا تھا۔ اس نے جلدی سے گلاس اٹھایا اور ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ ٹشو پیپر سے ہونٹ خشک کیے، پھر وہی ٹشو جلدی جلدی دونوں آنکھوں پر بھی رکھا اور ہنس کر بولی۔ ''بیئر بہت ٹھنڈی ہے۔ ٹشو بھی ٹھنڈا ہو گیا۔ اس سے میں نے آنکھوں کو بھی ٹھنڈک پہنچائی۔''

عادل بے وقوف نہیں تھا کہ اصل بات نہ سمجھتا، تاہم وہ نظرانداز کر گیا اور بولا۔ ''بیئر کب سے پینے لگیں؟ وہسکی چھوڑ دی کیا؟''

''نہیں۔'' وہ دھیرے سے ہنسی۔

وہ جب بھی ہنستی تھی، عادل کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے گلابوں کے پیچھے موتیا مہکنے لگا ہو۔ اب بھی اسے یہی احساس ہوا تھا۔

شمی نے بات آگے بڑھائی۔ ''موسم آج کل اتنا گرم ہے کہ دن میں بیئر ہی پیتی ہوں البتہ رات کو......'' اس نے قریب رکھے ہوئے بیگ کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہسکی...... ایک بوتل ہے اس میں...... تمہارے لیے ایک......''

''نہیں۔'' عادل جلدی سے بول پڑا۔ ''تم جانتی ہو۔ پہلے بھی میں تمہاری خاطر ایک آدھ ڈرنک لے لیتا تھا۔ عادی کبھی نہیں رہا تھا اس کا، اور اب بھی نہیں ہوں۔''

''اب بھی...... میری ہی خاطر ایک ڈرنک لے لو۔''

''اچھا!'' عادل نے طویل سانس لی۔ ''تم چاہتی ہو تو...... کوئی حرج نہیں...... لیکن...... گلاس؟''

شمی ہنسی۔ ''گلاس تو ایک درجن ہیں اس وقت میرے پاس...... میں جس ہوٹل میں ٹھہری تھی، وہیں ایک شاپ پر نظر آئے تھے یہ۔'' شمی بیگ اٹھا کر کھولنے لگی۔ ''ڈیزائن مجھے

بہت اچھا لگا۔ خرید لیے تھے۔ اس وقت سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ اس وقت کام آ جائیں گے۔''

عادل کچھ نہیں بولا۔ وہ گم صم ہو گیا تھا۔

شمی گلاس دھو کر لائی۔ بیگ میں سے اس نے اعلیٰ درجے کی وہسکی کی بوتل نکالی جو ایک چوتھائی کے قریب خالی تھی۔ اس نے گلاس میں وہسکی کی کچھ مقدار نکال کر بوتل بند کر کے فولڈنگ ٹیبل پر ہی رکھ دی۔ بیئر کے تھرماس کے علاوہ ایک بڑا تھرماس اور تھا۔ شمی نے اسے کھول کر وہسکی کے گلاس میں پانی انڈیلا۔

''یہ بھی بالکل یخ ہے۔'' اس نے کہا اور پھر اس نے اپنا گلاس بھرنے کے لیے بیئر کا تھرماس اٹھایا۔ ''اوہ!'' وہ مسکراتے ہوئے رکی۔ ''اب تم میری خاطر ایک ڈرنک لے رہے ہو تو مجھے بھی تمہارا ساتھ دینا چاہیے۔'' اس نے تھرماس رکھ کر وہسکی کی بوتل اٹھائی اور اپنے لیے بھی ایک پیگ بنایا۔

عادل اب بھی گم صم تھا۔

''کیا سوچنے لگے!'' شمی کی آواز نے اسے چونکایا۔

''یہ لو۔''

عادل نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ گلاس اٹھایا۔ اس کے ساتھ ہی شمی نے بھی اٹھایا تھا۔

''چیئرز!'' شمی نے کہتے ہوئے اپنا وہ ہاتھ آگے بڑھایا جس میں گلاس تھا۔

عادل نے بھی اپنا گلاس آگے بڑھایا۔ ''چیئرز!''

''گزرے ہوئے دنوں کے نام۔'' شمی نے کہا۔

دونوں گلاس آہستگی سے ٹکرائے تھے لیکن عادل کے دماغ میں خاصا چھناکا ہوا اور اس کے ساتھ ہی یوں لگا جیسے کسی فلم کا کوئی منظر کسی دوسرے منظر میں ڈزالو ہوا ہو۔

☆☆☆

''آنے والے دنوں کے نام!'' شمی نے برسوں پہلے اس وقت کہا تھا جب عادل کے گلاس سے اپنا گلاس ٹکرایا تھا۔

اس وقت شمی کی عمر چوبیس سال کے لگ بھگ تھی۔ چہرے پر شوخیوں کا غبار بکھرا ہوا تھا۔ وہ جینز اور بنیان میں ملبوس تھی۔ پیروں میں اونچی ایڑی کے سینڈل تھے۔ اس کی حرکات و سکنات ایسی تھیں جیسے جسم میں بجلیاں بھری ہوئی ہوں۔ عادل کی عمر اس وقت اٹھائیس تیس سال کے لگ بھگ تھی۔

''آپ کے ڈرائنگ روم کی آرائش بہت یونیک ہے۔'' جواب میں شمی ہنسی تھی اور عادل کو یوں محسوس ہوا تھا جیسے گلابوں میں موتیا مہک گیا ہو۔ ''یہ سب میری وجہ سے ہے۔'' اس نے عادل کو جواب دیا تھا۔ ''ممی کے بعد ڈیڈی کو گھر سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی اور نعیمہ کو کتابوں میں گھسے رہنے کے علاوہ جیسے کچھ آتا ہی نہیں تھا۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے اس نے اپنی تعلیم مکمل کی ہے۔ سال بھر پہلے آپ یہاں آئے ہوتے تو یہاں یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ اس وقت جب میں امریکا سے آئی تھی تو یہ سارا کچھ میں نے ہی کیا تھا جو اب آپ دیکھ رہے ہیں۔''

''غالباً چھ سال رہی ہیں آپ امریکا میں۔ مجھے صادق صاحب نے بتایا تھا۔''

شمی کے والد صادق علی شہر کے نہایت صاحب ثروت لوگوں میں سے تھے۔ شمی بولی۔ ''مجھے شوق تھا کہ میں امریکا ہی میں اپنی تعلیم مکمل کروں۔ ڈیڈی تو نعیمہ کو بھی بھیجنا چاہتے تھے لیکن وہ صرف اس لیے نہیں گئی کہ ڈیڈی یہاں اکیلے رہ جاتے۔''

''ڈرنک کی عادت آپ کو امریکا ہی میں پڑی یا پہلے ہی سے......''

''عادت تو اب بھی نہیں ہے۔'' شمی ہنسی۔ ''دن میں تو اس وقت صرف آپ کی خاطر......''

''میں تو خود آپ کی خاطر پی رہا ہوں۔'' عادل نے اس کی بات کاٹی۔ ''ورنہ کبھی کبھار صرف کچھ خاص قسم کی پارٹی ہو تو ایک ڈرنک لے لیتا ہوں۔''

''چلیں یوں ہی سہی۔'' شمی ہنس رہی تھی۔ ''میں آپ کی خاطر اور آپ میری خاطر پی رہے ہیں۔ خیر! یہ پہلی ملاقات ہے۔ ایک دوسرے کی خاطر ہی سہی...... لیکن میرے خیالات یہ ہیں کہ ہر انسان کی زندگی اس کی اپنی زندگی ہوتی ہے۔ وہ جس طرح چاہے گزارے۔ کسی اور کو اس میں دخل انداز نہیں ہونا چاہیے۔''

''آپ کا خیال ہے...... بلکہ آپ کا نظریہ کہنا چاہیے...... آپ ازدواجی زندگی میں بھی سمجھوتوں کی قائل نہیں؟''

''جی ہاں، میں ایسے کسی سمجھوتے کی قائل نہیں ہوں جس سے کسی ایک فریق کی زندگی کو گھن لگ جائے۔ بس اس حد تک سمجھوتا ہونا چاہیے کہ فریقین ایک دوسرے سے مخلص ہوں، منافقت نہ برتیں۔ جو بات بھی ہو، وہ کھل کر ہو لیکن اس معاملے میں انتہا پسندی بھی نہیں ہونا چاہیے۔ میرا مطلب ہے، اگر ایک فریق میں کوئی معاشرتی خرابی ہو تو قطعی لغو بات ہوگی، اگر دوسرا فریق اس سے سمجھوتا کرے۔''

''کیا اس بات کو یوں واضح کیا جا سکتا ہے کہ فریقین

کی ازدواجی زندگی میں کسی تیسرے فریق کو دخل انداز نہیں ہونا چاہیے؟"

"آپ نے بہت مہذب انداز میں بہت اچھی وضاحت کی ہے میری بات کی!..... میرا یہی مطلب تھا۔ ایسی ہی کسی بات کو معاشرتی خرابی کہا جاتا ہے۔ اب میں اپنے نظریۂ زندگی کے دوسرے پہلو کو بھی کسی ایک مثال سے واضح کرنا چاہوں گی۔"

ڈرنک کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے ہوئے یہ ساری باتیں بڑی سنجیدگی سے ہو رہی تھیں لیکن اس موقع پر عادل مسکرا دیا۔

"وہ بھی واضح کر ڈالیے! ہماری اس ملاقات کا مقصد ہی یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ لیں۔"

"جی۔" شمی نے کہا۔ "میں صرف رات کو ایک ڈرنک لینے کی عادی ہوں۔ اس وقت تو میں نے آپ پر بس یہ ظاہر کرنا ضروری سمجھا تھا کہ میں پیتی ہوں۔"

"ہمارا تعلق جس سوسائٹی سے ہے، اس میں ایسے لوگ بہت کم ملتے ہیں جنہوں نے ڈرنک کو کبھی ہاتھ نہ لگایا ہو اور کبھی ہاتھ نہ لگانا چاہتے ہوں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو کبھی کبھی پی لیتے ہیں، جیسے میں ہوں۔"

"تو پھر آپ کی بیوی ایسی نہیں ہونا چاہیے جو آپ کو اس کا عادی بنانے کی کوشش کرے اور میں بھی کسی ایسے ہی شخص کو شوہر بنانا پسند کروں گی جو اس بات کا خواہاں نہ ہو کہ میں رات کو ایک ڈرنک لینے کی عادت ترک کر دوں یا کلب وغیرہ کی زندگی سے دور ہو جاؤں یا وہ میری ہر قابلِ تعلق وحرکت پر پابندی لگانا چاہے۔ بس یہ ہے میرا نظریۂ زندگی۔"

"تو آپ اپنے ہونے والے شوہر پر بھی ایسی کوئی قدغن نہیں لگائیں گی۔"

"کیسے لگا سکتی ہوں..... میرا نظریہ ہی یہ ہے کہ ہر انسان کو اپنی زندگی اپنے طور پر گزارنے کا حق ہونا چاہیے لیکن معاشرتی خرابیوں سے بچ کر۔"

"یہ فیصلہ کیسے ممکن ہے کہ معاشرتی خرابی کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔" عادل نے کہا۔ "مجھے ایک شعر یاد آ رہا ہے اس بات پر۔"

"سنایئے..... شعر سننے کے بعد ہی میں آپ کی بات کا جواب دوں گی۔" عادل نے شعر سنایا۔

"ہر اک طبقے کا اک میزان الگ ہے
کریں پھر نیک و بد کا فیصلہ کیا"

"اچھا شعر ہے۔" شمی بولی۔ "اس میں دو رائے نہیں ہو سکتیں۔ ہمارا سارا معاشرہ طبقات میں بٹا ہوا ہے اور ہر طبقے میں اچھائیوں اور برائیوں کے الگ الگ پیمانے ہیں۔ میں تو یہ کہوں گی عادل صاحب کہ یہ صرف آج کے ہمارے معاشرے کی بات نہیں، یہ بات تو ادوار پر بھی منطبق ہوتی ہے۔ گزرے ہوئے کل کی بہت سی مروّجہ برائیاں آج کے دور میں برائی نہیں سمجھی جاتیں اور گزرے ہوئے کل کی بہت سی رائج باتیں آج بری سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن ہر انسان کو اپنے دور اور اپنے طبقے کے مطابق زندگی گزارنا پڑتی ہے۔"

عادل ہنسا۔ "مجھے بتایا تھا آپ کے والد نے کہ آپ فلسفے کی طالبہ رہی ہیں۔"

شمی بھی ہنسی۔ "بس اتنا اور کہوں گی کہ ہر دور اور ہر دور کے طبقے میں برائی وہ ہوتی ہے جو اس عہد کے مروّجہ معاشرے میں کوئی الجھاؤ اور انتشار پیدا کرے۔"

"بس اب زیادہ نہیں۔" عادل ایک ہاتھ اٹھاتے ہوئے ہنسا۔ "اس سے زیادہ فلسفہ مجھے گھبراہٹ کا شکار کر دے گا۔ اتنی باتوں سے ہی میں نے آپ کو پوری طرح سمجھ لیا ہے۔"

"اور آپ کے بارے میں ڈیڈی نے بڑے یقین سے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ کسی بھی انسان کو پوری طرح سمجھنے میں ڈیڈی کبھی غلطی نہیں کر سکتے۔"

"بتایا تو تھا انہوں نے بھی مجھے آپ کے بارے میں، لیکن میری خواہش تھی کہ آپ سے ایک مرتبہ ملاقات ہو جائے۔ انہیں اس پر اعتراض بھی نہیں تھا۔"

اعتراض نہ ہونے ہی کی وجہ سے ان دونوں کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس اعتبار سے اسے Arranged meeting کہا جا سکتا تھا۔ اس وقت صادق علی گھر میں موجود نہیں تھے۔

"مجھے بھی بتا دیا تھا انہوں نے کہ آپ اس وقت آئیں گے۔" شمی نے کہا۔ "مجھے آپ کی تصویر بھی دکھا دی تھی۔"

"مجھے بھی آپ کی تصویر دکھائی تھی انہوں نے۔"

"آپ نے مجھے تصویر کے مطابق پایا..... یا....."

شمی نے جان بوجھ کر اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تھا۔

"صرف اتنا مختلف کہ تصویر میں آپ شلوار قمیص میں ہیں۔"

شمی مسکرائی۔ "امریکا میں تو جینز پہننا ہی پڑتی ہے لیکن یہاں آنے کے بعد میں صرف شلوار قمیص یا بوتیک کے نت نئے لیکن مشرقی ڈیزائن کے لباس پہننا پسند کرتی ہوں۔ اس وقت تو میں نے جان بوجھ کر جینز پہنی ہے۔ میں آپ کو جتا دینا چاہتی تھی کہ میں اس حد تک آزاد خیال ہوں لیکن اس

آزاد خیالی کو بھی میں نے ایک حد تک پابند رکھا ہے۔ حد سے میری مراد ہے کہ..... کہ....." شمی نے ہچکچا کر بات ادھوری چھوڑتے ہوئے نظریں جھکا لیں۔

عادل مسکرایا۔ "آپ کے اس طرح چپ ہو جانے سے میں یہ بھی سمجھ گیا کہ گفتگو میں بھی آپ کی بے باکی ایک حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔"

"شکریہ....." شمی نے کہتے ہوئے گلاس سے آخری گھونٹ لیا۔

شمی کو گلاس ختم کرتے دیکھ کر اس نے بھی آخری گھونٹ لے کر گلاس تپائی پر رکھنا چاہا مگر نہ جانے کیا ہوا کہ گلاس فرش پر گر کر چکنا چور ہو گیا۔

☆☆☆

شور مچاتی، سیٹی بجاتی ٹرین کا سفر جاری تھا۔

ایئر کنڈیشنڈ کمپارٹمنٹ میں شمی کے سامنے کی برتھ پر بیٹھے ہوئے عادل نے گلاس پر اپنی گرفت اتنی مضبوط کی جیسے اسے ڈر ہو کہ گلاس اس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ نہ جائے۔ انجن کی تیز سیٹی نے اسے عین اس وقت چونکایا تھا جب خیالات کی دنیا میں وہ شمی سے پہلی بار ملا تھا اور وہسکی کا خالی گلاس اس کے ہاتھ سے گر کر چکنا چور ہوا تھا۔

ان یادوں سے باہر آتے ہی عادل نے شمی کی طرف دیکھا۔ وہ بڑی سنجیدگی اور غور سے عادل کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنی طرف متوجہ پا کر وہ مدھم مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "کہاں کھو گئے تھے؟ کئی منٹ سے دیکھ رہی ہوں کہ بالکل گم صم تھے۔"

جواب میں عادل بھی مسکرایا لیکن اس کی مسکراہٹ پھیکی سی تھی۔ وہ بولا۔ "ہاں! کچھ یادوں میں کھو گیا تھا میں۔ بعض باتیں ذہن سے اس طرح چپک جاتی ہیں کہ اس کی جزئیات تک یاد رہ جاتی ہیں۔ مجھے اس وقت تم سے اپنی ملاقات یاد آ گئی تھی۔ انجن کی تیز سیٹی نے مجھے عین اس وقت چونکایا جب گلاس میرے ہاتھ سے گر کر ٹوٹا تھا۔"

"مجھے بھی یاد ہے۔ تم بہت خفیف ہو گئے تھے۔" شمی سوچتے ہوئے اس طرح بولی جیسے وہ بھی ماضی میں کھو گئی ہو۔ "ہم دوسرے صوفوں پر جا بیٹھے تھے۔ ایک ملازم نے آ کر شیشے کے ٹکڑے جمع کیے تھے۔ میں نے تمہیں دوسرے پیگ کی پیشکش کی تھی لیکن تم نے انکار کر دیا تھا اور جانے کے لیے کھڑے ہو گئے تھے۔ میں تمہیں چھوڑنے کے لیے باہر تک گئی تھی۔ تمہاری کار چاکلیٹی رنگ کی تھی۔ مجھے اس کار کا نمبر آج بھی یاد ہے۔"

"ہوتا ہے ایسا! میں نے ابھی کہا نا کہ بعض باتیں ذہن سے حیرت انگیز طور پر چپک کر رہ جاتی ہیں۔ ایک ناول نگار سے میری شناسائی ہے۔ انہیں اپنے پہلے ناول کا پہلا صفحہ آج بھی زبانی یاد ہے جبکہ وہ ناول لکھے ہوئے انہیں پچیس سال گزر چکے ہیں۔"

"آج کل میں بھی ایک ناول لکھ رہی ہوں۔"

"اوہ! خوشی ہوئی یہ سن کر!..... لیکن حیرت نہیں ہوئی۔ فائن آرٹس سے دلچسپی رکھنے والے اگر کسی ایک شعبے سے دلچسپی رکھتے ہوں تو کسی وقت بھی انہیں فائن آرٹس کے کسی دوسرے شعبے سے بھی دلچسپی ہو جاتی ہے۔ مصوری کا شوق تو تمہیں تھا ہی۔"

"بزنس کی وجہ سے میں اپنے اس شوق کو زیادہ وقت نہیں دے پاتی تھی لیکن بعد میں..... میرا مطلب ہے..... جب....." شمی نے خاموش ہو کر گلاس منہ سے لگا لیا۔

"میں سمجھ گیا، تم کیا کہنے جا رہی ہو۔" عادل بولا اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "مجھے تمہارے حالات کا علم رہتا تھا۔ بزنس وائنڈ اپ کر کے تم مستقل طور پر لاہور منتقل ہو گئی تھیں اور وہاں تم نے راشن صاحب کی شاگردی اختیار کر لی تھی۔ پھر چند سال بعد تمہارا نام اخبارات میں آنے لگا تھا اور اب تو تم بہت مشہور ہو چکی ہو۔ مصوری کی دنیا میں اب راشن صاحب کے بعد تمہارا ہی نام آتا ہے۔ ٹی وی چینلز پر بھی تمہارے کئی انٹرویوز آ چکے ہیں۔ وہ سب دیکھے ہیں میں نے۔"

"اور نعیمہ نے؟" شمی بے اختیار پوچھ بیٹھی۔

عادل افسردگی سے مسکرایا۔ "تمہاری زبان پر دو مرتبہ نعیمہ کا نام آ چکا ہے۔ اس سے میں تمہاری جذباتی کیفیت کا اندازہ لگا سکتا ہوں۔ نعیمہ کے جذبات بھی ایسے ہی ہیں۔ ہر مرتبہ..... بس اتفاق ہے..... ہر مرتبہ نعیمہ ہی نے مجھے اطلاع دی تھی کہ فلاں وقت پر اور فلاں چینل پر تمہارا انٹرویو آنے والا ہے۔ تو جب دونوں طرف یہ عالم ہے....."

"تم لاہور کس سلسلے میں آئے تھے؟" شمی نے جلدی سے موضوع گفتگو بدلا۔

عادل نے ایک طویل سانس لی اور گلاس سے ایک بڑا گھونٹ لے کر بولا۔ "بزنس ٹرپ۔"

"صرف ایک بریف کیس کے ساتھ؟"

"کام ہی صرف دو گھنٹے کا تھا۔ صبح کی فلائٹ سے آیا تھا میں۔ دوپہر کو واپس چلا جاتا لیکن معلوم ہوا کہ پائلٹس ایسوسی ایشن نے اچانک ہڑتال کا اعلان کر دیا ہے۔ تمام فلائٹس کینسل ہو چکی ہیں۔ مجبوراً اس ٹرین میں بکنگ

کروائی۔ وقت کافی تھا اس لیے گوجرانوالہ بھی ہو آیا۔ نعیمہ کی فرمائش تھی۔ اسے گوجرانوالہ کا میسو بہت پسند ہے۔"

"ہاں۔" شمی مسکرائی۔ "یہ عجیب بات ہے، اسے مٹھائی کبھی پسند نہیں رہی لیکن گوجرانوالہ کا میسو وہ ہمیشہ شوق سے کھاتی رہی ہے۔ کسی نہ کسی موقع پر اسے میسو منگانے کا موقع مل ہی جاتا تھا۔"

"تم بھی مجبوراً ہی ٹرین سے جارہی ہوگی۔"

"ہاں۔ پہلے تو ارادہ تھا کہ کل صبح کی فلائٹ سے جاؤں گی لیکن جب فلائٹس کینسل ہونے کا علم ہوا تو پھر یہی ایک راستہ تھا کہ ٹرین پکڑوں۔ کل میرا کراچی میں ہونا ضروری ہے۔"

"جانتا ہوں میں۔" عادل نے کہا۔ "آرٹ گیلری میں تمہاری تصویروں کی نمائش ہے۔ اخبار میں پڑھا تھا میں نے۔ گوجرانوالہ سے آکر میں نے فون کیا تھا نعیمہ کو۔" ہنس کر مزید کہا۔ "اسے یہ خوش خبری دینا بھی کہ کراچی میں خاصے لوگ تمہاری تصاویر کی نمائش کے سلسلے میں پرجوش ہیں۔"

"سب کچھ امین صاحب کی تربیت کا صدقہ ہے۔ رنگوں سے ایک خاص انداز میں کھیلنا مجھے انہوں نے ہی سکھایا ہے۔ انہیں بھی مجھ پر ناز ہے۔ ان کا کوئی اور شاگرد اس مقام تک نہیں پہنچ سکا۔"

"جب تک شاگرد میں غیر معمولی صلاحیت نہ ہو، دنیا کا بڑے سے بڑا استاد بھی کچھ نہیں کرسکتا۔ اب تو وہ بہت معمر ہوچکے ہیں۔"

"چھیانوے سال کے ہوگئے ہیں۔ سفر کرنا ان کے لیے ممکن نہیں رہا ہے، ورنہ وہ میرے ساتھ ہی کراچی جاتے۔"

"نہ جانے کس نے مجھے بتایا تھا کہ تم ان کے ساتھ ہی رہتی ہو۔"

"یہ ضروری تھا۔" شمی نے جواب دیا۔ "میں ہر وقت رنگوں میں ڈوبی رہنا چاہتی تھی اور یہ اسی طرح ممکن تھا کہ مجھے ہمہ وقت ان کی رہنمائی حاصل رہے۔"

"اور کون کون رہتا ہے ان کے ساتھ؟"

"میرے علاوہ تو صرف ملازمین ہی ہیں۔ دوسرے شاگرد تو بس آتے جاتے رہتے تھے۔ اولاد ان کی ہے نہیں۔ جوانی ہی میں بیوی کا انتقال ہوگیا تھا۔ جب میں نے ان کی شاگردی اختیار کی تھی تو وہ اسی بیاسی سال کے تھے۔ اس کے باوجود ان کے فن سے عقیدت کے باعث ان کی دو شاگردوں نے ان سے شادی کرنا چاہی تھی لیکن وہ ناراض ہوگئے تھے۔"

"اب ان کے کتنے شاگرد ہیں؟"

"اب تو کوئی بھی نہیں ہے۔ دراصل اب ان میں اتنی سکت نہیں رہی کہ کسی شاگرد کو وقت دے سکیں۔ طویل العمری کا تقاضا ہے کہ انہی کی خبر گیری کے لیے کوئی ہو۔ اگرچہ ملازم ہیں لیکن ملازمین ان کا اس طرح خیال نہیں رکھ سکتے جس طرح میں رکھتی ہوں۔ اب میں جب تک لاہور واپس نہیں جاسکوں گی، مجھے ان کی فکر لگی رہے گی۔"

"گویا حق شاگردی ادا کررہی ہو۔"

"اب یہ تو ختم کرو۔" شمی نے عادل کے گلاس کی طرف اشارہ کیا۔ "بھوک لگ رہی ہے اب مجھے۔"

"میں دو ایک مرتبہ پہلے بھی ٹرین کا سفر کرچکا ہوں۔ ڈائننگ کار کا کھانا مجھے سخت ناپسند ہے۔ بس پھلوں پر گزارہ کروں گا کراچی پہنچنے تک۔"

"کھانا میرے ساتھ وافر مقدار میں ہے۔ میں اگرچہ پہلی مرتبہ ٹرین سے سفر کررہی ہوں لیکن رامین صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ ڈائننگ کار کے کھانے سے بہتر ہے کہ تم اپنے ساتھ لے کر جاؤ۔"

شمی نے برتھ کے نیچے سے اس قسم کا ٹفن نکالا جس میں کھانا گرم رہتا ہے۔

"مکمل تیاری کے ساتھ چلی ہو۔" عادل بولا۔

"سب تاج بی بی کی بدولت۔"

"یہ تاج بی بی کون ہیں؟"

"رامین ولا کی داروغۂ مطبخ۔" شمی کے گلابوں میں موتیا کھلکھلائے۔ "کچن کی ذمے دار وہی ہیں۔ پھر رامین صاحب نے ہدایت بھی کی تھی تاج بی بی کو کہ مجھے سفر میں کسی قسم کی کمی محسوس نہ ہو۔"

"گویا صرف تم ہی رامین صاحب کا خیال نہیں رکھتیں بلکہ انہیں بھی تمہاری فکر رہتی ہے۔"

"قدرتی امر ہے عادل! تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔" جواب دے کر شمی ٹفن کھولنے لگی۔ وہ اپنا گلاس خالی کرچکی تھی۔

عادل نے بھی اپنا گلاس ختم کرکے ایک طرف رکھا۔

کھانے کے دوران میں اس نے کہا۔ "اتنے برسوں بعد ہم ساتھ کھانا کھا رہے ہیں۔ عجیب سا محسوس ہورہا ہے۔"

"وہ جو کہا ہے نا کسی نے... ! اسی کے مطابق....." شمی مسکراتے ہوئے بولی۔ "تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔"

"کیا تاریخ زندگی کے ہر پہلو کو دہرا سکتی ہے؟"

عادل کا لہجہ خاصا معنی خیز تھا۔

"یہ حالات کی کسی خاص کروٹ پر منحصر ہوتا ہے۔" شمی نے سرسری انداز میں جواب دیا اور پھر شاید جان بوجھ کر موضوعِ گفتگو بدلا۔ "تمہارا لاہور کا بزنس ٹرپ کیسا رہا؟"

پھر اس کے بعد ماضی کی کسی بات کا ذکر نہیں چھیڑا۔

"اب میں کچھ دیر آرام کروں گی عادل!" شمی نے کھانے سے فراغت پانے کے بعد کہا۔ "تم بور تو نہیں ہوگے۔"

"نہیں نہیں، آج کا اخبار ہے میرے بریف کیس میں...... اس کے چند خاص آرٹیکل میں ابھی نہیں پڑھ سکا ہوں۔ میں وہ پڑھتا رہوں گا۔ مجھے تو عادت ہے نہیں دوپہر کے کھانے کے بعد آرام کرنے کی۔ پہلے یہ عادت تمہیں بھی نہیں تھی۔ صبح اٹھتی بھی خاصی دیر سے تھیں۔ میں اور نعیمہ ہی دفتر چلے جاتے تھے۔ تم بعد میں آتی تھیں۔"

"اب میں سحر خیز ہوگئی ہوں۔" شمی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس لیے دوپہر کے کھانے کے بعد گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے لیے جھپکی لینے کی بھی عادت پڑگئی ہے۔"

اس نے سوٹ کیس سے ایک چادر نکالی۔ عادل اخبار نکالنے کے لیے اپنا بریف کیس کھولنے لگا۔ شمی چادر اوڑھ کر برتھ پر لیٹ گئی۔ عادل نے اخبار نکال کر اس کا ایک آرٹیکل پڑھنا شروع کیا لیکن پڑھ نہیں سکا۔ چند سطروں کے بعد ہی وہ بھول جاتا تھا کہ کیا پڑھ چکا ہے۔ اس کا دماغ ماضی میں اُلجھا ہوا تھا۔ اس کی نظریں بھی بار بار شمی کے چہرے کی طرف اٹھ جاتی تھیں جو آنکھیں بند کیے ہوئے تھی۔

آدھے گھنٹے سے بھی کچھ کم وقت گزرا تھا کہ شمی کے بالوں کی ایک لٹ اس کی پیشانی پر اس کی بائیں آنکھ کے کنارے کو چھونے لگی۔

عادل کو خیال آیا کہ شمی کے بالوں کی یہ لٹ آج بھی پہلے ہی کی طرح شریر ہے۔ سوتے میں وہ کئی بار شمی کی پیشانی پر آجاتی تھی۔ اگر کبھی اس لٹ کا کوئی بال شمی کی آنکھ میں چبھتا تھا تو سوتے ہی میں اس کا ہاتھ اس لٹ کو پیشانی سے ہٹا دیتا تھا۔ کئی مرتبہ عادل نے بھی وہ لٹ اس کی پیشانی سے ہٹائی تھی۔ پہلی مرتبہ شادی کی پہلی رات کو!

☆☆☆

حجلۂ عروسی کے بستر پر عادل اور شمی قریب قریب لیٹے ہوئے تھے شمی کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کے برخلاف عادل جاگ رہا تھا اور شمی کی طرف کروٹ لیے ہوئے تھا۔ اس کی کہنی تکیے پر تھی اور اسی ہاتھ کی ہتھیلی پر اس کا سر تھا۔ نظریں شمی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں سے محبت شمی کے چہرے پر جیسے برس رہی تھی۔ بالوں کی ایک لٹ اس وقت بھی شمی کی ایک آنکھ کو چھو رہی تھی۔ پھر غالباً کوئی بال شمی کی آنکھ میں چبھا۔ شمی کی آنکھیں بند رہیں لیکن ایک ہاتھ نے حرکت کی، لٹ پیشانی سے ہٹا دی۔ جانے کیوں عادل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ ذرا دیر بعد وہ لٹ پھر شمی کی پیشانی پر تھی۔ اس مرتبہ اس سے پہلے کہ شمی کا ہاتھ حرکت میں آتا، عادل نے ہاتھ بڑھا کر وہ لٹ آہستگی کے ساتھ شمی کی پیشانی سے ہٹا دی۔

شمی کو اپنی پیشانی پر عادل کے ہاتھ کا بہت معمولی سا لمس محسوس ہوا ہوگا لیکن اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ چت لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے سر گھما کر عادل کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔

"یہ کیا ہورہا ہے؟"

"تمہارے بالوں کی ایک لٹ بہت شریر ہے۔ بار بار آجاتی ہے تمہاری پیشانی پر! اسی کو ہٹا رہا تھا۔ احتیاط بھی برتی تھی میں نے لیکن تمہاری جلد بہت حساس ہے۔ جاگ گئیں تم!"

"میں سوئی ہی کب تھی۔ نیند تو ہے لیکن سونے کو دل نہیں چاہ رہا ہے آج کی رات......! بس تھوڑا سا آرام کرنے کے لیے آنکھیں بند کی تھیں۔" شمی نے جواب دیتے ہوئے کروٹ لی اور اپنا بازو عادل کے گلے میں حمائل کرتے ہوئے محبت آمیز شکایتی لہجے میں بولی۔ "دو گھنٹے میں ہی تم نے مجھے بری طرح تھکا دیا ہے۔"

"آج کی رات سونے کے لیے ہوتی بھی نہیں ہے۔" عادل نے شوخی سے کہا۔ "چلو باتیں ہی کرتے ہیں۔ میں کچھ باتیں کرنا بھی چاہتا ہوں۔"

"میں منہ پر ذرا ایک چھپکا مار آؤں۔"

"ہاں۔"

شمی بستر سے اٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی۔ عادل نے انگڑائی لیتے ہوئے دیوار گیر کلاک پر نظر ڈالی جو تین بجا چکا تھا۔

ذرا دیر بعد شمی تولیے سے منہ خشک کرتی ہوئی باتھ روم سے نکلی، پھر تولیا ایک کرسی پر پھینک کر ایک الماری کی طرف گئی۔ الماری سے اس نے وہسکی کی بوتل نکالی۔

"یہ کیا!" عادل کے منہ سے نکلا۔

"تمہیں بتا تو چکی ہوں میں...... رات کو ایک پیگ ضرور لیتی ہوں اور آج موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔"

"لیکن اب بیوی کی تو..... میرا مطلب ہے..... صبح دیر تک سونے کی عادی ہو..... یہ پینے کے بعد..... بلکہ اور دو ایک گھنٹے گزارنے کے بعد سوؤ گی تو اٹھو گی کب؟ دوپہر ہوجائے گی پھر تو!"

"دو گھنٹے میں تو اس کا اثر بالکل ختم ہو چکا ہوگا۔ اس کی وجہ سے دیر تک نہیں سونا پڑے گا۔ ویسے بھی آج تو میں اس گھر کی ملکہ ہوں۔ ڈیڈی بہت سمجھ دار ہیں عادل!..... آج کی رات گزارنے کے لیے وہ بڑی ممی کے گھر چلے گئے ہیں، کہہ بھی گئے تھے کہ کل دوپہر کے بعد آئیں گے۔ گھر میں ہم دونوں کے علاوہ صرف ملازمین ہیں یا نعیمہ، اور نعیمہ اتنی بدھو نہیں ہے کہ صبح ہی صبح آکر کھٹکھٹا دے کمرے کا دروازہ۔"

ان باتوں کے دوران میں شمی شراب کی بوتل اور دیگر لوازمات کے ساتھ خواب گاہ کے ایک گوشے میں لگے ہوئے صوفہ سیٹ کے بڑے صوفے پر جابیٹھی تھی۔ اس نے ایک ہی گلاس نکالا تھا۔ وہ ہنس کر بولی۔ "میں تم سے ہرگز نہیں کہوں گی کہ میرا ساتھ دو۔ ہاں اگر تم کہو تو ایک گلاس اور نکالوں؟"

عادل ہنسا۔ "میں تو ہرگز نہیں کہوں گا۔"

"وہ تو خیر ہم دونوں میں طے پاچکا ہے کہ ہر انسان کو اپنی زندگی اپنے طور سے گزارنے کا حق ہونا چاہیے لیکن یہ تم مجھے بتا چکے ہو کہ گاہے بگاہے کسی خاص موقع پر اپنے دوستوں کے ساتھ پی لیتے ہو اور آج کی رات ہم دونوں ہی کی زندگی کی ایک خاص رات ہے۔ میں اپنے نظریۂ حیات کے مطابق اصرار تو نہیں کروں گی لیکن میری خواہش ضرور ہے کہ پہلی ملاقات کی طرح آج بھی تم میرا ساتھ دو۔ آج کے بعد میں اپنی اس خواہش کا اظہار کرنے سے گریز کروں گی۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" عادل ہنستے ہوئے بستر سے اٹھا۔ "آج واقعی ہماری زندگی کی خاص رات ہے۔ میں تمہاری خواہش کا احترام کروں گا۔"

شمی خوش ہوگئی اور دوسرا گلاس لانے کے لیے جلدی سے اٹھی۔

پہلی ملاقات کے بعد یہ ان کی زندگی کی دوسری ہی ملاقات تھی لیکن پہلی ملاقات اور شادی طے ہوجانے کے بعد بیچ میں ایک ماہ کا جو وقفہ آیا تھا، ان دنوں میں وہ ایک دوسرے سے سیل فون پر باتیں ضرور کرتے رہے تھے اور انہی باتوں میں بے تکلفی بتدریج بڑھی تھی اور گفتگو کے دوران میں لفظ "آپ" کی جگہ "تم" نے لے لی تھی۔

شمی دوسرا گلاس نکال لائی۔ اس نے خود ہی دونوں پیگ بنائے۔ چیرز کرتے وقت شمی نے کہا تھا۔ "آج کی ناقابلِ فراموش رات کے نام!"

جواب میں عادل نے شوخی سے کہا تھا۔ "ابھی گزرے ہوئے خوشگوار لمحوں کے نام!"

شمی نے اس جواب کو نظرانداز کرنے کے لیے گلاس فوراً اپنے منہ سے لگالیا۔ ایک گھونٹ پینے کے بعد اس نے گلاس تپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں! یاد آیا۔ تم کچھ باتیں کرنا چاہ رہے تھے۔ کوئی خاص بات ہے کیا؟"

"کچھ ایسی زیادہ خاص بھی نہیں۔ کسی حد تک میں واقف بھی ہوں لیکن اب جبکہ میں تمہارے خاندان کا ایک فرد بن چکا ہوں تو اس کی تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔ یہ تو مجھے معلوم ہوچکا ہے کہ تمہارے ڈیڈی......"

"کیا!" شمی تیزی سے بول پڑی۔ "اب بھی ڈیڈی کو میرے ڈیڈی کہا کروگے؟ صرف ڈیڈی نہیں کہہ سکتے۔"

"سوری!" عادل مسکرایا۔ "عادت پڑی رہی ہے نا!...... اب میں انہیں صرف ڈیڈی ہی کہا کروں گا۔ تم سے شادی کے بعد مجھے کہنا بھی یہی چاہیے۔ ڈیڑھ سال قبل میرے ڈیڈی کا تو انتقال بھی ہوچکا ہے۔ اب تمہارے ڈیڈی ہی میرے ڈیڈی ہیں، کوئی اور نہیں ہے میرا اب اس دنیا میں!" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی، پھر یک بہ یک ہنس کر بولا۔ "خیر چھوڑو۔ آج رات ہر افسردہ بات کو بھول جانا چاہیے۔ ہاں!...... مجھے شادی سے پہلے معلوم ہوگیا تھا کہ تم ڈیڈی کی دوسری شادی کا ثمر ہو۔ بس میں اسی کا پس منظر جاننا چاہتا ہوں۔"

"پس منظر کچھ زیادہ نہیں ہے۔" شمی نے گلاس دوبارہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "بڑی ممی کا نام کلثوم بیگم ہے۔ ڈیڈی کی پہلی شادی انہی سے ہوئی تھی۔ ڈیڈی کو اولاد کی شدید خواہش تھی لیکن بڑی ممی سے شادی کے چار سال بعد بھی ان کی خواہش پوری نہیں ہوئی۔ بڑی ممی کو ڈیڈی کی اس خواہش کی شدت کا اندازہ ہوگیا تھا۔ انہوں نے خود ڈیڈی سے کہا کہ وہ دوسری شادی کرلیں۔ نہ صرف کہا بلکہ اصرار کرتی رہیں۔ آخر ڈیڈی نے دوسری شادی کرلی۔ بڑی ممی خوشی سے اس شادی میں شریک بھی ہوئیں مگر اس شادی کے لیے انہوں نے ایک شرط بہرحال رکھی تھی کہ ڈیڈی اپنی دوسری بیوی کو ان کے ساتھ نہیں رکھیں گے۔"

"یعنی بڑی ممی کے ساتھ؟"

''ہاں۔'' شمی نے جواب دے کر ایک گھونٹ لیا، پھر اپنی بات جاری رکھی۔ ''اپنی دوسری بیوی ہی کے لیے ڈیڈی نے یہ بنگلا بنوایا تھا جس میں اس وقت ہم دونوں موجود ہیں۔ اس دوسری شادی کے نتیجے میں ڈیڈی کی خواہش پوری ہوگئی۔ ان کی دوسری بیوی سے سال بھر بعد ہی ایک لڑکی پیدا ہوگئی۔''

''جو تم ہو!'' عادل بول پڑا۔

''ہوں۔'' شمی مسکرائی۔ میرا نام شمیمہ رکھا گیا تھا لیکن بچپن ہی سے مجھے شمی کہہ کر پکارا جانے لگا اور آج تک میں شمی ہی ہوں۔''

''اور ہمیشہ رہو گی۔'' عادل نے خواہ مخواہ لقمہ دیا اور گلاس سے ایک گھونٹ لیا۔ اس کے پینے کی رفتار شمی سے سست تھی۔

شمی نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''پھر یہ ہوا کہ میری پیدائش کے چار سال بعد بڑی ممی بھی ماں بن گئیں۔ میری اس بہن کا نام نعیمہ رکھا گیا۔ ڈیڈی اسے بھی نمی پکارنا چاہتے تھے مگر جانے کیوں بڑی ممی اس کی مخالف تھیں چنانچہ نعیمہ آج بھی نعیمہ ہے۔'' شمی مسکرائی۔

''دونوں بیویوں سے ڈیڈی کے تعلقات یکساں رہے؟''

''بالکل یکساں!...... بلکہ دونوں بیویوں کے تعلقات بھی ہمیشہ بہت اچھے رہے۔ بالکل بہنوں کی طرح!...... بس یہ کہ رہتیں دو الگ الگ گھروں میں تھیں۔ یہ بات میری سمجھ میں کبھی نہیں آسکی کہ بڑی ممی نے ساتھ رہنا کیوں گوارا نہیں کیا جبکہ میری ممی کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ خیر!'' شمی نے ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا۔

عادل سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ شمی نے گلاس تپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ مجھے ڈیڈی نے تعلیم کے لیے امریکا بھیج دیا تھا۔ یہ میں شاید تمہیں بتا چکی ہوں کہ ڈیڈی نعیمہ کو بھی بھیجنا چاہتے تھے لیکن وہ جانے کے لیے صرف یوں تیار نہیں ہوئی کہ پھر ڈیڈی بہت اکیلے رہ جاتے۔ میری والدہ کا انتقال تو بہت عرصے پہلے ہوگیا تھا اور بڑی ممی نہایت مصروف سوشل ورکر بن گئی تھیں۔ نعیمہ کو بھی ان سے زیادہ محبت ڈیڈی سے تھی۔ اس کا زیادہ وقت اسی گھر میں گزرتا تھا۔ وہ بس رات کا کھانا کھا کر یہاں سے اپنی ممی کے گھر جایا کرتی تھی اور اب بھی اس کا یہی حال ہے۔''

''تو بڑی ممی بڑی حد تک اکیلی ہی رہتی ہیں؟''

''بس ملازمین ہیں گھر میں!...... ڈیڈی کی دوسری شادی کے بعد انہوں نے اپنی ایک بیوہ خالہ کو اپنے ساتھ رکھ لیا تھا مگر سال بھر قبل ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ بڑی ممی دن میں اپنے سوشل ورک کی وجہ سے مصروف رہتی ہیں اور نعیمہ سارا دن یہیں گزارتی ہے۔ رات کو ڈیڈی خود اسے چھوڑنے جاتے ہیں اور کچھ وقت بڑی ممی سے گپ شپ میں گزار کر آتے ہیں۔ جب میں امریکا میں تھی تو ڈیڈی وہیں رہا کرتے تھے مگر اب میری وجہ سے وہ نعیمہ کو چھوڑ کر واپس آجاتے ہیں۔ ہاں البتہ آج رات......'' شمی ہنسی۔ ''نعیمہ کو یہاں چھوڑ کر وہ خود بڑی ممی کے پاس چلے گئے ہیں۔''

''عجیب بات ہے کہ دونوں بیویوں سے وہ ایک ایک لڑکی ہی کے باپ بنے اور مزید اولادیں نہیں ہوئیں۔ خصوصاً اولاد نرینہ کی کمی تو وہ ضرور محسوس کرتے ہوں گے۔''

''شاید کرتے ہوں اور شاید اسی لیے انہوں نے تم سے کہا تھا کہ اسی گھر میں رہو۔'' شمی مسکرائی۔

''اور میں نے ان کی اس خواہش کا احترام اس لیے کیا کہ میرا تو آگے پیچھے کوئی اور ہے نہیں۔''

''تم بہت دھیرے دھیرے پی رہے ہو۔ میرا گلاس ختم ہوگیا اور تمہارا گلاس ابھی آدھا ہی ہوا ہے۔ مجھے باتوں میں خیال نہیں رہا، ورنہ ٹوک چکی ہوتی تمہیں!''

''میں نے دانستہ ایسا کیا ہے۔ تمہارے دوسرے گلاس میں بھی تو تمہارا ساتھ دینا ہے۔''

''نہیں نہیں، میں بس ایک ہی ڈرنک لیتی ہوں۔''

''تمہاری خواہش تھی کہ میں تمہارا ساتھ دوں۔ اب میری خواہش ہے کہ تم ایک ڈرنک اور لو!''

''کیوں! کیوں!''

''یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔''

''سمجھ گئی تم کیا چاہتے ہو۔'' شمی نے سر ہلاتے ہوئے شوخی سے عادل کی طرف دیکھا۔ ''اور جب یہ چاہتے ہو تو تم بھی ایک پیگ اور لو۔''

عادل ہنسا۔ ''چلو ٹھیک ہے، آج کی رات ہم دونوں ہی اپنے نظریۂ حیات کو بھول جاتے ہیں۔ تم بناؤ اپنے لیے۔ میں بھی یہ باقی گلاس جلدی سے ختم کرتا ہوں۔'' عادل نے خاموش ہو کر ایک خاصا بڑا گھونٹ لیا۔

شمی اپنے لیے دوسرا پیگ بناتے ہوئے بولی۔ ''اب تم بھی تو اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔''

''ڈیڈی نے تمہیں بتایا تو ہوگا۔''

''شاید وہ کوئی بات بھول گئے ہوں، بتایا تو ہے انہوں نے۔''

''چلو ٹھیک ہے۔'' عادل ہنسا۔ ''اس طرح کچھ وقت اور گزر جائے گا۔ دو دو پیگ ختم ہو جائیں گے۔ میں بتاتا ہوں۔ میرے ڈیڈی اور تمہارے ڈیڈی بہت اچھے دوست تھے۔ میرے ڈیڈی کا بزنس لاہور میں تھا۔ اگرچہ ڈیڈی نے مجھے بھی اپنے ساتھ شامل کرلیا تھا لیکن ان کے انتقال کے بعد مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں زیادہ تجربہ کار نہیں تھا۔ اسی لیے میں اکثر معاملات میں تمہارے ڈیڈی کو فون کر کے ان سے مشورے لیا کرتا تھا۔ بعض بڑے اہم معاملات میں مجھے مشورہ کرنے کے لیے کراچی بھی آنا پڑتا تھا۔ کچھ عرصے قبل انہوں نے میری اور تمہاری شادی کی بات چھیڑی۔'' عادل نے خاموش ہو کر دو گھونٹ لیے اور گلاس خالی کردیا۔

شمی نے بوتل پہلے ہی اٹھالی تھی جو اس نے عادل کے گلاس میں انڈیلتے ہوئے کہا۔ ''اس کے بعد ہی ہماری وہ پہلی ملاقات ہوئی تھی جس میں، میں نے جان بوجھ کر جینز اور شرٹ پہنی تھی۔ اب تم مجھے اس لباس میں کبھی نہیں دیکھو گے۔''

عادل مسکرایا، پھر اس نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔ ''اس کے بعد ہم دونوں سیل فون پر باتیں کرتے رہے ہیں۔ اسی دوران میں ڈیڈی نے یہ تجویز میرے سامنے رکھی کہ میں لاہور میں اپنا بزنس وائنڈ اپ کر کے سارا سرمایہ یہاں ان کی کمپنی میں لگا دوں اور سرمائے کے تناسب سے ان کا بزنس پارٹنر بھی بن جاؤں۔ میں نے ان کی بات فوراً مان لی۔ دراصل مجھے اپنا بزنس سنبھالنے میں دقت تو ہوتی ہی تھی۔ ڈیڈی کی وجہ سے میرا یہ بوجھ ختم ہو جاتا۔''

''اب یہ تو سنبھالو۔'' شمی نے اس کے گلاس کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں تو دوسرے پیگ کو بھی ایک تہائی خالی کر چکی ہوں۔''

''اب میں کچھ تیزی سے پیوں گا اور تمہارے ساتھ ہی ختم کرلوں گا۔'' عادل نے گلاس اٹھا کر ایک گھونٹ لیا۔ ''اپنا بزنس وائنڈ اپ کر کے میں پچھلے ہفتے کراچی آگیا۔ پارٹنرشپ کے کاغذات ڈیڈی نے تیار کروا لیے تھے۔ میں نے اپنا سرمایہ ڈیڈی کی کمپنی میں لگالیا۔ کاغذات پر دستخط ہوگئے۔ میں نے ایک ہوٹل میں قیام کیا تھا اور اس فکر میں تھا کہ اپنا گھر کہاں بنواؤں۔ بزنس وائنڈ اپ کرنے کے بعد میں لاہور کا گھر بھی بیچ آیا تھا۔''

عادل نے رک کر ایک چھوٹا گھونٹ لیا، پھر اپنی بات جاری رکھی۔ ''ڈیڈی کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے بتایا کہ یہ بنگلا وہ جہیز میں تم کو دے دیں گے۔ اس طرح یہ گھر میرا ہو جائے گا لہٰذا میں یہاں رہ سکتا ہوں۔ دوسرا گھر بنوانے یا خریدنے کی ضرورت نہیں پھر۔'' عادل ہنسا۔ ''ڈیڈی نے مجھے یہ کہہ کر شرمندہ بھی کیا تھا کہ اگر تم دونوں میاں بیوی...... یعنی ہم دونوں کی اجازت سے وہ بھی اپنے کمرے میں پڑے رہا کریں گے۔''

اس بات پر شمی بھی ہنس دی۔ وہ آدھا گلاس ختم کر چکی تھی۔ بڑی بڑی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیرنے لگے تھے۔ وہ صوفے پر اس طرح لیٹ گئی کہ اس کا سر عادل کی گود میں رہے۔ گلاس اس نے اپنے ہاتھ میں تھامے رکھا تھا۔ عادل نے اس پر جھک کر اس کے ہونٹوں سے ہلکی سی گستاخی کی، پھر بولا۔ ''میں نے ان کی یہ بات اس لیے بھی مان لی کہ اگر کہیں اور گھر بنواتا تو میرے دفتر جانے کے بعد تمہیں اکیلا رہنا پڑتا جبکہ یہاں نعیمہ بھی ہے اور......''

''یہ تو خیر تم نے غلط سمجھا۔'' شمی نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ ''میں تو اب تمہارے لیے پیرتسمہ پا ثابت ہوں گی۔ تمہارے ساتھ دفتر میں بھی جایا کروں گی۔''

''ضرور چلا کرنا۔ مجھے خوشی ہوگی اور اس پر اعتراض کرنے کا تو مجھے کوئی حق بھی نہیں ہے۔''

''حق کیسے ہو سکتا ہے!...... اب میں بھی تو اس کمپنی کی ڈائریکٹر بن جاؤں گی۔ ڈیڈی نے مجھے آج ہی اپنے فیصلے سے آگاہ کیا ہے۔ وہ کمپنی کے اپنے مالکانہ حقوق ہم دونوں میں تقسیم کر رہے ہیں۔ یعنی میرے ساتھ اب نعیمہ بھی کمپنی کی ایک ڈائریکٹر ہوگی۔''

''اوہ، گڈ!'' عادل نے ایک بڑا گھونٹ لیا۔

شمی بولی۔ ''ڈیڈی اب ریٹائرڈ لائف گزارنا چاہتے ہیں۔''

☆☆☆

''اور انہوں نے زندگی ہی سے ریٹائرمنٹ لے لی تھی۔'' عادل ٹھنڈی سانس لے کر بڑبڑایا تھا۔ برتھ پر لیٹے لیٹے وہ اخبار کا ایک آرٹیکل پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کے دماغ میں ماضی کے واقعات چکراتے رہے تھے۔

دوسری برتھ پر لیٹی ہوئی شمی فنِ مصوری سے متعلق انگریزی کی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ عادل کے بڑبڑانے پر وہ چونکی۔

''مجھ سے کچھ کہا عادل!''

''نہیں شمی!'' عادل اخبار ایک طرف ڈالتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔ ''مجھے شادی کی پہلی رات یاد آگئی تھی۔ تم نے اسی رات بتایا تھا نا کہ ڈیڈی نے کمپنی کے اپنے مالکانہ حقوق

تمہارے اور نعیمہ کے نام کر دیے تھے کیونکہ تمہاری شادی کے بعد وہ ریٹائرڈ لائف گزارنا چاہتے تھے مگر انہوں نے زندگی ہی سے ریٹائرمنٹ لے لی تھی۔ ہماری شادی ہوئے پانچ ہی دن گزرے تھے تاجب ان پر ہارٹ اٹیک ہوا تھا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے تھے؟"

"ہاں۔" شمی بھی ٹھنڈی سانس لے کر اُٹھ بیٹھی۔ "پانچواں یا چھٹا ہی دن تھا۔ مجھے اب ٹھیک سے یاد نہیں۔ شاید تمہاری ہی یادداشت صحیح بتا رہی ہو کہ پانچ ہی دن گزرے تھے۔"

"مجھے اچھی طرح یاد ہے۔"

شمی بیٹھے بیٹھے کچھ سوچنے لگی۔ ٹرین کی رفتار اب بتدریج کم ہو رہی تھی۔ اندھیرا پھیل چکا تھا۔

"اس کے بعد تو ہماری زندگی بدلتی ہی چلی گئی تھی۔" شمی کھوئے کھوئے سے انداز میں بولنے لگی۔ "شاید ڈیڈی کے انتقال ہی کا صدمہ پہنچا تھا بڑی ممی کو...... وہ اس کے بعد بہ مشکل ایک سال زندہ رہی تھیں۔ اس کے بعد میں نے نعیمہ کو مستقل طور پر اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ اگر بڑی ممی کا انتقال نہ ہوا ہوتا تو......" شمی نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ غالباً وہ اس کے بعد کے واقعات اپنی زبان پر نہیں لانا چاہتی تھی۔ اس نے وہ کتاب بند کر کے ایک طرف ڈال دی جو وہ اس وقت تک اپنے ہاتھ میں لیے رہی تھی۔

ٹرین کی رفتار اب بہت کم ہو چکی تھی۔

"کوئی اسٹیشن قریب آگیا ہے۔" عادل کھڑکی کے شیشے سے باہر دیکھتے ہوئے بولا۔ "شہر کی روشنیاں دکھائی دینے لگی ہیں۔"

شمی زندگی میں پہلی مرتبہ ٹرین سے سفر کر رہی تھی اس لیے اسے اندازہ نہیں تھا کہ آنے والا اسٹیشن کون سا ہوگا۔

ٹرین ہلکے سے دھچکے کے ساتھ پلیٹ فارم پر رکی۔ اسی وقت شمی کے پرس سے سیل فون کی گھنٹی بجنے کی آواز آنے لگی۔ شمی نے سیل فون نکال کر اس کے اسکرین پر نظر ڈالی، پھر فون کان سے لگاتے ہوئے بولی۔ "جی رامین صاحب!"

عادل اس کی طرف دیکھنے لگا۔ شمی نے دوسری طرف کی آواز سننے کے بعد کہا۔ "نہیں رامین صاحب! پریشانی کیا ہوتی...... آپ نے میرے لیے پورا کمپارٹمنٹ ہی ریزرو کروا دیا تھا...... نہیں، تنہائی سے بھی مجھے بوریت نہیں ہوتی لیکن اتفاق سے تنہائی بھی نہیں رہی۔ عادل غلطی سے آگئے تھے میرے کمپارٹمنٹ میں!" یہ جواب دیتے ہوئے شمی نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ عادل کی طرف دیکھا، پھر قدرے رک کر بولی۔ "بس اتفاق سمجھیے۔ انہیں کسی کام کے سلسلے میں لاہور آنا پڑا تھا۔ فلائٹس کینسل ہو جانے کے بعد انہیں بھی ٹرین ہی کا خیال آیا۔ کسی وجہ سے انہیں اسٹیشن پہنچنے میں دیر ہو گئی تھی۔ چلتی ٹرین میں سوار ہوئے تھے اس لیے اس بوگی تک نہ پہنچ سکے جس میں ان کا ریزرویشن ہے۔ وہ میرے کمپارٹمنٹ میں آگئے۔ انہوں نے سوچا تھا کہ اگلا کوئی اسٹیشن آنے پر وہ اپنی جگہ چلے جائیں گے لیکن میں نے انہیں روک لیا۔"

عادل نے اپنی جگہ بے چینی سے پہلو بدلا۔ اس کے دل میں شدت سے یہ خواہش ابھری تھی کہ وہ دوسری طرف سے آنے والی آواز بھی سنے لیکن یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ وہ اٹھ کر شمی کے برابر میں جا بیٹھتا اور اپنا سر اس کے سر کے قریب کر لیتا مگر اس کا یہ اقدام تہذیب کے خلاف ہوتا اس لیے کسمسا کر رہ گیا۔

شمی اب کہہ رہی تھی۔ "نہیں...... اتنی جلدی کھانا کیسے کھا لیتی...... ابھی تو آٹھ ہی بجے ہیں۔ ٹرین ابھی کسی اسٹیشن پر رکی ہے۔ معلوم نہیں کون سا اسٹیشن ہے۔"

عادل نے اسٹیشن کا نام دیکھ لیا تھا۔ اس نے بولنا چاہا لیکن پھر خاموش ہی رہ گیا۔

شمی نے دوسری طرف سے کچھ سننے کے بعد کہا۔ "ڈرنک کچھ دیر بعد لوں گی۔ گویا کھانا ساڑھے نو بجے تک کھاؤں گی۔" شمی نے مسکرا کر عادل کی طرف دیکھا۔ پھر دوسری طرف سے کچھ سننے کے بعد اس کے چہرے پر سنجیدگی کا گہرا تاثر آگیا۔ وہ بولی۔ "یادوں پر تو ظاہر ہے کہ اختیار نہیں ہوتا۔" پھر کچھ توقف سے اس کے چہرے پر تناؤ کی کیفیت آگئی۔ وہ پتھریلے سے لہجے میں بولی۔ "پلیز رامین صاحب!...... آئندہ آپ کی زبان پر یہ بات نہیں آنا چاہیے۔ اس وقت تکلیف پہنچائی ہے آپ نے مجھے!...... اوہ...... نہیں...... پلیز...... سوری کہہ کر مجھے شرمندہ نہ کیجیے......! ہاں۔" وہ یکایک خفیف سی مسکرائی۔ "مجھے خوشی ہوئی کہ آپ اپنے الفاظ واپس لے رہے ہیں...... اور ہاں!...... تاج بی بی آپ کا خیال رکھ رہی ہیں نا؟...... دوپہر کو کھانا وقت پر کھا لیا تھا؟...... گڈ!...... آپ خود بھی اپنی دوا کا خاص طور سے خیال رکھیں...... جی ٹھیک ہے...... خدا حافظ۔" شمی نے رابطہ منقطع کر کے سیل فون پرس میں رکھ لیا۔ عادل اب بھی اسی کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

ٹرین جہاں رکی تھی، وہ کوئی چھوٹا سا اسٹیشن تھا جہاں اسے کم وقت ہی رکنا تھا۔ انجن کی دوسری سیٹی کے ساتھ وہ بہ

آہستگی حرکت میں آگئی۔

"رامین صاحب کو......" عادل ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "میرے بارے میں سب کچھ شاید پہلے ہی بتا چکی ہو۔"

"ہاں۔" شمی نے مختصر جواب دیا۔

"ایسا کیا کہہ دیا تھا انہوں نے جس سے تمہیں تکلیف پہنچی تھی؟"

"وہ......" شمی افسردگی سے مسکرائی۔ "بس تھی کوئی بات!"

"انہوں نے اپنے الفاظ بھی واپس لیے تھے۔"

"ہوں۔ میں ذرا باتھ روم ہو آؤں۔" شمی اٹھی۔

عادل سمجھ گیا کہ شمی اس موضوع پر گفتگو سے گریز کرنا چاہتی ہے۔ عادل نے فیصلہ کیا کہ اب اسے بھی شمی کو کریدنے کی مزید کوشش نہیں کرنا چاہیے۔

شمی باتھ روم سے آکر بیٹھی اور بیگ میں سے وہسکی کی بوتل نکالنے لگی۔ فولڈنگ ٹرے کھول کر بوتل اس پر رکھی پھر گلاس اٹھاتے ہوئے بولی۔ "یہ دھو لاؤں۔"

عادل سر ہلا کر رہ گیا۔ ٹرین اب نہایت تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔ شاید اتنی ہی تیزی سے کچھ خیالات بھی عادل کے دماغ میں چکرانے لگے تھے۔ اس نے پہلے کبھی رامین اور شمی کے بارے میں اس طرح نہیں سوچا تھا۔ پہلی بار اس کے دماغ میں کچھ ایسے شبہات رینگنے لگے تھے جن کا سایہ بھی کبھی اس کے دماغ پر نہیں پڑا تھا۔ یہ سوال تو اس کے دماغ میں خاصا چبھ رہا تھا کہ رامین نے ایسی کیا بات کہی تھی جس سے شمی کو تکلیف پہنچی تھی اور پھر رامین نے اپنے وہ الفاظ واپس بھی لے لیے تھے۔ عادل وہ الفاظ جاننا چاہتا تھا لیکن شمی ٹال گئی تھی...... مگر کیوں؟...... کیوں؟ عادل کے دماغ پر اس سوال کے تھپیڑے سے لگ رہے تھے۔

شمی گلاس دھو کر باتھ روم سے واپس آئی۔ اپنی برتھ پر بیٹھ کر اس نے گلاس فولڈنگ ٹرے پر رکھ کر وہسکی کی بوتل اٹھائی۔ اس کا ڈھکنا کھولتے ہوئے اس نے عادل کی طرف دیکھا۔ "ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے تم گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے ہو۔"

"گہری سوچ!" عادل کی مسکراہٹ میں پھیکا پن تھا۔ "نہیں، کچھ ایسی خاص گہری بھی نہیں۔"

شمی نے اس طرح سر ہلایا جیسے اس نے عادل کے جواب پر یقین کر لیا ہو لیکن عادل کے خیال کے مطابق شمی نے سمجھ لیا تھا کہ اس کے دماغ میں کس قسم کے خیالات چکرا رہے تھے۔ ان کے بارے میں جاننے کے لیے اصرار اس نے اس لیے نہیں کیا تھا کہ وہ اس موضوع پر بات کرنے سے گریز کرنا چاہتی تھی۔

اپنے لیے ایک پیگ بنانے کے بعد شمی نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ عادل کی طرف دیکھا۔ نظریں ملتے ہی اس نے ڈرنک کی بوتل پر ایک اُچٹتی سی نظر ڈال کر پھر عادل کی طرف دیکھا۔ عادل نے اس کی آنکھوں میں استفہام محسوس کیا اور بہت دھیرے سے ہنس دیا۔

"نہیں شمی!...... میں نہیں پیوں گا۔"

"اوکے!...... اب اس وقت میں اصرار بھی نہیں کروں گی۔" شمی نے کہا اور ایک گھونٹ لے کر بولی۔ "کبھی کبھی ایک خواہش میرے دماغ میں شدت سے ابھرتی ہے۔"

"وہ کیا؟" عادل نے جلدی سے پوچھا۔

شمی نے جواب دیا۔ "میں نے شہرت تو بہت حاصل کر لی ہے لیکن میری خواہش ہے کہ میں مونا لیزا جیسا کوئی شاہکار بنا سکوں جو میری دائمی شہرت کا سبب بن سکے۔"

"ہوں۔" عادل کی آواز اتنی دھیمی تھی جیسے وہ شمی کے جواب سے مایوس ہوا ہو۔ وہ کچھ اور ہی سننا چاہتا تھا لیکن شمی دنیا کے بڑے مصوروں اور ان کے بنائے ہوئے شاہکاروں ہی پر بات کرتی رہی۔ عادل کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور اس کا خیال تھا کہ شمی نے بھی اس کی عدم دلچسپی محسوس کر لی ہوگی لیکن اس کے باوجود وہ وہی باتیں کرتی رہی۔

☆☆☆

اسٹیشنوں پر رُکتی رُکاتی ٹرین اپنا سفر طے کرتی رہی!

گیارہ بجے کے قریب شمی اور عادل اپنی اپنی برتھ پر لیٹ گئے۔ عادل نے اخبار اٹھا لیا۔ شمی بھی مصوری کی کتاب اٹھاتے ہوئے بولی تھی۔ "کچھ دیر پڑھے بغیر نیند نہیں آتی مجھے!"

"میں بھی کچھ پڑھتا ہوں۔" عادل نے اخبار اپنی آنکھوں کے سامنے لاتے ہوئے کہا۔

لیکن وہ دوپہر کو بھی کچھ نہیں پڑھ سکا تھا اور نہ اب امکان تھا کہ وہ کچھ پڑھ پاتا۔ جب تک نیند نہ آجاتی دماغ میں خیالات موج در موج اُٹھتے ہی رہتے۔ اس کا خیال تھا کہ ایسا ہی شمی کے ساتھ بھی ہوگا۔ یہ اسے ناممکن لگ رہا تھا کہ اس کی رفاقت میں سفر کرتے ہوئے بھی شمی کو ماضی یاد نہ آتا۔

عادل کا یہ خیال بالکل درست تھا۔ شمی بس دکھاوے کے لیے کتاب اپنی آنکھوں کے سامنے کیے ہوئے تھی۔ ماضی فراموش کرنا اس کے لیے بھی ممکن نہیں تھا۔ خصوصاً اس سچویشن میں جبکہ عادل اس کا ہم سفر تھا۔

ماضی کے واقعات اس کے دماغ میں چکراتے ہی

رہے تھے۔ بہت سے مناظر اس کے تصور میں بار بار ابھرتے رہے تھے۔ اس وقت بھی وہ دیکھ رہی تھی کہ نعیمہ اور عادل اس کے گھر کے ڈرائنگ روم میں ایک دوسرے کے بہت قریب قریب کھڑے تھے۔ قریب ہونے کی وجہ یہ تھی کہ نعیمہ، عادل کی قمیص کے گریبان کا کوئی بٹن ٹانک رہی تھی۔

''اگر میری نظر نہ پڑ جاتی تو آپ اسی طرح روانہ ہوجاتے دفتر کے لیے۔'' نعیمہ نے بٹن ٹانکنے کے دوران میں کہا تھا۔

''کیا کرتا پھر؟'' عادل نے جواب میں کہا تھا۔ ''اگر کالر کا بٹن ٹوٹا ہوا ہوتا تو ٹائی باندھتے وقت نظر پڑ جاتی۔ بعد میں نظر پڑی تو سوچا کہ چلنے دو۔ ٹائی کے نیچے چھپ جائے گا۔ قمیص تبدیل کرنے میں کچھ وقت لگتا۔ ادھر تمہارا خیال تھا کہ انتظار کر رہی ہوگی۔ یہ عجیب ہی عادت ہے تمہاری کہ دفتر پہنچنے میں ایک منٹ کی بھی تاخیر نہ ہو۔''

''تاخیر تو اب ہو ہی گئی نا!'' نعیمہ نے بٹن ٹانکنے کے بعد سوئی دھاگا وہیں ایک صوفے پر ڈال دیا۔ ''بس اب چلیے!''

شمی نے یہ منظر اتفاق سے اس لیے دیکھ لیا تھا کہ اس صبح نہ جانے کیوں اس کی آنکھ خاصی جلدی کھل گئی تھی۔ نعیمہ اور عادل دفتر جانے کے لیے ٹھیک نو بجے روانہ ہوجاتے تھے یا نو بجے سے دو چار منٹ پہلے۔ اس کے برخلاف شمی ساڑھے نو بجے سے پہلے بیدار نہیں ہوتی تھی۔ پھر اطمینان سے غسل اور ناشتے سے فارغ ہوکر ساڑھے دس بجے تک گھر سے نکلا کرتی تھی۔ اگر وہ اس روز اتفاق سے جلدی نہ اٹھ جاتی تو وہ سب کچھ اس کی نظر میں نہ آتا۔

کلثوم بیگم کے انتقال کے بعد شمی نے مناسب نہیں سمجھا تھا کہ نعیمہ اپنے گھر میں اکیلی رہے چنانچہ وہ رسمی طور پر عادل سے مشورہ کرکے نعیمہ کو اپنے گھر لے آئی تھی۔

ماں کی موت کے صدمے سے نکل آنے کے بعد نعیمہ کو گھر میں تنہائی سے وحشت ہوتی تھی کیونکہ شمی اور عادل دفتر چلے جایا کرتے تھے۔

''اب میں بھی دفتر چلا کروں گی۔'' اس نے ایک روز شمی اور عادل سے کہا تھا۔

شمی ہنس پڑی تھی۔ ''ہاں ہاں، کیوں نہیں!...... آخر تیسری ڈائریکٹر تم بھی ہو کمپنی کی۔''

اس وقت تک عادل اکیلا ہی دفتر جایا کرتا تھا۔ کمپنی کی بھاری ذمے داری اسی نے اپنے سر لے رکھی تھی اس لیے وہ ضروری سمجھتا تھا کہ دفتر جانے کے لیے ساڑھے نو بجے تک گھر سے نکل جایا کرے۔ اس نے کبھی شمی سے نہیں کہا تھا کہ وہ اپنی عادت بدلے اور صبح جلدی اٹھ کر اس کے ساتھ دفتر جایا کرے۔ غالباً شمی کا یہ جملہ اس کے ذہن سے چپک کر رہ گیا تھا کہ ''ہر انسان کو اپنی زندگی اپنے طریقے سے گزارنے کا حق ہونا چاہیے۔''

شمی کو اس کے اکیلے جانے پر کیا اعتراض ہوتا، وہ تو خوش ہوئی تھی کہ اس طرح اسے جلدی نہیں اٹھنا پڑے گا۔

اس کے بعد یہ معمول بن گیا کہ نعیمہ اور عادل ساتھ ساتھ دفتر چلے جایا کرتے تھے۔ نعیمہ کچھ زیادہ ہی جلدی جاگنے کی عادی تھی لہٰذا اس نے عادل سے یہ طے کرلیا تھا کہ انہیں دفتر جانے میں ذرا بھی دیر نہیں کرنا چاہیے، وہ زیادہ سے زیادہ نو بجے تک گھر سے روانہ ہوجایا کریں گے۔

عادل اور شمی کی شادی کو ایک سال گزر چکا تھا۔ اس دوران عادل اور نعیمہ کے درمیان بے تکلفی بڑھتی رہی تھی۔ پھر جب اسے شمی اپنے گھر لے آئی تو اس بے تکلفی میں مزید اضافہ ہوگیا۔ عادل سے نعیمہ کی چھیڑ چھاڑ شمی کے سامنے ہوتی رہتی تھی جس پر شمی ہنستی رہتی تھی۔ وہ سالی بہنوئی کی چھیڑ چھاڑ کو مشرقی رسم و رواج کا حصہ سمجھتی تھی۔ وہ نعیمہ کو عادل کی قمیص کا بٹن ٹانکتے ہوئے دیکھ کر یہ واقعہ بھی بھول جاتی لیکن اسے یہ برا لگا تھا کہ بٹن لگاتے وقت نعیمہ، عادل کے بہت قریب ہوگئی تھی۔ شمی نے یہ منظر اوپری منزل کی بالکونی سے دیکھا تھا اور محسوس کیا تھا کہ ان دونوں کے جسم ایک دوسرے سے مس بھی ہوگئے تھے۔ دن بھر شمی کے دماغ میں خلش سی رہی، لیکن پھر اس نے یہ سوچ کر اس خیال کو ذہن سے جھٹکا کہ اس نے وہ منظر دور سے دیکھا تھا لہٰذا ضروری نہیں کہ اس کا خیال درست ہی ہو۔

چند دن میں اس نے یہ واقعہ بالکل ہی فراموش کردیا۔

ایک اتوار کو وہ دوپہر کے کھانے کے بعد اپنی ایک دوست سے ملنے کے لیے روانہ ہوئی۔ عادل یا نعیمہ کو اس نے اپنے ساتھ لے جانا مناسب نہیں سمجھا تھا کیونکہ اس کی دوست شادی کے چند ماہ بعد ہی کچھ ازدواجی مسائل میں پھنس گئی تھی اور اسی سلسلے میں شمی سے مشورہ کرنا چاہتی تھی۔

شمی کی کار نے تین چوتھائی فاصلہ طے کرلیا تھا جب کار کے ایئرکنڈیشنر میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی اور اس نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ کار روک کر اس خرابی کو چیک کرنا یا کسی معمولی خرابی کو ٹھیک کرنا شمی کے بس کی بات نہیں تھی اس لیے وہ اسی حالت میں کار چلاتی رہی۔ کار میں جو تھوڑی بہت ٹھنڈک تھی،

وہ بہت جلد ختم ہوگئی کیونکہ ان دنوں نہایت شدید گرمی پڑ رہی تھی۔ ٹھنڈک ختم ہوتے ہی حبس کا احساس ہوا۔ شمی نے اپنی طرف کی کھڑکی کا شیشہ کھولا تو اس کے چہرے پر لُو کے تھپیڑے پڑنے لگے۔ دوست کا گھر اب قریب آچکا تھا لیکن اتنی ہی دیر میں شمی پسینے میں شرابور ہوگئی۔

اس کی دوست فائزہ نے اسے اس حال میں دیکھا تو اسے تعجب ہوا۔ شمی نے اسے بتایا کہ اس کی گاڑی کا ایئرکنڈیشنر راستے میں خراب ہوگیا تھا۔

ٹھنڈے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ٹھنڈا مشروب پینے سے اس کی حالت سنبھلی۔ اس دوران میں باتیں بھی ہوتی رہی تھیں۔ فائزہ کی عمر اٹھائیس سال ہوچکی تھی۔ مختلف وجوہ سے اس کی شادی چند سال کی تاخیر سے ہوئی تھی۔ اب شادی کے چند ماہ بعد اسے علم ہوا تھا کہ اس کے شوہر نے سترہ اٹھارہ سال کی ایک خوب صورت لڑکی میں دلچسپی لینا شروع کردی تھی۔ لڑکی کا تعلق اوسط درجے کے گھرانے سے تھا۔ وہ اپنی عمر سے دگنی عمر کے شخص کی طرف اس لیے راغب ہوگئی تھی کہ ایک دولت مند شخص اسے نہایت عیش و عشرت کی زندگی مہیا کرسکتا تھا اور اب اس کا قوی امکان پیدا ہوچکا تھا کہ فائزہ کا شوہر اس لڑکی سے شادی کرلیتا۔

''مردوں کو ہوس ہوتی ہے نوعمر لڑکیوں کی۔'' فائزہ نے کچھ غصے اور افسردگی سے کہا۔ ''تم کو میں نے اس لیے بلایا ہے شمی کہ تم کوئی صحیح مشورہ دے سکو گی۔ میں تو غصے میں ہوں اور جانتی ہوں کہ غصے میں عموماً غلط فیصلے ہوجاتے ہیں۔''

اس موضوع پر ان دونوں میں گھنٹے بھر تک گفتگو ہوئی۔ شمی جس حد تک بہتر مشورے دے سکتی تھی، وہ اس نے دیے۔

ایک گھنٹے بعد جب وہ اپنے گھر واپس جانے کے لیے اٹھی تو فائزہ نے کہا۔ ''تمہاری گاڑی کا ایئرکنڈیشنر خراب ہے اور گرمی آج بے پناہ ہے۔ لو بھی چل رہی ہے۔ تم میری گاڑی لے جاؤ۔ اپنے شوفر سے واپس بھجوا دینا۔ وہی تمہاری گاڑی یہاں سے لے جائے گا۔ اسے میرے گھر کا پتا سمجھا دوگی تو کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی اسے۔''

شمی نے فائزہ کی بات مان لی۔ اس کے والد کی زندگی میں تو دو شوفر ملازم تھے۔ صادق علی صاحب کی وفات کے بعد ایک شوفر کی چھٹی کردی گئی تھی۔ دوسرا شوفر اس لیے رہنے دیا گیا تھا کہ کاروں کی صفائی، اس کے ذریعے سے کاروں کو سروس اسٹیشن بھیجنے یا اور کسی چھوٹے موٹے کام کے سلسلے میں اس کی ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ نعیمہ کو بھی اس کی ضرورت تھی۔ اس کی کار گھر میں تھی مگر جب کہیں جانا ہوتا تو وہ شوفر ہی کے ساتھ جاتی تھی، ابھی تک اس نے کار ڈرائیونگ نہیں سیکھی تھی۔

روانگی کے وقت فائزہ نے اسے سن گلاس بھی دے دیا۔ اسی دن یہ اتفاق بھی ہوا تھا کہ شمی گھر سے چلتے وقت اپنا سن گلاس لینا بھول گئی تھی۔ فائزہ کا سن گلاس شمی کے چہرے کے لیے بڑا تھا جو اس نے اس لیے گوارا کرلیا کہ آنکھیں تو دھوپ کی شدت سے بچ جائیں۔

واپسی کا سفر طے کرتے ہوئے شمی کے دماغ میں فائزہ کی باتیں چکراتی رہیں۔

راستے میں ایک جگہ بہت بڑا گراؤنڈ پڑتا تھا جہاں نوعمر لڑکے کرکٹ یا فٹ بال وغیرہ کھیلا کرتے تھے لیکن چلچلاتی دھوپ، لو اور بلا کی گرمی میں اس وقت وہاں سناٹا ہی تھا۔

شمی اس گراؤنڈ کے قریب سے گزرتے ہوئے چونک گئی۔ گراؤنڈ میں اسے نعیمہ کی کار دکھائی دی تھی۔ اگرچہ اس ماڈل اور اسی رنگ کی بہت سی کاریں شہر میں اور بھی ہوں گی لیکن کار کی اگلی نشستوں پر بیٹھے ہوئے جوڑے کی ہلکی سی جھلک سے شمی کے دماغ میں یہ شبہ پیدا ہوا تھا کہ وہ نعیمہ اور عادل تھے۔

عام حالات میں انسان معمولی قسم کے شبہے کو ذہن سے جھٹک دیتا ہے لیکن شمی کے دماغ میں اس وقت فائزہ کی باتیں چکرا رہی تھیں۔ ان باتوں کی وجہ سے شبہے کو تقویت اس منظر نے پہنچائی جب نعیمہ ایک صبح عادل کی قمیص کا بٹن ٹانک رہی تھی۔ شمی کو یہ شبہ بھی ہوا تھا کہ ان دونوں کے جسم ایک دوسرے سے مس ہوئے تھے۔

شمی نے بریک لگائے کیونکہ گراؤنڈ میں داخلے کا پھاٹک پیچھے رہ گیا تھا۔ اس وقت شمی کے دماغ میں فائزہ کا یہ جملہ بھی گونج رہا تھا۔

''مردوں کو ہوس تو ہوتی ہے نوعمر لڑکیوں کی۔''

اگرچہ نعیمہ کو نوعمر تو نہیں کہا جاسکتا تھا لیکن شمی سے وہ بہرحال چار سال چھوٹی تھی اور ابھی غیر شادی شدہ بھی تھی۔ شمی کار موڑ کر پھاٹک سے گراؤنڈ میں داخل ہوگئی۔ جلد ہی اس کا شبہ درست ثابت ہوگیا۔ کار میں نعیمہ اور عادل ہی تھے۔

نعیمہ نے اس وقت تک ڈرائیونگ نہیں سیکھی تھی۔ عادل اس وقت اسے ڈرائیونگ سکھا رہا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ نعیمہ کے شانے پر پھیلا ہوا تھا جو اسٹیئرنگ پر نعیمہ کے ہاتھ پر جما ہوا تھا۔

شمی کی کار قریب دیکھتے ہی نعیمہ کے دونوں پیر ایکسی لریٹر اور کلچ پر توازن کھو بیٹھے۔ کار ایک جھٹکے سے رک گئی۔

عادل نے اپنا ہاتھ نعیمہ کے شانے سے ہٹالیا۔

☆☆☆

ٹرین میں سوتی ہوئی شمی خواب میں اس وقت وہی منظر دیکھ رہی تھی جب نعیمہ کی کار ایک دھچکے کے ساتھ رکی تھی۔

شمی کی آنکھ اس لیے کھلی کہ ٹرین میں بھی خاصا دھچکا لگا تھا۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھی اور اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"کیا ہوا عادل؟"

ٹرین۔۔ دھچکا کھانے کے بعد اب رک بھی چکی تھی۔

"معلوم نہیں کیا ہوا ہے۔ باہر جا کے دیکھنا پڑے گا۔" عادل کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔ اس نے اخبار برتھ پر ڈال دیا تھا۔ اس کی حالت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے جاگے ہوئے دیر ہو چکی تھی۔

کمپارٹمنٹ سے نکل کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔

شمی نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ نو بج چکے تھے۔ گویا صبح ہوئے بھی دیر ہو چکی تھی۔

شمی اٹھ کر باتھ روم کی طرف بڑھی۔ وہ جو خواب دیکھتے ہوئے جاگی تھی، اس سے متعلق خیالات اس کے ذہن میں چکرانے لگے۔ باتھ روم سے وہ برش کر کے اور منہ ہاتھ اچھی طرح دھو کر باہر نکلی تو عادل واپس آ چکا تھا۔

"ایک بھینس آ گئی تھی ٹرین کے آگے۔" عادل نے اسے ٹرین کے دھچکا کھانے اور رکنے کی وجہ بتائی۔ "وہ تو کہو کہ انجن ڈرائیور نے کچھ دور سے دیکھ لیا تھا اور بریک لگانا شروع کر دیا تھا۔ اگر پوری رفتار سے ٹکراؤ ہوتا تو نہ جانے کیا صورت بنتی۔"

"او گاڈ! پھر تو شاید ٹرین ہی پٹری سے اتر جاتی۔"

"شاید۔"

"ٹرین اب کتنی دیر میں چلے گی؟"

عادل کو اس بات کا جواب نہیں دینا پڑا۔ انجن کی سیٹی کے ساتھ ٹرین بہ آہستگی حرکت میں آ گئی تھی۔

"ناشتا کر لیا جائے۔" شمی نے ٹفن نکالتے ہوئے کہا۔

شمی نے اس مرتبہ جو ٹفن نکالا تھا، وہ قدرے چھوٹا تھا۔ اس میں اُبلے ہوئے اور فرائی انڈوں کے علاوہ مکھن، جیلی، جام اور شاہی ٹکڑے بھی تھے۔ چائے کا تھرماس عادل پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔

"تم شاید کافی پہلے اٹھ چکے ہو۔" شمی نے تمام سامان فولڈنگ ٹرے پر لگاتے ہوئے کہا۔

"میں تو ساڑھے سات بجے ہی جاگ گیا تھا۔ گھنٹے بھر پہلے گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی تھی تو جا کے اسٹال سے اخبار بھی لے آیا تھا۔ اس کی ایک خبر کے مطابق ایئر لائن کی انتظامیہ اور پائلٹ ایسوسی ایشن کے مذاکرات رات کو ہو گئے تھے اور کامیاب رہے تھے۔"

"اوہ! گویا پائلٹس کی ہڑتال ختم ہو گئی ہو گی۔"

"ہاں۔" عادل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اگر میں نے..... بلکہ تم نے بھی..... جلدی نہ کی ہوتی تو آج صبح کی فلائٹ سے کراچی آ سکتے تھے۔"

"لیکن کم از کم میں یہ رسک نہیں لے سکتی تھی۔ اگر ہڑتال ختم نہ ہوتی تو میرے لیے مشکل ہو جاتی..... بہت ضروری تھا کہ آج میں کراچی میں ہوں۔"

شمی نے بیگ میں سے ڈبل روٹی نکالی۔

عادل اپنی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے بولا۔ "ہم ڈیڑھ گھنٹے میں کراچی پہنچ جائیں گے، وہاں تمہارا قیام کہاں ہو گا؟..... جب تم لاہور شفٹ ہو گئی تھیں تو گھر بیچ دیا تھا تم نے اپنا۔"

"ہاں۔ انور شاد صاحب نے پی سی میں میرے لیے کمرا بک کرا دیا ہو گا۔ فون پر بات ہو گئی تھی ان سے۔ میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ ٹرین سے آ رہی ہوں۔ وہ مجھے لینے اسٹیشن بھی آئیں گے۔"

"یہ شاد صاحب کون ہیں؟"

"جو میری تصاویر کی نمائش کرا رہے ہیں۔"

"اچھا وہ!..... آرٹس کونسل والے شاد صاحب!..... ایک دو بار ملاقات ہوئی ہے ان سے میری!..... بہت نفیس آدمی ہیں۔"

"ہوں۔"

"تم نمائش میں کب پہنچو گی؟"

"بس اندھیرا پھیلتے ہی۔" شمی نے جواب دیا۔ "شاد صاحب ہی ہوٹل آ کر مجھے لے جائیں گے۔ کرائے کی کار کا بندوبست میں نے اس لیے نہیں کرایا کہ مجھے کہیں آنا جانا تو ہے نہیں۔ ہوٹل سے نمائش اور نمائش سے ہوٹل!..... اور شاد صاحب نے یہ ذمے داری اپنے سر لے لی ہے۔"

ان باتوں کے دوران میں انہوں نے ناشتا شروع کر دیا تھا۔

"اگر....." عادل کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

شمی استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"اگر....."

"میرا مطلب ہے....." عادل نے ہچکچاتے ہوئے

کہا۔ "تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں آؤں نمائش دیکھنے؟"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں، بلکہ....." اس مرتبہ شمی کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"بلکہ.....؟" عادل نے اسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا۔

شمی ٹال گئی۔ اس نے پوچھا۔ "اخبار میں کوئی اہم سیاسی خبر ہے؟"

"نہیں۔ عام سی خبریں ہیں۔" عادل نے جواب دیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ شمی کیا کہتے کہتے رک گئی تھی۔ اس کے یقین کے مطابق شمی چاہتی تھی کہ وہ اپنے ساتھ نعیمہ کو بھی لائے۔

"تم اسٹیشن سے گھر کیسے جاؤ گے؟" شمی نے کچھ رک کر پوچھا، پھر ہنس کر بولی۔ "نعیمہ تو بہت بے چین ہو گی گوجرانوالہ کے میسو کھانے کے لیے۔"

شمی کا دوسرا فقرہ قطعی بے تکا تھا۔ عادل یہ بات بخوبی سمجھ گیا۔

عادل نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "وہ نہیں آ سکے گی۔ میری عدم موجودگی کے باعث کمپنی میں اس کی ذمے داری بہت بڑھ جاتی ہے۔ شوفر آئے گا کار لے کر۔ نعیمہ تو اس وقت دفتر میں ہو گی!"

شمی اس جواب سے کچھ مایوس ہوئی لیکن اس نے کوشش کی تھی کہ اس کے چہرے سے کچھ ظاہر نہ ہو۔ یہ دوسری بات ہے کہ عادل نے اس کی کیفیت محسوس کر لی تھی۔

ناشتا کر چکنے کے بعد شمی نے سامان سمیٹنا شروع کیا۔ عادل نے اسے بتا ہی دیا تھا کہ وہ کچھ دیر میں کراچی پہنچنے والے ہیں۔

"میں اب اس وقت نہاؤں گی تو نہیں۔" وہ بولی۔ "لیکن ساری بدل لیتی ہوں۔"

عادل نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ اگر وہ نہ ہوتا تو شمی سوتے وقت نائٹی ہی پہنتی۔ اس کی وجہ سے وہ ساری ہی پر چادر اوڑھ کر سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔ ایسی صورت میں یہ تو ہونا ہی تھا۔ سوٹ کیس سے دوسری ساری اور متعلقہ چیزیں نکال کر وہ باتھ روم میں چلی گئی۔ اس کے باہر آنے تک عادل اخبار کی سرخیوں پر نظر دوڑاتا رہا۔ جب وہ باہر آئی تو عادل بولا۔

"کیا اب صرف ساری ہی باندھنے لگی ہو؟"

"ہاں۔" شمی نے جواب دیا۔ "اب اس عمر میں مجھے وہ لباس پسند نہیں رہے جو میں کبھی پہنا کرتی تھی۔"

"ساری واقعی ایک پُروقار لباس ہے۔"

شمی مسکرا کر رہ گئی۔ وہ اتاری ہوئی ساری سوٹ کیس میں رکھ رہی تھی۔

"لاہور آنے کے بعد میں اب پہلی مرتبہ کراچی جا رہی ہوں۔" وہ برتھ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "سنا ہے اب کراچی بہت تبدیل ہو گیا ہے۔"

"ہاں۔" عادل نے جواب دیا۔ "اب تم کراچی کی سڑکوں پر اکیلی سفر نہیں کر سکتیں، بھٹکتی رہو گی۔"

عادل اسے بتانے لگا کہ کراچی میں کہاں کہاں کیسے پل بن گئے تھے۔ شمی اگرچہ وہ سب کچھ پہلے بھی لوگوں سے سن چکی تھی اور اس نے بدلے ہوئے کراچی کی تصاویر بھی دیکھی تھیں لیکن اس نے عادل کو وہ سب کچھ بتانے سے نہیں روکا۔ وہ چاہتی تھی کہ کراچی آنے تک یہی باتیں ہوتی رہیں، کوئی اور موضوع نہ چھڑ سکے۔

"کینٹ اسٹیشن تو قریب آ گیا ہے۔" عادل بولا۔ "تم کہاں اترو گی؟"

"میں سٹی اسٹیشن پر اتروں گی۔"

"مجھے بھی وہیں اترنا تھا لیکن میں کینٹ پر ہی اتر جاتا ہوں۔ شوفر کو فون کیے دیتا ہوں کہ وہ کینٹ اسٹیشن پہنچے۔ مناسب نہیں ہو گا کہ ہم ساتھ ساتھ اتریں۔ شاد صاحب مجھے جانتے ہیں۔ ان کے علم میں غالباً یہ بات نہیں آنا چاہیے کہ ہم نے ساتھ ہی سفر کیا ہے۔"

شمی نے نظریں جھکا لیں اور بہت آہستگی سے ٹھنڈی سانس لی۔ جواب میں اس کے کچھ نہ کہنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ عادل کے خیال سے متفق تھی۔

کینٹ اسٹیشن پر گاڑی رکی۔ عادل اپنا بریف کیس اٹھاتے ہوئے کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی شمی بھی اٹھی اور عادل کے ساتھ ہی کمپارٹمنٹ سے نکلی۔ "میں آرٹ گیلری میں تمہاری منتظر رہوں گی۔" وہ مختصر سی راہداری طے کرتے ہوئے بولی۔

"میں ضرور آؤں گا۔"

جب عادل بوگی سے اترا تو اس میں اور شمی میں "خدا حافظ" کا تبادلہ ہوا۔ پھر شمی دروازے میں اس وقت تک کھڑی رہی جب تک عادل اسے نظر آتا رہا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اپنے کمپارٹمنٹ کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے محسوس کیا جیسے اس کے قدم بوجھل ہو گئے ہوں۔ اب اس کے چہرے پر اداسی بھی نظر آ رہی تھی۔

کمپارٹمنٹ میں برتھ پر بیٹھنے کے بعد بھی اس کے

چہرے پر اداسی قائم رہی۔ جب گاڑی کراچی اسٹیشن پر رکی تو وہ کھڑی ہوئی۔

انور شاد کو بوگی کا نمبر بتادیا گیا تھا اس لیے وہ بہ آسانی شمی کی بوگی کے دروازے پر آ گیا۔ ایک قلی بھی اس کے ساتھ تھا جس نے شمی کا سامان اتارا۔

انور شاد اور شمی رسمی باتیں کرتے ہوئے اسٹیشن سے نکلے۔

جب انور شاد کی کار اسٹیشن سے روانہ ہوئی تو شمی اس کے برابر میں بیٹھی ہوئی تھی۔

پی سی کے کمرے میں پہنچنے کے بعد انور شاد نے پوچھا۔ ''شام کو میں کس وقت آجاؤں آپ کو لینے!''

''بس ایسے وقت آجایئے گا کہ جب میں وہاں پہنچوں تو اندھیرا پھیلنا شروع ہو چکا ہو۔''

''ٹھیک ہے۔ میں ساڑھے چھ بجے تک آجاؤں گا۔''

شمی نے انور شاد کو رخصت کرنے کے بعد کمرے کا دروازہ بند کیا اور تیزی سے اپنے اس بیگ کے قریب پہنچی جس میں وہسکی کی بوتل تھی۔

گزشتہ روز اچانک عادل کا سامنا ہونے کے بعد اسے ماضی کی یادوں نے شدت کے ساتھ گھیر لیا تھا اور اس کا دل چاہا تھا کہ وہ خود کو ڈرنک میں ڈبو دے۔ عادل ہی کی وجہ سے اسے یہ خواہش ہوئی تھی لیکن عادل ہی کی وجہ سے اس نے زیادہ پینے سے گریز کیا تھا۔

اب جو تنہائی ملی تو اس سے رہا نہ جاسکا۔ اب بھی اس کی یہ پرانی عادت برقرار تھی کہ وہ دن میں وہسکی نہیں پیتی تھی لیکن اس وقت وہ پہلا پیگ صرف دس منٹ میں پی گئی۔ دوسرے پیگ سے بھی اس نے دو بڑے گھونٹ لیے اور گلاس تپائی پر رکھ کر اسے گھورنے لگی۔ ماضی کے واقعات اس وقت بھی اس کے دماغ میں گردش کر رہے تھے۔ یکے بعد دیگرے واقعات کے بعد وہ واقعہ بھی اس کے دماغ میں ابھرا جب اس نے نعیمہ اور عادل کو ایک کار میں دیکھا تھا۔

☆☆☆

شمی کے خیال کے مطابق اس وقت ان دونوں نے ڈھٹائی کا ثبوت دیا تھا۔

نعیمہ نے چونک کر ہنستے ہوئے کہا تھا۔ ''ارے باجی!...... آپ یہاں کیسے؟'' وہ انجن بند کرکے کار کا دروازہ کھولنے لگی تھی۔

دوسری طرف کے دروازے سے عادل اتر رہا تھا۔

شمی نے بھی اپنی کار روک دی تھی اور بائیں جانب کی کھڑکی کا شیشہ تھوڑا سا کھول دیا۔ ''یہاں کیا ہو رہا ہے؟'' شمی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

نعیمہ کے پیچھے عادل بھی تیزی سے قریب آ گیا تھا۔

نعیمہ نے شمی کو جواب دیا۔ ''میں ڈرائیونگ سیکھ رہی ہوں باجی!...... گھر پر پڑے پڑے خیال آیا کہ عادل بھائی سے کہوں، یہ فوراً مان گئے میری بات!''

''تم اس وقت اِدھر کیسے نکل آئیں؟'' عادل نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ''تم تو اپنی کسی دوست سے ملنے گئی تھیں...... یہ کار بھی تمہاری نہیں ہے۔''

''میری کار کچھ خراب ہو گئی تھی۔ یہ میری دوست کی کار ہے۔ میں اب واپس آ رہی تھی۔'' شمی نے جواب دیا۔ پھر نعیمہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری کار پر نظر پڑ گئی تو......'' اس نے جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔

''اب گھر ہی چلیں۔'' نعیمہ نے سر گھما کر عادل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا خیال ہے۔''

''نہیں، تم سیکھو! میں جا رہی ہوں۔'' شمی نے کہا اور اپنی کار حرکت میں لے آئی۔

''باجی!'' نعیمہ نے اسے پکارا۔

کار آگے نکل جانے کے باوجود شمی نے نعیمہ کی آواز سن لی تھی لیکن اس نے کار نہیں روکی۔ کھڑکی کا جو شیشہ نیچے کیا تھا، وہ بھی اوپر کر دیا۔ راؤنڈ لے کر وہ اپنی کار پھاٹک کی طرف لے چلی گئی۔ اس نے عقب نما شیشے میں دیکھا کہ نعیمہ اور عادل بھی اب کار میں اس کے پیچھے آ رہے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر عادل تھا۔

شمی نے کار کی رفتار بہت تیز کر دی۔ وہ جانتی تھی کہ عادل ڈرائیونگ کرتے ہوئے بہت محتاط رہتا تھا اور کبھی زیادہ تیز رفتاری سے کار نہیں چلاتا تھا۔

شمی کے دماغ میں فائزہ کا جملہ پھر گونجنے لگا تھا۔

''مردوں کو تو ہوس ہوتی ہے تو عمر لڑکیوں کی!''

ایکسی لریٹر پر شمی کے پیر کا دباؤ غیر ارادی طور پڑھا تھا کیونکہ اس کے رگ و پے میں غصے کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اسے یقین تھا کہ نعیمہ کے شانے پر پھیلا ہوا عادل کا ہاتھ جو اسٹیئرنگ پر نعیمہ کے ہاتھ پر جما ہوا تھا، اس ہاتھ کی کلائی ضرور نعیمہ کے سینے کو چھو رہی ہوگی اور یہ بات صاف ظاہر تھی کہ نعیمہ نے اس لمس سے بچنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

شمی اس وقت گئی تو تھی اپنی دوست فائزہ کی ازدواجی زندگی کی اُلجھن دور کرنے کے سلسلے میں لیکن یہ سان گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ خود اس کی زندگی اسی قسم کے

بھونچال کی زد میں آچکی تھی یا آنے والی تھی۔

اس وقت شمی کے دماغ میں فائزہ کی ایک اور بات بھی گونجی۔ فائزہ نے کہا تھا۔ ”تم کو میں نے اس لیے بلایا ہے شمی کہ تم کوئی صحیح مشورہ دے سکو گی۔ میں تو غصے میں ہوں اور جانتی ہوں کہ غصے میں غلط فیصلے ہوجاتے ہیں۔“

اور شمی اس وقت غصے ہی میں تھی۔ نعیمہ اور عادل اس کے پیچھے آہی رہے تھے۔ وہ گھر پہنچتے ہی ان دونوں پر برس پڑتی، جو فائزہ کے خیال کے مطابق غلط بھی ہوسکتا تھا۔

خود شمی فائزہ کو سمجھا کر آئی تھی کہ وہ اس معاملے میں دل و دماغ ٹھنڈا رکھنے کے ساتھ ہی اپنے شوہر کو اپنا گرویدہ بنانے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرے اور اگر اس کے باوجود پانی سر سے اوپر نکلتا دکھائی دے تو پھر اس کے سامنے دو ہی راستے ہوں گے یا تو وہ سوکن برداشت کرے یا اپنے شوہر سے طلاق لے لے۔

فائزہ کی عمر ابھی اتنی زیادہ نہیں ہوئی تھی کہ وہ طلاق لینے کے بعد دوسری شادی نہ کرسکتی۔

فائزہ کو مشورہ دیتے ہوئے اس مشورے کے پس منظر میں شمی کا یہ نظریہ بھی تھا کہ ہر انسان کو اپنی زندگی اپنے طور پر گزارنے کا حق ہونا چاہیے لیکن اب خود شمی پر پڑی تھی تو اس کا انداز ایسا ہوگیا تھا جیسے وہ اپنے نظریۂ حیات پر قائم رہنے کی پوزیشن میں نہ رہی ہو۔ عادل سے اس کا یہ معاہدہ بھی ہوچکا تھا کہ ان دونوں کو ہمیشہ اپنی زندگی اپنے طور پر گزارنے کا حق حاصل رہے گا۔

گھر پہنچنے تک شمی نے فیصلہ کرلیا تھا کہ جیسا مشورہ اس نے فائزہ کو دیا تھا، اسی طرح خود بھی فوری۔ اپنا ردعمل ظاہر نہیں کرے گی اور اپنے دل و دماغ کو ٹھنڈا رکھے گی۔

کار روک کر اس نے شوفر کو بلایا اور اسے کار کی چابی دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ میری دوست فائزہ کی کار ہے۔ میری کار کا اے سی کچھ خراب ہوگیا ہے۔ وہ میں وہیں چھوڑ آئی ہوں۔ وہ تم وہاں سے لے آنا گھر لانے سے پہلے اس کا اے سی ٹھیک کروالینا۔“

اس نے شوفر کو فائزہ کے گھر کا پتا بھی سمجھا دیا۔ فائزہ کا سن گلاس اس نے کار میں ہی چھوڑ دیا تھا۔ نعیمہ کی کار اس وقت تک بنگلے میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ خود شمی کو بھی اندازہ تھا کہ عادل احتیاط سے ڈرائیونگ کرتا ہے اس لیے وہ دونوں چند منٹ بعد ہی پہنچ سکیں گے۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر شمی نے اپنا پرس بستر پر پھینکا اور فوراً باتھ روم میں چلی گئی۔ ابھی وہ اپنے غصے کو پوری طرح نہیں دبا سکی تھی اور اس کے لیے ٹھنڈے پانی کا شاور خاصا مفید ثابت ہوسکتا تھا۔ دو منٹ بعد جب وہ شاور کے نیچے کھڑی تھی اس نے کمرے کا دروازہ کھلنے کی مدھم آواز سنی۔ اس نے دروازہ اندر سے بولٹ اسی لیے کیا تھا کہ عادل کی آمد متوقع تھی۔

دروازہ کھلنے کی مدھم آواز کے بعد کچھ آوازیں باتیں کرنے کی بھی سنائی دیں لیکن وہ بھی مدھم تھیں۔ اس نے بس اتنا سمجھا کہ وہ آوازیں نعیمہ اور عادل کی تھیں۔ پھر ایسی آواز آئی جس سے اندازہ ہوا کہ دروازہ ایک بار پھر کھلا اور بند ہوا تھا۔ شمی سمجھ گئی کہ نعیمہ وہاں سے چلی گئی ہوگی۔

شمی نے آدھے گھنٹے تک ٹھنڈے پانی کا شاور لیا، پھر باتھ گاؤن پہن کر تولیے سے اپنے بال خشک کرتے ہوئے باتھ روم سے نکلی۔

عادل کپڑے تبدیل کرکے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ شمی نے یہ بھی دیکھا کہ اس نے اپنا پرس جو بستر پر ڈال دیا تھا، اٹھا کے سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا گیا تھا۔ عادل نے باتھ روم میں پانی گرنے کی آواز سے یہ بھی سمجھ لیا ہوگا کہ وہ باتھ روم میں تھی۔

”بڑی دیر لگادی تم نے!“ وہ شمی کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ ”عام طور پر دس بارہ منٹ میں نکل آتی ہو۔“

”گرمی بہت لگ رہی تھی۔“ شمی اپنے بال خشک کرتے ہوئے ایک صوفے کی طرف بڑھی۔ ”میں نے سوچا، ٹھنڈا پانی زیادہ دیر تک سر اور جسم پر گرتا رہے۔ میں نے باتھ روم میں قدموں کی آہٹ سن لی تھی۔ تمہارے ساتھ شاید نعیمہ بھی تھی؟“

”ہاں، وہ کچھ پریشان تھی اس لیے تم سے کچھ بات کرنے آئی تھی۔“

”پریشان؟“

”ہاں، اس کا خیال تھا کہ تمہیں اس کا ڈرائیونگ سیکھنا برا لگا تھا۔ میں نے اس سے کہا بھی تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوگی لیکن اس نے تمہارے تاثرات سے اندازہ لگایا تھا کہ تم غصے میں تھیں۔“

”قطعی نہیں۔ میں اس وقت کچھ پریشان تھی...... بس!“

”میرا بھی یہی خیال تھا۔ تم اپنی دوست سے ملنے گئی تھیں نا!...... تم نے مجھے بتا بھی دیا تھا کہ اس کا کچھ مسئلہ ہے۔ میں نے نعیمہ سے بھی کہا تھا کہ تم غصے میں نہیں بلکہ غالباً اپنی دوست ہی کے معاملے میں الجھی ہوئی اور کچھ پریشان ہوگی لیکن نعیمہ نے میرے خیال کو درست نہیں سمجھا تھا۔ اسی لیے وہ میرے ساتھ کمرے میں بھی آئی تھی لیکن تم باتھ روم میں تھیں۔ وہ یہ کہہ کر چلی گئی کہ تھوڑی دیر بعد آکر بات کرے گی تم سے!“

”بے وقوف ہے وہ تو۔“ شمی نے سرسری انداز میں کہا۔ ”مجھے بھلا کیوں اعتراض ہوگا اس کے ڈرائیونگ سیکھنے پر!“

”مجھے تو اس کا یقین تھا۔“ عادل نے جواب دیا، پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”تمہاری یہ بات بھی تو میرے ذہن میں ہے نا کہ ہر انسان کو اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کا حق ہونا چاہیے جس میں کسی دوسرے کی دخل اندازی کو تم گوارا نہیں کرسکتیں۔“

شمی دھیرے سے ہنس دی۔ اگرچہ ابھی اس کے جذبات پوری طرح قابو میں نہیں آئے تھے لیکن پھر بھی اس نے خود کو بڑی حد تک سنبھال لیا تھا۔

”اب جلدی سے تیار ہوجاؤ۔“ عادل بولا۔ ”پھر چائے پی جائے۔“

شمی اٹھ کر سنگار میز کی طرف گئی اور اس کی ایک دراز سے ہیئر ڈرائر نکالتے ہوئے بولی۔ ”اب تو کافی دیر ہوگئی۔ نعیمہ ابھی آئی نہیں۔“

”ہاں، یہ بتانا تو میں بھول ہی گیا تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ تھوڑی دیر بعد جب چائے پئیں گے، اسی وقت وہ تم سے بات کرکے اپنا خوف دور کرلے۔ آج مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ وہ تم سے ڈرتی بہت ہے۔“

”مجھے یاد نہیں، کبھی ایسا ہوا کہ میں اس پر ناراض ہوئی ہوں۔“

”جانے کیا بات ہے...... آج مجھے ایسا ہی لگا تھا کہ وہ تم سے ڈر گئی ہو۔“

”پاگل پن ہے اس کا۔“ شمی نے سرسری انداز میں کہا اور پھر موضوعِ گفتگو بدلا۔ ”تم بھی تو ذرا فریش ہوجاؤ۔“

”مجھے تو دس منٹ لگیں گے۔“ عادل بستر سے اٹھتے ہوئے بولا اور باتھ روم میں چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں اور نعیمہ ٹی وی لاؤنج میں تھے۔ ملازمہ سے کہہ دیا گیا تھا کہ وہ چائے وہیں لے آئے۔

شمی اب پوری طرح خود پر قابو پاچکی تھی۔ وہ ہنس ہنس کر عادل کو دفتر کے ایک بے وقوف سے چپراسی کی دو ایک حرکتوں کے بارے میں بتانے لگی۔ اسی دوران میں چائے آگئی۔ نعیمہ نے اپنی ڈرائیونگ کے بارے میں کوئی بات نہیں چھیڑی۔ اس نے شمی کے خوشگوار موڈ سے سمجھا ہوگا کہ عادل ہی کا خیال درست تھا۔

خود شمی بھی چاہتی تھی کہ وہ بات نہ چھیڑے۔ امکان تھا کہ اگر وہ بات چھیڑتی تو شمی کو اپنے اوپر قابو نہ رہ پاتا۔

اس وقت شمی یہ فیصلہ ضرور کرچکی تھی کہ اب وہ عادل اور نعیمہ پر کڑی نظر رکھے گی۔ عادل صبح ساڑھے سات بجے اٹھا کرتا تھا۔ شمی نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ پونے آٹھ بجے اٹھا کرے گی۔ اپنے سیل فون میں اس وقت کا الارم لگالیا کرے گی اور الارم کی آواز ہلکی رکھے گی۔ عادل اس وقت باتھ روم میں ہوتا تھا۔ الارم کی آواز اس تک نہ پہنچ پاتی۔ شمی جاگ جانے کے باوجود آنکھیں بند کیے رکھتی اور جب عادل کمرے سے چلا جاتا تو وہ بھی اٹھ جاتی اور پھر چھپ کر اس کی اور نعیمہ کی نقل و حرکت پر نظر رکھتی۔

رات ہونے سے پہلے ہی شمی نے عادل کی نظر بچا کر اپنے سیل فون میں صبح پونے آٹھ بجے کا الارم لگالیا۔ جب وہ دونوں سونے کے لیے لیٹے تو شمی نے سیل فون اپنے تکیے کے نیچے رکھ لیا۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ عادل کو عجیب سی لگتی۔ شمی کی عادت تھی کہ وہ سیل فون تکیے کے نیچے رکھا کرتی تھی لیکن اس سے تو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا، شمی نے سوچا، نعیمہ عادل کے ساتھ ہی دفتر جایا کرتی تھی۔ اگر ان دونوں میں کوئی تعلق پیدا ہوچکا تھا تو دفتر میں نعیمہ، عادل کے کمرے میں یا عادل اس کے کمرے میں جاسکتا تھا۔

شمی کو دوسرا فیصلہ یہ کرنا پڑا کہ وہ صبح اپنی دیر سے اٹھنے کی عادت ترک کرکے عادل کے ساتھ ہی اٹھا کرے۔ تینوں ساتھ ہی دفتر جایا کریں۔ اس صورت میں وہ نعیمہ کو اپنی کار میں لے جاسکتی تھی۔

لیکن پھر شمی کو خیال آیا کہ اس سے بھی کیا ہوگا۔ دفتر کے کمروں میں تو وہ ان کے ساتھ نہیں ہوتی تھی۔ تینوں کے کمرے الگ الگ تھے۔

شمی اپنے فیصلے سے عادل کو اسی رات بتا سکتی تھی مگر اس نے یہ معاملہ دوسرے دن تک کے لیے ٹال دیا تھا۔ چھٹی دوسرے دن بھی تھی۔ اتفاق سے اتوار کے دوسرے دن سرکاری چھٹی پڑ گئی تھی۔

غنودگی کے عالم میں بھی شمی اس بارے میں سوچتی رہی اور پھر کسی وقت اس کی آنکھ لگ گئی۔ صبح الارم کی آواز نے اسے جگا دیا۔ ایک مرتبہ آنکھیں کھلنے پر اس نے عادل کو بستر پر نہیں پایا۔ اس کی توجہ باتھ روم کی طرف گئی جہاں سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ عادل کو شیو کرنے اور

نہانے میں بیس منٹ لگتے تھے۔ شمی اس وقت بھی سوئی ہوئی ہوتی تھی۔ عادل ڈائننگ روم یا لاؤنج میں چلا جاتا تھا جہاں وہ اور نعیمہ ناشتا کیا کرتے تھے۔ شمی اپنے مقررہ وقت پر ہی اٹھتی تھی اور ناشتا کرتی تھی۔ چھٹی کا دن ہونے کی وجہ سے نعیمہ اور عادل کیونکہ گھر پر ہی ہوا کرتے تھے اس لیے وہ صرف چائے پینے کی حد تک شمی کا ساتھ دیا کرتے تھے۔

جاگنے کے بعد شمی باتھ روم کے دروازے کی طرف دیکھتی رہی۔ جلد ہی پانی گرنے کی آواز آنا بند ہوگئی۔ پھر جیسے ہی دروازہ کھلا نظر آیا، شمی نے آنکھیں بند کرلیں اور ایسی بن گئی جیسے بہ دستور گہری نیند سو رہی ہو۔

عادل بہت دھیمی آواز میں گنگنا رہا تھا۔ دو تین منٹ بعد شمی نے کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی تو آنکھوں میں جھری بناتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ عادل کی ہلکی سی جھلک تھی جو کمرے سے باہر نکل رہا تھا۔ وہ اس وقت صرف گاؤن پہنے ہوئے تھا جو کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ چھٹی کے دن وہ اگر کہیں باہر نہیں جاتا تھا تو گاؤن ہی پہنے رہا کرتا تھا۔

پانچ منٹ بعد شمی بستر سے اٹھی۔ باتھ روم میں جا کر اس نے منہ پر پانی کے چند چھینٹے مارے، کلی کی، پھر باہر آکر فلاسک جگ سے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس پیا اور ننگے پیر کمرے سے نکل آئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے چلنے سے ذرا بھی آواز ہو۔

حتی الامکان احتیاط سے وہ ڈائننگ روم تک گئی۔ اندر سے اسے کسی قسم کی آواز نہیں سنائی دی تو اس نے جھانک کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اب شمی نے ٹی وی لاؤنج کا رخ کیا۔ لاؤنج کے زیادہ قریب پہنچنے سے پہلے ہی اس نے نعیمہ کے ہنسنے کی آواز سن لی۔ وہ پنجوں کے بل تیزی سے آگے بڑھی۔ وہ چھپ کر ان دونوں کی باتیں بھی سننا چاہتی تھی۔ وہ اپنے اس مقصد میں ناکام نہیں رہی۔

نعیمہ کہہ رہی تھی۔ ”شکر ہے کہ باجی ناراض نہیں ہوئیں اور یہ بھی بہت اچھا ہوا کہ آپ نے مجھے کل ہی بتا دیا تھا ورنہ رات کو مجھے نیند بھی ٹھیک سے نہیں آتی۔“

”اس میں ڈرنے کی کوئی بات ہی نہیں تھی نعیمہ!...... شمی کا نظریہ ہے کہ ہر انسان کو اپنی مرضی اور اپنی خواہشات کے مطابق زندگی گزارنا چاہیے۔ کسی دوسرے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس کی مرضی اور خواہشات میں حارج ہو۔“

”پھر تو میں آپ سے پیراکی بھی سیکھ سکتی ہوں۔“

”ہاں، کیوں نہیں!“

”آپ نے ایک بار بتایا تھا کہ آپ بہت اچھے پیراک ہیں۔“

”ایک مقابلے میں بھی حصہ لے چکا ہوں۔“ عادل نے ہنس کر کہا۔ ”گولڈ میڈل ملا تھا مجھے!“

”گڈ!...... تو پھر آج ہی سے آپ مجھے پیراکی بھی سکھائیے۔ ہمارا سوئمنگ پول بہت بڑا ہے۔“

”سکھا دوں گا بھئی!“

”بس ابھی ناشتے کے بعد چلتے ہیں سوئمنگ پول پر!“

”ناشتے کے فوراً بعد یہ مناسب نہیں ہے۔ آدھے گھنٹے کا وقفہ ضرور ہونا چاہیے۔“

”چلیں تو آدھے گھنٹے بعد سہی!“

ایک بار پھر شمی کا جسم غصے سے تپنے لگا۔ پیراکی سکھانے میں تو ان دونوں کے جسم ایک دوسرے سے دور رہ ہی نہیں سکتے تھے۔ اس کا جی چاہا کہ فوراً اندر داخل ہوکر ان دونوں کو اور خصوصاً نعیمہ کو آڑے ہاتھوں لے۔ خصوصاً نعیمہ کو اس لیے کہ پیراکی سیکھنے کی خواہش اس نے ظاہر کی تھی۔

لیکن اس وقت بھی شمی ضبط کر گئی۔ اسے فائزہ کی بات یاد آ گئی تھی کہ غصے میں کوئی اقدام نہیں کرنا چاہیے۔

وہ تیزی سے مڑی لیکن اس نے خیال رکھا تھا کہ آواز بالکل نہ ہو۔ وہ پنجوں کے بل چلتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف لوٹی۔ یہ اتفاق تھا کہ اس کا سامنا گھر کے کسی ملازم سے نہیں ہوا، ورنہ وہ شمی کا یہ انداز دیکھ کر متعجب ضرور ہوتا۔ کوئی سوال کرنے یا کچھ کہنے کی ہمت اسے بہرحال نہ ہوتی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے محسوس کیا کہ اس کا دماغ بہت منتشر ہو چکا تھا۔ اسے ڈرنک پینے کا خیال آیا لیکن یہ اس وقت مناسب نہ ہوتا۔ غصے اور جذباتی کیفیت کے باعث وہ ڈرنک پینے کے بعد زیادہ شدت سے ری ایکٹ کرسکتی تھی۔ اس نے اس وقت بیئر پر اکتفا کیا۔ گرمیوں میں وہ ویسے بھی کسی وقت بیئر پی لیا کرتی تھی۔

روم فریج سے اس نے ایک کین نکالا اور اسے کھول کر گلاس میں انڈیلے بغیر منہ سے لگا لیا۔ دو گھونٹ لے کر وہ رکی اور کین ہاتھ میں لیے لیے کمرے میں ٹہلنے لگی۔ اس وقت اسے خیال آیا کہ وہ گاؤن پہنے بغیر ہی کمرے سے نکل گئی تھی۔ وہ اس وقت صرف نائٹی پہنے ہوئے تھی۔ اس نے کین ایک طرف رکھ کر گاؤن پہنا۔

عام حالات میں وہ بیئر کا کین پندرہ بیس منٹ میں پی ڈالتی تھی مگر اس وقت اس نے اتنی تیزی نہیں کی۔ کین ختم

کرنے میں اس نے آدھا گھنٹا لگا دیا۔ اس کے بعد خواہش تو ہوئی تھی کہ ایک کین اور لگا لے مگر اس نے خواہش کچل دی۔ دو کین پی جانے سے ایک پیگ کے قریب نشہ تو ہو ہی جاتا اور وہ نشہ اسے انگیخت کرسکتا تھا جس سے وہ اس وقت گریز کرنا چاہتی تھی۔

دس منٹ اور گزارنے کے بعد وہ سلیپر پہن کر اپنے کمرے سے نکلی۔ اس نے پہلے تو ڈائننگ روم اور لاؤنج ہی کا چکر لگایا جہاں عادل اور نعیمہ موجود نہیں تھے۔ پھر وہ باہر نکلی اور ٹہلنے کے سے انداز میں چلتی ہوئی بنگلے کے عقبی لان کی طرف بڑھی۔ سوئمنگ پول صادق علی نے وہیں بنوایا تھا۔ ملازمین کو اس طرف جانے کے لیے اجازت لینے کی ضرورت پڑتی تھی۔

چند قدم اٹھاتے ہی شمی کو خیال آیا کہ اس طرح تو شمی اور عادل بھی اسے دیکھ لیتے۔ وہ مڑ کر تیزی سے چلتی ہوئی پھر اپنے کمرے میں گئی۔ ایک الماری سے اس نے دوربین نکالی۔ کمرے سے نکل کر اس مرتبہ اس نے بہت تیزی سے قدم بڑھائے۔

سوئمنگ پول کے قریب جائے بغیر اس نے دور ہی سے خود کو آڑ میں رکھتے ہوئے دوربین آنکھوں سے لگا کر سوئمنگ پول کی طرف دیکھا۔

اس کا یہ خیال درست ہی تھا کہ پیراکی سکھانے اور سیکھنے والوں کے جسم ایک دوسرے سے دور نہیں رہ سکتے تھے اور وہ ایسا ہی دیکھ رہی تھی۔ عادل کے جسم پر صرف انڈرویئر تھا۔ وہ نہایت خوب صورت ورزشی جسم کا مالک تھا جو جنس مخالف کے لیے نہایت پرکشش تھا۔ نعیمہ سوئمنگ کاسٹیوم میں نہیں تھی۔ اس نے وہی لباس پہن رکھا تھا جس میں اسے دیکھ چکی تھی۔

شمی اپنی جگہ کھڑی ان کی طرف دیکھتی رہی، کچھ ہی دیر بعد اس نے ان دونوں کو سوئمنگ پول سے نکلتے دیکھا۔

سوئمنگ پول کے پاس کئی ایزی چیئر پڑی ہوئی تھیں۔ عادل نے اپنا گاؤن اور سلیپنگ سوٹ جس کرسی پر ڈالا تھا، وہ اسی کرسی کی طرف بڑھا۔

نعیمہ ہانپ رہی تھی۔ گیلے ہونے کی وجہ سے اس کے کپڑے اس کے جسم سے چپک کر رہ گئے تھے۔ اس کا ایک ایک عضو نمایاں نظر آرہا تھا۔ اس نے عادل کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ کہا اور پھر تیزی سے بنگلے کی عمارت کی طرف آنے لگی۔ اسے اب کپڑے بدلنے کی جلدی ہوگی۔

فوراً ہی شمی بھی تیزی سے مڑی۔ وہ نعیمہ کی نظر میں نہیں آنا چاہتی تھی۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں پہنچ گئی۔ امکان تھا کہ اب عادل بھی کمرے میں آتا۔ شمی کے جاگنے کا وقت بھی ہو چکا تھا۔ وہ فوراً باتھ روم میں جا گھسی اور باتھ ٹب بھرنے لگی۔ جلد ہی اس نے کمرے کا دروازہ کھلنے اور پھر عادل کے قدموں کی آہٹ سنی۔ اب اس نے شاور کھولا۔ وہ عادل کو پانی گرنے کی آواز سنانا چاہتی تھی۔ ایک منٹ بعد اس نے شاور بند کیا اور باتھ ٹب میں لیٹ گئی۔

اب شمی کے خیال کے مطابق پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا لہٰذا اب اسے کوئی فیصلہ کن قدم اٹھانے کی ضرورت تھی۔ اسے خدشہ تھا کہ عادل اور شمی کے جسمانی تعلقات قائم نہ ہو چکے ہوں۔ یہ بہت ہی بری بات اس اعتبار سے بھی ہوتی کہ نعیمہ اس کی بہن تھی۔ ان کی مائیں الگ سہی لیکن باپ تو ایک ہی تھا۔

شمی سوچنے لگی کہ اب وہ فوری طور پر کوئی قدم اٹھائے یا کچھ اور وقت گزر جانے دے۔ اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ جو کچھ ہونا تھا، وہ ہو چکا تھا۔ اب کوئی قدم اٹھانے کے لیے ٹھوس جواز کی ضرورت تھی۔ ان دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہیے تھا۔

☆☆☆

ہوٹل میں ڈرنک پیتے ہوئے شمی کے دماغ میں چکراتے ہوئے یہ سارے خیالات دھندلے پڑتے چلے گئے۔ ڈرنک اپنا کام کر گئی تھی۔ اسے نیند آ گئی۔

ساڑھے پانچ بجے الارم کی آواز نے جگایا۔ اسے یاد نہیں آسکا کہ ڈرنک پینے کے دوران میں اس نے کب الارم لگایا تھا۔ غالباً اسے احساس ہوگا کہ نشے میں وہ سو نہ جائے جبکہ ساڑھے پانچ بجے تک اس کا اٹھنا ضروری تھا۔ ساڑھے چھ بجے انور شاد اسے لینے آجاتا۔ شمی نے محسوس کیا کہ اس کا دماغ خاصا بھاری ہو رہا تھا۔ اس کا سبب زیادہ نشہ ہی ہوسکتا تھا۔ اس نے فوراً باتھ روم کا رخ کیا۔ ٹھنڈا پانی پڑنے سے دماغ کا بھاری پن کم ہوتا چلا گیا۔

ساڑھے چھ بجے انور شاد اسے لینے آیا تو وہ روانگی کے لیے تیار تھی۔

کار میں بیٹھتے وقت انور شاد نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”گیلری میں خاصے لوگ جمع ہیں۔ خصوصاً تو جوان لڑکے ”اور لڑکیاں“ تو آپ کو دیکھنے کے لیے بے تاب ہیں۔ انہیں اس وقت بڑی خوشی ہوئی تھی جب انہیں معلوم ہوا تھا کہ میں آپ کو لینے جا رہا ہوں۔“

''مجھے تعجب ہے اس پر کہ میں نئی نسل میں بھی مقبول ہوں۔'' شمی نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''میں نے مصور کی حیثیت سے جو نیا رنگ اپنایا ہے، وہ میرے خیال میں پختہ عمر لوگوں ہی کے لیے پسندیدہ ہوسکتا تھا لیکن میرے مداحوں کے جو خطوط آتے ہیں، وہ بھی زیادہ تر نوجوانوں کے ہوتے ہیں جن میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ ہے۔''

''آپ کا انداز مصوری دونوں نسلوں میں مقبول ہے اور یہ انداز بہت کم مصوروں کو حاصل ہوتا ہے۔''

''خوش نصیبی ہے میری۔''

''گیلری میں آپ کو بری طرح گھیر لیا جائے گا۔''

''ہوں۔''

لیکن منزل پر پہنچنے کے بعد نوجوانوں کی بھیڑ نے گیلری کے باہر ہی شمی کو گھیر لیا۔ ان کی باتوں کا جواب اور آٹوگراف دینے میں اتنا وقت گزر گیا کہ شمی تکان سی محسوس کرنے لگی اور پھر اس نے گیلری میں جانے سے پہلے کچھ دیر انور رشاد کے کمرے میں بیٹھ کر آرام کیا۔

پھر جب وہ گیلری میں گئی تو دوسرے لوگوں کے علاوہ اس کا سامنا عادل سے بھی ہوا۔

''بڑی دیر سے آئے تم!'' شمی کے منہ سے نکلا اور اس کی نظریں عادل کے پیچھے کسی کو تلاش کرنے لگیں۔

''نہیں، دیر سے تو نہیں آیا۔'' عادل نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ ''تم کو آٹوگراف لینے والوں نے گھیر لیا تھا اس لیے میں دور سے ہی وہ سب کچھ دیکھتا اور خوش ہوتا رہا۔''

''خوش کیوں ہوتے رہے۔'' شمی مسکرائی۔

''تمہاری مقبولیت کیا میرے لیے خوشی کا باعث نہیں ہوگی۔''

''ہاں۔'' شمی نے ٹھنڈی سانس لی۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی افسردگی چھا گئی تھی۔ ''کاش تم نے وہ حرکت نہ کی ہوتی جس کے بعد......''

اسے اپنا جملہ ادھورا چھوڑنا پڑا کیونکہ انور رشاد ایک ادھیڑ عمر شخص کو اس کے قریب لے آیا تھا اور اس کا تعارف کراتے ہوئے بولا۔

''یہ آپ کی تصاویر کے اتنے گرویدہ ہیں کہ آپ کی منہ مانگی قیمت پر گیلری کی ساری تصاویر خریدنا چاہتے ہیں۔''

''سوری۔'' شمی نے سنجیدگی سے کہا۔ ''قیمت کی میرے لیے کوئی اہمیت نہیں ہے۔ مجھے اپنے سبھی مداحوں کا خیال رکھنا ہے۔ ان میں سے جو بھی میری کوئی تصویر خریدنا چاہے گا، وہ تصویر اسی کو اسی قیمت پر دی جائے گی جو میں پہلے ہی طے کر چکی ہوں۔''

''اصولی خاتون ہیں آپ!'' اجنبی شخص نے مسکرا کر بہ ظاہر شمی کی تعریف کی لیکن اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اسے شمی کی بات بہت گراں گزری تھی۔ اس کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ ہوگی۔

پھر وہ مزید کچھ کہے بغیر آگے بڑھ گیا۔ اس وقت عادل نے دیکھا کہ انور رشاد کے چہرے سے پریشان کن سنجیدگی کا احساس ہونے لگا تھا۔

شمی کی متجسس نظریں ایک بار پھر ادھر اُدھر دوڑنے لگیں۔

''کچھ دیر میں...... جیسے ہی موقع ملے، میرے دفتر میں آیئے گا۔'' انور رشاد نے شمی سے کہا۔

شمی نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ انور رشاد چلا گیا۔

''تم کسی کو ڈھونڈ رہی ہو شمی؟'' عادل نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''آں...... ہاں......'' شمی نے کسی قدر چونکے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ ''خیال تھا، کچھ پرانے شناسا یہاں آئیں گے۔''

''اوہ!''

''کیوں! اتنے مایوس کیوں ہوئے تم میرے جواب سے!''

''مایوس تو نہیں ہوا۔ دراصل میرا خیال تھا کہ تمہیں شناساؤں کی نہیں، صرف ایک شناسا کا خیال تھا۔''

اس سے پہلے کہ شمی کوئی جواب دیتی، ایک نوجوان جوڑا قریب آگیا اور شمی سے اس کی ایک پینٹنگ کے بارے میں استفسار کرنے لگا۔

گیلری میں شمی کو مستقل طور پر تنہائی مل ہی نہیں سکتی تھی، اس لیے عادل اس کے قریب سے ہٹ کر دوسرے لوگوں کے ساتھ پینٹنگز دیکھنے میں لگ گیا۔ اس دوران میں اس کا دماغ اس شخص میں بھی الجھا رہا جس نے شمی کی ساری پینٹنگز خریدنا چاہی تھیں۔ شمی نے اسے ٹکا سا جواب دے دیا تھا جس کے بعد انور رشاد کے چہرے سے کچھ پریشانی ظاہر ہوئی تھی۔ عادل کی سمجھ میں نہیں آسکا تھا کہ اسے پریشانی کیوں لاحق ہوئی تھی۔ اس نے بعد ازاں شمی سے اپنے دفتر میں آنے کے لیے بھی کہا تھا، جیسے وہ اسے کوئی ایسی بات بتانا چاہتا ہو جو دوسروں کے سامنے نہیں بتائی جاسکتی تھی۔

وہ شخص عادل کو پھر دکھائی دیا۔ وہ گیلری کے بیرونی دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ عادل کی نظریں اس کا تعاقب کرتی رہیں۔ جب وہ شخص باہر نکل رہا تھا تو ایک

جرنلسٹ عدنان اندر آرہا تھا۔ اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس شخص کو سلام کیا لیکن یا تو وہ کسی خیال میں گم تھا یا اس نے جان بوجھ کر عدنان کو نظر انداز کیا تھا اور باہر نکل گیا تھا۔ عدنان نے بے پروائی سے اپنے شانوں کو جنبش دی اور گیلری میں آگیا۔

عدنان سے عادل کی تھوڑی بہت شناسائی تھی اور وہ اس لیے کہ عدنان جس اخبار سے تعلق رکھتا تھا، اس کے مالک سے عادل کے تعلقات بہت پرانے تھے۔

عادل کو اس سے اس اجنبی شخص کے بارے میں کچھ معلومات ہوسکتی تھیں لیکن فوری پر ایسا نہ ہوسکا۔ کچھ اور اخباروں کے رپورٹرز بھی گیلری میں تھے۔ عدنان فوری طور پر ان میں گھر گیا۔

کچھ فاصلے پر شمی اپنی ایک پینٹنگ کے قریب کھڑی تھی۔ کچھ لوگ بھی تھے جو شمی سے اس کی پینٹنگ کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔

عادل اس طرف چلا گیا جہاں ٹوائلٹ وغیرہ تھے۔ یہاں لوگوں کے باتیں کرنے کا شور نہیں تھا۔ اِکا دُکا افراد آجا رہے تھے۔ وہاں سے عادل نے اپنے سیل فون پر نعیمہ سے رابطہ کیا۔

دوسری طرف سے کال ریسیو ہوتے ہی ہنسنے کی آواز آئی اور کہا گیا۔ ''مجھے یقین تھا کہ آپ فون کریں گے۔ وہیں گیلری سے بول رہے ہیں نا؟''

''یقین تمہیں ہونا ہی چاہیے تھا۔ وعدہ لیا تھا تم نے مجھ سے فون کرنے کا؟''

''باجی کیسی ہیں؟'' بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

''میں نے کل بتایا تو تھا تمہیں!...... شمی بالکل ٹھیک ہے، تندرست ہے۔ اب ایک دن میں کوئی تبدیلی تو نہیں آجاتی۔ خیر!...... اگر تم نے مجھ سے فون کرنے کا وعدہ نہ لیا ہوتا تو بھی میں فون کرتا۔''

''کیوں؟''

''میں نے محسوس کیا تھا کہ مجھ سے ملتے ہی شمی میرے پیچھے دیکھنے لگی تھی۔ بعد میں بھی مجھے یہ محسوس ہوتا رہا کہ اسے کسی کی تلاش ہے۔ میں نے استفسار کیا تو کہنے لگی کہ اسے کچھ لوگوں کے آنے کی توقع تھی لیکن مجھے اس بات پر یقین نہیں آیا۔''

''کیوں؟''

''میں یقین سے کہہ سکتا ہوں نعیمہ کہ اسے تمہارے آنے کی توقع تھی۔''

''اچھا!'' نعیمہ کے لہجے میں افسردگی تھی۔

''میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ میرے ساتھ چلو۔''

''مجھے اب بھی ان سے ڈر لگتا ہے۔''

اس وقت عادل نے عدنان کو تیزی سے اپنی طرف آتے دیکھا۔

''اچھا اب گھر آکے بات کروں گا۔'' عادل نے جلدی سے کہا۔ ''ایک جاننے والے میری طرف آرہے ہیں۔''

عادل نے نعیمہ کا جواب سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔

عدنان بالکل قریب آچکا تھا۔ اس نے بڑے احترام سے عادل کو سلام کیا۔ وہ اپنے مالک کی وجہ سے عادل کا احترام کرتا تھا۔ سلام کرکے اس نے کچھ کہنا بھی چاہا تھا لیکن عادل اس سے پہلے ہی بول پڑا۔

''میں نے تمہیں گیلری میں آتے دیکھا تھا۔ اس وقت ایک صاحب باہر نکل رہے تھے۔ تم نے انہیں سلام کیا تھا لیکن وہ جواب دیے بغیر باہر نکل گئے تھے۔ تہذیب کے نہایت خلاف بات تھی یہ...... ایسے لوگوں کو ہرگز سلام نہیں کرنا چاہیے۔''

''یہ ہم جیسے لوگوں کی مجبوری ہے عادل صاحب!'' عدنان نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''ہمیں یہ تاثر دینا ہی پڑتا ہے کہ ہم انہیں ناپسند نہیں کرتے۔''

''وجہ؟''

''غالباً آپ شاہ دلدار سے واقف نہیں۔''

''اوہ! وہ شاہ دلدار تھا...... ہاں نام سنا ہے میں نے اس کا! اس کے باپ شاہ نامدار کی تصویریں اور بیانات تو اخبارات میں آتے ہی رہتے ہیں۔''

بوڑھا شاہ نامدار اب سیاست سے کنارہ کش ہوچکا تھا لیکن حکومت اور اپوزیشن کے سبھی سیاست داں اب بھی اس سے ملتے رہتے تھے۔

''شاہ نامدار تو ایک بہت بڑا وڈیرا لیکن نہایت اچھا آدمی ہے۔'' عادل نے کہا۔

''لیکن بیٹا بہت مغرور اور خر دماغ ہے۔ کئی جرائم میں بھی ملوث ہے لیکن دولت کے بل پر ہر کیس دبوا دیتا ہے۔''

عادل چونکا۔ ''کس قسم کے جرائم؟''

''عادی جرائم پیشہ وہ بہرحال نہیں ہے۔'' عدنان نے جواب دیا۔ ''بس ضدی ہے۔ ضدی پن میں ہی کئی ایسی حرکتیں کرچکا ہے جن کا شمار جرائم میں ہی کیا جاسکتا ہے۔ کئی شادیاں کرچکا ہے اور انہیں طلاقیں بھی دے چکا ہے۔ بس

کوئی لڑکی پسند آجائے اسے...... ایک لڑکی نے اس کی پیشکش ٹھکرائی تھی تو اس نے جرائم پیشہ افراد سے اس کے چہرے پر تیزاب پھنکوا دیا تھا۔ بس یہی اس کی ایک بری عادت ہے کہ جو پسندیدہ چیز اسے حاصل نہ ہو سکے، وہ اسے برباد کروا دیتا ہے۔"

عادل کے دماغ میں سنسناہٹ ہونے لگی کیونکہ شاہ ولدار کو شمی کی پینٹنگز پسند آگئی تھیں۔

عدنان ٹوائلٹ چلا گیا۔

عادل کو شمی گیلری میں نہیں دکھائی دی تو وہ سمجھ گیا کہ وہ انور شاد سے ملنے اس کے دفتر میں چلی گئی ہوگی۔ عادل نے انور شاد کے چہرے پر پریشانی دیکھی تھی اس لیے وہ سمجھ گیا کہ انور شاد بھی ان باتوں سے واقف ہوگا جو عدنان نے بتائی تھیں۔

کچھ دیر بعد ہی شمی گیلری میں آگئی۔ عادل نے اس کے چہرے سے اندازہ لگایا کہ وہ قطعی پریشان نہیں تھی۔

"کیا انور شاد نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟" عادل نے اس سے پوچھا۔

"کس بارے میں؟"

"شاہ ولدار تمہاری ساری پینٹنگز خریدنا چاہتا ہے۔"

"تم کیسے جانتے ہو شاہ ولدار کو؟"

"ابھی ایک جرنلسٹ سے ملاقات ہوگئی تھی۔ اس سے مجھے معلوم ہوا کہ شاہ ولدار کس قسم کا آدمی ہے۔ مجھے تشویش ہوگئی ہے شمی!"

"مجھے بالکل نہیں۔" شمی نے ہنس کر کہا۔ "انور صاحب نے مجھے بتا دیا ہے اس کے بارے میں...... وہ کیا کر سکتا ہے آخر...... پینٹنگز پر تیزاب پھنکوائے گا کیا؟"

"نہ جانے کیا کر بیٹھے...... مجھے تو کچھ پریشانی ہوگئی ہے۔"

"ختم کرو یہ ذکر!" شمی نے منہ بنایا۔ "جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔ میں اس کی پیشکش قبول کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوں گی۔ اچھا اب میں یہاں دس بارہ منٹ اور ہوں۔ انور صاحب سے میں نے کہہ دیا ہے کہ وہ مجھے ہوٹل چھوڑ آئیں۔ اب تھکن ہوگئی ہے۔ کل آؤں گی، تم آؤ گے نا کل بھی؟"

"یقیناً۔"

"اگر ممکن ہو تو اکیلے مت آنا۔" شمی نے کہا اور عادل کے جواب کا انتظار کیے بغیر اپنی اس پینٹنگ کی طرف بڑھ گئی جہاں زیادہ لوگ جمع تھے اور اس پینٹنگ پر تبصرے کر رہے تھے۔

☆☆☆

رات کو ہوٹل میں شمی نے اپنے معمول کے مطابق وہسکی کا ایک پیگ پیا اور کھانا کھا کر بستر پر لیٹ گئی۔ سیل فون پر اس نے رامین سے رابطہ کیا۔ باتوں باتوں میں اس نے شاہ ولدار کا ذکر بھی کر دیا لیکن اس طرح جیسے وہ اس کے لیے کوئی خاص بات نہیں تھی۔

فون بند کرنے کے بعد وہ لیٹے لیٹے ایک کتاب پڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔ ان دنوں کچھ پڑھنے پڑھانے میں اس کا دل ہی نہیں لگ پاتا تھا۔ ماضی کے واقعات اس کے دماغ میں چکراتے رہتے تھے۔

نہ جانے کس وقت اسے نیند آگئی۔ صبح وہ اٹھی تو اس کی نظر کیلنڈر پر گئی۔ اس دن کی تاریخ پر اس کی نظریں جم گئیں۔ برسوں پہلے یہی تاریخ تھی جب اس کی زندگی نے ایک اہم موڑ لیا تھا۔

وہ اس دن صبح باتھ روم میں تھی۔ عادل اور نعیمہ کے ساتھ دفتر جاتے ہوئے اسے دو دن گزر چکے تھے۔ اس نے ان دونوں پر ظاہر نہیں کیا تھا کہ وہ انہیں پیار کرتے دیکھ چکی ہے مگر وہ ان دو دنوں میں سنجیدہ بہت رہی تھی۔ اس کی سنجیدگی کا احساس عادل اور نعیمہ کو بھی ہو گیا تھا مگر وہ دونوں ہی اس سے اس بارے میں استفسار کرتے ہوئے گریز کرتے رہے تھے۔ اس سے شمی نے سمجھا تھا کہ اب وہ دونوں بھی اس شک میں پڑ گئے تھے کہ وہ ان دونوں کے معاملات کے بارے میں کچھ نہ کچھ جان چکی ہے۔

غسل کرتے ہوئے اس نے کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی تھی اور پھر قدموں کی آہٹ باتھ روم کے دروازے پر آگئی تھی۔

"آج تو دفتر جانے میں دیر ہو جائے گی باجی!" نعیمہ کی آواز آئی تھی۔ "اب آپ کو تیار ہونے میں آدھا گھنٹہ تو اور لگے گا۔"

"ہاں، دراصل آج میں الارم لگانا بھول گئی تھی۔ تم اور عادل تو تیار ہو گئے ہو گے۔"

"جی ہاں باجی!...... میں انہیں لاؤنج میں چھوڑ کر آئی ہوں۔"

"تم بھی وہیں جا کے بیٹھو۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

"نہیں میں اب یہیں رکوں گی۔ موقع مل رہا ہے تو آپ سے کچھ بات ہی کر لوں۔"

"کوئی خاص بات ہے کیا؟"

"نہیں کچھ ایسی زیادہ خاص بھی نہیں ہے۔ آپ اطمینان سے غسل کریں۔ میں بیٹھ کر اخبار پر نظر ڈال لیتی ہوں۔"

"اچھا بیٹھو!"

نعیمہ کے قدموں کی آہٹ باتھ روم کے دروازے سے دور ہوگئی۔

غسل کرنے کے بعد شمی نے باتھ گاؤن پہنا۔ اسی وقت اس نے پھر کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ اسے خیال آیا، کیا نعیمہ اس سے بات کیے بغیر ہی واپس جا رہی ہے؟

لیکن یہ علم اسے بعد میں ہوا کہ دروازہ کھولنے والا عادل تھا۔ جب وہ باتھ روم سے نکلی تو اس نے وہ منظر دیکھا جو اس کے سارے جسم میں انگارے بھر دینے کے لیے کافی تھا۔

عادل نے نعیمہ کی کرسی کے پیچھے کھڑے اپنے دونوں ہاتھ بڑھا کر نعیمہ کی ٹھوڑی میں ڈال کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا تھا اور اس کی پیشانی چوم لی تھی یا شاید بات اس سے آگے کی ہو جو شمی نہیں دیکھ سکی تھی۔

"تالیاں۔" شمی کے منہ سے نکلا۔ ساتھ ہی اس نے دو مرتبہ تالی بجائی بھی۔ "بہت خوب...... شاندار!"

نعیمہ بوکھلا کر اٹھی۔ اخبار اس کے ہاتھ سے گر گیا۔

"پلیز شمی!" عادل تیزی سے بولا۔ "غلط نہ سمجھو۔ نعیمہ کی پشت تھی دروازے کی طرف! میں سمجھا تھا، کرسی پر تم بیٹھی ہو۔"

"ہاں، یقیناً۔" شمی زہریلے انداز میں بولی۔ "نعیمہ کو پیار کی سکھاتے ہوئے بھی تم یہی سمجھے ہو گے کہ مجھے سکھا رہے ہو۔"

نعیمہ کا چہرہ فق پڑ گیا تھا۔

"باجی!...... میں......"

شمی اتنی تیزی سے اس کی طرف بڑھی کہ وہ گھبرا کر نہ صرف چپ ہوئی بلکہ اس نے پیچھے بھی ہٹنا چاہا لیکن شمی اس کے قریب پہنچ ہی گئی اور پھر اس کا زناٹے دار طمانچہ نعیمہ کے بائیں گال پر پڑا۔

"شمی!" عادل چیخ پڑا۔

"چپ رہو!" شمی اس سے بھی زیادہ زور سے چیخی۔ "یقیناً تمہیں تکلیف ہوئی ہوگی نعیمہ کے منہ پر تھپڑ لگنے سے!...... پیار جو کرنے لگے ہو تم اس سے!"

"ہاں۔" عادل دانت پر دانت جما کر غصے سے بولا۔ "بہت پیار کرنے لگا ہوں میں اس سے!...... اپنے پیار کا اظہار بھی کر چکا ہوں۔"

نعیمہ اس طرح کھڑی تھی جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔ طمانچے کی ضرب سے اس کی آنکھوں میں آنسو بھی نہیں آئے تھے۔

عادل کے ہونٹ اس طرح پھڑپھڑا رہے تھے جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو لیکن غصے کی زیادتی کے باعث بول نہ پا رہا ہو۔

شمی نے نعیمہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے بہت زور سے گھسیٹتے ہوئے عادل کی طرف دھکیل دیا۔ وہ گر ہی پڑتی۔ اگر عادل نے اسے سنبھال نہ لیا ہوتا۔

"دفع ہو جاؤ دونوں!" شمی ایک مرتبہ پھر دہاڑی۔

عادل نے نعیمہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے لیے ہوئے تیزی سے دروازے کی طرف جانے لگا۔ نعیمہ نے کئی بار سر موڑ کر شمی کی طرف دیکھا۔ شاید وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہ سکی۔ وہ دونوں کمرے سے نکل گئے۔ عادل نے باہر سے ہی دروازہ بڑی زور سے بند کیا تھا۔

شمی بستر پر گر سی پڑی۔ وہ بری طرح ہانپنے لگی تھی۔ اس کا جسم بھی غصے سے کانپ رہا تھا۔ سات آٹھ منٹ گزرتے گزرتے وہ معمول پر اس حد تک آگئی کہ اس کا ہانپنا اور کانپنا ختم ہو گیا۔ اب اس کے ہونٹ پھڑپھڑانے لگے۔ یہ جذباتی کیفیت تھی۔ آنکھوں میں آنسو بھی امڈ آئے تھے۔ اس نے اپنا سر تکیے پر گرا دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے آہستگی سے اپنا سر تکیے سے اٹھایا۔ اب اس کے چہرے پر اس قسم کا سکون تھا جو سمندر کی سطح پر تو نظر آتا ہے لیکن اس کی گہرائی میں طوفان ہوتے ہیں۔

وہ کچھ دیر ساکت بیٹھی رہی، پھر اس نے اپنا سیل فون اٹھا کر کمپنی کے چیف اکاؤنٹینٹ اور دیگر دو ایک متعلقہ افسران سے آدھے گھنٹے سے زیادہ دیر تک بات چیت کی اور انہیں کچھ کام کرنے کی ہدایات دیں۔ ان باتوں کے دوران میں اسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ عادل اور نعیمہ دفتر پہنچ چکے تھے۔ اسے گمان تھا کہ شاید یہ باتیں ان دونوں کے علم میں بھی آئی ہوں گی اور دونوں ہی چکرا گئے ہوں گے کہ شمی کیا چاہتی ہے۔

بعدازاں شمی نے اپنے ایک جاننے والے ایڈووکیٹ ریحان احمد کو فون کیا۔ ایڈووکیٹ ان ہدایات پر حیران رہ گیا جو شمی نے اسے دی تھیں۔ اس نے شمی سے اس کے اس اقدام کی وجہ جاننا چاہی مگر شمی نے اسے مبہم جوابات دے کر پوچھا۔ "یہ کاغذات آپ کب تک......"

"میں اس وقت ہائی کورٹ میں ہوں۔" ایڈووکیٹ نے اس کی بات کاٹی۔ "آج مجھے ایک ہی کیس نمٹانا ہے۔

دس پندرہ منٹ میں ہیرنگ شروع ہونے والی ہے۔ میں گیارہ بجے تک اپنے دفتر پہنچوں گا۔ کاغذات کی تیاری میں کوئی خاص وقت نہیں لگتا۔"

"آپ کاغذات کے ساتھ ایک بجے تک میرے گھر آسکتے ہیں؟"

"بالکل آجاؤں گا بلکہ ساڑھے بارہ تک آجاؤں گا۔"

"میں آپ کی منتظر رہوں گی۔" شمی نے کہا اور رابطہ منقطع کردیا۔

اس نے جو اقدامات کیے تھے، انہی کے باعث اب اس کے چہرے پر جذباتیت نظر آنے لگی تھی۔ اس نے یکایک اٹھ کر الماری سے ڈرنک کی بوتل نکال لی جبکہ وہ دن میں پینے کی عادی نہیں تھی۔

سوا بارہ بجے تھے جب اس نے دو پیگ پینے کے بعد ایک خط لکھنا شروع کیا۔

نعیمہ!...... بڑی می کے انتقال کے بعد میں نے مناسب نہیں سمجھا تھا کہ تم وہاں اکیلی رہو، اس لیے میں تمہیں اپنے گھر لے آئی تھی۔ تم نے جو کچھ کیا، میں اس کے بارے میں کوئی شکایت نہیں کرنا چاہتی۔ بس اتنی سی بات ہے کہ اب تم میرے ساتھ نہیں رہوگی۔ اس سے تمہارے لیے کوئی مسئلہ بہرحال پیدا نہیں ہوگا۔ بڑی می کا بنگلا مقفل پڑا ہے۔ تم وہیں جاکر رہ سکتی ہو۔ اس خط کے ساتھ میں بنگلے کی چابیاں بھی بھیج رہی ہوں۔ دفتر سے سیدھی وہیں چلی جانا۔ میں نہیں چاہتی کہ اب تم میرے سامنے آؤ۔ خالی پڑے ہوئے اس بنگلے کی صفائی وغیرہ کے سلسلے میں تم عادل سے مدد لے سکتی ہو۔"

خط کے آخر میں اپنا نام لکھ کر شمی نے ایک ملازم کو بلایا اور اس سے کہا کہ وہ شوفر کو اس کے پاس بھیج دے۔

شوفر کے آنے تک شمی وہ خط ایک لفافے میں بند کرچکی تھی۔ چابیوں کا ایک چھوٹا سا گچھا اس نے الماری سے نکال لیا تھا۔ شوفر آیا تو شمی نے چابیاں اور لفافہ اسے دیتے ہوئے کہا۔ "دفتر چلے جاؤ۔ یہ چابیاں اور لفافہ نعیمہ کو دے کر واپس آجانا۔"

شوفر نے ایک نظر بوتل اور گلاس پر ڈالی، پھر چابیاں اور لفافہ لے کر کمرے سے رخصت ہوگیا۔

اب شمی نے تیسرا پیگ بنایا اور اس کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتی ہوئی بار بار گھڑی کی طرف دیکھتی رہی۔ ایک بجنے میں پندرہ منٹ رہ گئے تھے جب اس کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ شمی نے سیل فون کے اسکرین پر عادل کا نام دیکھا۔ پھر کال ریسیو کی۔ اس کا لہجہ سپاٹ رہا۔ "فرمایئے!"

"اس لہجے میں بات کروگی مجھ سے!"

"میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" شمی نے کھردرے لہجے میں کہا۔

"تمہاری آواز بھاری ہوگئی ہے۔ کیا پینے بیٹھ گئی ہو؟"

"میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" شمی نے اپنا فقرہ دہرایا۔

دوسری طرف عادل نے ایک طویل سانس لی، پھر بولا۔ "نعیمہ سے تمہارا یہ رویہ......"

"خوب! بہت خوب!" شمی نے تیزی سے بولتے ہوئے عادل کی بات کاٹی۔ "تو وہ خط اس نے تمہیں دکھا دیا؟...... ٹھیک ہے، یہی ہونا چاہیے تھا۔ اب وہ تمہیں ہی بتاسکتی ہے اپنا رازدار!"

"دیکھو شمی! تم......"

شمی نے پھر اس کی بات کاٹی۔ "نعیمہ تو نہیں، البتہ تم آکر مجھ سے ملو۔ لنچ کا وقفہ ہونے میں چند منٹ رہ گئے ہیں۔ ڈیڑھ بجے تک آجاؤ۔ میں تمہارا انتظار کروں گی۔" شمی نے رابطہ منقطع کرکے ملازم کی طرف دیکھا جو کمرے میں آیا تھا۔

"ریحان ایڈووکیٹ صاحب آئے ہیں۔"

"انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ، میں آتی ہوں۔"

ملازم چلا گیا۔ شمی نے اپنے ذاتی اکاؤنٹ کی چیک بک نکالی۔ ایک چیک پر ریحان ایڈووکیٹ نام لکھا، اپنے دستخط کیے۔ چیک، کراس کرکے چیک بک میں سے پھاڑا اور اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں قلم اور دوسرے میں چیک تھا۔

ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا ریحان ایڈووکیٹ اسے دیکھ کر کھڑا ہوا۔ اس نے سلام کرکے چند کاغذات پر مشتمل ایک فائل اس کی طرف بڑھائی۔ شمی نے سلام کا جواب دیتے ہوئے فائل لی اور چیک اس پر رکھ کر پوچھا۔ "آپ کی فیس؟"

"میڈم! آخر آپ نے یہ فیصلہ......"

"آپ کی فیس؟" شمی نے اس کی بات کاٹی۔

"وہ آپ بھجوا دیجیے گا۔ میں فون پر بتادوں گا۔"

"خوامخواہ معاملہ کیوں آگے بڑھا رہے ہیں آپ!...... یہ لیجیے۔" شمی نے تقریباً زبردستی، چیک ریحان ایڈووکیٹ کے ہاتھ میں تھما دیا۔ "دستخط کردیے ہیں میں

نے...... فیس کی رقم آپ خود لکھ کر چیک اپنے اکاؤنٹ میں جمع کروا دیجیے گا۔ یہ فائل میں دستخط کے بعد آپ کو بھجوا دوں گی۔ جو بھی عدالتی پروسس ہوتا ہے، وہ ذمے داری بھی آپ کی ہوگی۔ چیک پر رقم آپ اس کے حساب سے لکھیے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس وقت آپ کی خاطر تواضع نہیں کرسکوں گی۔"

شمی فائل ہاتھ میں لیے ہوئے مڑی اور تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی ڈرائنگ روم سے نکل آئی۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے فائل تپائی پر رکھی اور ڈرنک کا گلاس اٹھا کر ایک بڑا گھونٹ لیا۔ پھر اسے کچھ خیال آیا۔ اس نے فوراً گلاس رکھ کر سیل فون پر اپنی کمپنی کے چیف اکاؤنٹینٹ سے رابطہ کیا۔

"اتنی دیر ہوگئی!" شمی نے تیز لہجے میں کہا۔ "فیگر نہیں بتائی آپ نے مجھے...... حساب دیکھنے میں اتنی دیر تو نہیں لگنا چاہیے۔"

"جی وہ......" چیف اکاؤنٹینٹ نے متذبذب لہجے میں کہا۔ "دراصل جب آپ مجھے ہدایات دے رہی تھیں تو عادل صاحب میرے پاس ہی تھے۔ وہ کچھ اور چیک کرنے آئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کیا کہہ رہی تھیں تو میں جھوٹ نہیں بول سکا۔ تب انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں فیگر تو نکال لوں لیکن فی الحال آپ کو نہ بتاؤں۔ وہ اس بارے میں خود آپ سے بات کریں گے۔"

"اور آپ نے ان کا حکم مان لیا!" شمی نے تیز لہجے میں کہا۔ "کیا میری کوئی اہمیت نہیں ہے؟"

"آئی ایم سوری میڈم!"

"فیگر بتایئے!" شمی نے سخت لہجے میں کہا۔

چیف اکاؤنٹینٹ نے ایک فیگر بتائی۔ شمی نے رابطہ منقطع کرکے وہ "فیگر" ایک کاغذ پر لکھ لی۔ پھر وہسکی کا ایک گھونٹ لے کر اس فائل کے کاغذات دیکھنے لگی جو ریحان ایڈووکیٹ دے گیا تھا۔

کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ دروازے کو خاصی زور سے کھولتا ہوا عادل اندر آیا۔ شمی نے اس کی طرف دیکھا لیکن پھر ایسی بن گئی جیسے عادل کے اندر آنے کا یہ انداز اس کے لیے کوئی قابل توجہ بات نہ ہو۔ اس نے فائل ایک طرف رکھ کر گلاس اٹھایا اور ایک گھونٹ لیا۔

عادل بہت سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ وہ کرسی گھسیٹ کر شمی کے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ شمی کو گھور رہا تھا۔

"چیف اکاؤنٹینٹ سے تمہاری ان باتوں کا مقصد؟" وہ بولا۔

"اسی کے لیے بلایا ہے میں نے تمہیں...... اس کے علاوہ بھی ایک کام ہے، لیکن وہ بعد میں......! پہلے یہ دیکھ لو۔" شمی نے وہ کاغذ اٹھایا جس پر اس نے اکاؤنٹینٹ کی بتائی ہوئی فیگر لکھی تھی۔ اس نے کہا۔ "تم نے اکاؤنٹینٹ کو منع کیا تھا لیکن میں نے ابھی فون کرکے اس سے یہ فیگر لے لی ہے۔ کمپنی میں میرا حصہ اتنا ہی ہے۔ اس رقم کا چیک تم مجھے دے دینا۔ ضروری نہیں کہ ابھی دو۔ چند روز میں یا...... جب تم مناسب سمجھو۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔"

"مقصد؟" عادل اسے گھورتا رہا۔

"میں اب مصوری کی طرف ساری توجہ دینا چاہتی ہوں۔ تم واقف ہو میرے اس شوق سے!...... اس شوق کی تکمیل مکمل توجہ چاہتی ہے اس لیے اب میں کمپنی سے الگ ہونا چاہتی ہوں۔ اب صرف تم اور نعیمہ ہی اس کمپنی کے مالک رہوگے۔"

"مصوری کا صرف بہانہ بنا رہی ہو تم!" عادل نے تیز لہجے میں کہا۔ "نعیمہ کو تم نے جو خط بھیجا ہے، اس سے بھی ظاہر ہوگیا ہے کہ دراصل بات کیا ہے۔"

"بات جو کچھ بھی ہے، وہ تم نے اور نعیمہ نے یقیناً سمجھ لی ہوگی اور یقیناً بالکل وہی سمجھا ہوگا جو میں سمجھ چکی ہوں۔ میں اب تم دونوں کے بیچ میں حائل نہیں رہنا چاہتی۔" شمی نے وہ فائل اٹھائی جو اسے ریحان ایڈووکیٹ دے گیا تھا۔ "میں تم سے طلاق نہیں مانگنا چاہتی، کیونکہ مجھے مہر کی رقم لینے سے بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں تم سے خلع چاہتی ہوں۔ یہ اسی کے کاغذات ہیں۔ دستخط کردو۔ دو ایک دن میں عدالتی پروسیس بھی مکمل ہوجائے گا جو میرا وکیل کرلے گا۔"

شمی کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی عادل کا عالم ایسا ہوگیا تھا جیسے اسے سکتہ ہوگیا ہو۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر شمی کی طرف دیکھے جارہا تھا۔

شمی نے ایک گھونٹ لیا اور بولی۔ "جلدی سے دستخط کردو تاکہ معاملہ ختم ہو۔ اب ہم دونوں اس چھت کے نیچے نہیں رہ سکتے۔"

"تم پاگل ہوگئی ہو کیا؟" عادل چیخ پڑا۔

"آہستہ بولو!" شمی اسے گھورنے لگی۔ "ضروری نہیں کہ ملازمین کو تماشا دکھایا جائے۔"

"تم نے جو کچھ سمجھا ہے، غلط سمجھا ہے شمی!" عادل نے بے حد کوشش کی تھی کہ اپنی آواز دھیمی رکھے۔ "دراصل......"

"میں کوئی اختراع نہیں سننا چاہتی۔" شمی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "مجرم اپنی صفائی کے لیے کچھ نہ کچھ سوچ ہی لیتا ہے۔"

عادل نے اتنی زور سے اپنی مٹھیاں بھینچیں جیسے اپنا غصہ ضبط کر رہا ہو۔

"اب یہ ایکٹنگ بھی مجھے متاثر نہیں کر سکتی۔" شمی بولی۔ "یہ بہت غلط ہے کہ تم دو بہنوں پر قبضہ جمائے رکھو۔ وہ میری سگی بہن نہیں لیکن بہن تو ہے۔ باپ ایک ہی تھے ہمارے...... اس گھناؤنے جرم میں شریک نہیں بن سکتی میں تم دونوں کی۔"

عادل کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر گیا اور ایک گلاس اٹھا لایا۔ اس نے خود ہی شمی کی بوتل اٹھائی اور گلاس آدھا بھر لیا۔ پھر اس نے پانی ملانے کی ضرورت نہیں محسوس کی اور ایک گھونٹ لے بیٹھا۔

شمی تیزی سے بولی۔ "عادی نہیں ہو تم اس کے...... اگر پینا ہی چاہتے ہو تو پانی ملا کر پیو۔"

عادل نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا اور دوسرا گھونٹ لیا۔ اب اس کی نظریں بھی شمی کی طرف نہیں تھیں۔ وہ فرش کو گھورے جا رہا تھا۔

شمی کو اس پر غصہ آیا لیکن وہ کچھ بولی نہیں اور اپنے لیے چوتھا پیگ بنانے لگی۔ پھر ایک گھونٹ پی کر بولی۔ "مناسب نہیں تھا کہ تم پانی ملائے بغیر پیو لیکن...... آج تم میرے ساتھ آخری بار پی رہے ہو، لہٰذا جس طرح دل چاہے پیو اور اس کے بعد خلع نامے پر دستخط کر دو۔"

عادل اب بھی خاموش رہا۔ فرش کو گھورتے ہوئے اس مرتبہ اس نے ایک چھوٹا گھونٹ لیا۔ شمی بولی۔ "یہ پیگ میں اپنی محبت کے جنازے کے نام پی رہی ہوں۔"

عادل نے جھٹکے سے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا مگر اس مرتبہ بھی کچھ بولتے بولتے رک گیا۔

شمی چوتھا پیگ پیتے ہوئے محسوس کرنے لگی کہ اب اس کا دماغ آہستہ آہستہ گھومنے لگا تھا۔ اس نے گلاس رکھ دیا۔ وہ اتنی زیادہ نہیں پینا چاہتی تھی کہ ہوش حواس جاتے رہیں۔ وہ دوسری جانب دیکھتے ہوئے انتظار کرنے لگی کہ عادل اپنا گلاس ختم کر لے۔

آخر جب عادل نے خالی گلاس کسی قدر زور سے تپائی پر رکھا تو شمی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اسی کو گھور رہا تھا۔

"کیا تم میری کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہو؟"

عادل نے کہا اور پھر اسے ایک ہچکی آئی۔

"میں نے کہا تھا کہ پانی کے بغیر نہ پیو۔ اب ہچکی تو آئے گی۔ خیر!...... تم نے بالکل ٹھیک سمجھا ہے۔ میں اب کچھ سننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

عادل کو پھر ہچکی آئی۔ وہ بولا۔ "بعد میں تم بہت پچھتاؤ گی شمی!"

شمی نے اس کی بات پر دھیان دیے بغیر اپنا قلم تپائی پر رکھی فائل پر رکھتے ہوئے کہا۔ "دستخط کر دو۔"

عادل نے دانت پر دانت جما کے ایک جھٹکے سے فائل اٹھائی۔ فائل پر رکھا ہوا شمی کا قلم فرش پر گر گیا۔ اس کے گرنے سے کھٹکے کی آواز بھی ہوئی۔

☆☆☆

ہوٹل کے کمرے میں لیٹی ہوئی شمی کی نظر ایک دم کیلنڈر سے ہٹ کر دروازے کی طرف گئی جسے آہستہ سے کھٹکھٹایا گیا تھا۔

"کون؟" شمی نے بلند آواز میں پوچھا۔

باہر سے ایک مردانہ آواز آئی لیکن وہ اتنی دھیمی تھی کہ شمی کو ٹھیک سے سنائی نہیں دیا کہ کیا کہا گیا تھا۔ وہ بستر سے اٹھی۔ وہ نائٹی پہنے ہوئے تھی۔ اس نے قریب رکھا اپنا گاؤن اٹھایا اور اسے پہنتے ہوئے دروازے کے قریب گئی۔

"کون ہے؟" اس مرتبہ شمی کی آواز میں جھنجلاہٹ تھی۔

"رامین۔" باہر سے پہلے ہی جیسی مدھم آواز سنائی دی لیکن اب کیونکہ شمی دروازے کے قریب تھی اس لیے اس نے آواز نہ صرف سنی بلکہ پہچان بھی گئی۔ اس نے جلدی سے دروازہ کھولا۔

سامنے دبلا پتلا اور نہایت عمر رسیدہ رامین کھڑا تھا۔

"آپ!" شمی کے منہ سے نکلا۔ اس کے لہجے میں خوشی بھی تھی۔

مسکراتا ہوا بوڑھا رامین شمی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اندر آیا۔ اس کی چال میں خفیف سی لڑکھڑاہٹ تھی۔ شمی نے جلدی سے دروازہ بند کر کے اسے سہارا دیا اور اسے بستر کی طرف لے جاتے ہوئے بولی۔ "دو دن میں آپ اتنے کمزور ہو گئے کہ آپ سے چلا بھی نہیں جا رہا ہے۔"

"اب عمر ہی اتنی ہو گئی ہے شمی!" بوڑھے رامین نے جواب دیا۔

شمی نے اس کے پیروں سے ناگرا اتارا۔

"یہ کیا کر رہی ہو!" بوڑھے رامین نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن شمی اپنا کام کر چکی تھی۔

بوڑھا رامین پھر بولا۔ "کئی مرتبہ ٹوک چکا ہوں تمہیں اس حرکت پر!"

"آپ کی خدمت کرنا میرا فرض ہے سر!" شمی نے عقیدت سے کہا اور پھر بستر پر بیٹھ کر اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگی جو بہت کم رہ گئے تھے۔

"تم مجھے "سر" کہنا شاید کبھی نہیں چھوڑو گی۔"

"آپ میرے استاد ہیں۔"

"تم مجھے اس سے زیادہ بڑا منصب دے چکی ہو۔"

"کوئی منصب استاد سے بڑا نہیں ہو سکتا۔ خیر، یہ بتائیں، آپ کا سامان کہاں ہے؟ کیا سامان کے بغیر آ گئے ہیں؟"

"نہیں۔ ایک سوٹ کیس ہے۔ بس!"

"کہاں ہے!"

"برابر کے کمرے میں!" بوڑھے رامین نے جواب دیا۔ "دراصل میں رات ہی کی فلائٹ سے آ گیا تھا۔ اتفاق ہے کہ مجھے تمہارے کمرے کے برابر ہی کمرا مل گیا۔ بارہ بج گئے تھے۔ میں نے سوچا کہ تم سو گئی ہو گی اس لیے تمہیں ڈسٹرب نہ کروں اور صبح ہونے کے بعد ہی تمہیں سرپرائز دوں۔ فون پر اطلاع بھی اس لیے نہیں دی تھی کہ سرپرائز دینا چاہتا تھا۔"

"کسی نے...... میرا مطلب ہے...... ہوٹل کی انتظامیہ نے آپ کو پہچانا بھی نہیں؟"

"پہچان لیا تھا لیکن میں نے ان لوگوں سے درخواست کی تھی کہ تمہیں اطلاع نہ دی جائے۔ ان شریف آدمیوں نے میری بات مان لی۔"

"اتنی سی باتیں کر کے آپ ہانپنے لگے۔ دو دن میں اتنی کمزوری میرے لیے تعجب کی بات ہے۔ شاید تاج بی بی نے آپ کا ٹھیک سے خیال نہیں رکھا۔ میں اس کی اچھی طرح خبر لوں گی۔ اچھا میں آپ کے لیے جوس تو منگواؤں۔ شاید آپ نے ابھی ناشتا بھی نہیں کیا ہے۔"

"ہاں، ابھی نہیں کیا۔"

شمی نے ٹیلی فون پر روم سروس سے رابطہ کر کے دو آدمیوں کے ناشتے کی ہدایات دیتے ہوئے کہا۔ "لیکن ایک مینگو جوس فوراً بھیج دیں۔"

بوڑھے رامین نے اب آنکھیں بند کر لی تھیں اور لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر شمی کو اپنے اوپر غصہ آیا۔ اسے کراچی آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ جہنم میں جھونکتی نمائش کو......

بیرا جوس لے کر آ گیا۔ وہ شمی نے اپنے ہاتھوں سے بوڑھے رامین کو پلایا، پھر بولی۔ "آپ کو آنے کی آخر ضرورت کیا تھی۔ کل میں خود ہی آ جاتی۔ نمائش تین ہی دن کے لیے تو ہے۔"

"مجبوراً آنا پڑا۔"

"کیا مطلب!"

"فون پر تم نے مجھے شاہ ولدار کے بارے میں بتایا تھا نا، اور یہ بھی کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے۔ میں ویسے بھی ان وڈیروں کی ذہنیت جانتا ہوں۔ مجھے یہ اندیشہ لاحق ہو گیا کہ وہ تمہاری تصویروں کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

"کیا خطرناک ثابت ہوتا!" شمی نے منہ بنایا۔

"وہ تصویریں چوری بھی کروا سکتا تھا۔" بوڑھے رامین نے کہا۔ "تم نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ بہت بارسوخ ہے لیکن تم جانتی ہو کہ میری عزت ایوان صدر میں بھی کی جاتی ہے۔ بہرحال چونکہ یہ کوئی بہت بڑا معاملہ نہیں تھا اس لیے میں نے صرف ڈی آئی جی کو فون کر کے سارے حالات سے آگاہ کیا۔ میں نے ان سے یہ وعدہ بھی لے لیا تھا کہ وہ تمہیں میرے فون کے بارے میں کچھ نہ بتائیں۔"

"بلاوجہ فکرمند ہوئے آپ!"

"قطعی بلاوجہ نہیں ہوا۔ رات چار بجے ڈی آئی جی کا فون آیا تھا میرے پاس...... جان سکتی ہو، کیا بتایا ہو گا انہوں نے مجھے؟"

شمی مستفسرانہ نظروں سے بوڑھے رامین کی طرف دیکھتی رہی۔

رامین نے بتایا۔ "ساڑھے تین بجے رات کو دو جرائم پیشہ افراد نے آرٹ گیلری میں آگ لگا دی تھی۔ انہیں گرفتار کیا جا چکا ہے۔"

"اوہ، گاڈ!" شمی کے منہ سے نکلا۔ "میری سب تصویریں......"

"محفوظ ہیں۔" بوڑھے رامین نے اس کی بات کاٹی۔ "میں نے رات ہی انور رشاد کو بھی فون کیا تھا اور اسے ہدایت کی تھی کہ وہ تمہاری تصاویر فوری طور پر آرٹ گیلری سے ہٹا دے۔ خاصی تفصیل سے بات ہوئی تھی۔"

"وہ دونوں...... جنہوں نے آگ لگائی......"

"وہ پولیس کی کسٹڈی میں ہیں۔ ان سے پوچھ گچھ کی جا رہی ہے۔ ضرور یہ بات سامنے آئے گی کہ انہیں اس کام کے لیے شاہ ولدار نے ہی کچھ رقم دی ہو گی۔"

بوڑھے رامین کی یہ بات بالکل درست ثابت ہوئی۔ ذرا دیر بعد جب وہ دونوں ناشتا کر چکے تھے، ڈی آئی جی

خود ان سے ملنے آیا۔

''آپ کا خیال درست ثابت ہوا رامین صاحب!'' اس نے کہا۔ ''ان دونوں نے اقرار کرلیا تھا کہ اس کام کے لیے ایک بھاری رقم انہیں شاہ ولدار ہی نے دی تھی۔ ان دونوں کی گرفتاری کے بعد سے میں اب تک جاگ ہی رہا ہوں۔ میں نے فوراً شاہ ولدار کے گھر جا کر اس سے بات کی۔ دراصل وہ اتنا بارسوخ ہے کہ میں نے اسے فوراً پولیس ہیڈکوارٹر بلانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اس نے آگ لگانے والوں کو جھوٹا قرار دیتے ہوئے آپ دونوں پر الزام لگایا کہ اسے پھنسانے کے لیے یہ سازش آپ لوگوں نے کی ہے۔ اس کے بیان کے مطابق۔'' ڈی آئی جی نے شمی کی طرف دیکھا۔ ''تصویروں کی خریداری کے سلسلے میں اس نے جب آپ سے بات کی تھی تو آپ نے اسے بہت برا بھلا کہا تھا۔ اس نے الزام لگایا ہے کہ آپ اچھے کردار کی خاتون نہیں ہیں۔''

''کیا!'' بوڑھا رامین تڑخ کر بول اٹھا۔

خود شمی کے چہرے کا رنگ بھی بدل گیا تھا۔

''مجھے یقین ہے کہ اس نے جھوٹ بولا ہے۔'' ڈی آئی جی نے کہا۔ ''اس کا بیان ہے کہ شمی صاحبہ اپنے سابق شوہر عادل سے طلاق لے کر لاہور چلی گئی تھیں جہاں انہوں نے آپ کی شاگردی اختیار کرلی تھی۔ اسے اس طلاق کا علم کیسے ہوا تھا، یہ اس نے ابھی نہیں بتایا۔ اب وہ کہتا ہے کہ ان کے سابق شوہر بھی نمائش میں موجود تھے۔ طلاق کے باوجود یہ اپنے سابق شوہر سے تعلقات...... قائم کرچکی ہیں۔''

''بکواس کرتا ہے وہ!'' بوڑھے رامین نے تڑخ کر کہا۔

شمی کا چہرہ بھی غصے سے سرخ ہوگیا تھا۔

ڈی آئی جی بولا۔ ''اس نے میرے سامنے ہی وزیرداخلہ کو بھی فون کیا تھا۔ میری بات بھی کرائی تھی وزیرداخلہ سے! انہوں نے مجھ سے سختی سے بات نہیں کی۔ وہ بھی جانتے ہوں گے کہ آپ کی رسائی ایوان صدر تک ہے۔ وزیرداخلہ نے مجھے صرف اتنی تاکید کی کہ میں قاعدے کے ساتھ اس معاملے کی تفتیش کرواؤں اور شاہ ولدار سے سختی سے پیش نہ آؤں۔''

شمی بولی۔ ''اس نے یہ بتایا کہ یہ بکواس اس نے کس بنیاد پر کی تھی؟''

''میں اس سے پوچھ گچھ جاری رکھتا لیکن وزیرداخلہ سے میری بات کرانے کے بعد وہ کچھ اکڑ گیا اور کہنے لگا کہ اب وہ اپنے وکیل کے ساتھ ہی پولیس ہیڈکوارٹر آئے گا اور وہیں اپنا مکمل بیان ریکارڈ کروائے گا۔ گیارہ بارہ بجے کے درمیان کا وقت دیا ہے اس نے...... مجھے آپ پر یقین ہے رامین صاحب!...... میں اسے چھوڑوں گا نہیں...... میں اس سے مل کر ہیڈکوارٹر جارہا تھا۔ میں نے سوچا کہ راستے ہی میں ہے آپ کا ہوٹل...... آپ سے ملتا چلوں اور آپ کو اب تک کے حالات سے باخبر کردوں۔''

''شکریہ ڈی آئی جی صاحب!'' بوڑھے رامین نے کہا۔ ''لیکن یہ آپ یاد رکھیں کہ میں شمی کی بدنامی برداشت نہیں کروں گا۔''

''آپ بےفکر رہیں رامین صاحب!''

ڈی آئی جی چلا گیا۔

بوڑھے رامین نے یہ ساری باتیں لیٹے لیٹے ہی کی تھیں لیکن اب پھر اس کے چہرے سے بےحد تکان ظاہر ہونے لگی تھی۔

''آپ اپنے دل پر اثر نہ لیں۔'' شمی نے محبت سے بوڑھے رامین کی کلائی پہ ہاتھ رکھا اور چونک گئی۔ ''ارے!...... آپ کو تو بہت تیز بخار ہوگیا ہے۔ بہت اثر لیا ہے آپ نے ان باتوں کا۔ میں ابھی ڈاکٹر کو بلواتی ہوں۔'' وہ جھپٹ کر ٹیلی فون کے پاس گئی اور روم سروس سے بات کی۔

دس منٹ میں ہوٹل کا ڈاکٹر آگیا۔ اس نے ابتدائی معائنہ کرکے فوراً رامین کے ایک انجکشن لگایا، اس کے بعد تفصیلی معائنہ کیا۔ اس کے بعد اس کے چہرے پر کچھ تشویش کے آثار دکھائی دیے۔

''خیریت تو ہے ڈاکٹر صاحب!'' شمی نے جلدی سے پوچھا۔

''بہتر ہوگا کہ انہیں اسپتال میں داخل کرادیا جائے۔''

''ہرگز نہیں۔'' رامین بول پڑا۔ ''میں اسپتال نہیں جاؤں گا۔''

''آخر بات کیا ہے ڈاکٹر صاحب!'' شمی نے پھر بےتابی سے پوچھا۔

''ابھی مجھے صرف ایک شبہ ہے لیکن جب تک یقین نہ ہوجائے، مناسب نہیں ہے کہ ڈاکٹر کچھ بتائے۔ اب اگر یہ اسپتال میں داخل نہیں ہونا چاہتے تو پھر یہ کرنا پڑے گا کہ ابھی ان کا خون لے کر لیبارٹری بھیجنا پڑے گا۔ اس رپورٹ کو دیکھنے کے بعد ہی میں کچھ کہہ سکوں گا۔''

شمی کے اصرار کے باوجود ڈاکٹر نے کچھ نہیں بتایا۔

رامین کا خون لے کر لیبارٹری بھیج دیا گیا۔

''کیا ہوگیا ہے آپ کو!'' شمی روہانسی ہوکر رامین سے پوچھنے لگی۔ ''کچھ دن پہلے بھی آپ کو بخار ہوگیا تھا لیکن آپ ٹھیک ہوگئے تھے۔ پھر جس دن میں آرہی تھی، اس دن بھی آپ کو ہلکی سی حرارت ہوگئی تھی۔ میں تو آپ کو اس حالت میں بھی چھوڑ کر یہاں نہ آتی لیکن آپ کی ضد کے آگے مجھے ہتھیار ڈالنا پڑے تھے۔ پھر یہاں یہ آفت بھی آگئی جس کا آپ نے بہت اثر لیا ہے۔ کاش میں یہاں نہ آتی۔''

''تم بہت زیادہ فکرمند ہورہی ہو شمی!'' رامین نے پژمردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''میں جلد ہی ٹھیک ہوجاؤں گا۔ سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ بس تم ایسا کرو کہ مجھے میرے کمرے میں پہنچادو۔''

''یہاں کیا تکلیف ہے آپ کو!''

''میری ڈائری میرے کمرے ہی میں ہے اور تم جانتی ہو کہ میں روزانہ ڈائری لکھنے کا قائل ہوں۔ مجھے ابھی ان سب باتوں کا اندراج کرنا ہوگا۔''

''آپ کی طبیعت......''

''انجکشن لگنے سے میں کافی بہتر محسوس کررہا ہوں۔''

بوڑھے رامین کا اصرار اتنا شدید تھا کہ شمی کو اس کی بات ماننا ہی پڑی۔ رامین میں چلنے کی سکت نہیں تھی اس لیے شمی نے ہوٹل ہی کا اسٹریچر منگوا کر رامین کو اس کے کمرے میں منتقل کیا۔

بستر پر لیٹ کر رامین نے سرہانے سے اپنی ڈائری نکالی اور لیٹے لیٹے ہی اس پر کچھ لکھنے لگا۔

''اب آپ اور تھکیں گے۔'' شمی بولی۔

''نہیں شمی! اب کافی بہتر محسوس کررہا ہوں۔ تم چاہو تو اپنے کمرے میں جاکر کپڑے وغیرہ تبدیل کرلو۔''

''میں آپ ہی کے پاس رہوں گی۔'' شمی کے لہجے میں ضد تھی۔

''اچھا!'' رامین نے ایک طویل سانس لی اور ڈائری لکھتا رہا۔

شمی نے کمرے کے ایک گوشے میں جاکر سیل فون پر انور شاد سے رابطہ کیا اور اس پر بگڑنے لگی کہ اس نے اسے بےخبر رکھا۔ انور شاد نے معذرت کے ساتھ بتایا کہ رامین صاحب نے ہی اسے منع کیا تھا کچھ بتانے سے۔

''گیلری کیا بالکل جل گئی ہے؟'' شمی نے پوچھا۔

''پوری تو نہیں لیکن اس قابل نہیں رہی کہ نمائش جاری رکھی جاسکے اور جاری رکھنے کی کوئی خاص ضرورت بھی اس لیے نہیں ہے کہ گزشتہ رات ہی تمام تصاویر کے دام لگادیے گئے تھے۔ میں ان لوگوں کو تصویریں بھجوانے کا بندوبست کررہا ہوں۔ ان لوگوں سے چیک بھی مل جائیں گے جو میں کسی وقت بھی لاکر آپ کو دے دوں گا۔''

شمی کو چیک وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے فون بند کردیا اور ایک طرف بیٹھ کر بوڑھے رامین کی طرف دیکھتی رہی۔

ڈائری میں اندراجات کرنے کے بعد رامین نے ڈائری تکیے کے نیچے رکھ دی اور آنکھیں بند کرلیں۔

''سونے کی کوشش کیجیے!'' شمی آہستہ سے بولی۔

رامین نے آنکھیں بند کیے کیے آہستگی سے اثبات میں سر ہلادیا۔

شمی بستر کے قریب ایک کرسی پر بیٹھی رہی۔ اس کے چہرے سے خاصی فکرمندی ظاہر ہورہی تھی۔ ذرا دیر بعد اس نے محسوس کیا کہ رامین سو گیا تھا۔ دروازے پر ہلکی سی کھٹکھٹاہٹ ہوئی تو وہ چونکی۔ اگر وہ بلند آواز سے پوچھتی کہ دروازہ کھٹکھٹانے والا کون ہے، تو اس سے رامین کی نیند میں خلل پڑسکتا تھا۔ وہ کرسی سے اٹھ کر دروازے کے قریب گئی اور دھیمی آواز میں پوچھا۔

''کون ہے؟''

''میں ہوں شمی، عادل۔'' باہر سے آواز آئی۔

شمی کو حیرت ہوئی کہ عادل نے اس کے کمرے پر دستک کیوں دی تھی، تاہم اس نے دروازہ کھول دیا۔ باہر کھڑا ہوا عادل خاصا پریشان نظر آرہا تھا۔ شمی نے باہر نکل کر دروازہ آہستگی سے بند کیا۔

''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں اس کمرے میں ہوں۔''

''پہلے میں برابر والے کمرے کے دروازے ہی پر گیا تھا۔ ایک بیرے نے بتایا کہ تم اس کمرے میں ہو۔ اس کمرے میں رامین صاحب ٹھہرے ہوئے ہیں، وہ کب آئے؟''

''رات ہی کو آگئے تھے لیکن مجھے آج صبح معلوم ہوا۔ ان کی طبیعت خاصی خراب ہوگئی ہے اس لیے میں یہاں تھی، تم......''

''مجھے ایک خبر نے پریشان کردیا ہے۔'' عادل نے اپنی بغل میں دبا ہوا اخبار نکالتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو!'' اس نے اخبار کھول کر شمی کے سامنے کردیا۔ وہ شام کا اخبار تھا۔

وہ دونوں راہداری ہی میں کھڑے ہوئے تھے۔
شمی پہلے صفحے کے اوپری حصے میں چھپی ہوئی خبر دیکھ کر چونک گئی وہ اس کی اور عادل کی اس وقت کی تصویر تھی جب ان دونوں کی شادی ہوئی تھی۔ تصویر کے برابر میں دو کالمی سرخی تھی۔ ”آرٹ گیلری میں آگ میں نے نہیں لگوائی۔ مجھے پھنسایا جا رہا ہے، شاہ ولدار۔“
ذیلی سرخی میں لکھا تھا۔ ”آگ لگانے والوں کو اس کے لیے پیسے دیے گئے ہوں گے کہ وہ جان بوجھ کر گرفتار ہوں اور میرا نام لیں۔“
شمی تیزی سے خبر پڑھنے لگی۔ ”خبر میں شاہ ولدار کے بیان کے مطابق واقعہ یہ تھا کہ گزشتہ رات وہ شمی کی تصاویر دیکھنے آرٹ گیلری گیا تھا۔ اسے وہ ساری تصویریں پسند آئیں تو اس نے شمی سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ ساری تصویریں خریدنا چاہتا ہے۔ شاہ ولدار نے اپنے بیان میں مزید کہا تھا کہ پندرہ سولہ سال پہلے شمی نے عادل نامی ایک شخص سے شادی کی تھی لیکن دراصل وہ اس سے یعنی شاہ ولدار سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ اس نے ہر طریقے سے شاہ ولدار کو اپنے دام میں لانے کی کوشش کی تھی۔ کیونکہ شاہ ولدار کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اچھے کردار کی مالک نہیں تھی لہٰذا اس نے شادی سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے بعد ہی اس نے عادل نامی شخص سے شادی کی تھی مگر جب عادل کو اپنی بیوی کے کردار کے بارے میں معلوم ہوا تو اس نے شمی کو طلاق دے دی۔ شمی کراچی سے مستقل طور پر لاہور چلی گئی جہاں اس نے مشہور و معروف آرٹسٹ رامین کی شاگردی اختیار کر لی۔ برسوں بعد اب وہ کراچی آئی تھی تو اس نے پھر کسی طرح عادل کو اپنے جال میں پھانس لیا۔ وہ اور شمی اس وقت گیلری ہی میں تھے جب اس نے شمی سے ساری تصاویر خریدنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ شمی کو ابھی تک شاہ ولدار پر غصہ تھا کہ اس نے اس سے شادی نہیں کی تھی اس لیے اس نے نہایت بدتمیزی سے جواب دیا، پھر جب وہ کچھ دیر کے لیے عادل سے الگ ہوئی تھی تو اس نے اس سے یعنی شاہ ولدار سے کہا تھا کہ اب وہ کراچی آئی ہے تو اس سے اس وقت کا انتقام ضرور لے گی جب اس نے شادی کرنا چاہی تھی لیکن شاہ ولدار نے اسے ٹھکرا دیا تھا......“

☆☆☆

خبر آگے اور بھی تھی لیکن اتنا ہی حصہ پڑھ کر شمی کا دماغ گھومنے لگا۔ یہ قطعی غلط لکھا تھا کہ عادل نے اسے طلاق دی تھی۔ حقیقت اس کے قطعی برخلاف تھی۔ شمی نے خود ہی اس سے خلع لیا تھا۔ ڈرنک پی کر عادل نے غصے میں خلع نامے پر دستخط کیے تھے اور تپائی پر پٹخ کر کمرے سے جانے کے لیے دروازے کی طرف مڑا تھا لیکن پھر ٹھٹک بھی گیا تھا۔
شمی نے دیکھا کہ دروازے میں نعیمہ کھڑی تھی جس کے چہرے سے خوف کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ شمی ہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔
”کیوں آئی ہو یہاں؟“ شمی غصے میں کھڑی ہوئی تھی۔ ”کیا تم نے میرے خط سے یہ نہیں سمجھا کہ اب میں تمہاری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔“
”لل...... لیکن...... باجی......“
”مت باجی کہہ کر مخاطب کرو مجھے...... گندا کر چکی ہو تم اس مقدس رشتے کو...... اب میں نے آزاد کر دیا ہے عادل کو تمہارے لیے...... شادی کر سکتے ہو اب تم دونوں۔“
عادل تیزی سے آگے بڑھ کر نعیمہ کے قریب پہنچا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے لے جانے لگا۔
”تمہاری کار یہیں ہے۔“ شمی بلند آواز میں بولی تھی۔ ”وہ میں شوفر سے بھجوا دوں گی۔“
عادل نعیمہ کا ہاتھ پکڑے اسے تیزی سے باہر نکال لے گیا۔ شمی ایک جھٹکے سے بیٹھی اور گلاس کی باقی ڈرنک ایک ہی سانس میں پی گئی۔ پھر اس نے گلاس ایک طرف پھینکا اور اٹھ کر بستر پر جا گری۔ اب وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اس نے جو قدم اٹھایا تھا اسے اس کا دکھ تھا کیونکہ وہ عادل سے بہت محبت کرنے لگی تھی لیکن یہ اس کے لیے ناقابل برداشت تھا کہ عادل اس سے بے وفائی کرے اور اس کی چھوٹی بہن کو بھی اپنے تصرف میں لے آئے۔
دو دن گزر گئے۔ شمی نے خلع نامے کی فائل ریحان ایڈووکیٹ کو بھجوا دی تھی۔ اس کے ذریعے خلع نامے کی عدالتی کارروائی بھی مکمل ہو گئی۔
شمی نے دو دن مسلسل ڈرنک پیتے ہوئے گزارے تھے۔ تیسرے دن سے اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی اور ایک ہی پیگ پی کر بوتل بند کر دی۔ اب اسے یاد آیا کہ اس نے نعیمہ کی کار نہیں بھجوائی تھی۔ اس نے شوفر کو بلا کر اسے نعیمہ کی کار کی چابی دی اور اسے ہدایت کی کہ وہ کار پہنچا کر نعیمہ سے کچھ کہے سنے بغیر واپس آ جائے۔
شوفر کے علاوہ دیگر ملازمین بھی حیران تھے کہ گھر میں یہ کس قسم کی تبدیلی آئی تھی اور کیوں آئی تھی لیکن وہ اس کی ہمت نہیں کر سکتے تھے کہ شمی سے اس بارے میں استفسار کرتے۔

شام کا وقت تھا۔ شمی نے اپنے اسٹوڈیو کا رخ کیا۔ جو اس نے گھر میں ہی بنا لیا تھا اور وقتاً فوقتاً وہاں اپنا مصوری کا شوق پورا کیا کرتی تھی۔ اب وہ اپنا دھیان بٹانے کے لیے اسی میں دل لگانا چاہتی تھی لیکن ہوا یہ کہ اس نے پہلے سے بنی ہوئی ایک تصویر کو فنشنگ ٹچ دینا چاہا۔ اس سے وہ تصویر بہتر ہونے کے بجائے خراب ہوتی چلی گئی۔ شمی نے غصے سے برش پھینکا اور اس کمرے سے نکل کر اپنے بیڈروم کی طرف بڑھی۔ سامنے سے شوفر آ گیا۔
”دے آئے؟“ شمی نے رسمی طور پر پوچھا۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ شوفر نے اس کے حکم کی تعمیل نہ کی ہوتی۔
”جی۔“ شوفر نے جواب دیتے ہوئے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ ”یہ صاحب نے دیا ہے۔“
”عادل نے؟“ شمی نے بے ساختہ پوچھا۔
”جی۔“
”وہ......“ شمی کچھ کہتے کہتے رکی، پھر اس نے کہا۔
”اچھا جاؤ!“
پھر وہ لفافہ چاک کرتے ہوئے اپنے بیڈروم میں داخل ہوئی۔
لفافے میں ایک چیک تھا۔ جو اسی کے نام تھا۔ اس پر لکھی ہوئی رقم وہی تھی جو کمپنی کے چیف اکاؤنٹینٹ نے بتائی تھی۔ چیک کے ساتھ ہی عادل کا ایک مختصر خط تھا جس میں اس نے شمی کو مخاطب کیے بغیر لکھا تھا۔
”یہ میں کل ٹی سی ایس سے بھجوا دیتا لیکن شوفر آیا ہے تو مجھے خیال آیا کہ اسی کے ہاتھ بھجوا دوں۔ کمپنی سے تمہاری علیحدگی کے کاغذات آج مکمل کروا لیے ہیں۔ جب تمہارا دل چاہے، آ کر دستخط کر دینا۔“
شمی نے چیک، خط اور لفافہ بستر کی سائیڈ ٹیبل پر ڈالے اور بستر پر لیٹ گئی۔ اس کے دماغ میں یہ خیال گردش کرنے لگا تھا کہ عادل اور نعیمہ نے سول میرج کر لی ہوگی۔
دن پر دن گزرتے رہے۔ شمی کوشش کرتی رہی کہ مصوری میں دل لگا لے۔ دس دن گزرے تھے کہ اس کے سیل فون پر عادل کی کال آئی۔ اسکرین پر اس کا نام پڑھ کر شمی کو عجیب سا لگا۔
”ہیلو!“ وہ سیل فون کان سے لگا کر سپاٹ لہجے میں بولی۔
”آج تم ضرور آنا۔“ دوسری طرف سے عادل نے کہا۔ ”شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔“
”کہاں؟“ شمی کو عادل کی بات پر تعجب ہوا تھا۔
”کہاں آنا؟“
”کیا تمہیں کارڈ نہیں ملا...... تین دن ہوئے بھیجے ہوئے۔ وہ تمہیں مل تو جانا چاہیے تھا۔“
شمی کو یاد آیا کہ دو دن قبل ایک ملازم نے اسے ایک لفافہ لا کر دیا تھا جو ٹی سی ایس سے آیا تھا۔ لفافے کے اوپر کی تحریر سے یہ بات ظاہر ہو گئی تھی کہ وہ کسی شادی کا دعوت نامہ تھا۔ شمی ان دنوں ذہنی طور پر اتنی پراگندہ تھی کہ اس قسم کی کسی تقریب میں جانا ہی نہیں چاہتی تھی۔ اس نے لفافہ دراز میں ڈال دیا تھا۔
”اچھا!“ شمی تلخی سے بولی۔ ”ہاں اب یاد آیا ہے مجھے!...... وہ میں نے کھول کر دیکھے بغیر دراز میں ڈال دیا تھا۔ تم نے یہ ہمت بھی کر ڈالی کہ اپنی شادی کا دعوت نامہ بھی مجھے بھجوایا؟...... سول میرج تو تم نے کر لی ہوگی۔ اب باقاعدہ شادی کر رہے ہو۔“
”میرا کوئی ارادہ نہیں ہے شادی کرنے کا۔“ شمی نے محسوس کیا تھا کہ عادل کے لہجے میں افسردگی تھی۔ ”وہ دعوت نامہ میری چھوٹی بہن کی شادی کا ہے۔“
”چھوٹی بہن؟“ شمی حیرت سے بولی۔ ”مجھے تو تمہاری کسی چھوٹی بہن کا علم نہیں ہوا کبھی!“
”کارڈ دیکھ لو۔“ عادل نے کہا۔ ”وہ کالج میں اپنے ساتھ پڑھتے ہوئے ایک لڑکے کو پسند کرتی تھی۔ ارسلان نام ہے اس کا۔ اس کے والدین کو تیار کرنے میں مجھے کچھ دن لگ گئے ورنہ خواہش تو یہی تھی کہ نعیمہ کی شادی میں ایک دن بھی نہ لگے۔“
”نعیمہ؟“ شمی چونکی۔
”ہاں۔“ جواب آیا۔ ”نعیمہ بنت صادق علی۔“
شمی کو اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے موبائل آف کیے بغیر بستر پر پھینکا اور دراز میں سے وہ لفافہ نکالا جو اس نے بے پروائی سے دراز میں ڈال دیا تھا۔ لفافہ پر صرف ”شمی صاحبہ“ لکھا ہوا تھا۔ وہ بھی شمی نے اس وقت دیکھا، پھر جلدی سے لفافہ کھولا اور پھر ایسا لگا جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔
وہ دعوت نامہ کسی لڑکے ارسلان سے اس کی بہن نعیمہ کی شادی کا تھا۔ ”نعیمہ بنت صادق علی“ لکھا تھا کارڈ پر، اور صادق علی اس کے والد ہی کا نام تھا۔
شمی چند لمحے بعد سکتے کے عالم سے باہر آئی۔ اس نے جھپٹ کر اپنا سیل فون اٹھایا جو اس نے بستر پر پھینک دیا تھا۔ ”ہیلو! ہیلو!“ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

''ہاں شمی! لائن پر ہوں میں ابھی! مجھے خیال تھا کہ تم مجھ سے پھر بات کرنا چاہو گی۔''

''یہ سب...... یہ سب کیا ہے...... عادل!''

''کارڈ پر تم نے جو کچھ پڑھا، وہی ہے۔''

''لیکن وہ سب...... میرا مطلب ہے......'' شمی ہکلا کر رہ گئی۔

''وہ سب!'' عادل نے طویل سانس لی۔ ''اب کیا کہوں میں شمی! نعیمہ تو تم سے ڈرتی ہے لیکن بولنے کا موقع تو مجھے بھی نہیں دیا تم نے!...... جب بھی کچھ کہنا چاہتا تھا، کچھ بتانا چاہتا تھا، تم میری بات کاٹ دیتی تھیں۔ تم نے مجھے صرف یہ فقرہ بھی نہیں بولنے دیا کہ آنکھیں بھی ایک جھوٹ دیکھتی رہیں۔ میں تمہیں بتانا چاہتا تھا کہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے مجھے یہ کسک محسوس ہوتی رہتی تھی کہ میری کوئی بہن نہیں ہے، اور یہی احساس نعیمہ کو بھی تھا کہ اس کا کوئی بھائی نہیں ہے۔'' عادل جذباتی انداز میں بولتا چلا جا رہا تھا۔ ''میں اور نعیمہ ایک دوسرے کے قریب ہوئے تو ہماری وہ تشنہ محبت آسودہ ہوتی چلی گئی۔ ہم نے کبھی ایک دوسرے سے نہیں کہا کہ ہم دونوں اب بہن بھائی ہیں لیکن ہمارے جذبات وہی تھے جو بہن بھائی کے ہوسکتے ہیں۔ میں نے اس کا ہر شوق پورا کرنے کی کوشش کی۔ اسے ڈرائیونگ سکھائی، پیراکی سکھائی لیکن...... ہمارے جذبات میں کسی قسم کا کھوٹ نہیں آیا۔ میں نے ہمیشہ یہی سمجھا جیسے وہ میری سگی بہن کی طرح ہے اور مجھے یقین ہے کہ نعیمہ کے جذبات بھی ہمیشہ یہی رہے لیکن تمہاری آنکھیں تمہارے دل و دماغ پر کچھ اور ہی اثرات مرتب کرتی رہیں۔''

عادل چپ ہو گیا لیکن شمی گم صم کھڑی رہ گئی۔

چند لمحے بعد دوسری طرف سے آواز آئی۔

''ہیلو!...... ہیلو شمی!''

اب شمی چونکی۔ اس نے تیزی سے پوچھا۔ ''ابھی تم کہاں ہو؟''

''گھر پر۔''

''گھر پر...... یعنی؟''

''ہاں۔'' عادل نے جواب دیا۔ ''بڑی ممی کے گھر پر! ہم دونوں بہن بھائی اسی دن سے یہیں ہیں۔ نعیمہ رو رہی ہے۔ اس نے مجھ سے تو نہیں کہا لیکن اس کو اس بات کا بہت صدمہ رہا ہے کہ تم اس کی شادی میں نہیں ہوگی۔ ابھی تک میں نے اسے نہیں بتایا ہے کہ میں تمہیں مدعو کر چکا ہوں اور مجھے یقین بھی تھا کہ تم آ ؤ گی۔ مجھے یہ بھی خیال تھا کہ تم شادی کا کارڈ ملتے ہی مجھ سے یا نعیمہ سے رابطہ کرو گی لیکن آج میں کچھ مایوس ہو گیا تھا اس لیے میں نے تمہیں خود ہی فون کرلیا۔''

''میں...... میں وہاں آرہی ہوں...... ابھی آرہی ہوں۔'' شمی کی سانس پھولنے لگی تھی۔ اس نے عادل کے جواب کا انتظار کیے بغیر رابطہ منقطع کیا اور دوڑتے ہوئے کمرے سے نکلی۔ اسی طرح بھاگتی ہوئی گھر سے بھی نکلی۔ ملازمین نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا لیکن وہ کسی کی طرف متوجہ ہوئے بغیر اپنی کار میں جا بیٹھی۔

چوکیدار نے بھی اس کی وحشت دیکھ لی۔ اس نے کار کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی تو دوڑ کر پھاٹک کھول دیا۔

شمی نے اپنی زندگی میں کبھی اتنی تیز رفتاری سے کار نہیں چلائی تھی۔ وہ آندھی طوفان کی طرح کلثوم بیگم مرحومہ کے بنگلے پہنچ گئی۔

پھاٹک کھلا ہوا ملا تھا۔ عادل ہی نے وہ پہلے سے کھلوا دیا ہوگا۔ وہ برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ شمی اس سے لپٹتے لپٹتے رہ گئی۔ اسے اچانک خیال آگیا تھا کہ وہ خود ہی اس رشتے کو توڑ چکی ہے جس کی بنیاد پر وہ بے جھجک عادل سے لپٹ سکتی تھی۔

عادل اسے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔

''نعیمہ کہاں ہے؟'' شمی نے بے چینی سے پوچھا۔

''میں نے اپنے چند دوستوں کی بیویوں اور ان کی بہنوں کو بلا لیا تھا۔ وہ اس وقت نعیمہ کے ساتھ اس کے کمرے میں ہیں۔ اسی کمرے میں جہاں نعیمہ تمہارے ساتھ جانے سے پہلے رہا کرتی تھی۔ اسے دلہن بنوانے کے لیے بیوٹی پارلر لے جایا جانے والا تھا لیکن جب تم نے مجھ سے کہا کہ فوراً آرہی ہو تو میں نے اسے روک لیا۔''

شمی فوراً نعیمہ کے پاس جانے کے لیے اٹھی۔

''ٹھہرو!'' عادل نے اسے روکا۔ ''بہتر ہوگا کہ تم دونوں ایک دوسرے سے تنہائی میں ملو۔ مجھے اندازہ ہے کہ یہ ملاقات بہت جذباتی ہوگی۔''

اس نے اپنے سیل فون پر کسی سے رابطہ کیا اور بولا۔ ''رشیدہ بھابی!...... آپ سب نعیمہ کو چھوڑ کر برابر کے کمرے میں چلی جائیے کچھ دیر کے لیے۔'' پھر اس نے دوسری طرف سے کچھ سن کر کہا۔ ''ہاں وہ آگئی ہیں۔ میں انہیں دو منٹ بعد نعیمہ کے پاس بھیج رہا ہوں۔''

شمی سمجھ گئی تھی کہ عادل نے ''رشیدہ بھابی'' اپنے

دوست کی کسی بیوی کو کہا ہوگا۔

دو منٹ بعد شمی، نعیمہ کے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ عادل اس سے ایک قدم پیچھے تھا۔

نعیمہ جو بستر پر بیٹھی ہوئی تھی، شمی کو دیکھتے ہی بستر سے اتر کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئی تھیں اور ہونٹ جذبات کی شدت سے کانپنے لگے تھے۔

نعیمہ کو گھورتے ہوئے شمی بہت تیزی سے اس کے قریب گئی اور اس کے بالکل قریب پہنچ کر ایک جھٹکے سے رک گئی۔ نعیمہ کی نظریں جھکیں اور دو آنسو اس کے گالوں پر ڈھلک گئے۔

"کم بخت!......" شمی کے منہ سے نکلا۔ "مجھے نہیں بتا سکتی تھی تو؟...... بڑی بہن نہیں تھی میں تیری!...... نہیں تھی میں!" شمی کا ہاتھ اٹھ گیا۔

طمانچہ نعیمہ کے منہ پر پڑا۔ اس کا سر تھوڑا سا گھوم گیا لیکن اس کے قدم اپنی جگہ پر جمے رہے۔ دوسرے ہی لمحے شمی نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ یہی حال نعیمہ کا ہوا۔ وہ تو ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی اور بول رہی تھی۔ "مجھے...... مجھے...... موقع کب دیا آپ نے...... کہ...... کہ میں...... کچھ کہتی۔"

عادل آہستہ آہستہ چلتا ہوا ان دونوں کے قریب پہنچا۔ اس کا چہرہ اب مرجھایا ہوا سا لگنے لگا تھا۔ وہ چپ کھڑا رہا لیکن جب دونوں بہنوں کے رونے میں ذرا بھی کمی نہیں آئی تو اس نے آہستگی سے نعیمہ کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"بس!...... بس!...... بس نمو!"

اس کا ہاتھ نعیمہ کے شانے پر اس لیے ٹک سکا کہ وہ اس کی بہن بن چکی تھی۔ اپنا دوسرا ہاتھ شاید اپنی خواہش کے باوجود شمی کے شانے پر نہیں رکھ سکا۔ وہ اب اس کی بیوی نہیں رہی تھی۔ شمی نے خود وہ رشتہ ختم کیا تھا۔

☆☆☆

سولہ سال بعد عادل ہوٹل کی راہداری میں شمی کے سامنے کھڑا تھا اور اخبار کی خبر پڑھتے ہوئے شمی کا سر چکرانے لگا تھا۔ اس خبر کے نیچے اس کی اور عادل کی ایک اور تصویر بھی چھپی تھی جو کسی نے آرٹ گیلری میں کھینچی تھی۔

"یہ سب بکواس ہے۔" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ "اس کمینے نے مجھے بدنام کرنے کے لیے یہ پریس ریلیز دی ہے اخبار کو۔"

وہ خبر کے آغاز میں "پ، ز" کے حروف پڑھ چکی تھی۔

"تمہیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں شمی!" عادل نے کہا۔ "میں تو شروع سے آخر تک رہا تھا گیلری میں!...... اس سے تمہاری کوئی تلخ کلامی نہیں ہوئی تھی اور نہ تم نے اس سے انتقام لینے کی کوئی بات کی تھی، لیکن یہ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اس نے یہ گندی حرکت کیوں کی ہے۔"

"وہ خود کو بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔ آرٹ گیلری میں آگ اسی نے لگوائی تھی۔"

"میں وہ خبر بھی پڑھ چکا ہوں۔ یہ شام کے اخبار والے اس قسم کی سنسنی پھیلانے والی خبروں کے بل پر ہی چلتے ہیں۔ پریس ریلیز کے طور پر چھاپی ہے اس نے یہ خبر تاکہ خود کو بچا سکے۔ شاہ دلدار نے اسے یہ خبر چھپوانے کے لیے کوئی بڑی رقم بھی دی ہوگی۔"

"اور یہ حرکت اس نے ڈی آئی جی صاحب سے ملنے کے بعد کی ہوگی۔"

"ڈی آئی جی؟" عادل کا لہجہ مستفسرانہ تھا۔

وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ راٹمن کی وجہ سے گیلری کی آگ کے سلسلے میں پولیس حرکت میں آچکی تھی۔

اس سے پہلے کہ شمی اسے اس بارے میں کچھ بتاتی، وہ یہ دیکھ کر چونک گئی کہ ہوٹل کا ڈاکٹر اور ہوٹل کا اسسٹنٹ منیجر تیزی سے اس کی طرف آرہے تھے۔ ان کے انداز سے پریشانی بھی ظاہر ہو رہی تھی۔

"کیا بات ہے ڈاکٹر؟" شمی نے اس وقت تیزی سے پوچھا جب وہ دونوں شخص اس کے قریب آچکے تھے۔

"لیبارٹری سے رپورٹ آگئی ہے۔ میں اب راٹمن صاحب کو فوراً پھر دیکھنا چاہتا ہوں۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"کوئی خطرناک بات ہے رپورٹ میں؟" شمی نے گھبرا کر پوچھا۔

"ہیپاٹائٹس۔"

"اوہ، گاڈ!" شمی کو اپنی جان نکلتی محسوس ہوئی۔

"اور وہ ڈرنک بھی پی رہے ہیں جو ان کے لیے زہر ہے۔ میں نے جب ان کا معائنہ کیا تھا تو اس کی بو محسوس کر لی تھی لیکن آپ کو کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ میں اب فوراً انہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ شاید اب ضروری ہو کہ......"

شمی پورا فقرہ سنے بغیر تیزی سے مڑی اور کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔ "آئیے!"

"کیا میں بھی آجاؤں شمی!" عادل جلدی سے بولا۔

"ہاں آؤ!" شمی کہتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔

اس نے دیکھا کہ راٹمن کے ہاتھ میں وسکی کا ایک خالی منی ایچر تھا جو اس نے اسی وقت خالی کیا ہوگا۔ دو منی ایچر اس کی گود میں پڑے تھے۔ شمی جب کمرے سے گئی تھی تو اس نے غلط سمجھا تھا کہ راٹمن سو گیا تھا۔ وہ یقیناً سویا نہیں تھا لہٰذا اس نے شمی کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تین منی ایچر پی ڈالے تھے۔ شمی اور ڈاکٹر وغیرہ کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر اس نے چھوٹی چھوٹی تینوں شیشیاں چھپانے کی کوشش کی۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ!" ڈاکٹر تیزی سے اس کے قریب پہنچا۔ "یہ زہر ہے آپ کے لیے!"

"امرت ہے یہ میرے لیے!" راٹمن کی آواز میں شدید نقاہت تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔

"سر!" شمی چیخ کر اس کے قریب پہنچی۔

ڈاکٹر کا ہاتھ راٹمن کی کلائی پر تھا۔

"انتہائی تیز بخار ہو گیا ہے انہیں!...... اب اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ انہیں اسپتال پہنچایا جائے۔"

شمی روہانسی نظر آنے لگی۔

اسسٹنٹ منیجر اس سے بولا۔ "گھبرایئے نہیں۔ ابھی سب بندوبست ہو جاتا ہے۔"

شمی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اسے محسوس ہوا تھا جیسے اس کی ٹانگوں کی جان نکل گئی ہو۔

"ہمت رکھو شمی!" عادل اس کی کرسی کے قریب آگیا۔

اسسٹنٹ منیجر وہیں سے کسی کو فون کرنے لگا۔ بہت جلد ایمبولینس آگئی۔ بوڑھے راٹمن کو اسٹریچر پر لٹا کے کمرے سے باہر لایا گیا۔ کمرے کے قفل کی چابی شمی نے اپنے پاس رکھ لی۔

اسٹریچر کے ساتھ ہی شمی بھی ایمبولینس میں سوار ہو گئی تھی۔ عادل نے اس سے کہہ دیا کہ وہ اپنی کار میں ایمبولینس کے پیچھے آئے گا۔

بیس منٹ بعد راٹمن کو اسپتال میں داخل کیا جا چکا تھا۔ راٹمن کی شہرت بین الاقوامی تھی اس لیے اسپتال کے ڈاکٹروں میں ہلچل مچ گئی۔ آئی سی یونٹ کی مشینریز اس کے کمرے میں پہنچا دی گئیں۔

شمی اور عادل کمرے کے سامنے ٹہلنے لگے۔ ان سے کہا گیا تھا کہ وہ فی الحال کمرے میں نہ آئیں۔

"راٹمن صاحب...... کیا زیادہ دن سے بیمار تھے؟" عادل نے پوچھا۔

"کچھ عرصے سے انہیں بار بار بخار آنے لگا تھا۔" شمی نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "میں نے کئی مرتبہ چاہا کہ ان کے ٹیسٹ کروائے جائیں لیکن وہ مانتے ہی نہیں تھے۔ ہنس کر ٹال جاتے تھے۔ ہمیشہ کہتے تھے، میں ابھی نہیں مروں گا شمی! سب ٹھیک ہے۔"

"نشے ہی کی وجہ سے ان کی یہ حالت ہوئی ہے۔"

"یہ نئی بات دیکھی ہے میں نے آج!...... کہا تو یہی جاتا ہے کہ یہ شاعر اور مصور قسم کے لوگ نشہ بہت کرتے ہیں لیکن وہ نہیں پیتے تھے۔ لاہور سے میرے آنے کے بعد شروع کی ہوگی انہوں نے لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟"

کچھ دیر خاموشی رہی، پھر عادل نے کہا۔ "جب میں ایمبولینس کے پیچھے آرہا تھا تو نعیمہ کا فون آیا تھا۔ میں نے اسے صورت حال بتا دی تھی۔ وہ خاصی پریشان ہوئی۔ اب بھی پریشان ہوگی۔"

"کل میں نے تم سے کہا تھا شاید کہ اکیلے مت آنا۔ اس سے میرا مطلب یہی تھا کہ......"

"میں سمجھ گیا تھا۔" عادل نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں نے نعیمہ سے کہا بھی تھا مگر اسے یقین نہیں آیا کہ تم نے اس کے بارے میں کہا ہوگا۔ وہ آج بھی یہی سمجھتی ہے کہ تم اس کی شادی میں تو شریک ہو گئی تھیں لیکن اس سے ناراض اب بھی ہو۔ تم اس کے بعد اس سے ملی ہی نہیں تھیں۔"

لیکن اس کا سبب ناراضی نہیں تھا۔ شمی بے انتہا شرمندہ تھی اپنی چھوٹی بہن سے۔ اس میں ہمت نہیں رہی تھی نعیمہ کا سامنا کرنے کی۔ اس کا دل بھی کراچی سے اُچاٹ ہو گیا تھا جہاں وہ عادل سے بھی دور ہو چکی تھی۔ اسی لیے اس نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کراچی چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ لاہور جا کے وہ بوڑھے راٹمن کی شاگرد ہو گئی تھی۔

راٹمن کے آرٹ کی وہ ہمیشہ سے مداح رہی تھی۔ شاگرد بننے کے بعد راٹمن سے اس کی عقیدت بھی بڑھتی چلی گئی۔ پھر اس عقیدت میں ایک طرح کی محبت بھی شامل ہو گئی۔ اسی عقیدت اور محبت کے باعث وہ جی جان سے راٹمن کی خدمت کرنے لگی۔

بوڑھے آرٹسٹ راٹمن کی عمر اس وقت بیاسی سال تھی جس کے ستر سال اس نے کینوس اور رنگوں کی سنگت میں گزار دیے تھے۔ اس عمر تک پہنچنے کے بعد اب وہ اس کام کو

زیادہ وقت نہیں دے پاتا تھا۔ شاگردوں ہی کو وقت دینے کے بعد وہ اتنا تھک جاتا تھا کہ پھر خود اس میں کچھ زیادہ کرنے کی ہمت ہی نہیں رہ جاتی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں جاکر پڑ جاتا تھا۔

شمی بہت جلد محسوس کرنے لگی تھی کہ رامین تنہائی میں بہت اداس ہوجاتا تھا، جیسے کہیں خلا میں بھٹک رہا ہو۔ کینوس اور رنگوں سے کسی قدر دوری ہی اس کے اس احساس کا باعث تھی۔ وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ اس کی زندگی میں کوئی کمی رہ گئی تھی۔ کبھی کبھی وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں اپنی اس کیفیت کا اظہار شمی سے بھی کر بیٹھتا تھا۔

''مجھے اپنی راتیں اب بہت طویل محسوس ہونے لگی ہیں۔'' ایک مرتبہ اس نے شمی سے کہا تھا۔

''یہ تنہائی کی وجہ سے ہے سر!'' شمی نے کہا۔ ''دو لڑکیاں آپ سے شادی کی خواہش مند رہ چکی ہیں۔ آپ ان میں سے کسی کو رفیق زندگی بنا لیتے تو راتوں کی طوالت کا احساس نہ رہتا۔''

''ان لڑکیوں کے دل میں صرف لالچ تھا۔ وہ شادی کرکے بے چینی سے میری موت کا انتظار کرتیں۔ ان کی یہ بے چینی مجھ سے چھپی نہ رہتی۔ اس طرح میں اور زیادہ اذیت کا شکار ہوجاتا۔ تمہاری طرح بے لوث نہیں تھیں۔''

''میں بے لوث ہوں؟ آپ کو یقین ہے؟''

''سو فیصد یقین!...... تم خود اتنی دولت مند ہو کہ تمہارے دل میں لالچ آہی نہیں سکتا۔ تم میری حد درجہ بے لوث شاگرد ہو۔ تمہیں فن مصوری سے بھی عشق ہے اور اسی لیے میں تمہیں زیادہ وقت بھی دیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم ہی میرا نام روشن رکھو گی۔''

''آپ کو آپ کا فن روشن رکھے گا سر!''

''لیکن تم اس روشنی کا مینار ہوگی۔''

''میں آپ کو تنہائی میں اداس دیکھتی ہوں تو میرا دل کٹنے لگتا ہے۔ اگر آپ مجھے بے لوث سمجھتے ہیں تو مجھے اپنی تنہائی کا ساتھی بنا لیجیے۔''

بوڑھا رامین چونک گیا تھا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ تم صرف پچیس چھبیس سال کی ہو۔ میں بیاسی سال کا ہوچکا ہوں۔ تمہیں میری دولت کا لالچ یقیناً نہیں ہوگا لیکن...... میں دوبارہ کہوں کہ میری عمر بیاسی سال ہوچکی ہے۔''

''میں سمجھ گئی آپ کیا کہہ رہے ہیں۔'' شمی کی نظریں جھک گئیں۔ ''لیکن عادل سے الگ ہونے کے بعد میری وہ حسیات دم توڑ چکی ہیں۔ میں صرف آپ کی تنہائی کا مداوا کرنا چاہتی ہوں۔''

وہ رامین کو عادل اور نعیمہ کے بارے میں سب کچھ بتا چکی تھی۔ اسے رامین سے اس قسم کی محبت ہوئی بھی نہیں تھی جو اسے عادل سے تھی۔ رامین سے اس کی محبت کا بیج عقیدت کے بطن سے پھوٹا تھا۔ وہ صرف یہ چاہتی تھی کہ وہ اپنے استاد کے چہرے پر اداسیوں کا کھنڈر نہ دیکھے۔

☆☆☆

اور اس طرح چودہ سال بیت گئے۔ رامین کا راتوں کی طوالت کا احساس ختم ہوگیا۔ اس کے چہرے کی جھریوں میں کروٹیں لیتی ہوئی اداسی ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔

چودہ سال بعد وہ بیمار ضرور رہنے لگا تھا اور اب یہ خبر شمی پر بجلی کی طرح گری تھی کہ وہ ہیپاٹائٹس کا شکار ہوگیا تھا۔ اسپتال پہنچنے تک وہ بے ہوش ہوگیا تھا اور اسی بے ہوشی میں وہ اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اس کے جنازے میں بے انتہا لوگ تھے اور اس کی موت کی خبریں دنیا کے بڑے بڑے اخبارات میں شائع ہونے کے ساتھ ساتھ ٹی وی چینلز سے بھی نشر ہوئی تھیں۔

شمی بالکل گم صم ہوکر رہ گئی تھی۔ اس کا قیام ہوٹل ہی کے کمرے میں تھا کیونکہ کراچی سے جاتے وقت وہ اپنا بنگلا بھی بیچ گئی تھی۔ جاتے وقت اس نے عادل سے یہ بھی کہا تھا۔ ''میں چاہتی ہوں کہ اب ہم دونوں ایک دوسرے سے کبھی نہ ملیں۔ شاید اس طرح میں تمہیں بھول سکوں ورنہ میں کسی موذی بیماری کا شکار ہوجاؤں گی۔''

لیکن قدرت اب ان دونوں کی زندگی کے ڈرامے کا ڈراپ سین کردینا چاہتی تھی اس لیے ٹرین میں ان کی اتفاقیہ ملاقات ہوگئی۔ اب وہ ہوٹل میں تھی۔ اس حادثے نے اس پر اتنا گہرا اثر کیا تھا کہ اگر وہ ہر وقت اپنے آپ کو ڈرنکس میں غرق کیے رہتی تو عادل ہرگز حیران نہ ہوتا لیکن اس کے برخلاف شمی نے اس کے بعد ڈرنک کو ایک بار بھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

ہوٹل میں عادل زیادہ سے زیادہ وقت اس کی دلجوئی میں گزارتا...... وہ صبح ہی صبح آجاتا اور رات تک رہتا۔

ایک صبح شمی چونک گئی۔ عادل کے پیچھے نعیمہ بھی تھی۔ اس وقت بھی اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے ڈری ہوئی ہو۔

شمی کی نظریں جھک گئیں۔ وہ دھیمی آواز میں بولی۔ ''یہ تیری غلط فہمی ہے نعیمہ!...... ناراض نہیں ہوں میں تجھ سے!...... میں تو تجھ سے شرمندہ ہوں، تجھ سے آنکھ ملانے کی

ہمت نہیں رہی ہے مجھ میں!''

''باجی!'' نعیمہ سسکیاں لیتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔ شمی کی آنکھوں میں آنسو نہیں آئے، وہ بس نعیمہ کی پیٹھ تھپکتی رہی۔

عادل نے نعیمہ کو سنبھالا۔

''آپ کب تک ہوٹل میں رہیں گی باجی!'' نعیمہ نے افسردہ چہرے کے ساتھ پوچھا۔

شمی خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی، پھر بولی۔ ''مجھے احساس ہی نہیں ہے کہ میں کہاں رہ رہی ہوں۔''

''آج میں ہمت کرکے اس لیے آئی ہوں کہ آپ کو اپنے ساتھ گھر لے جاؤں۔''

''لے جاؤ۔'' شمی کا لہجہ سپاٹ ہی رہا۔ ''میرے لیے اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں کہاں رہوں اور کہاں نہ رہوں۔''

''تو بس! تیار ہوجائیے!''

''ارسلان کو تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟''

''وہ بزنس کے کچھ معاملات میں بیرون ملک گئے ہوئے ہیں لیکن میں انہیں فون پر آپ کے بارے میں بتاتی رہی ہوں۔ کل انہوں نے ہی مجھ سے کہا تھا کہ آپ کو ہوٹل سے لے آؤں۔ گھر چل کر آپ کا دل بہلانے کے لیے بارہ اور دس سال کی دو بچیاں بھی ہوں گی۔''

''بچیاں؟'' شمی کے چہرے پر تعجب کے تاثرات ابھرے۔

''آپ کی بھانجیاں۔'' نعیمہ پہلی مرتبہ خفیف سا مسکرائی۔

''اوہ!'' شمی بھی اس مرتبہ مسکرا دی، پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ''مجھے خیال ہی نہیں آیا کہ اتنا عرصہ گزر چکا ہے۔ تم ماں بھی بن چکی ہوگی۔ کیسی ہیں میری پیاری بھانجیاں؟''

''چل کر دیکھ لیجیے گا۔ میں انہیں بتا کر آئی تھی کہ آپ کو لینے جارہی ہوں۔ بڑی بے چینی سے انتظار کررہی ہوں گی آپ کا۔ بس جلدی سے تیار ہوجائیں۔''

''تیار کیا ہونا ہے۔ بس ایسے ہی چلتی ہوں۔ صرف سامان اٹھانا ہے۔'' شمی نے اداس نظروں سے ایک طرف دیکھا۔ ''یہ رامین صاحب کا سوٹ کیس ہے۔ یہ میں ان کے کمرے سے لے آئی تھی۔ اس کا کرایہ بھی ادا کرچکی ہوں۔''

''یہاں کا حساب میں ابھی نیچے جاکے کرآتا ہوں۔'' عادل کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔ ''پورٹر کو بھی لیتا آؤں گا۔''

شمی نے اپنا پرس اٹھایا تو عادل کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ شمی نے محسوس کرلیا اور اپنا پرس واپس رکھ دیا۔ عادل کمرے سے چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ تینوں عادل کی کار میں روانہ ہوئے۔ راستے میں عادل بتانے لگا کہ شاہ دلدار نے جو پریس ریلیز اخبار کو دی تھی، پولیس کو اپنا بیان بھی اسی کے مطابق دیا تھا لیکن ڈی آئی جی نے رامین صاحب کے حوالے سے براہ راست ایوان صدر سے رابطہ کرلیا تھا اور شاہ دلدار کا سرپرست وزیر داخلہ تلملا کر رہ گیا تھا۔ پھر ڈی آئی جی نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ ایک آدھ دن میں ڈی آئی جی کو شمی سے مل کر اس کا بیان دوبارہ لینا تھا۔ پھر چند دن کے اندر اندر کیس عدالت میں چلا جاتا۔

شمی نے یہ ساری باتیں بڑی بے دلی سے سنیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے رامین کے بعد اسے کسی بات سے دلچسپی ہی نہ رہی ہو۔

نعیمہ کے گھر پر اس کی دونوں بھانجیاں اس سے لپٹ گئیں۔ اس نے انہیں پیار کیا۔

چند دن گزر گئے۔ شمی کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ یہاں بھی عادل اپنا سارا دن شمی کی دل جوئی میں گزارتا تھا۔

آخر ایک دن وہ کہہ بیٹھا۔ ''شمی!...... میں نے ابھی تک دوسری شادی کے بارے میں سوچا تک نہیں۔''

''بتایا تھا مجھے نعیمہ نے۔'' شمی نے سرسری انداز میں کہا، پھر بولی۔ ''کرلیتے تو اچھا تھا۔ میں تمہارے لیے اچھی بیوی ثابت نہیں ہوئی تھی۔''

''اگر برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں؟''

''پوچھو لیکن میں جانتی ہوں تم کیا پوچھو گے۔''

''کیسے جان سکتی ہو تم؟''

''رامین صاحب کی وجہ سے میری جو حالت ہوئی ہے، اس سے تم نے یہ سمجھا ہے کہ میں نے ان سے شادی کرلی تھی اور ان سے محبت کرنے لگی تھی۔ میں تمہارے سوال کرنے سے پہلے بتا دیتی ہوں کہ ہاں، میں نے ان سے شادی کرلی تھی لیکن اس لیے نہیں کہ مجھے ان سے اسی قسم کی محبت ہوگئی تھی جیسی شادی کے بعد تم سے ہوگئی تھی۔''

عادل چپ بیٹھا سنتا رہا۔ شمی نے مختصر الفاظ میں بتایا کہ اس نے ایک بوڑھے آرٹسٹ سے شادی کیوں کی تھی۔

"لیکن ..." شمی نے بات جاری رکھی۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اپنے دل میں میرے لیے اتنا گداز رکھتے تھے..." شمی کی آواز بھرا گئی۔

"کیا مطلب!" عادل نے پوچھا۔

شمی نے ایک ڈائری نکال کر عادل کی طرف بڑھائی۔ "یہ رامین صاحب کی ڈائری ہے۔ پڑھ لو۔"

عادل بہت دیر تک ڈائری پڑھتا رہا۔ اگرچہ وہ سولہ سال کے واقعات کی ڈائری نہیں تھی لیکن حالیہ عبارت سے بھی پڑھنے والا اندازہ لگا سکتا تھا کہ ان گزرے ہوئے برسوں میں بھی کیا کچھ ہوتا رہا تھا۔

رامین صاحب کو شمی نے عادل کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا لیکن شادی کے بعد جب شمی ان کے کمرے میں سونے لگی، تب انہیں احساس ہوا کہ شمی کے دل سے عادل کی چاہت ختم نہیں ہوسکی تھی۔ وہ سوتے میں کبھی کبھی بڑبڑانے لگتی تھی جس سے رامین صاحب کو اس کا اندازہ ہوا تھا۔ پھر کچھ عرصے سوچتے رہنے کے بعد انہوں نے چاہا تھا کہ وہ شمی کو طلاق دے دیں۔ اس کے بعد وہ عادل سے دوبارہ شادی کرسکتی تھی مگر شمی اس بات پر ان سے ناراض رہنے لگی تو انہوں نے اس موضوع پر بات کرنا چھوڑ دیا۔ اب کچھ عرصے سے وہ بیمار رہنے لگے تھے تو انہوں نے شمی سے چھپ کر اپنے کچھ ٹیسٹ کروائے تھے اور انہیں معلوم ہوگیا تھا کہ وہ ہیپاٹائٹس کا شکار ہوگئے تھے۔ انہوں نے شمی کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ خوش تھے کہ موت اب دبے قدموں ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ان کی موت کے بعد شمی عادل سے شادی کرسکتی تھی۔ انہیں اس کا بھی علم تھا کہ اس مرض میں ڈرنک انسان کے لیے زہر ثابت ہوتی ہے اس لیے انہوں نے شمی سے چھپ کر ڈرنک پینا بھی شروع کر دی تھی۔ کیونکہ چھپ کر پیتے تھے اس لیے زیادہ نہیں پی پاتے تھے لیکن جب شمی کراچی کے لیے لاہور سے روانہ ہوگئی تو انہوں نے زیادہ پینا شروع کر دی۔ پھر جب ٹرین کے سفر میں شمی کی ملاقات عادل سے ہوئی اور شمی نے سیل فون پر بھی رامین صاحب کو اس سے آگاہ کر دیا تو انہوں نے اسی وقت شمی سے علیحدگی کی بات پھر چھیڑی جس پر شمی نے خفگی کا اظہار کیا تھا۔ عادل نے اس سے خفگی کی وجہ بھی جاننا چاہی تھی لیکن شمی ٹال گئی تھی۔ پھر جب آرٹ گیلری میں اس کی مڈبھیڑ شاہ دلدار سے ہوئی تو اس نے رامین صاحب کو بھی اس سے آگاہ کر دیا۔ رامین صاحب پریشان ہوگئے۔ انہوں نے فون پر ڈی آئی جی سے رابطہ کیا اور خود بھی کراچی پہنچ گئے۔ شراب کے منی ایچر وہ اب ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ جب عادل ہوٹل پہنچا اور شمی باہر نکلی تو رامین صاحب سوئے نہیں تھے۔ موقع دیکھتے ہی انہوں نے تین منی ایچر نکال کر پی ڈالے۔ پانی ملی بغیر تیز ڈرنک نے ان پر خوفناک اثرات مرتب کیے اور وہی اثرات ان کی موت کا سبب بنے۔ ڈائری میں ایک جگہ انہوں نے لکھا تھا۔

"میں خوب جانتا ہوں کہ شمی کی مجھ سے محبت صرف عقیدت کی وجہ سے ہے ورنہ اس کے دل میں اب بھی عادل ہی بسا ہوا ہے۔ اب اچانک وہ ٹرین میں عادل سے مل بیٹھی ہے تو اس کا محبت کا مارا ہوا دل بری طرح تڑپ اٹھا ہوگا۔ کاش شمی کو اس کی محبت جلد از جلد مل جائے۔ اس کی ایک صورت اب میری سمجھ میں یہ آرہی ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ ڈرنک پیوں اور ختم ہو جاؤں۔ ویسے بھی میری عمر بہت ہوچکی ہے۔ مجھے بہت پہلے مرجانا چاہیے تھا لیکن میں زندہ ہوں۔ شاید دو ایک سال اور زندہ رہوں لیکن شمی کی خاطر میں جلد از جلد مرجاؤں تو یہ شمی کے حق میں بہت اچھا ہوگا۔"

عادل نے افسردگی سے ڈائری بند کر کے شمی کی طرف دیکھا جو گم صم بیٹھی ہوئی تھی۔

"بہت عظیم انسان تھے رامین صاحب!" وہ بولا۔

شمی خاموش رہی۔

"بہت محبت کرنے لگے تھے وہ تم سے!" عادل پھر بولا۔ "اسی لیے اب تمہیں ان کی آخری خواہش کا احترام کرنا چاہیے۔ انہوں نے اپنی جان دے کر تم پر زندگی کے دروازے کھول دیے۔"

"بند کر دیا ہے۔" شمی بول پڑی۔ "یہ قربانی دے کر تو انہوں نے زندگی کا وہ دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا ہے، میں اب شادی کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔"

"لیکن......"

"پلیز عادل!...... تم جانتے ہو۔ بتا چکی ہوں میں تمہیں!...... ہر انسان کو اپنی مرضی سے زندہ رہنے کا حق ملنا چاہیے۔"

"اچھا!" عادل نے ٹھنڈی سانس لی۔ "تو پھر اب میں بھی تمہارے اس نظریہ حیات کو نہایت سنجیدگی سے اپنائے لیتا ہوں۔ اب تم بھی مجھ سے کبھی نہ کہنا کہ میں کسی سے شادی کرلوں۔"

شمی کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے عادل کے سینے سے لگ گئی۔